رجسٹرڈ نمبر ایل ۲۷۱

خاتون

نمبر ۱	ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۲۴ھ مطابق جنوری سنہ ۱۹۰۷ء	جلد ۴

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

علی محمد خاں کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علیگڈہ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہی اور اسکی سالانہ قیمت (عہ۱) اور ششماہی عہ/ ہے

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہی یعنی مستو ات میں تعلیم پھیلانا اور پڑہی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانی کوئی آسان بات نہیں ہی اور جب تک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہوتے ہیں اُس کی طرف ہمیشہ مردوں کو متوجہ کرتے رہینگے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جاوے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑہنے کی اُن کو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اُس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہی معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالے کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی مدد آپ کرنا ہی اگر اسکی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائیگا۔

۷۔ تمام خط وکتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علیگڈہ ہونی چاہیے۔

ملکہ جودہ بائی

اس مشہورِ آفاق ملکہ کا نام تو بہت لوگ جانتے ہیں مگر حالات سے کم لوگ واقف ہیں۔ اس مضمون میں مس نصیر الدین حیدر نے جو خاندان مغلیہ کی ایک لائق بیگم ہیں۔ اس ملکہ کے اصلی حالات جو تواریخ اور نیز اپنے شاہی گھرانے کے بڑے بوڑھوں سے انہوں نے معلوم کیے ہیں ناظرین و ناظرات خاتون کی دلچسپی کے لیے جمع کیے ہیں ہم اس مضمون کو اس کی خوبی و دلچسپی اور اس لحاظ سے کہ مضمون اور مضمون نگار میں ایک عظیم الشان تاریخی تعلق ہے۔ شروع سال کا پہلا مضمون قرار دیتے ہیں۔

اڈیٹر

ہماری اکثر ناظرین بہنیں۔ خصوصاً تاریخی مذاق رکھنے والی بیویاں مہارانی جودہ بائی کے نام نامی سے ضرور واقف ہوں گی۔ تاہم عجب نہیں ہے کہ اُن کی اخلاقی خوبیاں۔ اور سوشیل قابلیتیں۔ جو زنانہ سوانح عمری کی گویا جان ہیں۔ بہت کم بیویوں کو معلوم ہوں۔ کیونکہ جس طرح اور صدہا قابل و ممتاز عورتوں کے لائق تذکرہ واقعات و حالات ہماری مورخ

صاحبوں کی توجہ کے شرمندہ احسان نہیں ہیں۔ اسی طرح اس نامور ملکہ ہندوستان کے مفصل حالات زندگی بھی عام تاریخی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ لیکن باوجود تاریخ کی اس افسوسناک بہلوتہی کے، اور باوجود اسکے کہ رانی ممدوحہ کے زمانہ کو کئی صدیاں گزر گئیں۔ کیا سبب ہی؟ کہ رانی جودہ بائی کا نام آتے ہی یہ معلوم ہوتا ہی گویا کل کی بات ہے۔ بلاشبہ جودہ بائی ایسے گھر کی بیٹی اور ایسے ہی گھر کی بہو تھیں جو اپنے اپنے زمانہ میں اسکے مصداق تھے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

ان کی یاد داشت کے لیے چندر بنسی خاندان کی راج کنواری۔ اور خاندان تیموریہ کے ایک شاہنشاہ کی پاٹ رانی ہونا کافی ہی۔ مگر اسکا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہی۔ کہ اُس عصمت شوہر پرست، خوش سیرت۔ دانشمند اور عظیم الشان رانی نے اپنی کریکٹر میں ہمارے لیے ایسی سبق آموز اخلاقی اور تمدنی مثالیں قائم کی ہیں۔ جو کسی طرح بھولنے کے قابل نہیں ہیں اور اگرچہ وہ امتداد زمانہ کے پردہ میں چھپی ہوئی ہیں۔ مگر باریک بین نگاہیں اُنکے نتیجہ خیز ہونے سے انکار نہیں کرسکتیں۔

رانی جودہ بائی اگرچہ ایک ہندو شاہی خاندان کی راج کنواری تھیں۔ مگر جب ایک مسلمان شاہنشاہی خاندان میں بہو بنکر آئیں تو اُنھوں نے اپنی اس اہم فرض منصبی کو اس خوبی سے نبھایا جس طرح ایک فرزانہ و نیک باطن ملکہ نبھا سکتی ہے۔

رانی جودہ بائی کی بیوگرافی صرف اُن کی صفات حسنہ اور اخلاق حمیدہ ہی کی وجہ سے قیمتی اور وزندار نہیں ہی۔ بلکہ ہندو مسلمانوں کے باہمی پولیٹکل اور سوشیل تعلقات کے لحاظ سے بھی بہت کچھ قابل یادگار ہے۔ اپنی ہم رتبہ رانیوں کی طرح اس دانشمند رانی کا وجود مسعود بھی ان دو متضاد قوموں کے بیچ میں ایک ایسا حلقہ بنگیا تھا جو دو زنجیروں کو آپس میں ملا کر اُن کی قوت کو دوگنا کر دیتا ہی۔ یا حرف مشدّد تھا جسنے اپنے دونوں پہلوؤں کو فیض پہنچا کر

ملکی قوت کو مکمل کر دیا تھا۔ افسوس کہ جو مفید و خوشگوار ارتباط و اعتبار کئی سو برس تک ہندو مسلمان دونوں قوموں کو بے انتہا فائدہ پہنچاتا رہا وہ اب ناسمجھی اور خود غرضی کے ہاتھوں کیسا رائیگاں ہو رہا ہے۔

خاندان۔ و پیدائش تعلیم و تربیت۔ رانی جودھا بائی راجہ مالدیو کی پوتی۔ والی جودھپور کی بیٹی۔ راٹھور خاندان سے تھیں۔ جو راجپوتوں کے اعلیٰ خاندانوں میں سے ایک خاندان ہے۔ رانی صاحبہ کی تاریخ و سن ولادت بتانے سے میں تو کیا جتنی تاریخیں میری نظر سے گزری ہیں سب عاجز ہیں۔ اسی طرح تعلیم و تربیت کا بھی صحیح صحیح حال معلوم نہیں۔ ہاں محل کے بعض اندرونی واقعات جو بزرگوں کی زبانی سننے میں آتے ہیں ایسے ہیں کہ جنسے قیاس ہو سکتا ہی کہ یہ رانی ہرگز کودن اور بے پڑھی لکھی نہ تھی۔ بلکہ اعلیٰ درجہ کی شائستہ۔ متین۔ حاضر جواب اور تیز طبیعت تھی۔ تیزی کے ساتھ مزاج میں چنچلاپن اور شوخی بھی بیحد تھی۔ جو اپنی حریف غالب نورجہاں بیگم جیسی فرزانہ و مشہور روزگار سوکن کو بآئین شائستہ نیچا دکھانے کو ہر وقت تیار رہتی تھی۔

معیار تعلیم کے باب میں گو تردد ہو۔ مگر اسمیں شبہ نہیں کہ تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر پائی ہوگی۔ اسلیے کہ اُس زمانہ کی زندگی میں۔ جس میں قابلیت دکھانے کا زیادہ موقع ہوتا ہی۔ بہت سے تمدنی معاملات و مراسم کی تراش خراش۔ اوقات کی پابندی۔ اپنے درجہ کے عظمت و وقار کا قائم رکھنا وغیرہ وغیرہ جسکا ذکر آیندہ برمحل آئیگا۔ بغیر اعلیٰ تعلیم و تربیت یافتگی کے ناممکن ہی۔ اسکے علاوہ اعلیٰ تربیت یافتگی یوں بھی قرین قیاس ہے کہ جب اُس زمانہ میں ادنےٰ غریب لوگ جو محض جاہل ہوتے تھے علماء و فضلاء کی صحبت میں بیٹھکر اس زمانہ کے معمولی پڑھے لکھوں سے بہتر ہو جاتے تھے۔ چار دیواری کی بیٹھنے والی معمولی بیویاں اپنی طبیعت داری سے اعلیٰ طبقہ کی بیگیات کی صحبت پاکر ہوشیار ہو جاتی تھیں تو ایک والی ملک مہاراجہ کی پیاری بیٹی کو اعلیٰ تربیت میسر آنی بالکل لگتی

لگاتی بات ہے۔

شادی | یہ رانی شاہنشاہ اکبر کی بہو۔ اور شہزادہ سلیم الملقب بہ نورالدین جہانگیر کی بیاہتا بیوی ہیں۔ خاندان تیموریہ میں کئی رانیوں کو بہو بننے کا درجہ حاصل ہوا۔ مگر جس ان مہت اور چاؤ چونچلوں سے یہ رانی آئیں وہ کسی کو بھی نصیب نہیں ہوا۔ رانی جودہ بائی سہرے جلوے کی دلہن اور پنچوں کی دی ہوئی ایسی ہی بہو تھیں جنکو گھر کی نیو کہتے ہیں۔

ہندوستان کی رسم کے مطابق اُن کی خواستگاری اُنکے باپ سے خود شاہنشاہ اکبر نے بڑی تمنا کے ساتھ اُسوقت کی جبکہ نورالدین جہانگیر عالم شہزادگی میں تھے۔ اور راجہ سے وعدہ کیا کہ میں خود بیاہنے آؤنگا۔ اور جس طرح ساس سسرے اپنے بروبر کی بیٹیوں کو بیاہ کر لیجاتے ہیں اسی طرح وداع کر کے اپنے گھر لاؤنگا۔ راجہ نے اپنے شہنشاہ وقت کی اسقدر افزاوہمسرانہ درخواست کو دل وجان سے منظور کر کے بڑی دہوم سے شادی کا سامان کیا۔ جہاں پناہ مع شہزادوں اور چیدہ سرداروں کے جودھپور تشریف لے گئے۔ اسوقت اکبری کیمپ کا جاہ وجلال جس میں شادی کی گھما گھمی اور چہل پہل سونے پر سہاگہ تھی۔ قابل دید ہوگا۔ ماڑواڑ کا ریگستان گلزار بنا ہوا ہوگا۔ راجہ کی طرف سے قرب وجوار کے رجواڑوں۔ بھائی بھتیجوں، اور تمام برادری والوں کو بلاوے بھیجے گئے۔ اور جیسا کہ اہل ہنود کا دستور ہے کہ برات کو کئی کئی دن تک دعوت دیتے ہیں۔ اسی طرح بادشاہ کی بھی خدم وحشم اور بھیڑ بھنگے سمیت کئی دن تک بڑے تکلف کے ساتھ ضیافت کی گئی۔ راجہ کے محل میں عظیم الشان منڈھا چھوایا گیا۔ جسکا سونے کا کلس دور دور سے نظر آتا تھا منڈہے کے نیچے اُس شاہی جوڑے یعنی دولہا دلہن کے تمام مراسم شادی ادا کیے گئے۔ یہ وہی منڈہا تھا جسکا تعریفی گیت (جو منڈھے ہی کے نام سے مشہور ہے) آجتک دلی کی ڈومنیاں اور ارباب نشاط دلہن کے گھر میں ہنگام وداع وقت

کی راگنیوں میں بڑے درد سے گا گا کر جہانگیر و جودہ بائی کی شادی کا سماں باندھا کرتے ہیں خصوصاً خاندان تیموریہ کے بچے کھچے اُجڑے ہوئے گھروں میں اب بھی جسوقت دُلہن وداع ہونے لگتی ہے تو وہی منڈھا گایا جاتا ہے۔ خدا جانے کس بلا کی تاثیر اُس منڈھے کے بولوں میں ہے کہ دلہن والے تو آٹھ آٹھ آنسو روتے ہی ہیں۔ دولھا والے بلکہ بعض رقیق القلب دولھا بھی اُسپر آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ چونکہ یہ منڈھا دراصل ایک بہت بڑی شادی کی یادگار ہے اسلیے اسکے کچھ بول یہاں لکھنے بیموقع نہونگے۔

منڈھا (۱) پربت بانس کٹا موے بابل۔ نی کا منڈہا چھواؤ رے۔

(۲) منڈھے اوپر کلس براجے۔ دیکھیں اجہ راؤ رے۔ پربت الخ

(۳) تمھاری رے بیٹی تھارے محلونکی چیری۔ ہم باندی غلام رے۔ پربت الخ

(۴) تمھاری رے بیٹی مہارے محلونکی رانی۔ تم صاحب دار رے۔ پربت الخ

(اس میں کچھ انترے اور بھی ہیں۔ جو زائد سمجھکر چھوڑ دیے گئے۔

بزرگوں در بزرگوں کی زبانی روایت ہے کہ اس شادی میں ہندوی اور اسلامی دونوں قطع کے مراسم ادا کیے گئے تھے۔ جب رخصت کا وقت ہوا۔ اور دلہن کو نالکی میں سوار کرایا گیا۔ تو دلہن کے باپ مہاراجہ جودہپور نے اپنی لڑکی کے خسر شاہنشاہ اکبر کے آگے ہاتھ باندھکر نہایت عجز و انکسار کے الفاظ عرض کیے۔ اور بادشاہ کے بہ نفس نفیس تشریف لانے اور اعزاز کے ساتھ بیاہ لے جانے سے بچیثموں میں جو عزت افزائی ہوئی تھی اسکا شکریہ ادا کیا۔ اکبر نے بھی اُس عقیدت و وفاداری کا نہایت تلطف آمیز اور قدر افزا جواب دیا۔ یہ دونوں سوال و جواب منڈھے کے انترے ۳ و ۴ میں بڑی خوبی سے بیان ہوئے ہیں جنسے صاف معلوم ہوتا ہے کہ رانی جودہ بائی دلہن بنی ہوئی نالکی[1] میں سوار ہیں۔ شہزادہ سلیم

[1] نالکی تعزیہ کی قطع کی سواری ہے۔ جو رنگ شاہی میں داخل تھی۔ اسکا کلس سونے کا اور رنگ سنہری رنگ روغن کا ہوتا تھا۔ اسکے نیچے چار ڈنڈے ہوتے تھے۔ ہر ڈنڈے میں چار کہار لگتے تھے۔ آٹھ کہار آگے کی

دولھا بنا ہوا ہے۔ اکبر بادشاہ اور مہاراجہ جودھپور دونوں نالکی کے پاس کھڑے ہیں۔ ایک طرف اپنی پالیسی کی کامیابی کا سرور۔ بہو بیاہ کر لیجانے کی خوشی اور شاہانہ الطاف و کرم کا جوش ہے دوسری طرف شاہنشاہی ہمراہانہ سربلندی کے ساتھ بیٹی بیاہ دینے کا مسرت آمیز رنج اور ادب آمیز عقیدت کا اظہار ہے۔ غرض طرفین کے شاہی جذبات شادمانی و یگانگت کے ساتھ گلے مل رہے ہیں۔ شاہنشاہ اکبر نے راجہ کو صرف زبان ہی سے یہ جواب نہیں دیا۔ بلکہ شہزادہ سلیم کو اشارہ کیا کہ نالکی کا ایک ڈنڈا اُٹھائے۔ اور دوسری طرف کا ڈنڈا خود کندھے پر رکھکر نالکی کو اُٹھالیا۔ بادشاہ کی اس حرکت کے ساتھ ہی تمام امرا و ارکین سلطنت نالکی کی طرف جھک پڑے۔ ہر سردار یہی چاہتا تھا کہ بادشاہ اور شہزادہ سے ڈنڈا بدلوانے میں مسابقت میری طرف سے ہو۔ بڑے بڑے راجہ و مہاراجہ اور سرداران گرامی قدر باری باری سے اپنی اس جاں نثارانہ ڈیوٹی کو جس میں کمال درجہ کی شاہانہ عزت اور سچے آرزو ارمان کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں بجالائے۔ کہاروں کے اُٹھانے کی تو نوبت بھی نہ آئی ہوگی۔ کیونکہ یہ معزز کہار ہی اتنے سارے تھے (جن میں غالباً خود دُلہن کے والد صاحب بھی شریک تھے) کہ دو دو ہی قدم کے اُٹھانے پر دلہن کی نالکی خیمہ شاہی تک پہنچگئی ہوگی۔ درحقیقت یہ ایسی شاہانہ نوازش و خسروانہ قدر افزائی تھی جو سوائے راجہ جودھپور کے اور کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اور اللہ رے رانی جودہ بائی کی قسمت کا زور! کہ جس جرار بادشاہ کی تلوار کے آگے چاند سورج تک سر جھکاتے تھے۔ (چندر بنسی اور سورج بنسی خاندانوں سے مراد ہے) روز ازل میں گویا یہ حصہ ہو چکا تھا کہ یہ اقبالمند لڑکی اُسکے اور اُسکے جگر گوشے کے کندھوں پر سوار ہوگی۔ راجہ نے اپنی رانی کے سسرال و میکے دونوں کی شان کے موافق بیٹی کو خوب دل کھولکر جہیز دیا۔ نقد و جنس۔ ساز و سامان۔ ہاتھی

بقیہ نوٹ صفحہ (۵) جانب ہوتے تھے آٹھ پیچھے کیجانب۔ یہ سواری بادشاہ بیگم کے لیے مخصوص تھی۔ یا بادشاہ جس بیوی کو چاہیں یہ دار کو عطا فرماتے تھے وہ بیٹھ سکتا تھا۔ شاہی خاندان کی بیٹیاں دلہن بنکر برات اور چوتھی کے دن اسی میں بٹھیہ کر جاتی تھیں بادشاہ کے ہاں سے اُنکے لیے نالکی آجاتی تھی۔

گھوڑے۔ دیہات وجاگیر کے علاوہ (جو قوی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور دی ہوگی)
تمام وہ کارخانہ امارت جو شاہی لوازمات میں داخل تھے۔ اور جو راجہ کی سرکار میں رانی جودہ بائی
کے لیے علیحدہ مقرر تھے۔ جہیز میں لڑکی کے ساتھ دیے۔ ان لوازمات میں رانی کی چیریوں
(جنکی تعداد سینکڑوں تھی) گائنوں اور نائنوں وغیرہ وغیرہ مختلف اہل خدمات کے علاوہ
پروہتیاں اور دل بہلانے والی سہیلیاں اور مصاحبین بھی تھیں۔ یہ سہیلیاں اور مصاحبین
سردار زادیاں اور ٹھاکر زادیاں تھیں۔ ان سب کی بھیڑ بھاڑ بجائے خود ایک چھوٹا سا لشکر تھا
کیونکہ جو شریف لڑکیاں رانی کی رفاقت میں دارالخلافہ آئی تھیں۔ اُنکے کُنبے کے کُنبے
اُنکے ساتھ ترک وطن کرکے یہاں آگئے تھے۔ جن کی نسل پشت در پشت پھیل گئی۔ گو بعد میں
یہ تمام لوگ مسلمان ہوگئے۔ اور مسلمان ہونے کے بعد ان میں خلط مبحث واقع ہوگیا۔ مگر ابتک
ان لوگوں کی اولاد جو رانی کے رفقا میں سے تھے اپنے تئیں دیگر اہل خدمات کی اولاد سے
افضل و ممیز سمجھتے تھے۔ اور اپنی قوم کو راجپوت کہتے تھے۔ خاندان تیموریہ کے بالکلیہ مٹنے
کے زمانہ تک اُن لوگوں کی تعداد دلّی میں صدہا کے شمار میں موجود تھی۔ اور انکے تمام
تعلقات قلعہ اور اہل قلعہ سے وابستہ تھے۔ راجہ نے جو لوگ رانی جودہ بائی کے جہیز میں دیے
تھے اُن کو بادشاہ کی سرکار سے دیہات اور زمینیں عطا ہوئیں۔ چنانچہ اُن لوگوں کے جو
رشتہ دار اُن دیہات میں ہیں وہ ابتک اُنسے متمتع ہیں۔ اور اس زمانہ میں جو لوگ ۵۷ کے
بعد مر کھپ کر باقی رہگئے تھے ہمارے سامنے بھی اُن کی رشتہ داری کے تعلقات ان
دیہاتی لوگوں سے باقی تھے۔ شاہنشاہ اکبر جیسے حوصلہ مند بادشاہ نے اپنی پیاری بہو کے
تمام کارخانہ جات کو صرف بحالہٖ قائم نہیں رکھا۔ بلکہ اُن میں اور اضافہ کردیا۔ چنانچہ روایتہً
سُنا ہے کہ اگرچہ رانی جودہ بائی نے تبدیل مذہب کرکے اپنی خوشی سے اسلام قبول کرلیا
تھا۔ مگر اکبر جیسے بے تعصب سسرے نے اُنکے واسطے علیحدہ ایک عالیشان مکان بنوادیا
تھا۔ جس کے جھروکوں میں سے رانی سورج کے درشن کرسکتی تھیں۔ اور یہ بھی سُنا ہے کہ

سوا پہر دن چڑھے تک رانی اُس جھروکہ میں مبٹھکر روزانہ بہت کچھ دان پن کیا کرتی تھیں۔ یہ تمام خرچ شاہی خزانہ سے اُنکے لیے مقرر تھے۔

رانی جودہ بائی کی شادی کے واقعات اس شرح وبسط کے ساتھ کسی تاریخ میں آپ کی نظر سے نہیں گزرینگے۔ لیکن یہاں میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ گھریلو اور خانگی واقعات وبیانات کی بنا پر لکھا ہے۔ کیونکہ اندرون محل کے بہت سے واقعات ایسے ہیں جنکا کسی تاریخ میں تذکرہ نہیں ہو۔ اور ہمارے ہاں وہ روایتیں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی آئی ہیں۔ اول تو اپنے گھر کی بات۔ دوسرے بہت سے قرائن ایسے ہیں جنسے ان واقعات کی تصدیق ہوتی ہو۔ مثلاً اسی شادی کی یادگار کے دو گیت ایسے ہیں جو میں نے خود خاص اُن لوگوں کی نسل کی عورتوں سے گاتے ہوئے سنے ہیں جنکو میں اوپر بیان کر آئی ہوں کہ رانی صاحبہ کے ساتھ آئے تھے۔ ایک گیت تو یہ ہے ؎ "سکھی ری مورا بنرا تو آیا سلطان" الخ اور دوسرا یہ ہے " میں تو تہارے ڈیرے آئی رے جلا۔ الخ" (جلا اکبر سے مراد ہو) دوسرا گیت تمام راجپوتانہ میں آجتک گایا جاتا ہو۔ اور وہاں ابتک اکبر کو جلاجی کہتے ہیں۔ گیتوں کی دلیل مشکوک نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہ ہند کا طریقہ ہو۔ چنانچہ جب تسخیر دکن کے ارادہ سے حضرت عالمگیر اپنی تمام چیدہ فوج کو دکن لے گئے۔ اور وہاں کے قیام نے اسقدر طول کھینچا کہ بارہ برس گزر گئے۔ تو فوجی سرداروں اور سپاہیوں کے قبائل اور بیوی بچے اپنے اپنے مردوں کے دیکھنے کو سخت بیچین ہوئے۔ اور اُنھوں نے اُنپر آنے کے تقاضے شروع کیے۔ تو اُنھوں نے اپنی مجبوری کے خطوط لکھے۔ ان نامہ وپیام کے مضامین کو ذیل کے چند ہندی اشعار میں جس خوبی سے بیان کیا گیا ہو وہ اُس زمانہ کی تصویر کو آنکھوں کے سامنے کردیتی ہے ؎

دلی شہر سہاونا اور کنچن برسے نیر | سب کے کنتھ ٹہور کرے گئے عالمگیر
صاحب کی نتی کرو۔ اور من میں راکھو دھیر | اب کے بچھڑے جب ملیں جب پٹیں عالمگیر

دلّی میں برسات کے موسم میں ایک ملار گایا جاتا ہے۔ اُس میں بھی دلّی والی بیویوں کے اسی زمانہ کے انتظار کو کیسی اچھی طرح بیان کیا ہے " چھپر پُرانے ہو گئے۔ کڑکن لاگے ہیں بانس۔ اے ہو جو پیا آؤں کہہ گئے۔ آؤں آؤں کہہ گئے۔ آئے نہ بارہ مانس اے ہو جو الخ"۔ غرض گیتوں سے کھوج نکالنا غلط نہیں ہے۔

ہندو مسلمانوں پر اس شادی کا اثر

کیا زمانہ کا انقلاب ہے۔ کہتے ہیں کہ بعض راجپوت اب جودہ بائی کی شادی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ باعث ہتک خیال کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ بیٹی نہیں۔ بلکہ ہمارے ہاں کی لونڈی تھی۔ لاحول ولا قوۃ۔ بھلا اکبر ایسا مورکھ نادان تھا کہ جسکے ہاں بغیر خواہش بڑی بڑی رانیوں کے ڈولے آئے۔ وہ جُل میں آکر ایک لونڈی کو کندھے پر بٹھا کر بیاہ لاتا۔ ! خیر کوئی کسی نظر سے دیکھے۔ ہمارے نزدیک تو یہ شادی قران السعدین سے کم نہیں تھی۔ بلاشبہ اس سے پہلے بھی ہندوؤں کے ہاں مسلمانوں کے اس قسم کے تمدنی تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ شاہنشاہ اکبر نے خود راجہ بہارامل مہاراجہ جیپور کی بیٹی سے شادی کی۔ جودہ بائی کے علاوہ کچھواہہ خاندان کی ایک دوسری رانی خود جہانگیر کے حبالہ نکاح میں آئی۔ مگر یہ رشتہ شادی کی دہوم دہام کے سبب سے کچھ اور حیثیت رکھتا تھا۔ ان تمام ازدواجوں نے ہندو مسلمانوں کے ملکی و تمدنی تعلقات پر جو گہرا اور دیرپا اثر ڈالا وہ دونوں کے حق میں نہایت مبارک تھا۔ مسلمانوں اور ہندوستان کے باشندوں خصوصاً راجپوتوں میں جو مغائرت و نفرت چلی آتی تھی۔ اور جو باوجود لگاتار کوشش کے بالکلیہ دور ہوتی تھی۔ اُسکا فرے درفرے خاتمہ ہوگیا۔ ہندوؤں کے وجود۔ اُنکے خیالات کا اثر۔ اُنکے مراسم۔ اُن کی محبت و رعایت مسلمانوں اور اُن کی سلطنت کے دل و جگر میں پیوست ہو گئی۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدے ہندوؤں نے حاصل کیے۔ مسلمانوں کو اپنی مدمقابل حریف قوم کے ہروقت کے رشک و حسد سے ایک حد تک نجات مل گئی۔ بلکہ اپنا خون ملجانے کے باعث شریک خود محافظ سلطنت

ہوگیا۔ چنانچہ تاریخ سے یہ ثابت ہو کہ شاہجہاں کو وقت پر اپنے ماموں اور نانا سے بھی مدد ملی تھی۔ اس یگانگت و اتحاد نے یہانتک توغل کیا کہ مسلمانوں کے عقائد بھی ہندوؤں کی توہم پرستی کے اثر سے محفوظ نرہ سکے

تمدن پر اثر رانی جودہ بائی وغیرہ کے رشتہ نے ہندو مسلمانوں۔ خصوصاً شاہی خاندان تیموریہ کو ایسا گھی کھچڑی کیا کہ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ مشہور ہوگیا۔ ان شادیوں سے مسلمانوں کے ترکی تمدن میں، جس میں ایرانی و عربی تمدن کی آمیزش تھی ہندوی تمدن کا جزو غالب شامل ہوگیا۔ اس میں کلام نہیں کہ تمدنی اتحاد دیگر ذرائع سے بھی ہوا۔ مگر جودہ بائی وغیرہ کے آنے سے گھر کے اندر ہندوی تمدن نے جگہ پکڑ لی۔ شادی مہمانی کی بہت سی رسمیں۔ بلکہ حکومت کے متعلق بہت سی رسمیں ایسی تہیں جو معلوم ہوتا ہو کہ انھیں رانیوں خاصکر جودہ بائی کے سبب سے خاندان تیموریہ میں رائج ہوئیں مثلاً مایوں بٹھانا۔ دوسری خوشبودار چیزوں کے ساتھ ہلدی کی آمیزش کا اُبٹنا دولھا دُلہن کے ملنا (ہلدی کی آمیزش ہندویت کی نشانی ہے۔ کیونکہ اس ملک میں یہ چیز رنگ نکھارنے کے لیے مخصوص ہو) کنگنا باندہنا۔ منڈھا کھڑا کرنا۔ چوک پُرانا۔ سہرا باندھنا۔ تیل چڑہانا۔ دولھا کے سر پر راجہ شاہی پگڑی باندہنا۔ گلے میں جامہ پہنانا۔ شادی میں مہمانوں کا باہم اُبٹنا اور رنگ کھیلنا۔ سمدہنوں کو گالیاں دینی (ہندوؤں میں گالیاں دینے کی رسم عام ہو۔ جسکو سیٹھنیاں کہتے ہیں) وغیرہ وغیرہ اور بہت سی جزوی رسمیں ہیں۔ انکے علاوہ ہولی اور دیوالی کی رسمیں ادا کرنی۔ بیٹیوں کو دیوالی دینی۔ کبھی کبھی ہولی کا جلسہ کرنا۔ اور سلطنت کے متعلق یہ رسمیں تھیں۔ کہ بادشاہ راجہ شاہی پگڑی باندھتے تھے۔ جامہ پہنتے تھے۔ راکھی پونم کے دن ایک ایسے معزز ہندو خاندان (جسکو راجائی بلکہ میرزائی کا خطاب ہوتا تھا) کی خاتون بادشاہ کی کلائی میں راکھی باندھتی تھی (حضرت بہادر شاہ مرحوم کے زمانہ تک یہ رسم جاری تھی۔ چنانچہ راجہ میرزا بھولا ناتھ۔ اور

راجہ میرزا کدار ناتھ کے خاندان کی ایک لیڈی یہ رسم ادا کیا کرتی تھی۔ اور حسب رواج بادشاہ کی بہن سمجھی جاتی تھی (جشن کے دن بادشاہ بیگم ناک میں نتھ پہن کر آدہی رات کی نوبت کے وقت کڑہائی میں بڑا ڈالتی تھیں۔ وغیرہ اور بہت سی ہندوی رسمیں تہیں۔ جو محل شاہی میں داخل ہوئیں۔ اُن میں سے بہت سی رسمیں تو اور مسلمان خاندانوں میں بھی رائج ہوگئیں۔ کیونکہ ایک زمانہ میں خاندان شاہی کے تمدن کی عام طور سے تقلید کیجاتی تھی۔ اور بہت سی رسمیں ایسی تھیں جو فقط خاندان تیموریہ ہی میں رہگئیں۔ جن میں سے بعض ابتک برتی جاتی ہیں۔ بعض لغو سمجھکر یا افلاس کے سبب سے چھوڑ دیگئیں۔ اور بعض سلطنت کے ساتھ رخصت ہوگئیں۔

ہمارے زنانہ لباس کے بھی بعض مخترعات رانی جودہ بائی کی طرف منسوب ہیں۔ خصوصاً تہ پوشی۔ یعنی کلیوں دار پائجامہ۔ یہ قطع پیجامہ کی ظاہر ہے کہ نہ عرب سے آئی نہ ایران و توران نہ خراسان و افغانستان سے نہ ہندوستان میں قدیم سے کہیں یہ وضع رائج تھی۔ البتہ لہنگا ہند کا خاص لباس ہے۔ اسی سبب سے بعض قطعات ہند کے مسلمانوں میں بھی لہنگے کا رواج ہوگیا ہے۔ مگر انکا لہنگا بھی بس اُسی حد و مقدار پر ہے جیسے کہ ہندی بہنوں کا لہنگا ہے۔ اس عام لہنگے کی قطع یہ ہے کہ صرف پاٹ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ کلیاں نہیں ہوتیں۔ گھیر بھی اوسط درجہ کا ہوتا ہے۔ البتہ راجپوتانہ خصوصاً مارواڑ کا لہنگا کلیوں دار تیس تیس چالیس چالیس گز کے گھیر کا ہوتا ہے۔ مارواڑ رانی جودہ بائی کا دیس تھا۔ ضرور اُن کا لہنگا بھی اسی گھیر گھمار کا ہوگا۔ مگر ان کی اختراع پسند طبیعت نے میکے سسرال دونوں جگہ کی وضع میں سے ایک نئی وضع تہ پوشی کی پیدا کی۔ اپنے اختراع کے ابتدائی زمانہ کے بہت دن بعد تک ڈہیلا پائجامہ اُتنا ہی اونچا رہا۔ جتنا کہ لہنگا ہوتا ہے۔ بعد میں اس کی وضع میں کئی ترمیمیں ہوئیں۔ (جو انشاءاللہ کسی قدیم لباس کے مضمون میں بیان کیجائیں گی) پھر کلیاں ڈھلک کر لگنے لگیں اور وہ وضع

قائم ہوئی جو آجتک رائج ہے۔ زیورات میں بھی رانی جودہ بائی کی شاہانہ طبیعت نے غالباً بہت کچھ تغیر و تبدل کیا ہوگا۔ کیونکہ ہمارے بہت سے زیور ایسے ہیں جن میں ہندویت و اسلامیت دونوں مذاق ہویدا ہیں۔ ہاں ایسے زیور جیسے نتھ وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ رانی موصوفہ یا زیادہ سے زیادہ اُن کی پیشرو رانیوں ہی کی تقلید سے مسلمانوں میں خصوصاً خاندان تیموریہ میں رائج ہوئے۔

بیاہی ہوئی زندگی

دنیا کا قاعدہ ہی کہ جہاں پھول ہی وہاں کانٹا بھی ہی۔ جہاں آسائش ہے وہاں کاہش بھی موجود ہی۔ رانی جودہ بائی بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھیں۔ جہاں اُن کو یہ قابل رشک مرتبہ حاصل تھا۔ کہ وہ شاہی خاندان کی بیٹی۔ بہو اور بیوی تھیں۔ وہاں اُن کی زندگی کے اعلیٰ درجہ کے حظ کو منغض کرنے کے لیے نورجہاں بیگم جیسی رقیب کا کانٹا بھی موجود ہوگیا تھا۔ مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہی کہ اُنھوں نے اپنی اس رقیبانہ منزل زندگی کو بڑے صبر و تحمل اور شاہانہ حوصلہ کے ساتھ طے کیا۔ اور سوکناپے کی جلن میں اپنی زندگی کو سوختہ کرنے کے بجائے اپنے خیالات کو ان باتوں کی طرف مبذول رکھا جو ہر متمدنہ عورت کے شایان شان ہیں۔ یعنی مذہبی اور تمدنی معاملات کی دلچسپی میں اُنھوں نے اپنا وقت گزارا۔ مذکورۂ بالا ایجادات و اختراعات وغیرہ کے انہماک سے اُن کی متمدنانہ لیاقت و دلبستگی کا پتہ چلتا ہی۔ ساتھ ہی اُسکے وہ اپنی شہرۂ آفاق سوکن کے مقابل میں خصوصاً مقابلہ کے وقت کھنچائی اور لڑ بھی نہیں تھیں۔ اگرچہ نورجہاں بیگم کے اقبال نے بقول مولوی محمد حسین صاحب آزاد کے رانیوں اور مہارانیوں کے چراغ گل کر دیے تھے (یہ اشارہ مولوی صاحب نے جودہ بائی ہی کی طرف کیا ہے) مگر حقیقتہً وہ چراغ اُلفت و محبت تھے جو ٹمٹما گئے تھے۔ نہ کہ چراغ وقعت و عظمت خود جہانگیر کے اقتدار میں تھا کہ قدرت نے جو درجہ جودہ بائی کا اُنکے محل بلکہ اُنکے خانۂ دل میں قائم کر دیا تھا وہ اُسکو زائل کر سکیں۔

حاضر جوابی ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جہاں پناہ رانی موصوفہ کے محل میں تشریف لائے اور رانی سے کہنے لگے۔ نورجہاں کہتی ہے کہ آپ کے دہن میں سے جو خوشبو آتی ہے وہ کسی کے مُنہ میں سے نہیں آتی کیا یہ سچ ہے؟ مہارانی نے جواب دیا۔ "میری شامہ نے کوئی دوسری بو نہیں سونگھی ہے جو حضور کے اور غیر کے بوئے دہن میں تمیز کرسکوں"۔ فی الواقع یہ وہ جواب تھا جسکے دینے کی رانی جودہ بائی حقدار تھیں۔ بادشاہ نے بھی جیسا جلایا تھا۔ ویسا وہ اپنا سامُنہ لیکر رہ گئے ہونگے۔

نورجہاں بیگم کو زک دینی اللہ اکبر رے طبیعت کی شوخی! ایک دفعہ کچھ دل میں جو آئی تو بیٹھے بیٹھے ایک ترکیب سوچی۔ حضرت بیوی (حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام) کی نیاز کے بلاوے تمام امرا کی بیویوں کو بھیجے۔ اور نورجہاں بیگم کو بھی بلایا۔ بیگم بڑے ٹھاٹھ سے سوکن کے ہاں آئیں۔ محفل اتحاد گرم ہوئی۔ محفل میں کسی مقام پر نیاز کا سامان تیار ہوا۔ جب نیاز ہو چکی۔ اور معلوم ہوا کہ اب سب کو جاکر نیاز کا کھانا کھانا چاہیے۔ تو نورجہاں بیگم بھی جانے کے لیے آمادہ ہوئی ہونگی۔ مگر اتنے ہی میں مہتمہ نیاز نے تمام حاضرین بیگمات اور بیوی زنوں کی خدمت میں آکر نہایت ادب سے عرض کیا کہ یہ حضرت خاتون محشر کی نیاز ہے۔ لہذا ایسی پاک بیوی کی نیاز کا کھانا کھانے وہی بیویاں تشریف لیچلیں جو یک شوہری ہوں۔ تمام بیویاں جو ایسی ہی ہونگی، اور غالباً رانی کے طرفداروں میں اور اس چشمک آمیز سازش میں شریک ہونگی، کھڑی ہوگئیں اور جو اس صفت سے خارج تھیں وہ بیٹھی رہگئیں۔ نورجہاں بیگم کو ناگوار تو بہت گزرا ہوگا۔ لیکن کیا کرسکتی تھیں۔ بیٹھی کی بیٹھی رہگئیں۔ رانی نے گو بہم طور سے اصرار کیا۔ مگر نورجہاں نے "اس نیاز کے قابل آپ ہی ہیں۔ تشریف لیجائیے" کہکر اپنی خفت مٹائی۔ اور بادشاہ سے جاکر بہت شکایت کی۔ بادشاہ نے رانی سے بازپرس کی۔ رانی نے نہایت اعتقاد سے کہا۔ کیا کروں یہ نیاز ہی

ایسی مطہر و مقدس بیوی کی ہی کہ ہاشما نہیں کھا سکتے " نورجہاں کی یہ زرک مشہور ہی۔ اور بیوی کی نیاز کی اصلیت یہی واقعہ ہی۔

اولاد | باوجود نورجہاں جیسے زبردست مدمقابل کے دور دورہ کے قدرت نے جو بیاہتا بیوی ہونے کی وجہ سے اُنکو اصل بادشاہ بیگم بنایا تھا وہ یوں بھی قائم رکھا کہ ولی عہد سلطنت شہزادۂ خرم انہیں کے بطن سے پیدا ہوا۔ شہزادۂ ممدوح الملقب بشہاب الدین شاہجہاں کی پیدائش کے بعض گیت بھی ابتک یادگار ہیں۔ جنسے معلوم ہوتا ہی کہ تمام ملک ہند خصوصاً دارالخلافہ سے لگاکر ماڑواڑ تک خرمی و شادمانی کا غلغلہ بلند ہوگیا تھا۔ اور انبساط و طرب کا مینھ برس رہا تھا۔ متوسلین اور اہل استحقاق نے جھگڑ جھگڑا کر اپنے انعامات لیے اور بادشاہ و شہزادہ کی سرکار سے دل کھول کر اُنکے دامن مراد پُر کیے گئے۔ یہ گیت زچہ گیریاں کہلاتی ہیں۔ دلّی میں شاید اور خاندانوں میں بھی یہ گائی جاتی ہیں۔ مگر تیموریہ خاندان کے کسی گھر میں جب زچّہ خانہ ہوتا ہے تو ذیل کی دونوں زچہ گیریاں ضرور گائی جاتی ہیں۔ انکے مضامین سے اُسوقت کی دولتمندی۔ فارغ البالی۔ شہزادہ کے پیدا ہونے کی خوشی اور رانی جودہ بائی کے میکے کا حال اور وہاں کے تعلقات کی کیفیت ہو بہو آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔

زچہ گیری نمبرا۔ مانگے ہی جودہاجی کا راج + لَلّا[۵] جی کا نال نہ چھووے

تھال بھر موتی جودہ رانی لائیں + وہ بھی نہ لیوے یہ دائی۔ لَلّا جی الخ

غرض ساری زچہ گیری اسی طرح ہی کہ تھال بھر موتیوں کے علاوہ " شال دوشالے جودہ رانی لائیں " اور " ہاتھی گھوڑے جودہا رانی لائیں " مگر دائی کے خطرے میں کوئی چیز نہ آئی۔ وہ جودہاجی یعنی جہانگیر کا آدہا راج پاٹ ہی انعام میں لینے پر اڑی رہی۔

---

[۵] لالہ جی۔

زچہ گیری نمبر ۲۔ میرے بابل کو لکھیو سندیس + جھنڈولا آج ہوا۔
بابل ہمارے نگری کے راجہ + تو بیرن بالے دیس " "
رس بھری کھچڑی لاموے بابل + تو نوبت باجے ہمیش " "

مذہب | تحقیق طور سے ہمارے خاندان میں مشہور ہے کہ رانی ممدوحہ نہ کسی کے زور ظلم سے بلکہ اپنی رضا و رغبت سے مشرف باسلام ہوگئی تھیں۔ چنانچہ بیوی کی نیاز والا مذکورۂ بالا واقعہ بھی اُنکے اسلامی عقائد کا شاہد ہے۔

رانی جودہ بائی کے باب میں غلطیاں | ایک ہندی رانیوں کے تذکرہ میں میں نے دیکھا کہ صاحب تذکرہ نے رانی موصوفہ کو خود اکبر کی بیوی بیان کیا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے شاہنشاہ اکبر کی بیوی جو تھیں وہ راجہ بہارامل والی جیپور کی بیٹی تھیں۔

مس نصیر الدین حیدر
از حیدر آباد دکن

ہمارے ہاتھوں بچوں کی خرابی

اس مضمون میں ایم۔ جے بیگم صاحبہ نے ایک نہایت مفید اور ضروری خیال کی طرف اپنی بہنوں کو توجہ دلائی ہے۔ جو امید ہے کہ بہنیں غور سے پڑھیں گی۔

اس میں شک نہیں کہ دیر سے اُٹھنے۔ سستی۔ کاہلی وغیرہ کی عادتوں کی بچپن ہی میں اگر روک تھام ہو جائے تو بچوں کی آیندہ زندگی خراب نہو۔ اور وہ جسقدر کام کرسکتے ہیں اُس سے بہت زیادہ کرسکیں۔ ایم جے بیگم کے طرز تحریر کی خصوصیت نے اس مضمون کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے۔

اڈیٹر

میں اکثر بہنوں کو دیکھتی ہوں کہ اسقدر سوتی ہیں کہ صبح کو جبتک دہوپ سر آچڑھے

نہیں اُٹھتیں اگر کسی نے جگا بھی دیا تو سینکڑوں نصیحتیاں ہو رہی ہیں جائیاں ہیں کہ چلی آتی ہیں دل ہی کہ بے برداشت ہی خدا خدا کر کے بیگم صاحبہ کا مزاج درست ہوا گھر کے کاروبار میں مصروف ہوئیں۔ آج شام ہوتے ہی نیند کا غلبہ ہوا روز نو بجے سوتی تھیں تو آج آٹھ ہی بجے سے سو رہیں۔ بچہ بھی کھیلتے کھیلتے سو گیا۔ ماماں نے بچہ کو حسب قاعدہ ماں کے پاس لٹا دیا۔

یہ عادت بچوں میں قدرتاً عام پائی جاتی ہے کہ صبح کو چار بجے سے اُٹھ بیٹھتے ہیں مگر افسوس کہ یہ عادت بچوں پاس کچھ دنوں مہمان ہوتی ہی۔ صبح کو چار بجے بچہ اُٹھا اور رویا ماں کے بہلانے سے لیمپ کی روشنی سے بچہ کھیلنے لگا اور ماں اُسی طرح نیند میں غافل ہوگئی۔ بچہ ماں کو سوتا دیکھ بسورا اور رونا شروع کیا۔ ماں کی آنکھ بچہ کے رونے سے کھل گئی۔ ماما کو پکارا ماما آئی ابھی پورے کمرہ میں داخل نہوئی تھی کہ بیوی نے آواز دی کہ خانم جان یہ ننھا روتا ہی مرچون اور گونگے دونوں کو بلالو کہ یہ روتا ہے اسکے کان کتر لو۔

خانم جان (یہ بچہ پالنے والی کا نام ہی) کمرہ سے باہر آکر کواڑوں پر ہاتھ مارتی ہی پھر اندر آکر لوبی بی وہ مرچین اور گونگا دونوں آموجود ہوئے جلدی ننھے میاں کو سلادو نہیں تو وہ مجھے بھی مارینگے۔

ماں۔ لے ہے دیکھا وہ مرچین گونگا دونوں آگئے اچھی بات ہی نہ سو دیکھو اب کیا ہوگا لو وہ ماتھے بھاگ اور اللہ کا فضل نابدان میں سے دیدے چمکا رہے ہیں اچھا ہوا آخر بیچارا بچہ سہم سہم کر سو رہا کہاں تک فتنہ بچہ کی یہ عادت اسی طرح کچھ دنوں میں جاتی رہی اور اماں کی طرح بچہ دن چڑھے اُٹھنے لگا اب اماں کی جان آرام سے ہوگئی اور پچھلے پہرے کی آفت سے جان چھٹی کہ بچہ نے جاگنے کی عادت چھوڑ دی۔ عاقبت کی خبر خدا جانے اب تو گی آرام سے گزرنے یہ معلوم نہیں کہ یہ آرام آخرت میں کیا رنگ

لائیگا۔ اول تو صاحبزادے جب ذرا ہوشیار ہوئے مدرسہ جانے کی مہم درپیش آئی وہاں صبح ہی پہنچنا یہاں صاحبزادے کی وہی دن چڑھے اُٹھنے کی قدیم عادت بھلا ادہر آگ اُدھر پانی گزر ہو تو کیونکر غرضکہ صاحبزادے پانچ چھ روز تو دن چڑھے جاتے رہے لیکن جب اُستاد نے دیکھا کہ یہ عادت اور لڑکوں پر بھی بڑا اثر ڈالے گی تو ذرا انھیں تاکید کی کہ بھائی لڑکے ذرا سویرے آیا کرو مگر نہ اماں جان کو عادت نہ صاحبزادہ کو گزر ہو تو کیونکر آخر اُستاد نے ذرا سختی کی پھر تو صاحبزادے بھی ذرا ہوشیار ہوئے لیکن کریں تو کیا عادت سے مجبور مگر ذرا ڈر سے آنکھ کھُلنے لگی۔ بعض روز دیر ہو جاتی تو سزا کا خیال رہتا۔ پھر یا تو گھر ہی پر بہانہ کیا یا مدرسہ سے ندارد رہے۔ مطلب یہ کہ بد شوقیٔ علم کا بیج بو یا گیا کیونکہ جب مدرسہ سے ندارد رہے۔ تو رہے کن بھلے مانسوں میں وہی گلی کوچہ کے لڑکوں میں یا مدرسہ کے کھلوڑے طالب علموں میں جنکو ذرا تمیز وشعور نہیں ہوتا۔ اگر گھر پر رہے تو کسی بیماری کے بہانہ سے ورنہ کہاں جب بہانہ کیا تو لگیں اُلٹی سیدھی دوائیں ہونے جنسے نہ بیمار ہوتے خواہ مخواہ بیمار ہو گئے اور اگر بالفرض دوا نہ بھی ملی تو سستی اور بیکاری ہی کیا کچھ کم بیماری ہے۔ غرض اسکے جو جو خراب نتایج ہیں اُنکا بیان کرنا تحریر وتقریر سے باہر ہے میری پیاری بہنیں خود غور کر سکتی ہیں۔ میں صرف ایک انگریزی مثل کے اُردو ترجمہ پر اِس استدعا کے بعد کہ سب بہنیں اس کی طرف توجہ فرمائیں اور اپنے بچوں کو سویرے اُٹھنے کی عادت ڈالیں اکتفا کرتی ہوں۔

رات کو سونا سویرے صبح کو اُٹھنا شتاب
صحت و دولت بڑھائے عقل کو دے آب و تاب

اکثر سنتی ہوں کہ بیویوں کے تمام دن ہاتھ پاؤں ٹوٹتے ہیں سر میں درد رہتا ہے کسی کام کو دل نہیں چاہتا۔ یہ اسی دن چڑھے اُٹھنے کا نتیجہ ہے۔ امید ہے کہ میری استدعا میری بہنوں کے بہت سے مرضوں کا علاج اور بچوں کی صحت و بہبودی کا باعث

ہوگی۔ اور ان خصلتوں کو جنکو میں بسبب اپنی نادانی کے ضائع کرکے بچوں کو حد سے زیادہ بزدل اور کمزور نکما کر دیتی ہیں قائم رکھیں گی۔

بیوی۔ خانم جان بچہ کہاں ہے۔

خانم جان۔ اللہ رکھے کوٹھے پر ابھی تو کھیلتا پھرتا تھا شاید اب باہر باغیچہ میں چلا گیا ہوگا۔

بیوی۔ ارے شام کے وقت کہاں درختوں میں نکل گیا۔ دونوں وقت ملتے ہیں پہلے ہی جی اچھا نہیں ہے۔

خانم جان۔ میری آنکھوں میں رائی نون خدا رکھے ہر ایک کے سامنے باتیں ہی تو ایسی ہی بناتا ہے جانے کمبخت کی نظر لگ گئی کل ضرور بچہ پر سے لہسن پیاز کے چھلکے اُتاروں گی۔

بیوی۔ ہاں ذرا یاد رکھنا۔

خانم جان۔ جبنے کل کون کہہ رہا تھا کہ آپکے باغچہ میں جو کیلہ کا درخت ہے اُس میں بڑ دسرا رہتا ہے اور کل شاہ صاحب آئے تھے وہ کہتے تھے کہ انار کے درخت میں آسیب ہے خدا اپنا سایہ رکھے۔ بیوی میں تو ہر وقت خیر کی دعائیں مانگتی ہوں۔ زیادہ بچی بچہ کا ڈر ہے۔ خدا رکھے میرا تو وہ کہنا مانتا نہیں ادہر اُدہر گھستا پھرتا ہے۔ دیکھو بیوی میں تمہارے سے کہے دیتی ہوں صاحبزادے بھی سامنے بیٹھے ہیں کہ یہ میرا کہنا نہیں مانتے کوئی گھڑی کیسی کوئی گھڑی کیسی خدا بُری ساعت نہ لائے۔

ماں۔ ہاں شام کے وقت درختوں میں نہ جایا کر تجھے ڈر نہیں لگتا تیرا کیسا موٹا دیدا ہے۔

بچہ (ڈر کر) اچھا اب نہیں جایا کرونگا مگر اماں یہ سناؤ کر وہاں کیا ہوتا ہے۔ بٹیا تھو تھو اسکا نام نہیں لیتے۔ بڑی بُری بلائیں ہوتی ہیں جو چمٹ جاتی ہیں اور جن سے

آدمی بیمار پڑ جاتا ہے۔

بچہ بھی سمجھ گیا کہ ایسی کوئی آفت ہوگی جس سے بڑے بڑے ڈرتے ہیں اب بچہ کے دل میں ڈر بیٹھ گیا۔ غرض بڑی دیر تک خانم جان اور بیوی میں اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں اور ڈراونے ذکر۔ بچہ بھی باتیں سنتے سنتے سہم کر سو رہا۔ اسے جو سن رہا تھا وہی خیال رہا معلوم نہیں ان باتوں کے سننے سے کس قدر صدمہ پہنچا۔ جب سب سو سلا رہے بچہ تمام شب چونک اُٹھا اور ڈر کر چیخیں بھی کئی ماریں۔ ماں نے بھی بچہ کے ساتھ رات جاگ کر کاٹی اب صبح ہوئی بچہ بھی اُٹھا۔

ماں (بچہ سے) میاں تمہاری طبیعت کیسی ہے میری تو رات آنکھوں میں گزر گئی چونکہ بچہ کی نیند بےچین رہی اور دل پر ایک قسم کا صدمہ تھا اس سے مرجھا گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہینوں کا بیمار ہے۔

بیوی۔ خانم جان یہاں آ ذرا اس کی دادی کے پاس ہو آؤ بچہ کا حال بیان کرنا اور کہنا کہ اگر آپ کہیں تو میں سید صاحب کے پاس جا کر بچہ کے لیے تعویذ لے آؤں یا آپ جسے بتائیں آپ کی بہو بچہ کی طرف سے بہت فکرمند ہیں آپ چلیے۔ اگر وہ کہیں تو اُن کو سوار کرا لانا۔ تھوڑی دیر میں لڑکے کی دادی بھی آ گئیں۔ بہو ساس کو آتا دیکھکر کھڑی ہو گئیں بہو نے آداب کیا ساس نے گلے لگایا۔ بچہ کو پیار کیا ساس بہوؤں میں باتیں ہوتی رہیں۔

ساس۔ رات بھر میں بچہ کا کیا حال ہو گیا رنگت زرد پڑ گئی کیسا ننھا سا چہرہ نکل آیا۔

بہو۔ تمام رات میری تو آنکھوں میں کٹی ہے۔ بخار ایسی شدت کا تھا کہ سر پر ہاتھ نہ رکھا جاتا تھا اسوقت پھر ہلکا ہے بلکہ پہلے جب میری آنکھ کھلی اور یہ ڈرا تو اسے بخار نہ تھا کوئی دو گھنٹہ بعد خوب بخار چڑھا جو ابتک موجود ہے۔

آنیوالی بیوی۔ حسین بی ذرا مظہر احمد کو بلا لاؤ (یعنی لڑکے کے باپ کو)

مظہر احمد۔ اماں آداب عرض ہے۔

ماں ۔ عمر دراز۔

مظہر احمد ۔ اس کی حقیقت کہدو تو میں ڈاکٹر صاحب کے پاس ہو آؤں ۔

ماں ۔ بھلا ڈاکٹرا سکو کیا کرے گا یہ تو ملاّں سیانے ہی جانتے ہیں سمجھو یا نہ سمجھو ۔

مظہر احمد ۔ اماں بھلا آپ کیا فرماتی ہیں ۔

ماں ۔ اے ہوش میں آ میرے سامنے باتیں نہ بنایا کر میں بڑی کہ تو ۔

بیٹا ۔ اچھا آپ کو اختیار ہے کچھ فائدہ تو ہے نہیں ۔

ماں ۔ پھر وہی بکے جائیگا ۔

بیٹا ۔ خیر آپ جانیں میری تو صرف اتنی عرض تھی کہ اسکا حال کہدو تو ڈاکٹر کے ہاں سے دوا آجائے ۔

ماں ۔ کچھ ضرورت نہیں ۔

مظہر احمد ماں کے کہنے سے باہر چلے گئے اور صندوقچے میں سے تھرمامیٹر نکال لائے بچہ کے مُنہ میں رکھکر جیب میں رکھ لیا اور واپس چلے گئے ۔ تھوڑی دیر میں ایک ہاتھ میں دوا کی شیشی ایک ہاتھ میں اونس لیکر آئے ۔ دوا اونس میں نکالکر بچہ کو پلانے کھڑے ہوئے ۔

ماں ۔ میں ہرگز نہیں پینے دوں گی ۔

مظہر احمد ۔ اماں اس میں آپ کا کیا حرج ہے دوا نقصان نہیں کرے گی ۔

غرض بڑی مشکل سے پلائی گئی ۔ اتنے میں بی خانم جان فلیتہ پڑھے ہوئے پانی کی صراحی تعویذ لیکر آئیں ۔

خانم جان ۔ لو بی بی یہ اُنھوں نے فلیتے دیئے ہیں ۔ کہا ہے چالیس روز جلیں گے اور یہ ایک تعویذ ابھی گھول کر پلادو اور ایک بازو پر دوسرا گلے میں ڈالدو اور بیوی اُنھوں نے ستانجہ کا صدقہ بتایا ہے اور سات روپیہ اور سات گز کپڑا سفید ۔ اُنھوں نے کہا ہے

کہ نظر ہو گئی ہے۔ کل انشاء اللہ حاضرات کرونگا خدا نے چاہا آرام ہو جائیگا۔

بیوی۔ ہاں بوا میں دوں گی ضرور لے آنا۔ ہنس ہنس کھائے پھوہڑ کا مال۔

مگر علاج ڈاکٹر کا ہوتا رہا دس پندرہ روز میں بچہ کی طبیعت اعتدال پر آگئی۔ اب بچہ پہلے سے کہیں زیادہ ڈرپوک ہو گیا۔ شام کے وقت باہر کا جانا بھی چھوڑ دیا ہر وقت گھر میں گھسا رہتا اور ڈر کے باعث باہر نہ نکلتا۔ اندھیرے میں باہر جانا تو کیسا اب دن کو بھی اکیلا جانے سے خوف کھانے لگا۔ غرضیکہ اسی طرح دن بدن صحت و بشاشت کنارہ کش ہوئی۔

پیاری بہنوں! گو آپ کا خیال کسیقدر ٹھیک ہے مگر نہیں بالکل غلط ہے۔ میری پیاری بہنوں آسیب۔ بھوت چڑیل کوئی چیز نہیں لیکن ہاں آپکے خیالی بھوت اور چڑیلیں بہت ہیں۔ اگرچہ شام کے وقت گنجان وعالیشان درختوں میں شل پیپل بڑہ وغیرہ ایسے درختوں میں جانا صحت کے لیے مضر ہے لیکن تازی ہوا کھانا اور باغ کی تفریح نظارہ جس سے کہ آدمی کی زندگی ہے ہرگز مضر نہیں خدا کا شکر ہے کہ اُس نے ہم کو ایسی عجیب و لطیف چیز عنایت فرمائی مگر بدقسمتی سے ہم اور ہمارے بچے عموماً اس نعمت بے بہا سے محروم ہیں۔ بہنوں! کوئی چڑیل بھوت نہیں ہوتا صرف ہوا کا اثر ہے جسکو میری اکثر بہنیں نہ جانتی ہونگی اُمید ہے کہ یہ تو جانتی ہونگی کہ شام کے وقت درخت اپنی کثیف ہوا چھوڑتے ہیں۔ کھلے باغوں کی ہوا نہایت صاف اور مفید ہوتی ہے۔ مگر افسوس صد افسوس ہمارے بچے اس سے بھی محروم رہتے ہیں اگر ماں تعلیم یافتہ اور سلیقہ مند ہے تو اپنے بچے کو صبح و شام نُہلا دُہلا کر پہنا کر نھی سی بگھی میں بٹھا کر بھیجتی ہے اور اتفاقاً کسی روز بخار بچہ کو ہو گیا اور بہو نے ساس کو [illegible] تو ماما نے جاکر کہا کہ بیوی تمہاری بہو پریشان ہو رہی ہیں بچہ کو بخار ہے چلکر دیکھیے [illegible]۔ اُسوقت اماں جان یاد نہیں آتیں جب بچہ کو کپڑے پہنا کر شام کے وقت دونوں وقت ملتے جنگل میں بھیجتی ہیں اور اماں جان ہیں کہ منہ دیکھتی کی دیکھتی رہجاتی ہیں بیٹی جو اپنے

کہے کا نہو تم جانو تمہارا کام ہمیں تو اس سے کچھ غرض نہیں۔ چھاتی کے خواہاں ہیں جان سے جیتے رہو خوش رہو آباد رہو ہماری کوئی سنتا نہیں ہم سے کچھ کام نہیں جو بنے سو کرو لیجیے بخار تو موسمی اتفاق سے ہوا اور درختوں میں سے بچہ کو چڑیل چھپٹا گئی سبحان اللہ۔

صبح کا اُٹھنا ہی ہزار نعمت ہے جسقدر خوشی و فرحت صبح کے وقت ہوتی ہے لاکلام ہے مگر جو وقت اچھے اور مسرت افزا ہیں انھیں کو بُرا سمجھا جاتا ہے۔ بچے صرف محروم ہی نہیں رہتے بلکہ اکثر ڈرتے ہیں آسیب کا خیال بھی عجب بیہودہ خیال ہے۔ پٹیالہ میں ایک مکان ہے جس کی بابت یہ مشہور ہے کہ اس میں آسیب ہے اُس مکان میں عجیب لطیفہ ہوا۔ وہ مشہور تو تھا ہی ایک صاحب جو اُس مکان میں آکر اترے لوگ حیران تھے کہ دیکھیے کیسے عامل ہیں اور کیا کرتے ہیں اور کیونکر رہتے ہیں۔ عامل وامل تو لوگوں کے خیال میں ہونگے البتہ دلیر ضرور تھے۔ مگر اُسی جواں مرد کے ساتھی جسکا ذکر سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے گلستاں میں کیا ہے کہ ایک جوانمرد تھا جو درخت سامنے آتا گرا دیتا تھا لیکن کچھ فاصلہ پر جاکر چوروں نے گھیر لیا بس ہاتھ پاؤں پھول گئے ہوش وحواس بجا نہ رہے اور کچھ نہو سکا اسی طرح کی حکایت اس دلیر کی ہوئی کہ بیچارے شب کو تن تنہا اُس مکان میں سوئے چونکہ سفر میں تھے کوئی برتن سوائے لوٹے کے موجود نہ تھا مجبوراً لوٹے ہی میں دودھ منگایا لیکن سوتے وقت پینا بھول گئے۔ جب سو رہے تو شب کو دو بجے بی بلی صاحبہ آئیں اور انھوں نے لوٹے میں سر ڈالکر دودھ پینا شروع کیا۔ جب دودھ ختم ہوچکا تو بلی نے سر نکالنا چاہا لیکن سر نہ نکلا اُسنے گھبراکر دوڑنا شروع کیا۔ ان میاں کی آنکھ کھل گئی بس خیال وہی جما ہوا تھا ہی سمجھے کہ حضرت جنات تشریف لے آئے ننگے پاؤں کھڑکی سے کود باہر جا رہے گرمیوں کے دن تھے اور لوگ جاگ بھی اُٹھے۔ خیر باتیں شروع ہوگئیں اتنے میں صبح ہوئی پھر لوٹا نماز کے لیے ڈھونڈا تو ندارد بس پھر تو اور بھی قائل ہوئے اور سمجھے کہ جنات ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ یہ خیال آیا کہ نماز کا وقت تنگ ہو چلا ہے اسلیے مسجد میں پ

لیکن عقل چکر میں تھی۔ اسی خیال میں وہاں پہنچے مسجد میں پہنچنے پر ایک صاحب نے آکر بیان
کیا کہ ایک بلی مری پڑی ہے اور اس کی گردن میں لوٹا پھنسا ہوا ہے یہ سنکر اُن کی عقل ذرا
درست ہوئی اور سمجھ گئے کہ کچھ نہ تھا صرف وہم تھا اس دن کے بعد اس مکان میں بہت
مدت تک رہے نہ کوئی جن چمٹا نہ بھوت اب اس میں لوگ آباد ہیں کوئی وہم نہیں کرتا بس
سمجھ لیجیے کہ یہی جن بھوت ہوا کرتے ہیں البتہ مجھے بھی جن بھوت پریت کا یقین مکانوں کی
طرف سے ضرور ہے وہ کیوں اس طرح کہ اگر کوئی مکان مہینوں سے بند ہوا اور ہوا کا اُس میں
دخل نہ ہو سیل بھی موجود ہو جھوٹ نہیں سچ مچ بھوت پریت پیدا ہو جاتے ہیں اور بیشک
ان سے بیماری بھی ضرور ہوتی ہے لیکن یہ نہیں کہ بس ایسا مکان انہیں کی نظر ہو جائے
صرف ایسے مکان کا علاج یہ ہے کہ بجائے پڑھی ہوئی کیلوں کے گڑوانے کے فتائل دھوپ
آگ وغیرہ سے علاج کیا جائے نہ کہ سینکڑوں روپیہ برباد کرکے پیرجی سے اسکا علاج
کرایا جاوے۔ (باقی آیندہ)

راقمہ

ایم۔ جے بیگم

ناجائز دباؤ

بعض شوہر عجیب ترکیب سے بیویوں پر اپنا رعب قائم کرتے ہیں جسے سنکر تعجب ہوتا
ہے۔ ایک بیوی کہتی تھیں کہ میری ایک سہیلی جو اکثر میرے یہاں آیا کرتی ہیں اور اُنسے بہت
بے تکلفی ہے ایک دفعہ ایسے موقع پر جبکہ وہ میرے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ وقار علی کے
[illegible] کام کو پردہ کرا کر گھر میں آئے اور کوئی بات ہنسی کی کی جو مجھے اسوقت یاد
[illegible] اُسکا جواب میں نے بھی ہنسکر دیا اور دو ایک ایسی ہی باتیں کہیں جسپر مجھکو ہنسی
[illegible] اور وہ خود بھی ہنسے انکے باہر جانے پر میری سہیلی جو برابر والے کمرہ میں سُن رہی تھیں

بڑے تعجب اور حسرت کے ساتھ کہنے لگیں۔

بوا تم اپنے میاں سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتی ہو اور تمہارے میاں بھی بہت ہی خوش خلق آدمی معلوم ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تم تنہا اتنے بڑے گھر میں رہتی ہو۔ کسی سے زیادہ ملتی جلتی بھی نہیں۔ لیکن کبھی میں نے دل گھبرانے کی شکایت تم سے نہیں سُنی۔ میری شادی کو قریب چوبیس برس کے ہوئے اب تک میرا دل اپنے شوہر سے ایسا کھلا اور بے تکلف نہیں ہے جیسا کہ تمہارے ساتھ ہے جس طرح کہ میں تم سے بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرتی ہوں۔ اُنکے سامنے کبھی نہیں کرتی۔ بلکہ جب تک وہ گھر میں رہتے ہیں میں اکثر تو چپ ہی رہا کرتی ہوں۔

میں نے پوچھا اس کی کیا وجہ۔ خدا نے یہ رشتہ ایسا بنایا ہے کہ ایک دوسرے کو دیکھکر خوش ہو جائے۔ تم نے کچھ شروع سے رکاوٹ پیدا کر لی ہو گی یا تمہارے میاں کچھ بہت زیادہ بدمزاج ہونگے۔

کہنے لگیں نہیں میرے ساتھ کچھ ایسی بدمزاجی نہیں کرتے۔ اور اکثر جب ہمارے یہاں بیبیاں آتی ہیں تو اُنسے ہنسی مذاق کی باتیں کیا کرتے ہیں یا باہر ملنے والے آتے ہیں تب اُنکے ہنسنے کی آواز آیا کرتی ہے۔ میں نے پوچھا پھر کیا سبب۔ کہا خدا معلوم کچھ اُنکے یہاں بیویوں کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ اچھا سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کہا تم کو کبھی ہنسکر بات کرنے پر روکا ہے۔ کہا کبھی نہیں لیکن میں نے جب کبھی کوئی بات خوشی کے ساتھ ہنسکر کہی اُسوقت اُنکا چہرہ دیکھکر ہمیشہ دل مرجھا گیا مجھے ہنستا اور خوش دیکھکر یا تو تیوری پر بل ڈالکر نظر نیچی کر لی یا دوسری طرف دیکھنے لگے یا کوئی اخبار اُٹھا لیا یا کچھ اور ذکر کرنے لگے۔

جب میں نے بارہا اس بات کو آزما لیا کہ اُن کو میرا ہنسکر بات کرنا یا نظر اونچی کر کے بات کرنا ناگوار ہوتا ہے تو اب خود میرا دل ایسا ہو گیا ہے کہ کبھی مجکو اُنکے سامنے بے تکلف ہو کر بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی کچھ اُنہیں پر منحصر نہیں اگر میں کسی اور سے

ہی ہنسی خوشی باتیں کر رہی ہوں اور وہ آجائیں تو میں شرمندہ سی ہوجاتی ہوں کہ انھوں نے دیکھ لیا۔ میں نے کہا شاباش تم کو جسکے پیچھے میکا سسرال اپنا پرایا سب چھوڑا جب اسی سے دبستگی نہوئی تو اور کسکے ساتھ ہوگی۔ یہ زندگی میاں بیوی کی نہیں بلکہ آقا اور ملازمہ کی ہے۔

رقیمہ

......

فال گوش

پت جھڑ کا موسم ہے۔ سبزے کی بہار لٹ گئی جنگل اور بن بے بہار اور ڈھنڈار پڑے ہیں۔ ہری بھری شاخیں سوکھ کر رہگئیں۔ سبز پتے خشک ہوکر زرد ہوکر مُردہ ہوکر گر پڑے درماندگی! بیچارگی! گویا یہ اُنھیں کی فتادگی ہے ؎

جوں خفتگان خاک ہے اپنی فتادگی
آیا جو زلزلہ کبھی کروٹ بدل گیا

بادِ فنا چل رہی ہے۔ ہوا کے جھکڑ سوکھی ٹہنیوں اور خشک اُفتادہ اور مُردہ پتوں میں یہی کھڑ کھڑ کرتے ہیں گویا عالم مُردہ میں لرزہ بلکہ زلزلہ ہے۔ پھلواریوں میں گلکاریوں کے بدلے خون کی پچکاریاں بہ رہی ہیں۔ کوئی پھولوں کی آنکھوں سے دیکھے، کوئی گل مہدی کے دل سے پوچھے! مالی کا بیرحم ہاتھ! کس بیدردی سے کاٹ چھانٹ کی ہے۔ روشیں کی روشیں الٹ گئیں، صفیں کی صفیں کٹ گئیں۔ صبا ہر روش پہ خاک اُڑاتی پھرتی ہے۔ چمن برباد و تاراج ہیں مٹی کے ریزے پھولوں کے مدفن ہیں جنپر شبنم ہر صبح چشم نم کرتی ہے۔

اندھیری رات نے اس عالم مُردہ کی صورت اور بھی بھیانک کردی۔ آدم نہ آدم زاد

سُنسان محلے اور مکان پڑے ہیں۔ ہاں فقط سیل طوفاں ہو رہا ہے۔ خدا جانے دنیا کی بستی کدھر گئی۔ کس بلا کی نیندیں ہیں۔ ع یہ کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے۔ مگر اس طرف اس مکان میں کیواڑوں اور پردوں میں سے چھن کر روشنی کی سی جھلک پڑتی ہے جو رات کی تاریکی کا اندازہ کراتی ہے۔ شاید کوئی چراغ سونے والوں کی نظر سے پوشیدہ نفس نفس ہچکیاں لیکر دم توڑ رہا ہے۔ یکایک ایک کیواڑ کھُلا اور دو پرچھائیاں سی پھرتی نظر آئیں۔ کمرہ سے چبوترہ، چبوترہ سے انگنائی، انگنائی سے دروازہ میں سرسراہٹ، تھوڑی دیر میں پاؤں کی سی آہٹ سُنائی دی، پھر کھٹ سے دروازہ کھُلا، اور مکان کے باہر گلی میں دو سفید بُرقعے ہوا میں لہراتے، پھڑ پھڑاتے نظر آئے۔ آہا یہ کوئی دو عورتیں ہیں۔ مگر عورتیں ساتھ ساتھ اور آپس میں بات چیت کچھ بھی نہیں۔ لبوں پر مُہر سکوت ہے۔ کیسی خاموش نکلی جا رہی ہیں۔ نہیں مُنہ میں پانی کی کلیاں ہیں۔ لیکن یہ کیا طور ہے، کوئی اسرار معلوم ہوتا ہے۔ گلی کی چک پھیریوں سے نکل کر سڑک پر آگئیں اور اسی سڑک پر سیدھی ہولیں۔ لپاک جھپاک نکلی چلی جاتی ہیں۔ دلوں میں حسرت بھرے تصور ہیں۔ کان سناٹے میں اس طرح لگے ہوئے ہیں، گویا کسی صدا کی آہٹ کے سننے کا انتظار ہے۔ گویا عزم سفر تلاش صدا کے لیے ہے۔ یہ کیا اسرار ہے یہ کیسی تلاش ہے کہ عالم مثال میں یگانہ ہے۔ چلتے چلتے ایک چوراہے پر پہنچیں۔ اُلٹے ہاتھ کی طرف سے یکایک ایک صدا ہوا میں فنا ہوتی سُنائی دی "...... جانا ہوگا"۔ فوراً ٹھٹھک گئیں، خاموش ایک دوسری کی طرف دیکھنے لگیں مگر صدا کی تکرار کا انتظار ہے۔ یہانتک کہ پھر چل کھڑی ہوئیں۔ سکوت میں وہ باہمی یگانگی ہے کہ بغیر بات کیے دل ہی دل میں ایک دوسرے کے ارادہ سے مطلع اور متفق ہو جاتی ہیں۔ اب اُسی اُلٹے ہاتھ کی طرف چل رہی ہیں۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد ایک آواز پھر بلند ہوئی۔ مگر یہ آواز کہیں قریب ہی کی ہے، بلند ہے، صاف ہے، واضح ہے، کوئی فقیر بڑے درد بھرے لہجہ میں گا کر صدا لگا رہا ہے۔

کرے سنگھار چتر البیلی ساجن کے گھر جانا ہوگا

ماٹی بچھونا، ماٹی کا اوڑھنا، ماٹی کا سرھیانہ ہوگا

یہ صدا سنتے ہی فوراً تھم گئیں، کلیاں تھوک دیں، اور ایک دوسرے کو حیران ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگیں۔ مگر نگاہیں اب پہلے تصور کا بہت صاف پتہ دے رہی ہیں گویا کوئی تائید غیبی کانوں نے دل کو پہنچائی ہے۔ ایک کے منہ سے نکلا "ہے ہے کیا ہو گیا"

دوسری۔ بُوا کیا کہوں میری تو پاؤں سے زمین نکل گئی۔

پہلی۔ اب وہاں جا کر کیا کہو گی۔

دوسری۔ لے ہے اب خدا کے لیے چلو... چلو، میں تو اپنی بیوی کی صورت (مضطربانہ اور رڈوبے ہوئے لہجہ میں) لے ہے ایک نظر اور دیکھ لوں۔

یہ کہکر ان مسافروں نے اپنے قدم پھیرے۔ مگر پاؤں لغزش کھاتے ہیں، دل دھڑکتا ہے، چلنا دوبھر ہے۔ منہ سے بات نہیں نکلتی، بمشکل منزل طے کر کے مکان پر پہنچیں اور سیدھی ایک کمرہ کی طرف چلیں، کیواڑ کھولا اور داخل ہوئیں۔ یہاں کا سماں ہی کچھ اور ہے۔ سامنے مسہری پر ایک مریض لیٹی ہے۔ مگر بیمار کی صورت دیکھی نہیں جا سکتی۔ عجب حسرت و اندوہ کا عالم ہے۔ زندگی حسرت کے ساتھ مریض کو دیکھتی ہے اور کراہ کر آہ بھر کر کہتی ہے ؎

رحم کر ظالم کہ کیا بُود چراغ کشتہ ہے

نبض بیمار وفا دود چراغ کشتہ ہے

دیوار سے لگا ہوا کونہ میں میز پر ایک لمپ دھرا ہلکی ہلکی دھیمی دھیمی پھیکی پھیکی روشنی ڈال رہا ہے گویا اب آنکھ جھپکی، اب گُل ہوا ع بطرز اہل فنا ہے فسانہ خوانی شمع۔ ادھر اُدھر انگریزی اور یونانی دوائیاں کچھ بکھری، مگر سب بے ترتیب، اس طرح سے پڑی ہوئی ہیں کہ شاید ایک کا بھی استعمال نہیں یا اگر استعمال ہے تو ملواں جلواں جیسی جس گھڑی صلاح ٹھیری وہی دوا دی گئی۔ مسہری کی شاموں میں تعویذوں کے گچھے لٹک رہے ہیں۔ سرہانے کرسی پر ایک بڑھیا تسبیح ہاتھ میں

لیے بیٹھی پڑھ رہی ہے اور پڑھ پڑھ کر مریض پر دم کرتی جاتی ہے۔ رہ رہکر آنسو ٹپکتے ہیں۔ رُک رُک کر ٹھنڈے سانس بھرتی ہے۔ جونہیں یہ دو عورتیں اندر داخل ہوئیں بڑھیا پریشان کھڑی ہوگئی اور گھبرا گھبرا کر اشاروں سے سوال کرنے لگی، اس اعتقاد کے ساتھ کہ گویا یہ نوشتۂ تقدیر دیکھکر آئی ہیں اور ان کا پیام مستجاب الدعوات کا جواب ہے۔ اشاروں ہی اشاروں میں مضمون ادا ہوا اور بڑھیا گھبرا کر روتی ہوئی کمرہ سے اندر دالان میں داخل ہوئی۔ یہ عورتیں بھی پیچھے پیچھے وہیں پہنچیں۔ وہاں بہت سی عورتیں چاروں طرف پڑی سوتی ہیں۔ مگر شہ نشین پاس دو عورتیں پریشان ہمہ تن انتظار بنی بیٹھی ہیں۔ بوڑھیا کی مضطربانہ حالت اور آنے والی عورتوں کی مایوسانہ صورت دیکھکر گھبرا کر پوچھنے لگیں۔ " اے ہے کیا ہوا خیر تو ہے"۔

آنے والیوں میں سے ایک۔ بیوی کیا کہوں میں تو کہیں کی نہ رہی۔

ایک بیوی۔ اے ہے میرا تو پہلے ہی ماتھا ٹھنکا تھا۔

دوسری بیوی۔ اری مُنہ سے پھوٹ چک کر کیا سُنا۔

آنے والی عورت۔ بیوی خدا نہ کرے جو سُنی ہو جا۔

دوسری آنیوالی نے ڈر ڈر کر رنج بھرے لہجہ میں ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں فقیر کی صدا سُنائی۔ یہ سنتے ہی ایک تو کلیجہ پکڑ کر وہیں رہگئیں، دوسری بیوی چیخ مار کر دوڑیں اور مریض کے کمرہ میں داخل ہوگئیں۔ اس چیخ اور بھاگ دوڑ سے اور سونے والیاں بھی اُٹھ بیٹھیں اور ہراساں سب کمرہ کے اندر مسہری کے ارد گرد آن جمع ہوئیں۔ سامان تتر بتر ہوگیا دوائیاں رہی سہی اور بھی بکھر گئیں۔ اس فال گوش نے دوائیوں پر رہا سہا اعتقاد اور بھی کھو دیا تھا، پھر دوائیوں کا کیا کسی کو فکر ہوتا۔ چیخ مارنیوالی بیوی نے بڑے پُر درد لہجہ میں رو کر مریض کے سینہ پر اپنا سر رکھدیا اور گلے میں بانہیں ڈالدیں۔ مریض نے آنکھ کھولکر دیکھا... خدا جانے کیا دیکھا... کیا خبر کہ یہ رخصتی نگاہ تھی۔ آہ یہ کیسی الوداع تھی۔

حقّی دہلوی

زنانہ شجاعت

امریکہ شمالی کے انتہاے شمال کے حصہ کو کینڈا کہتے ہیں۔ اس خطہ کو پہلے پہل اہل فرانس نے ۱۶۰۸ء میں آباد کیا اور یہ لوگ ۱۷۶۳ء تک دروبست قابض و متصرف رہے بعدازاں کنیڈا کی حکومت قوم انگریز کے ہاتھ میں آگئی اور اسی زمانہ سے اہل فرانس کی نوآبادیوں کو ضعف آنا شروع ہوگیا اہل برطانیہ کی آبادیوں نے ان کی جگہ لے لی۔ مگر ہم اس جگہ اُس زمانہ کا قصہ بیان کرینگے جبکہ یہاں اہل فرانس کی حکومت تھی۔

مقام ورچری کنیڈا کے مغربی حصے دریای لارنس کے کنارے پر ایک مقام ہے یہاں ایک فرانسیسی قلعہ ہے اور گولہ باروت کا ایک گودام بنا ہوا ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اسی قلعہ کا سردار کسی ملکی خدمت پر دریا کے پار شہر کیو کو گیا ہوا تھا اور اُسکی بیوی کسی ضرورت سے مونٹ ریل گئی ہوئی تھی جو قلعہ سے ۲۰ کوس کے فاصلہ پر ہے اس قلعہ میں سردار کی ایک لڑکی میڈلین جس کی عمر ۱۴ برس کی تھی۔ اور اس لڑکی کے دو بھائی ایک دس سال کا دوسرا بارہ سال کا اور چند اور آدمی تھے ۱۱ اکتوبر ۱۶۹۲ء کا ذکر ہے کہ قلعہ میں صرف یہ لڑکی اسکے بھائی اور ایک ۸۰ برس کا عمر رسیدہ بوڈھا اور دو سپاہی رہگئے اور باقی سب آدمی اپنے اپنے کام کاج کو چلے گئے۔ صبح کا وقت تھا اس لڑکی کے دل میں آیا کہ سیر کرے صبح کا لطف اور دریا کا کنارا تھا۔ چنانچہ اُسنے ایک قُلی ساتھ لیا اور دریا کے کنارے کی سیر کرنے کو نکل کھڑی ہوئی۔ یہ کم سن لڑکی خدا کی حمد اور اُس نظارہ سے محظوظ اپنے خیال میں کھڑی تھی کہ ایکا ایکی کھیت سے آواز آئی کہ بیگم صاحب دوڑو دوڑو وہ آدمی وحشی لٹے وہ آئے یہ چونکی اچانک مڑکر دیکھا تو وہ حقیقت میں انکی ۵۰۔ کی جماعت کو اپنے سے کوئی ۲۰۰ سوگز کے فاصلہ پر پایا۔ گھبرا کر قلعہ کی طرف بھاگی اور ان وحشیوں نے بھی اسکا تعاقب کیا مگر خیر کسی نہ کسی طرح جوں توں کرکے قلعہ تک

پہنچ ہی گئی جب ان ظالموں نے دیکھا کہ زندہ نہیں پکڑ سکتے تو ایک بندوق کا فیر کیا مگر خدا کی قدرت سے نشانہ خطا ہوا اور یہ صحیح سلامت قلعہ میں داخل ہو گئی۔ اس لڑکی نے اپنی بہادری سے نہ صرف قلعہ میں اپنی جان بچائی بلکہ قلعے کو جس میں عورتیں اور چند بزدل مرد تھے ہلاکت سے بچائے اور اپنی بہادری اور استقلال کی مثال اپنی بہنوں کے لیے چھوڑی۔ مس ٹڈ ایبن صاحب نے اپنے ان وحشیوں کے ہاتھ سے بچنے اور قلعے میں محصور ہونے اور قلعے کے آدمیوں کی بدحواسی کو خود بیان کیا ہے وہ کہتی ہیں کہ۔

جوں ہی میں نے اُن وحشیوں کے انبوہ کثیر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا میں قلعہ کی طرف دوڑی جب ان لوگوں نے دیکھا کہ یہ مجکو زندہ نہیں پکڑ سکتے تو تعاقب چھوڑ دیا۔ اور میرے پر ایک بندوق کا فیر کیا مگر گولی میرے کان کے پاس سے ہو کر گذری اور اتنی دور پر تھی کہ آواز سُنی جاسکے میں نے چلا کر کہا کہ اپنے اپنے ہتیار سنبھالو قلعے کے دروازے میں گھُسی تو دیکھتی کیا ہوں کہ دو عورتیں اپنے خاوندوں کو رو پیٹ رہی ہیں جنکو ابھی ان وحشیوں نے شہید کیا تھا۔ میں نے ان عورتوں کو اندر جانے کے لیے کہا اور جلدی سے قلعہ کا دروازہ بند کیا جب اندر پہنچ گئے اور دروازہ بند کر دیا تب جا کر کہیں دم آیا اور مجکو یہ سوچنے کا موقع ملا کہ اپنے تیں اور اپنے ساتھیوں کو کیونکر بچا سکتی ہوں۔

میں نے پہلے معائنہ کیا قلعہ کو جا کر دیکھا تو اُس کی عجب حالت تھی بالکل غیر محفوظ تھا۔ بہت ایسے کھول مقام تھے کہ جہاں سے دشمن بہ آسانی اندر گھُس سکتے تھے۔

مینے انہیں چند قلعے کے آدمیوں کو ان مقامات کو بند کرنے کے لیے کہا اور خود بھی انکے ساتھ شریک ہوئی جب یہ شگاف بند ہو گیا اور اطمینان ہو گیا تو میں گودام کی طرف گئی وہاں میں نے دو سپاہیوں کو دیکھا کہ ایک کے ہاتھ میں تو دیا سلائی اور دوسرا کونے میں چھپا کھڑا ہے میں نے اُس سپاہی سے کہ جسکے ہاتھ میں دیا سلائی تھی یہ سوال کیا کہ تم کیا کرو گے یہ

کم ہمت سپاہی نہایت مایوسی اور بدحواسی سے بولا کہ لو بس اب اس باروت کو آگ لگا دو اور ہم سب کو جلا دو۔ یہ سنتے ہی میں نے سپاہی کو غضب آلودہ لہجہ میں کہا کہ جا اے کم ہمت اس جگہ سے دفع ہو۔ میرا کچھ بات کرنے کا ایسا انداز تھا کہ سپاہی نے فوراً تعمیل کی اور چلا گیا۔ میں اپنے دل میں سوچتی تھی کہ بھلے کو میں یہاں پہنچگئی ورنہ ان سپاہی صاحب کے ہاتھوں آج کیا آفت آتی۔ جب میں ان تمام امور سے فارغ ہوئی تو میں نے اپنے زمانہ لباس کو خیرباد کہکر ایک مردانہ لباس پہنا بندوق ہاتھ میں لی اور اپنے دو ننھے بھائیوں سے اسطرح مخاطب ہوئی۔ برادران عزیز۔ اب ہم کو مرتے دم تک لڑنے سے جی نہ چرانا چاہیے۔ ہم اپنے پاک اور مقدس دین اور ملک کے لیے لڑینگے۔ دیکھو تم کو ابا جان کے الفاظ یاد ہونگے کہ وہ فرمایا کرتے تھے کہ شریف آدمی ایسیے پیدا ہوئے ہیں کہ اپنی جان خدا کی راہ میں اور اپنے بادشاہ کے لیے قربان کریں۔ بہن کے ان الفاظ سے اُن ننھی ننھی جانوں نے بھی لڑنے کا پکا ارادہ کر لیا اور سپاہیوں کے ساتھ ملکر یہ بھی لڑتے تھے۔

جب اس جنرل لڑکی نے اپنے بھائیوں اور چند آدمیوں کو لڑنے پر آمادہ کر لیا تو اپنے بھائیوں کو قلعہ کی دیوار کے سوراخوں سے غنیم پر بندوق چلانے کو کہا۔ جب ان وحشیوں کے چند آدمی مقتول اور مجروح ہوئے۔ تب جا کر اُن کو کہیں ہوش آئے یہ سمجھے کہ قلعہ فوج سے بھرا ہوا ہے۔ قلعہ کی اصلی حالت کی ناواقفیت کی وجہ سے یہ لوگ حملہ کرنے سے باز رہے۔ مگر مگر اب ان لوگوں نے اپنی توجہ گرد نواح کے کھیتوں پر کام کرتے آدمیوں پر مبذول کی ان سخت دلوں نے ان کو بے خبر آن دبایا اور کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔

اب میڈلین کو موقع ہاتھ آیا اور اسنے توپ چلانے کا حکم دیا تاکہ آس پاس کے آدمی خبردار ہو جائیں اور دشمن خائف ہوکر بھاگ جائیں۔

اس لڑکی نے اس معرکہ میں ایسے وقت پر کہ جب بڑے بڑے سپاہیوں کی گھگی بندھی جاتی ہے اس استقلال اور قوت ارادی اور بہادری کا اظہار کیا جو

قیامت تک صفحات تاریخ میں فخر اور عزت سے یاد رہے گی۔

توپ کے چلنے کے چند منٹ بعد ایک کشتی قلعے کی برجی پر سے نظر پڑی جو نہایت بیتابی سے ساحل خشکی کی طرف زیست سے مایوس چلی آرہی تھی۔ یہ وحشی ابھی کچھ دور نہ گئے تھے اور گرد نواح میں خوں ریزی کر رہے تھے۔ اس کشتی میں فاڈلین مع اپنے کنبہ کے تباہی لیے آرہا تھا مڈلین نے کہا کہ اگر اس کی مدد نہ کی گئی تو دشمن کے ہاتھوں اس غریب کے بچے بیوی مع خود کے ہلاک ہوجاوینگے۔ اس آفت زدہ خاندان کی یہ حالت دیکھکر مڈلین کا دل پانی پانی ہوگیا۔ اُسنے سپاہیوں سے درخوست کی کہ جاکران بیچاروں کو بچائیں اور صحیح وسلامت سلے آئیں مگر ان بزدلوں کے تو قلعہ کے اندر ہی چھکے چھوٹے جاتے تھے مڈلین نے ایک کی نہ دو خود ہی تن تنہا فاڈلین کو دریا کے کنارے لینے چلی۔ جب وہ تمام صحیح وسلامت خشکی پر اُتر آئے تو اسنے اُن کو خوب تن کر ایک قطار میں چلنے کا حکم دیا۔ ان لوگوں نے کچھ ایسی بہادرانہ صورت بنائی کہ وحشی خود انسے خائف ہوگئے۔ اور کسی نے چوں تک نہ کی۔ اس طرح مس مڈلین نے انکو صحیح سالم قلعہ میں پہنچایا۔ غروب آفتاب تک بخیر وعافیت گزری۔ مگر دشمن کی تعداد میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا جاتا تھا اور یہ لوگ قلعہ کے آس پاس قلعہ کی قوت کا اندازہ کرتے پھرتے تھے۔ جب آفتاب چھپا تو اُنھوں نے بھی حملہ کی تیاریاں کیں۔ بزدل اور ناحق کے دشمنوں کا خاصہ ہے کہ آدھی رات پچھلے پہر ہی موقع پاکر بے خبر دشمن پر اکثر حملہ کیا کرتے ہیں مگر مس مڈلین صاحب اس قلعہ سے عثمان پاشا کی طرح سے غافل نہ رہیں اور ہر طرح کے ٹھیک ٹھاک کر لیے۔ خدا کی قدرت اسی رات کو ایسی سخت بارش ہوئی کہ اب ہوکر کبھی نہو گی۔ آندھی و طوفان آیا مگر مڈلین کی ہمت کسی طرح پست نہوئی اُسکو خدا کی ذات پر پورا بھروسہ تھا۔

یہ وحشی بھی دیوار کے اردگرد کاوے کاٹتے پھرتے تھے۔ اور اُن کی نقل وحرکت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بجائے طوفان کی وجہ سے فرار ہونے اور اپنے

ملجا و ماوی کی تلاش میں رات کی تاریکی میں قلعہ کی دیوار پر چڑھکر اندر آن گھسیں گے
میں نے اپنے تمام لاؤ لشکر کو جمع کیا یعنی کل چھ آدمیوں کو اور انکو مخاطب کرکے کہا۔ کہ
خداوند تعالیٰ نے اپنی رحمت سے آج کے دن دشمن کے ہاتھوں سے بال بال بچایا ہے
مگر ہم کو خیال رکھنا چاہیے کہ اس رات کو کہیں ہم انکے پنجے میں نہ پڑجائیں۔ لو بس میں ان بڈھے
۸۰ برس کے بڑے میاں کے ساتھ قلعہ کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہوں اور تم میاں فاڈلین
ان چار سپاہیوں اور بچے اور عورتونکو لیکر گودام میں جاؤ کیونکہ یہ مقام قلعہ کی بہ نسبت
زیادہ مضبوط اور محفوظ ہے۔ ہاں دیکھو فرض کرو کہ اگر میں تمہاری آنکھوں کے سامنے گرفتار
ہی کیوں نہو جاؤں چاہے وہ مجکو تمہارے سامنے جلاکر خاک سیاہ کردیں مگر تم ہرگز اطاعت
قبول نہ کرنا۔ کیونکہ اگر تم نے ذرا سا بھی لڑائی میں ثابت قدمی کا اظہار کیا تو تم یاد رکھو کہ ان کی
جبلی خصلت اور کم ہمتی کبھی ہم پر قابض ہونے دیگی لو اللہ کا نام لیکر جاؤ

سچ تو یہ ہے کہ دو رات اور دو دن تک میری پلک سے پلک نہ جھپکی اور چھ وقت میں ایک
کھیل کا دانہ اُڑکر مُنہ میں نہیں پڑا۔ ہر وقت قلعہ کی بُرجی پر ہی جمی رہی۔ میری عجب حالت تھی
کبھی گودام کو دیکھنے جاتی تھی کہ وہاں آدمیوں کا کیا حال ہے اور کبھی اپنی جائے ماموری پر آتی۔
اسی طرح تانا تن کر رات آنکھوں میں گذاری۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اس مصیبت کی حالت میں بدل
اور افسردہ نہ رہی۔ اور ساتھیوں کی جماعت کو بھی ہمت دلاتی رہی۔ ہم لوگوں کی عجب حالت
ہوگئی تھی کہ ۴۸ گھنٹے کے متواتر اندیشے اور جونکے رہنے کی وجہ سے بالکل ناطاقت ہوگئے
تھے اور دشمن تھے کہ کسی طرح پیچھا نہ چھوڑتے تھے۔ آخر کار خدا خدا کرکے ایک فوجی افسر
چالیس آدمی کے ساتھ تیسرے دن آیا جب یہ افسر پہنچا ہے تو میرا بُرا حال تھا۔ آنکھیں خمار اور
نیند کی وجہ سے بند ہوجاتی تھیں۔ میں میز پر سر رکھے اور بندوق سامنے بے خودی کے
عالم میں تھی کہ ایک سپاہی آیا اور اُسنے خبر دی کہ بیگم ایک آواز دریا کے کنارے سے
آئی ہے کہیں ہمارے آدمی نہوں میں فوراً ہی بُرجی پر گئی میں نے اُن آدمیوں سے جو

بڑھے چلے آرہے تھے چلاّکر پوچھا کہ آپ کون لوگ ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم فرانسیسی ہیں آپ کی مدد کو آئے ہیں۔ یہ سنکر توبندی کی جان میں جان آئی۔ میں نے دروازہ کے کھولنے کا حکم دیا اور ایک سپاہی کو ٹھرنے کو کہکر میں اُن لوگوں سے دریا کے کنارے پر ملنے گئی۔ جوں ہی میں نے فوجی افسر کو دیکھا سلام کیا اور اُنسے کہا کہ لیجیے حضرت یہ بندوق اب آپ آگئے ہیں آپ جانیں اور آپ کا کام۔ افسر نے نہایت خوشی اور جوش میں آکر کہا کہ خدا کا شکر کہ ہتیار آپ جیسی بہادر کے ہاتھ میں ہیں۔

افسر نے آتے ہی قلعہ کا معائنہ کیا اور ہر چیز کو مرتب اور باقرینہ پایا اور سپاہیوں کو ہر ایک برجی پر دیکھا۔ میں نے افسر سے کہا کہ اب ہماری مشکل آپ آسان کریں کیونکہ ہم لوگوں کو یہاں ایک عرصہ کھڑے ہوگیا۔

ناظرین کو اس چھوٹے سے قلعے اور اُس کی شیر دل لڑکی کی قسمت کے متعلق اب کسی مزید قصہ سُننے کا انتظار نہوگا کیونکہ اس بیچاری بچی نے اپنی داستان اپنے مُنہ سے اپنی بہنوں کے سننے کے لیے بیان کردی ہے۔

میں اپنی طرف سے اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو آزادی نسواں کے مخالف ہیں۔ اُن کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ عورتیں نہ صرف تعلیم و تربیت کے میدان ہی میں ترقی اور کامیابی حاصل کرسکتی ہیں بلکہ وہ جنگ پیکار میں بھی ہر طرح مردوں کی برابر ہیں تاریخ اسلام میں بکثرت ایسی عورتوں کے نام پائے جاتے ہیں جنہوں نے دنیا میں ایثار نفسی اور شجاعت کی مثالیں چھوڑی ہیں۔

یہ ہی مس میڈلین اگرچہ ایک غیر قوم کی لڑکی ہیں مگر ان کی شجاعت کی داستاں نہ صرف فرانس ہی کی لڑکیوں کے لیے موجب تقلید و فخر ہے بلکہ دنیا کی عورتوں کی اولوالعزمی اور شہامت کے کارناموں کی فہرست میں ایک بڑا قابل قدر اضافہ ہے۔ ان بیگم صاحب کے حالات بہت سے یورپ کی زبانوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ اور آج اُن کا جی اپنی ہندوستانی

بہنوں سے ملنے کو چاہا ہی تو ہندوستانی لباس پہنکر آن کھڑی ہوئی ہیں۔ اور اپنی ہندوستانی بہنوں کے دلوں کو جوش حب الوطنی اور ملک و قوم پرستی پر آمادہ کرنا چاہتی ہیں۔ سچ ہی آدمی مرجاتا ہی مگر اُس کی نیکی کبھی نہیں مرتی۔

راقم

محمد فضل امین

زیب النسا بیگم

سلاطین مغل کے خاندان میں زیب النسا بیگم ایک فاضل اور دانشمند بیگم گذری ہے۔ اسکا نام بچّہ بچّہ کی ورد زبان ہے۔ اور تمام مورخین ہی اس کی قابلیتوں کے معترف ہیں۔ اس کی قابلیتیں اور پولٹیکل کارنامے، اس امر کی کافی دلیل ہیں کہ ایک پردہ نشین عورت باوصف کمال پابندی پردہ کے بھی، فضل و کمال میں، نام و نمود حاصل کرسکتی ہی۔

زیب النسا بیگم۔ عالمگیر کی پیاری بیٹی تھی۔ یہ پانچویں فروری ۱۶۳۹ء کو پیدا ہوئی۔ اسکے چار اور بہنیں تھیں۔ لیکن جو دولت علم و فضل اسکو نصیب ہوئی وہ اسکی بہنوں کو تو کیا شاہی خاندان میں بھی سوائے ایک آدھ کے کسی کو حاصل نہوئی۔

بادشاہ عالمگیر نے صغر سنی ہی میں اس کی تعلیم کی طرف کافی توجہ مبذول کی۔ پہلے روشن آرا بیگم کے سپرد اس کی تعلیم ہوئی۔ تھوڑے ہی سے سن میں اسنے کلام مجید حفظ کرلیا۔ بادشاہ نے اس موقع پر ایک جشن نہایت دہوم دھام سے کیا۔ جس میں تمام علماء و صلحائے زمانہ مدعو کیے گئے تھے۔ اور سب بادشاہ کے سخاوت سے فیضیاب ہوئے۔ زیب النسا بیگم کو بھی بادشاہ نے تیس ھزار اشرفیاں انعام میں دیں۔

ختم قرآن کے بعد، زیب النسا بیگم کو ملا جیون صاحب کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ جو ایک نامور مصنف تھے، اور وہ عالمگیر کے بھی اُستاد رہ چکے تھے۔ زیب النسا بیگم

نے انسے تمام کتابیں پڑھیں۔ اسکے علاوہ زیب النسار کو خوشنویسی کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ پائے تخت کے مشہور خوشنویسوں سے اسنے مختلف قسم کے خط سیکھے۔ نستعلیق نسخ اور شکستہ میں اُسے کمال تھا تمام ہمعصر اسکے خط کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور وہ اسوجہ سے نہیں کہ بادشاہ وقت کی بیٹی کا خط ہی۔ بلکہ اسوجہ سے کہ وہ بجائے خود کمال فن کا قطعی نمونہ تھا۔

زیب النسار بیگم۔ کو انتہا درجہ کا علمی مذاق تہا۔ وہ اور بیگمات کی طرح آرام طلبی میں منہمک نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنے اوقات کا زیادہ حصہ، علمی اشغال میں صرف کرتی تھی۔ اور یہی چیزیں اُسکے دل بہلاؤ کا ذریعہ بنی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اُسکے پاس ایک ایسا کتب خانہ تہا جس میں تمام علوم کی کتابیں جمع تہیں۔ جہاں اسکو کسی نادر کتاب کا پتہ چلا اُسنے فوراً منگوا لیا۔ اسی طرح پر اس کی لائبریری تمام نادر اور بیش بہا کتابوں کا مجموعہ تھی۔ اور وہ اپنے عزیز اوقات کو اس چمن کی سیر میں گزارتی تہی۔ اسکے کتب خانہ میں زیادہ تر مذہبی اور لٹریری مذاق کی کتابیں تھیں۔

اسکے علاوہ زیب النسار بیگم اہل علم وکمال کی حد درجہ قدر دان تھی۔ چنانچہ اُسکے اسٹاف میں زیادہ تعداد ایسے اشخاص کی تھی جو اُس زمانہ میں علم وفضل میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ ان لوگوں کے سپرد علمی کام تھے۔ ان میں سے زیادہ تر شاعر۔ مصنف اور خوشنویس تھے۔ علما عمدہ اور مفید کتابیں تصنیف کرتے تھے۔ بعض کے سپرد ترجمہ کا کام تھا۔

اُن کتابوں میں سے جو اُسکے عہد میں ترجمہ ہوئیں ایک زیب التفاسیر ہی جو اُسکے نام سے منسوب ہے۔ یہ ترجمہ قران کی مشہور تفسیر تفسیر کبیر کا ہی، جو امام رازی کی نامور تصنیف ہے اسکا ترجمہ ملا شفیع الدین عرض بیگی نے کیا تہا۔ جنکو بیگم مذکور نے کشمیر میں اس کام پر مقرر کیا تہا۔ اسکے علاوہ زیب النسار نے اور بہت سی کتابیں ترجمہ و تصنیف کرائی تھیں۔

لیکن افسوس ہے کہ اُن کی زیادہ تعداد آج صفحہ عالم سے ناپید ہے۔

زیب النسا بہت بڑی سخن سنج اور سخن فہم تھی۔ فی البدیہہ شعر کہنے میں اُسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ کہتے ہیں کہ فارسی کے نامور شاعر ناصر علی سے زبان شعر میں اس سے سوال وجواب ہوتے تھے۔ چنانچہ اُسکے اکثر شعر زبان زد خاص وعام ہیں۔ لیکن ہمکو اسکے ماننے میں کلام ہے کیونکہ وہ اشعار اسقدر تہذیب وشائستگی سے دور ہیں، کہ عقل ایک لمحہ کو بھی باور نہیں کرسکتی کہ اتنی بڑی فاضل اور خدا پرست بیگم کے مُنہ سے ایسے لفظ نکلے ہونگے۔ اور نہ درایت یہ تسلیم کرسکتی ہے کہ ایسے بادشاہ اجل کی بیٹی کو جسکے نام سے دل دہلتے تھے ایک ادنیٰ آدمی نے، ایسے الفاظ میں مخاطب کیا ہوگا۔

زیب النسا بیگم کا تخلص مخفی تھا۔ لوگ کہتے ہیں "دیوان مخفی" اُسی کی تصنیف ہے۔ لیکن اس میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک ایرانی اُستاد کا طبع زاد ہے۔ لیکن اس میں ایک غزل کا مقطع اس خیال کی تردید کرتا ہے۔ اگر یہ شعر اضافہ کا نہو تو ہم کو بھی اُسے زیب النساء کے کلام مان لینے میں کچھ تامل نہیں ہے۔ وہ شعر یہ ہے ؎

دختر شاہم ولیکن رو بہ فقر آوردہ ام

زیب و زینت بس ہمینم نام من زیب النساست

حاصل یہ کہ زیب النسا بہت بڑی سخنگو تھی۔ لیکن جو شعر اُس سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ انکے زیب النساء کے طبع زاد ہونیکا کوئی قطعی ثبوت نہیں ہے۔

سلاطین مغل کی پالٹکس میں اکثر بیگمات نے بھی بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ مثلاً جہانگیر کی سیاست میں نورجہاں بیگم نے روح رواں کا کام دیا۔ شاہجہاں کی ابتدائی سلطنت میں ممتاز محل کا بہت کچھ اثر تھا۔ ممتاز محل نے جب وفات پائی تو اُس کی فاضل بیٹی جہان آرا بیگم نے امور سلطنت میں بہت کچھ دخل دیا۔ اور زیادہ تر کام اُسی کی رائے سے ہوتے تھے جب عالمگیر تخت پر بیٹھا تو روشن آرا کا ستارہ چمکا۔ کیونکہ خانہ جنگی کے زمانہ میں وہ عالمگیر کی

تہی اور وہ قلعہ کی تمام خبریں عالمگیر کو خفیہ طور پر پہنچاتی تھی۔ اسوجہ سے عالمگیر اُسکا بہت
احسان تہا۔ اور اُسکے ساتھ دلی محبت رکہتا تہا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام امور سیاست اُسی کی
سے انصرام پاتے تھے۔ فرامین کا نفاذ اُسکے حکم پر منحصر تہا۔ لیکن اُسکا یہ عروج زیادہ
نہیں رہا۔ جب زیب النسا، عالم شباب کو پہنچی۔ اُسکے علم وفضل اور روشن دماغی
م دلوں پر بیٹھ گیا۔ بادشاہ بہی اُس کی زیادہ محبت کرنے لگا۔

اُسی زمانہ میں ایک اور حادثہ وقوع میں آیا۔ جو روشن آرا کی قسمت کا فیصلہ تہا۔ سنہ ۱۶۶۲ع
لگیر سخت علیل ہو گیا۔ ہمیشہ اُسپر غشی طاری رہتی تھی۔ روشن آرا اُس کی تیماردار تھی اور
نس کو اُس مکان میں، جہاں عالمگیر تہا وہ جانے نہیں دیتی تہی۔ مکان کے باہر قلمانیوں
پہرہ رہتا تہا۔ بادشاہ کی حالت مزاج سے کسی شخص کو آگاہی نہیں ہو سکتی تہی۔ روشن آرا
شش میں تہی کہ عالمگیر اگر وفات پائے تو اُس کی جگہ، شاہ عالم اسکا بڑا بیٹا جو ایک
بطن سے پیدا ہوا تہا اور مستحق سلطنت بہی تہا۔ تخت نشین نہو۔ بلکہ اُسکے چھوٹے
تخت ملے۔ لیکن اُس کی عمر اسوقت صرف چھ سال تھی۔ اسکے لیے اُس نے
لیا تہا کہ اسکے جوان ہونے تک میرے ہاتھ میں عنان سلطنت رہے گی۔ اس
سے اُسنے شاہی مُہر بہی عالمگیر کے ہاتھ سے نکال لی تہی۔ اور تمام فرامین اُس زمانہ
شاہ کے نام سے جاری ہونے لگے۔ تمام صوبہ داروں۔ راجاؤں اور عمالوں کو بہی اُس
کے خط اُسنے بھیجدیے۔

محلسرا میں ہر ایک سخت اضطراب تہا۔ کسی کو یہ بہی معلوم نہ تہا کہ بادشاہ زندہ ہے یا انتقال
آخر بادشاہ کی ایک ہندو بیوی نے قلمانیوں کو بہت کچھ رشوت دیکر بادشاہ کا
ل کیا۔ عالمگیر اُسوقت بیہوش پڑا ہوا تہا۔ اور اُسے مطلق نہ پہچان سکا۔ اسی عرصہ
شن آرا آگئی اور اُسنے رانی کے نازک چہرہ پر ایسا سخت طمانچہ رسید کیا کہ وہ
ئی باہر چلی گئی۔ عالمگیر کے دل میں اس رانی کی حد درجہ محبت تہی۔ اور اسپر وہ

اسقدر فریفتہ تہا۔ کہ باوجود اُس مذہبی تشدد کے جسکے لیے وہ تاریخی دنیا میں مشہور ہی اُس رانی کو وہ خاص محلسرا میں بت پرستی کرنے سے نہیں روکتا تہا۔ رانی نے شاہ عالم سے یہ واقعہ بیان کیا اور وہ اُسکے حصول مدعا میں سدِ راہ ہونے کی کوششیں کرنے لگا۔ آگرہ میں عام طور پر یہ چرچا تھا کہ عالمگیر اب بچ نہیں سکتا۔ اُسکے بعد شاہجہاں (جو قلعہ آگرہ میں قید تہا) پھر سلطنت حاصل کرلیگا۔ لیکن عالمگیر کا خوف اسقدر تہا۔ کہ اُسکے زمانہ علالت میں بغاوت کے لیے ایک ذرہ بھی نہیں ہل سکا۔

آخر خدا خدا کرکے عالمگیر کو افاقہ ہوا۔ اُسنے اس خوشی میں دہلی میں ایک جشن نہایت دہوم دہام سے کیا۔ اس جلسہ میں اعلیٰ سے ادنی طبقہ تک کے لوگوں کو شرکت کی اجازت تھی۔ رعایا نے اپنے بادشاہ کو دوبارہ تخت پر بیٹھے دیکھکر جو خوشی کی اُس کی کوئی حد نہ تھی۔ بادشاہ کا روشن آرا کی ان حرکتوں کے باعث اُسپر سخت قہر عتاب نازل ہوا۔ اور رانی کو بیش بہا خلعت۔ انعام اور خطاب عطا کیے گئے۔

روشن ارا کا زوال زیب النساء کے عروج کا زینہ تہا۔ اب اس بیگم نے بہت کچھ اختیار حاصل کرلیا۔ اور امور سلطنت میں بہی وہ بہت کچھ دخل دینے لگی۔ اہم معاملات میں بادشاہ اس سے استصواب رائے کرنے لگا۔ اُسکے علم وفضل فہم و دانش نے اُسکی وقعت اور اثر کو دوبالا کردیا تہا۔ منوچی لکھتا ہی کہ "زیب النساء کی بہ حیثیت سلطنت مغلیہ کے ایک روشن ستارہ ہونے کی پرستش کیجاتی تھی"۔ اسوقت اس کی عمر پچیس سال کی تھی۔ بادشاہ کو ہنوز شفائے کامل حاصل نہوئی تہی۔ زیب النسا نے اُسے سفر کشمیر کی صلاح دی۔ لیکن دو امور بادشاہ کو اس ارادے میں سدِ راہ تھے۔ اول یہ کہ موسم گرما کی حرارت اُس کی تندرستی کے لیے شاید مضر ثابت ہو۔ دوسرے یہ کہ شاہجہاں ابتک زندہ تھا۔ عالمگیر کو خوف تہا کہ دار الخلافت چھوڑنے سے کہیں بغاوت کا ہنگامہ برپا ہو۔ کیونکہ شاہجہاں کے ابتک بہت لوگ ہمدرد تھے۔ بعض مورخین نے لکھا ہی کہ اس موقع پر عالمگیر کا ارادہ ہوا کہ بہائیوں اور

بھتیجوں کی طرح باپ کی بھی زندگی کا خاتمہ کردے۔ چنانچہ اسکے متعلق زیب النسا سے بھی اُسنے مشورہ لیا۔

زیب النسا نے اسکی بہت زوروں کے ساتھ مخالفت کی۔ اور بادشاہ کو اس گناہ عظیم کے ارتکاب سے بچایا۔ اور یہ سمجھادیا کہ وہ تو اب خود شیخ فانی ہیں۔ ۷۵ برس کی اُن کی عمر ہوگئی تندرستی کا یہ حال ہے۔ اعلیحضرت چند روز اور صبر کریں۔ انکے مرنے میں کچھ دیر نہیں ایسی حالت میں کیا ضرور ہے اتنا بڑا گناہ عظیم اپنے سر لیں۔ اور ملک میں بدنام ہوں۔

آخر تھوڑے دنوں کے بعد، شاہجہاں کا انتقال ہوگیا۔ اور عالمگیر سے زیب النسا نے سفر کشمیر کی پھر تحریک کی عالمگیر راضی ہوگیا۔ چھٹی دسمبر کو بادشاہ دہلی سے روانہ ہوا۔ برنیر لکھتا ہے کہ اس موقع پر بادشاہ کے ہمرکاب پینتیس ہزار سوار اور دس ہزار پیادہ تھے ستر توپیں بھی تھیں۔ زیب النسا نے ایک مرتبہ جہان آرا کو شاہجہاں کے ساتھ نہایت دھوم دھام کے ساتھ سفر کشمیر کرتے دیکھا تھا۔ اور اُسی وقت سے اُس کی تمنا تھی کہ میں بھی اُسی طرح پر سفر کروں۔ چنانچہ اس موقع پر اُسنے تمام حوصلے نکالے۔ زیب النسا ایک بلند اور خوبصورت ہاتھی پر سوار تھی جسکا ہودج سونے کا بنا ہوا تھا اور اُس میں بیش قیمت جواہر لگے ہوئے تھے۔ ہاتھی کے اِردگرد دور تک قلمانیوں اور خواجہ سراؤں کی جماعت رہتی تھی۔ اسکے پیچھے پیچھے اور بیگمات کے ہاتھی تھے۔ یہ منظر قابل دید تھا۔ زیب النسا نے اس سفر میں بہت زیادہ سخاوت اور دریادلی سے کام لیا تھا۔

زیب النسا کی شادی نہو سکی۔ سلاطین مغل کی اکثر لڑکیاں شادی سے محروم رہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ شادی کے لیے اپنے مقابل کا آدمی چاہتے تھے۔ دوسرے اُن لوگوں سے بغاوت کا بھی کھٹکا لگا رہتا تھا۔ زیب النسا کے دامن عصمت پر بازاری گپوں نے بڑا دھبا لگا رکھا ہے۔ بعض ملک کے کوتاہ اندیش، اس کی اشاعت کرتے پھرتے ہیں۔ ان نقلوں سے مجلسوں کی دلچسپی بڑھاتے ہیں۔ ان بے اصل روایتوں کے سرچشمہ

حضرات مورخین یورپ ہیں جنکو ایسے بے سروپا قصے گھڑنے میں خاص ید طولی حاصل ہے۔ اور برنیر اور ٹورنیر تو اس گروہ کے مقدس پیشوا ہیں

زیب النسا نے ۱۷۰۱ء میں چھ سال اپنے والد بزرگوار سے پیشتر وفات پائی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ لاہور میں دفن ہوئی۔ لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ وہ باغ جو اُسکا مدفن قرار دیا جاتا ہے بیشک اُسی کا باغ ہے جسکو اُسنے میا بائی اپنے انا کو ہبہ کر دیا تھا۔ اُس میں وہ دفن نہیں ہوئی۔ سر سید مغفور لکھتے ہیں کہ وہ دہلی میں زینت المساجد میں مدفون ہوئی۔ لیکن مجھے اس سے بھی اختلاف ہے۔ غالباً وہ مسجد اُس کی بہن زینت النسا کی ہے۔ اور اُس میں وہی دفن ہے۔

پنجاب کے بہترین مورخ اور ہندوستان کے سب سے بڑے انشا پرداز شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ اُس کی قبر بیرون دہلی تھی میں نے اُس کی قبر خود دیکھی تھی اُسکا کتابہ جس میں آیت "فادخلی فی جنتی" بھی شامل تھی۔ جس سے عالمگیر نے اُسکا سن وفات نکالا تھا اپنے آنکھوں سے دیکھا تھا۔ افسوس کہ اُسکے سینہ پر اب ریل جاتی ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

محبوب الرحمن کلیم۔ بی۔ اے۔
مدرسۃ العلوم علیگڈھ

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ڈہاکہ

امسال کانفرنس کا اجلاس مقام ڈہاکہ ملک مشرقی بنگال میں بتاریخ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹ دسمبر منعقد ہوا۔ اور حسب معمول صیغہ تعلیم نسواں کا جلسہ بھی ۲۸۔ دسمبر کی شب کو ہوا۔ آنریبل جسٹس شرف الدین صاحب پریزیڈنٹ قرار پائے۔ پریزیڈنٹ موصوف نے افتتاح جلسہ پر حسب ذیل تقریر فرمائی۔

حضرات! انسان بلاتعلیم کے انسان نہیں کہلا سکتا۔ اور مرد عورت دونوں انسان ہیں
لہذا بغرض تکمیل انسانیت مرد وعورت دونوں کو تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ ممکن ہے تعلیم میں کچھ
نقصانات بھی ہوں لیکن اُس میں جو فوائد ہیں وہ اس درجہ بڑے اور اہم ہیں کہ نقصانات اُنکے
مقابلہ میں شمار کی ہستی نہیں رکھتے۔ وغیرہ۔

اسکے بعد مسٹر ارچبولڈ پرنسپل ایم۔ اے۔ او کالج کا ایک خط جو صاحب موصوف نے
سکرٹری کے پاس بھیجا تھا پریزیڈنٹ صاحب نے پڑھکر سُنایا مسٹر ارچبولڈ نے افسوس
ظاہر کیا تھا کہ میں بوجہ ایک ضروری کام کے ایسے اہم جلسہ میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اور مجکو
اغراض سے بے انتہا ہمدردی اور دلچسپی ہے۔ میرے نزدیک مسلمانوں کو عام طور پر اور ایم
اے۔ او کالج کے ٹرسٹیوں کو خاص طور پر اب یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ تعلیم نسواں کے بارے
میں آیندہ کیا کرنا ہوگا۔ اگر علیگڈھ میں کوئی مدرسۂ نسواں جاری کیا جائے تو احاطۂ کالج سے بہت
فاصلہ پر ہونا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ

اسکے بعد سکرٹری صاحب نے حسب اجازت پریزیڈنٹ اپنی سالانہ رپورٹ جلسے کے
سامنے پڑھی۔ اور اپنی رپورٹ کی تمہید میں اس بات کو پورے طور پر ثابت کیا کہ اب تعلیم
نسواں کی حمایت کا خیال ملک میں ترقی پکڑتا جاتا ہے۔ جو لوگ مخالف تھے وہ بھی اب ساکت
ہوگئے ہیں اور بظاہر مخالفت نہیں کرتے۔ ابھی تک ایک انقلاب کی حالت ہے۔ مخالف گروہ
روز بروز موافقت کی طرف آتا جاتا ہے۔ اسکے بعد ہندوستان میں مختلف پہلوؤں سے تعلیم
نسواں کی ترقی دکھلائی۔ اور واقعات سے اس بات کا ثبوت دیا کہ گورنمنٹ کو تعلیم نسواں کی
طرف بہت توجہ ہے۔ مسلمانوں نے گذشتہ چند سال میں جو کچھ اس تعلیم نسواں میں ترقی کی
ہے اُسکو بھی واقعات سے ثابت کیا۔ اسی دوران میں مختلف اسلامی مدارس نسواں کے
ذکر کے بعد مدرسہ تعلیم نسواں علیگڈھ کی کیفیت مفصل بیان کی۔ اور اُن دو خاتون کی
رپورٹ پڑھکر سُنائی جو اس مدرسہ کی نگرانی کرتی ہیں۔ اور سال بھر میں جو کچھ اس اسکول

کے لیے چندہ وصول ہوا اُسکا مفصل حساب پیش کیا۔ جس کی رو سے سن رواں میں پانچہزار پانچسو تینتیس روپیے کی رقم وصول ہوئی اور شروع سے لیکر ابتک متفرق طور پر گیارہ ہزار چار سو اڑتیس روپیے گیارہ آنہ چندہ جمع ہوا۔ جس میں سے آٹھ سو پچیس روپیے مختلف ڈپوٹیشنوں اور ایجنٹوں کے صرف میں آئے۔ اور نیز اس میں وہ خرچ بھی شامل ہے جو کہ ہز ہائنس نواب صاحب بہاولپور اور ہز آنر لفٹنٹ گورنر اور ہز ہائنس آغا خاں کی خدمت میں عرضداشتیں پیش کرنے میں صرف ہوا۔

دو سو تیس روپیے شروع سے ابتک رسالہ جات واپیل وسالانہ رپورٹ اور اشتہارات کی چھپوائی۔ اور ڈاک کے خرچ میں صرف ہوئے۔ دفتر کے خرچ کی کمی اسوجہ سے ہے کہ ابتک سب کام آنریری طور پر ہوتا ہے اور چونکہ اب کام بڑھتا جاتا ہے اسلیے کسی علیحدہ کلرک کے رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ سکریٹری نے حاضرین جلسہ سے خاص طور پر استدعا کی کہ آپ مہربانی سے تعلیم نسواں کی طرف توجہ فرمائیں اور اُس کی ترقی میں عملی کوشش فرمائیں اسکے بعد نمائش صنعت وحرفت نسواں کے متعلق ذکر کیا اور اسکو ایک نہایت اہم اور ضروری کام کانفرس کا بنایا۔ اور اس کی ضرورت کو دلائل اور واقعات سے ثابت کیا۔ امسال کی نمائش میں اشیا بہ نسبت سال گذشتہ کے کم آئیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ہم نے کوشش بہت دیر میں شروع کی۔ اول تو نمائش کا ارادہ ہوا۔ پھر لوکل کمیٹی ڈہاکہ کی سکوت کی وجہ سے یہ خیال کیا کہ ملتوی کردی جائے۔ لیکن ۲۶۔ نومبر کو صیغہ تعلیم نسواں کی کمیٹی نے آخرکار یہ فیصلہ کیا کہ نمائش ضرور ہونی چاہیے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ نمائش کے لیے کوشش کرنے کو ہمکو کسقدر ناکافی مہلت ملی تاہم بھی جو کچھ جمع ہوگیا بہت غنیمت ہے۔

ہم کالج کے طلبا۔ مسٹر عبد الرحمٰن۔ مسٹر حسن شاہد۔ غلام الحسنین صاحب۔ سید مہدی حسن۔ انصار احمد۔ مسٹر شمشاد احمد خاں۔ خواجہ احمد اللہ صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس میں کوشش کی۔ انکے علاوہ مس ڈابر وصاحبہ انسپکٹرس آف اسکولز لکھنو

مس کولمبس جیسیآ خان بہادر مرزا شجاعت علی بیگ صاحب سعید احمد بیگم صاحبہ اور عالی جناب سید محمد علی صاحب جج کی صاحبزادیاں خاص طور پر شکریہ کے قابل ہیں۔

مفصلہ ذیل اشیاء کے اوپر تمغہ جات اور سارٹیفکٹ ملنے تجویز ہوئے

نام	شہر	تمغہ یا سرٹیفکٹ	کس پر	چاندی یا برانز
تین اسکول	بھوپال	۳ تمغے	عام چیزوں پر	چاندی
خاتون اسٹور	دہلی	۱	"	"
گورنمنٹ نارمل اسکول	لکھنؤ	۱	کنڈرگارٹن	"
مشن اسکول	دہلی	۱	لیدر ابرُاڈری	"
مس ایم سبحانی	بمبئی	۱		"
مس زین العابدین	"	۱		"
امریکن گرل	کلکتہ	۱		"
مسز عبدالغنی	میرٹھ	۱	ٹوپی پر	"
نیس آف کونسل آف پرشیا	کلکتہ	۱		"
پردہ نشیں	کوئٹہ	۱	کارچوبی پر	"
پروپرائٹرس اڈورڈ ویڑنگ ورکس	ڈھاکہ	۱	قالین پر کام	"
ایچ خانم	کلکتہ	۱		برانز
مرتضیٰ بیگم	کلکتہ	۱	کُرتے کا کٹاؤ	"
مجید النساء بیگم	"	۱		"
عباسی بیگم	کرشنا	۱	جالی کا کام	چاندی
کلثوم و محمود بیگم	حیدرآباد دکن	۱		برانز

نام	شہر	تمغہ یا سرٹیفکیٹ	کس پہ	برانز
مس اے۔ ایم سبحانی	بمبئی	تمغہ		"
مسز ایوب	"	ا		"
مسز پی سنگھانی	"	ا		"

مسز عبدالرحیم	مرادآباد	سرٹیفکیٹ	تانبے پر نقشی کام
نواب شہر بانو بیگم صاحبہ	مرشدآباد	"	
محمڈن لیڈی	ڈہاکہ	"	
مسز فصیح الدین	بدایوں	"	
مسز عبدالقوی	لکھنؤ	"	جالی کا کام
این این داسی	کلکتہ	"	قالین
فاطمہ محمدی	مرزاپور	"	
زہرا محمدی	"	"	
احمدی محمدی	"	"	
ہمشیرہ عبدالسلام	ڈہاکہ	"	
ایک لڑکی	مرزاپور	"	
سلطانہ بیگم	دہلی	"	گڑیوں کا لباس
عائشہ بی بی	کلکتہ	"	
ایک مسلمان عورت	ڈہاکہ	"	
محمودہ بیگم	کلکتہ	"	
حانمہ بی بی	"	"	
خدیجہ بی بی	"	"	
فاطمۃ الکبرےٰ	"	"	خوشخطی

فاطمۃ الکبریٰ کا سرٹیفکٹ غیر معمولی سرٹیفکٹ ہے جو سب سے اعلیٰ درجہ کا ہوسکتا ہی اور اُن کو نواب صاحب ڈھاکہ کی طرف سے ایک سنہرا تمغہ ملیگا۔ مفصل رپورٹ الگ چھاپ کر خدمت میں پیش کیجائیگی۔

شاہ کابل۔ ۱۲۔ جنوری ۱۹۰۷ء کا دن محمڈن کالج علیگڈھ کی تاریخ میں وہ شاندار دن ہی کہ اگر ہر سال اس تاریخ کو کالج عید منائے تو زیبا ہی۔ ۱۲۔ تاریخ کو ہز مجسٹی کی کالج میں تشریف آوری تھی۔ دو تین دن پہلے ہی سے ہندوستان کے ہر ہر گوشہ کے مسلمان ایک اسلامی بادشاہ کے دیدار کے لیے کالج میں آتے تھے۔ اور معزز مسلمانوں اولڈ بوائز وغیرہ کا جسقدر ہجوم اس مرتبہ کالج میں ہوا تھا کبھی اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ ۱۲ تاریخ کو ساڑھے دس بجے وہ بادشاہی سواری آپہونچی جسکے دید کی خاطر دور دور سے لوگ آئے ہوئے تھے اور جسکے انتظار میں ہمہ تن چشم بنے ہوئے تھے۔ اس موقع پر کالج کی سجاوٹ دید کے قابل تھی اور اس میں ہر طرف مسلمانوں کا ہجوم ایک عجیب شان رکھتا تھا۔

ہز مجسٹی جو نہایت بارعب اور جاہ وجلال کی مجسم تصویر معلوم ہوتے تھے نہایت سادگی اور بے تکلفی سے ہر ایک سے ملے۔ آنکے شاہانہ اخلاق میں ایسی دلچسپی اور ہر دلعزیزی کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی جو دلوں کو اپنی طرف خواہ مخواہ کھینچ لیتی تھی۔ ہز مجسٹی کی اعلیٰ قابلیت غیر معمولی عقلمندی اور فطانت نے اُن کو کالج کی ظاہری حیثیتوں کی طرف بہت کم متوجہ ہونے دیا۔ اور انھوں نے یہاں کی تعلیمی حالت کا اندازہ لگانیکی طرف اپنی توجہ زیادہ تر مصروف فرمائی۔ کلاسوں کو اپنے سامنے بلوا کر پڑھوا کر دیکھا۔ اور سب سے بڑا کام جو انھوں نے کیا وہ یہ تھا کہ کالج کے دشمنوں نے اُنسے بڑی شکایتیں اس کالج کے متعلق کی تھیں کہ یہاں کی مذہبی حالت اور دینی تعلیم [illegible] نہیں ہی۔ مگر شاہ موصوف نے اُنکی باتوں پر اعتبار نہ کرکے خود اپنی آنکھوں سے اُسکا دیکھنا ضروری سمجھا تاکہ اسکے متعلق وہ صحیح رائے قائم کرسکیں۔ چنانچہ انھوں نے مختلف کلاسوں کے لڑکوں کو جمع کرکے کامل دو گھنٹہ تک مذہبی سوالات پوچھے۔ ہر ایک سوال کا جواب لڑکوں نے بآئین شائستہ دیا۔ ہز مجسٹی یہاں کے لڑکوں کی مذہبی حالت اور دینی تعلیم دیکھکر اسقدر خوش ہوئے جسکی کوئی انتہا نہیں۔ اور بار بار یہ فرماتے رہے کہ جن لوگوں نے مجھسے اس کالج کی شکایتیں کی تھیں۔ وہ سراسر جھوٹ سراسر دروغ سراسر بدگوئی ہیں۔ اسٹریچی ہال میں بھی

ہز مجسٹی نے نہایت زور کے ساتھ فرمایا کہ کالج کی شکایت کرنے والوں کا منہ بند کرنے والا پہلا شخص میں ہونگا۔ یہ ایک نہایت پکّے پابند اسلامی بادشاہ کے جملے ہیں جو اُسنے اس کالج کی نسبت فرمائے اور وہ بھی سرسری طور پر نہیں بلکہ اچھی طرح جانچ کر امتحان لیکر۔

اسکے بعد ہز مجسٹی نے دیگر عمارات کالج کا ملاحظہ فرمایا۔ اور تمام بورڈنگ دیکھے۔ ہز مجسٹی کی مربیانہ محبت کی ایک عجیب مثال پیش آئی کہ جسوقت آپ انگلش ہاؤس کا ملاحظہ فرمارہے تھے تو شیشے کے پیچھے سے ایک چھوٹی بچی جو خان بہادر مولوی زین العابدین صاحب کی نواسی اور ہمارے دوست سید ولی حسن صاحب کی پیاری بیٹی ہے۔ اُجھکتی ہوئی نظر آئی۔ اس بچی کی عمر بمشکل تین سال ہوگی۔ نہایت پیاری پیاری صورت ہے اور بڑی فصاحت اور طراری سے گفتگو کرتی ہے۔ ہز مجسٹی نے اپنے ایک سردار کو حکم دیا کہ اس بچی کو لاؤ۔ آپنے اُسکو اپنی گود میں بٹھایا اور باتیں کی۔ پھر ایک اشرفی اپنی جیب خاص سے نکالکر اُسکو مرحمت فرمائی۔

ایک ایسی ہی مثال آگرہ میں بھی پیش آئی تھی۔ ہز مجسٹی جہاں جب دوبارہ تاجگنج کے ملاحظہ کو تشریف لے گئے تو وہاں ایک سارجنٹ کے لڑکے کو کھیلتا دیکھکر اپنے پاس بلالیا۔ اور اپنی زبان مبارک سے اُس سے شفقت آمیز باتیں کیں۔ بچہ بھولے پن سے کچھ جواب دیتا رہا آخر میں تشریف لیجاتے وقت ایک ہار جس کی قیمت اٹھارہ سو روپیہ بیان کیجاتی ہے بچہ کے گلے میں ڈالدیا۔

اسی طرح کانپور میں بھی ایک ننھی سی بچی کی باتوں سے خوش ہوکر اعلیٰ حضرت نے ایک اشرفی اسکو عنایت فرمائی۔

شام کو اعلیٰ حضرت نے بکمال مہربانی ٹرسٹیان کالج کے ہمراہ کھانا تناول [illegible] اسکے بعد آپنے فرمایا کہ میں شکرگزار ہوں اور خوش ہوں کہ آج میں نے اپنے مسلمان بھائیونکے ساتھ کھانا کھایا۔ ہز مجسٹی کی محبت و شفقت۔ اخلاق و اسلامی پابندی نے سب کے دلوں میں اُن کی محبت کا تخم بو دیا۔ جو ملا اُس سے بکمال مہربانی گفتگو فرمائی نواب محسن الملک اور نواب فیاض علیخانصاحب کو کئی بار اپنی فرودگاہ پر بلواکر اُن سے باتیں کیں۔ اللہ تعالےٰ ہمارے دیسی والیان ریاست کو اسی نمونہ کے مطابق بننے کی

ہدایت فرمائے۔

اعلان چندہ نمبر ۱

جن بیگم صاحبہ نے علاوہ رقم ہزار روپیے کے پندرہ روپیہ ماہوار نارمل اسکول کو سال بھر تک دینے کا وعدہ کیا تھا اور جو اپنا نام نامی ظاہر فرمانا نہیں چاہتیں اُنھوں نے مبلغ للعہ تین ماہ کے بھیجدیے ہیں۔

نمبر ۲۔ ہمارے دوست رئیس اعظم جناب راجہ نوشاد علیخاں صاحب نے اپنی کمال فیاضی اور قومی ہمدردی سے مبلغ تین ہزار روپیہ نارمل اسکول کو اس غرض کے لیے دینے کا وعدہ فرمایا ہی کہ زنانہ نارمل اسکول میں ایک کمرہ تیار کیا جاے۔ گو ہم کو اُنھوں نے کوئی خاص ہدایت نہیں فرمائی کہ کسکے نام پر یہ کمرہ تعمیر ہو۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اُن کے خاندان کی کسی معزز خاتون اور بالخصوص اُن کی والدہ صاحبہ کے نام نامی سے اُسکو مزین کریں۔ ہمارے صوبہ کے رؤسا میں راجہ صاحب نے یہ پہلی نیک مثال قائم کی ہی اور اب امید ہی کہ دیگر اکابر قوم بھی ادہر توجہ فرمائینگے۔ ہم راجہ صاحب کے تہ دل سے مشکور ہیں۔

کچھ اپنی نسبت۔ خاتون نے جس اہم مقصد یعنی تعلیم نسواں کی اشاعت کا بیڑا اُٹھایا ہی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہی کہ اُس میں اسکو اس تھوڑی سی مدت میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ اسکے ناظرین کی تعداد اب اسقدر وسیع ہوگئی ہی کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ کے اسلامی خاندان جو تعلیم یافتہ ہیں اُن میں اسکی ضرور پہونچ ہی۔ اور ایسے بہت کم گھرانے ملک میں نکلیں گے جو اسکے خریدار نہوں۔ اسکی ہر [illegible] نے نہ صرف نئے تعلیم یافتوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہی بلکہ پرُانے خیال کے لوگ بھی اب اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اسکے مضامین کی خوبیوں نے جسمیں ملک کے بڑے بڑے اہل قلم بھی حصہ لیتے ہیں اُنکو اپنی طرف مائل کرلیا ہی۔ اسکے ساتھ ہی اسکی اشاعت صرف مسلمان ہی گھرانوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اہل ہنود کے بہت سے معزز گھرانے اسکو خریدتے ہیں۔

یہ تو خاتون کی ذاتی ترقی ہی جسکو ہم بذاتہ بڑی قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے بلکہ ہم اس بات پر

نگاہ ڈالتے ہیں کہ ابتک اسکے ذریعہ سے ملک میں کیا کام ہوا۔ الحمد للہ کہ اسکو دیکھکر ہی ہمارا دل مطمئن ہوجاتا ہے۔ وہ قوم جو آج سے تین برس پیشتر تعلیم نسواں کی مخالفت پر آمادہ تھی۔ اور اسکو اپنی قوم کے لیے زہر کا گھونٹ خیال کرتی تھی آج اسی خاتون کی بدولت وہ تعلیم نسواں کی حمایت پر آمادہ ہے، اور یہ سمجھ گئی کہ طبیب قوم نے جو یہ دوا مریض قوم کے لیے تجویز کی ہے بہت ضروری اور مفید ہے اور بلا اسکے مریض قوم ہلاک ہوجائے گی۔

اسکے ساتھ ہی اسنے زنانہ لٹریچر کی ایک شاندار بنیاد ڈالدی ہے جسپر کسی وقت ایک بلند اور عالی شان عمارت تیار ہوجائیگی۔ اور ملک اور قوم کی اس شاہراہ کی طرف اسنے راہنمائی کردی ہے۔

اسکے ساتھ ہم اُن حامیان قوم کے نہایت شکر گزار ہیں جنہوں نے خاتون کی اشاعت میں گذشتہ سال کوشش فرمائی۔ کیونکہ خاتون کی اشاعت کی کوشش صرف رسالہ کی اشاعت کی کوشش نہیں ہے۔ بلکہ درحصل وہ تعلیم نسواں کی اشاعت کی کوشش ہے۔

ہدایت۔ چونکہ خاتون کے خریداروں کی تعداد بفضلہ بہت زیادہ بڑہگئی اور دن بدن بڑہتی جاتی ہے۔ اسلیے ہر ایک خریدار کو خط وکتابت میں اپنا رجسٹر نمبر ضرور لکھنا چاہیے۔ جو چیٹ پر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ ۱۷۲ نمبر پرچہ کے رجسٹر کا ہے۔ بعض لوگ اسکو اپنا نمبر خریداری خیال کرلیتے ہیں۔ اگر بلانمبر کے خط وکتابت ہوگی تو عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

زنانہ نارمل اسکول۔ خدا کے فضل سے دن بدن اس اسکول میں لڑکیوں کی تعداد بڑہتی جاتی ہے۔ اسوقت تک ۲۵ لڑکیاں [illegible] ہوچکیں باہر سے بہت سے احباب لکھتے [illegible] کہ ہم اپنی لڑکیوں کو بھیجیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ابتک ہمارے پاس بورڈنگ نہیں ہے جس میں بیرونجات سے لڑکیاں آکر رہ سکیں۔ اس لیے تاوقتیکہ بورڈنگ نہ تیار ہو ہم باہر کی لڑکیوں کو اسکول میں داخل کرنے سے مجبور ہیں۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۷۱

خاتون

جلد ۲ | ماہ ذالحجہ ۱۳۲۴ھ مطابق فروری ۱۹۰۷ء

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

علی محمد خاں کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علیگڈہ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہی اور اسکی سالانہ قیمت (عہ) اور ششماہی ۱۲/ ہے

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہی یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑہی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہی اور جبتک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی اُمید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہورہے ہیں اُس کی طرف ہمیشہ مردوں کو متوجہ کرتے رہینگے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جاوے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑہنے کی اُن کو ضرورت محسوس ہوتا کہ وہ اپنی اولاد کو اُس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہی معیوب تصوُر کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالے کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی مدد آپ کرنا ہی اگر اسکی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائیگا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علیگڈہ ہونی چاہیے۔

مصیبت زدہ صُغرٰی

بچپن کا زمانہ ایک ایسی بیکسی کا زمانہ ہو۔ کہ اُس وقت انسان کو کسی چیز کی نہ تو طاقت ہی ہوتی ہو نہ وہ اپنے آرام و آسائش کا کوئی انتظام کرسکتا ہو۔ اس نازک اور بے بسی کے زمانہ کیلیے خداوند عالم نے فطرتاً ماں باپ کے دلوں میں محبت ڈالکر اس کا کافی سامان کردیا ہو۔ ماں اور باپ اس اجنبی نووارد بچّے کو اُسی فطرتی محبت کیوجہ سے اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اُس کی خوشی پر اپنی خوشی اور اُسکی تکلیف پر اپنی تکلیف منحصر سمجھتے ہیں۔ اُسکی بیماری خود اُن کو بیمار کردیتی ہو۔ اور اُسکی راحت اُنکو سُکھ دیتی ہو۔ اور یہ قانون فطرت نہ صرف نوع انسان پر بلکہ حیوانات پر بھی حادی ہو۔ وہ بھی لپنے بچّے کو اس سے کم [illegible]ی نگاہ سے نہیں دیکھتے جسقدر کہ انسان۔ اُس کو چاٹتے ہیں۔ چومتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں۔ اور بغل میں دبائے ہوئے منھ میں لیے ہوے۔ یا پیٹھ پر بٹھائے ہوئے جان کی طرح ساتھ ساتھ رکھتے ہیں۔

اب آپ اُن لوگوں کی نسبت کیا رائے رکھیں گے جو محض اپنے آرام و راحت کو

مد نظر رکھکر اپنے چھوٹے بچوں کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دیتے ہیں۔ کیا یہ فعل وحشیانہ نہیں ہے۔ کیا وہ لوگ جانوروں سے بھی زیادہ ناحق شناس اور بے مہر نہیں۔

اسی قبیل کا مندرجہ ذیل واقعہ ہے۔ جسکو مس۔ ایس۔ بی۔ ڈی صاحبہ لکھتی ہیں۔ بوجہ جہالت کے اکثر ہمارے ملک میں اس قسم کا وحشیانہ سلوک نامہربان باپ اپنی بیکس اولاد کے ساتھ کرتے ہیں۔

اڈیٹر

جس شہر کا میں واقعہ لکھکر اپنی بہنوں کے پیش نظر کرنا چاہتی ہوں وہ اس زمانہ میں تو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے مگر تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی زمانہ میں گجرات کے مسلمان بادشاہوں کا پایۂ تخت رہ چکا ہے۔ اسوقت اگر ان بادشاہوں کی یاد دلانے والی اور اُنکے اسلامی جوش کا نشان دینے والی کوئی شے ہے تو وہ پُرانی پرانی مسجدیں اور درگاہیں جو اُنھوں نے بہت سا روپیہ لگاکر بڑے شوق سے بنائی تھیں مگر وہ بھی اب زمین میں دھس گئی ہیں اور صرف کھنڈرات معلوم ہوتی ہیں۔ ہماری کہانی جولائی مہینے میں شروع ہوتی ہے۔ یعنی آغاز موسم برسات میں۔ درختوں نے اپنی پُرانی پھیکی سڑی ہوئی چادریں اُتار کر سبز رنگین دوشالے اوڑھ لیے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پودوں کو بھی کچھ ایسا زور آگیا ہے کہ ایک ایک دن میں ایک ایک بالشت بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ زمین میں جدہر نظر ڈالو سبزی ہی سبزی نظر آتی ہے۔ بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی ہم لوگوں کو دیکھکر رشک ہوا ہے اور ہماری طرح سے اسنے بھی سبز رنگین ڈوپٹے اوڑھنا شروع کر دیا ہے۔ اور اُسپر بارش کی ہلکی ہلکی پھوار نے پانی کے قطرے کچھ اس انداز سے ڈالدیے ہیں کہ گویا زمین کی رنگین مزاجی کو دیکھکر کسی نے ابدار موتی بکھیر دیے ہیں۔ پرندوں نے بھی جوش میں آکر اپنی خوش الحانی سے راگ راگنیاں چھیڑ دی ہیں۔ غرض ہر چیز خوش ہے۔ میں برسات کا سین کھینچنا نہیں چاہتی

اور نہ میں اس خوبی سے اس موسم کے لطف کو بیان کر سکتی ہوں جیسا کہ بہت سے افسانہ نگاروں نے اپنی طبع آزمائی کی ہے۔

اسوقت کوئی رات کے بارہ بجے ہیں تمام شہر سُنسان ہے اور گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر پر سناٹا حکمرانی کر رہا ہے۔ اس ہو کے طلسم کو توڑنے والی اگر کوئی شے ہے تو وہ گاہے گاہے چوکیداروں کے چلانے کی آواز ہے کبھی کبھی گیدڑ بھی عجیب وحشتناک آواز سے سب ملکر چلانے لگتے ہیں۔ چاند گو چودھویں رات کا ہے مگر ان کالے کالے بادلوں نے اس بیچارہ کا ایسا پیچھا لیا ہے کہ وہ اپنا گورا چمکتا ہوا چہرہ تھوڑی دیر تک ہمیں اچھی طرح سے کہا بھی نہیں سکتا مگر پھر بھی وہ ہمارا سچا خدمتگار ان موٹے مہیب دیووں کی نظر بچا کر ہمیں روشنی پہونچانے نکل ہی آتا ہے۔ بجلی کو بھی اس روز کچھ ایسی شرارت سوجھی ہے کہ دم بھر کے لیے بجلی نہیں بیٹھتی کبھی ادھر چمکی کبھی اُدھر لپکی گاہے کسی چیز پر گر کر اُسے فنا کر دیا گاہے بیچارے نیند بھرے جانوروں کو چونکا دیا۔ غرض یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسکے سر پر بھی شیطان سوار ہے۔

گاؤں سے ایک وسیع سڑک جو اسوقت مینھ کے برسنے سے بالکل صاف ہے۔ بڑی دور تک جاتی ہے۔ یہ سڑک شاید کسی شہر کو جاتی ہے۔ دن بھر تو یہاں مسافروں کی آمد ورفت رہی تھی مگر اسوقت اور خصوصاً ایسے موسم میں تو یہ بھی بڑی وحشتناک معلوم ہوتی ہے۔ یوں تو لوگ اس کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔ کہتے ہیں بڑی دلچسپی رہتی ہے دونوں طرف بڑے بڑے شاندار درخت ہیں۔ اطراف میں ہرے ہرے کھیت اور میوہ جات کے باغ ہیں۔ غرض ہزاروں دلچسپیاں بتلاتے ہیں مگر اوفو اسوقت اگر وہی لوگ ایکبارگی اسے دیکھ لیں تو کانپ اُٹھیں۔ پُرانے پُرانے بڑے بڑے درخت تو گویا کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ جو کچھ بھی روشنی ماہ تاباں سے بچ بچا کر آجاتی تھی وہ بھی ان درختوں کی وجہ سے نہیں آتی۔ کہیں سانپوں کی پھنکار کی آواز آرہی ہے تو کہیں بجلی کی دمک دل ہلا دیتی ہے

ہَوا سے درختوں کے پتے ہلنے لگتے ہیں۔ اور اُن کی آواز سے خوف پیدا ہوتا ہی۔ تھوڑی دور آگے چلکر اس سڑک کی ایک شاخ دو کھیتوں کو جُدا کرتی ہوئی تھوڑی دور تک جاتی ہی۔ مگر یہ بھی وحشت انگیزی میں کچھ کم نہیں۔

اس سڑک پر کھڑے رہکر جب ہم غور سے دیکھتے ہیں تو دُور کچھ دُھندلی سی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کچھ درختوں کے جُھنڈ ہیں یا پُرانے کھنڈرات۔ چلیے ہم بھی اپنی بہنوں کو یہاں کی سیر کرالائیں   آہا قریب جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو ایک قبرستان ہی۔

اس وقت یہ سین کچھ عجیب خوفناک ہی۔ رات کے بارہ بجے کے بعد اور پھر ایسا موسم۔ سر پر کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ روشنی کا کہیں نام نہیں۔ اور پھر وہ موٹے کالے دیوقد ریں لڑ لڑ کر وحشتناک آواز پیدا کرتے ہیں۔ بہنیں خود خیال کرسکتی ہیں کہ ایسے مقام پر جانا آنا تو درکنار صرف خیال کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ کہیں گڑھا ہی تو کہیں ٹیلا ہی۔ کہیں کوئی قبر زمین میں دھس گئی ہی تو کسی میں پانی بھر کر جم گیا ہے   آفرین ہی اے اہل قبور آفریں۔ تم ہی ہو جو پاؤں پھیلا کر یہاں آرام سے سو رہے ہو۔ **شعر**

ہوائیں غفلت کی چل رہی ہیں اُمنڈ رہی ہیں بلا کی نیندیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونیوالے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

آہ اے زمین تو بھی کیسی سنگدل ہی کیسے کیسے جوانوں کو تو نے اس دنیا سے الگ کیا کیسے کیسے بہادر سپاہیوں کو جو اپنے ملک و دین کے امن کے ذریعے تھے خاک میں سُلا دیے۔ کبھی تو کسی بوڑھے باپ کے اکلوتے جوان بیٹے کو، جو اُس کی زندگی کا سہارا تھا، جو اُس کے بڑھاپے کی لاٹھی تھی نگل گئی۔ کبھی کسی نازوں میں پلی ہوئی نازنین کو جس نے کبھی فرش مخمل کے سوا تیری پیٹھ پر پیر نہ رکھا ہوگا تو نے جبراً اپنی ہچولیوں میں

شامل کر دیا۔ گاہے کسی ماں کی چھوٹی سی بیٹی سے جس پر اُس نے کیسی کیسی اُمیدوں اور آرزوؤں کے سہارے باندھے تھے۔ اُس کی گود خالی کر کے اپنی گود بھر لی۔ گاہے ننھے ننھے بچوں کے بلبلانے اور آہ وزاری کرنے پر بھی رحم نہ آیا اور اُن سے اپنی ماں کو چھٹا دیا۔ آہ تیرا پیٹ بھی ہمیشہ بھوکا رہا۔ ادھر تو تو ہمارے لیے کیسے کیسے پھول اور پھل اُگل رہی ہے اور اُدھر تو ہی ہمارے اچھے اچھے غنچوں کو جو بیچارے ابتک کھلنے بھی نہ پائے تھے نگل رہی ہے۔ لوگ تو آسمان کو سنگدل کہتے ہیں۔ مگر درحقیقت تو ہی۔ مگر سُننا یہ آواز کیسی یہ تو کسی کے رونے کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت قبرستان میں مُردوں کے سوا زندہ بھی ہوگا۔ آہ یہ دل دہلانے والی آواز تو کسی ننھے سے بچے کی سی سُنائی دیتی ہے۔ یہ شاید اسی سامنے والے جُھنڈ میں سے آرہی ہے۔ چلو ہم بھی اپنے بیچین دل کو تسلی دینے کو دیکھ آئیں کہ اس وقت یہ کون بچہ آفت کا مارا اس وحشتناک مقام پر آیا ہے۔

آہ! یہ تو ایک نو دس سالہ لڑکی ہے۔ اسکے لمبے لمبے بال شانوں پر عجیب لاپروائی سے بکھرے ہوئے ہیں۔ دونوں گھٹنے ٹیکے ہوئے ایک تازہ قبر پر کھڑی رو رہی ہے۔ آنکھوں سے دو چشمے بہ رہے ہیں جو اُس مرنیوالے کی قبر پر چھڑکاؤ کا کام کر رہے ہیں۔ اس کا ننھا سا متفکر دل بلّیوں اُچھل رہا ہے۔ کبھی کبھی بجلی کی چمک سے اُسکی روشنی درختوں میں سے چھن چھن کر اس معصومہ کے چہرہ پر پڑ رہی ہے تو اس کی پیاری صورت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ صورت بالکل خوف زدہ ہے۔ ہاتھ پیر کانپ رہے ہیں۔ آہ اس بھولی بھولی صورت سے عجیب حسرت برستی ہے۔

مگر اس سے دو ایک قدم پرے کو یہ کیا چیز رکھی ہے۔ جب ہم اور آگے پہونچے ہیں اور خوب غور کے ساتھ نظر سے کام لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ڈیڑھ دو سالہ بچہ زمین پر پڑا سو رہا ہے۔ آہ کیسی بے خبر نیند میں پڑا ہے اسے کیا معلوم کہ

وہ اسوقت کہاں ہے اور کس کی گود میں سو رہا ہے۔ اُسے کیا خبر کہ اسکی دودھ پلانے والی اسے پرورش کرنے والی۔ اسے سنبھالنے والی اور اسے اپنا لخت جگر سمجھنے والی ماں اسوقت کہاں ہے۔ اور کیا کر رہی ہے۔ آہ لے طفل معصوم۔ تیری زندگی بھی عجیب ہے۔ تجھے کیا پرواکہ کوئی مرے یا جیے۔ تجھے کیا صدمہ کہ کسی کے نازک دل پر اسوقت کیا گذرتی ہے۔ جیسا کل تو اپنی محبت بھری ماں اور اپنی پیاری بہن کے ساتھ تھا۔ وہ ماں جسنے تجھے اپنی گود سے کبھی جدا نہ کیا تھا۔ وہ ماں جو تجھپر دن بھر میں ہزار بار قربان ہوجایا کرتی تھی۔ وہ ماں جسکا دل تیری چیخ سے دہل جاتا تھا، وہ ماں جسنے تجھے بڑی مشکلوں سے امّ ماں (اماں) کہنا سکھلایا تھا وہ ماں جسے تو اپنے باپ اور اُسکے نالایق شوہر کو دن رات یاد دلایا کرتا تھا، ویسا ہی اب بھی تو اُسی ماں اور بہن کے پاس پڑا سو رہا ہے۔ آہ مگر تجھے کیا معلوم کہ اس رفتار زمانہ نے اُس سین کو کیسا پلٹا دیا۔ تجھے یہ کیا معلوم کہ کل کیا ہو رہا تھا اور اسوقت کیا ہو رہا ہے۔ مگر سُن کل تو تو اپنی حقیقی ماں کے گود میں سو رہا تھا اور آج اپنی مادر زمین کی گود میں سوتا ہے۔ کل تو تجھے اپنی ماں خود لوریاں گا کر سُلا رہی تھی اور آج تیرے لیے زمین پر درندے اور آسمان پر کالے بادل لوریاں گا رہے ہیں۔ کل تو اپنی ماں کے ہاتھ کے جلائے ہوئے چراغ کو دیکھکر خوش ہوتا تھا اور آج تیرے سر پر بجلی چمک رہی ہے کل تیری بہن ہنس ہنس کے تیرے ساتھ کھیلتی تھی، اور آج وہی بہن آٹھ آٹھ آنسو رو رہی ہے۔ کل تیری ماں اور بہن خوش ہو ہو کر تیرے بوسے لیتے تھے اور آج برسات کی سرد ہوا تیرے مُنہ پر تھپیڑا مار رہی ہے۔ کل تو اگر نیند میں ذرا مسکراتا تھا تو تیری پیاری ماں خوش ہو کر یہ کہتی تھی کہ فرشتے اسکے ساتھ کھیلتے ہیں اور اگر تو نیند میں ذرا بیچین ہو جاتا تھا تو وہ مامتا کی ماری تجھے تھپکیاں دے دیکر سُلاتی تھی اور آج اگر تجھے سانپ کاٹ جائے شیر پھاڑ جائے یا بھیڑیا اُٹھا لیجائے تو وہ اپنے خواب غفلت سے کروٹ تک نہیں بدلیگی۔ تُو تو بے خبر سوتا ہی مگر چلو ہم بھی سُنیں کہ یہ لڑکی کیا کہتی ہے۔ آہ کس درد بھرے لہجہ میں یہ اس

مرنے والی کو جو اس کی ماں ہی کہہ رہی ہے۔

اچھی اماں اُٹھو ایکبار گی ہمیں دیکھہ تو لو۔ کیا اب تم گھر نہیں چلو گی ہم سے ایسی خفا ہو گئیں کہ اب ہماری صورت بھی نہیں دیکھتیں۔ اپنے پیارے آبو کو دیکھ تو لو، دیکھو وہ کہاں سو رہا ہے۔ پیاری اماں مجھے یہاں ڈر معلوم ہوتا ہے۔ میں یہاں کھڑے کھڑے تھک گئی چلو بی اماں اب گھر چلو، تمہارے بغیر اب ہم کس کے پاس رہیں۔ اب ہمیں کون سنبھالیگا۔ ننھے آبو کو اب کون دودھ پلائیگا۔ اچھی کل ہی تو تم نے کہا تھا کہ صغریٰ گھبراؤ نہیں میں ابھی اچھی ہو جاؤں گی۔ کیا اچھے یوں ہی ہوا کرتے ہیں۔ اتنے میں بادل زور سے گرجنے لگتے ہیں تو یہ سہم کر اپنی ماں کی قبر سے لپٹ جاتی ہے اور کہتی ہی کہ اچھی اچھی اماں دیکھو یہ کیا شور رہے۔ آہ مجھے کوئی پکڑنے آیا، اماں مجھے اپنے ساتھ لیلو اماں، اماں دیکھو، اتنے میں بجلی بہت زور سے چمکی اور بیاری صغرا ڈر کے مارے اپنی ماں کی قبر سے چمٹ گئی۔ اور بیہوش ہو گئی۔ آہ ننھی صغرا جسنے کبھی گھر سے باہر قدم نہ رکھا تھا جو قبر کے نام سے ڈر جاتی تھی۔ جسنے ایسی اندھیری رات کو درختوں کو شاید دیکھا بھی نہو گا۔ وہ ہی صغرا آج بے بس اور بیکس ننگے پاؤں ننگے سر قبرستان میں پڑی ہی۔ آہ جو ہمیشہ اپنی ماں کے ساتھ سوتی تھی آج وہ اپنی ماں کی قبر سے چمٹی ہی۔ جو کتوں کی آواز سے گھبراتی تھی آج اُسے درندوں کا بھی خوف نہیں۔ آہ جسکے دل میں گھٹاؤں کی شکل سے ڈر پیدا ہوتا تھا آج بادل اسکے سر پر گرج رہے ہیں۔ اتنے میں سنگدل آسمان کو بھی کیا سوجھی کہ وہ بھی اپنا دامن نچوڑنے لگا۔ الٰہی کس زور کا مینھ ہے کہ رُکنے کا نام نہیں لیتا۔ بادل کی گرج بجلی کی چمک، لگا تار مینہ اور ننھا آبو اور اُس کی پیاری بہن قبرستان میں بیہوش وحواس پڑے ہوئے ہیں۔ ادہر تو یہ بیچارے دونوں بھیگ رہے تھے کہ دور کچھ روشنی نظر آئی معلوم ہوتا ہے کہ چند آدمی ہاتھ میں مشعلیں لیے ہوئے آگے کو بڑہے چلے آرہے ہیں یہ شاید صغریٰ کے والد ہو نگے جو تخمیناً ایک سال سے ان بیچارے تینوں آفت زدہ

ماں بچوں کو چھوڑ کر الگ رہتے ہیں اور کسی عورت سے نکاح بھی کر لیا۔ نہیں مگر قریب آنے سے معلوم ہوتا ہی کہ یہ کچھ لوگ ایک جنازہ لیے ہوئے آرہے ہیں۔ آہ یہ مرنے والا بھی شاید اسی مرض طاعون سے مرگیا ہے جس سے ہماری پیاری صغریٰ کی ماں کا انتقال ہوا۔ یہ لوگ قریب آتے آتے جہاں بیچاری صغریٰ بے حس و حرکت پڑی تھی وہیں آ گئے جوں ہی ایک شخص کی (جو آگے کو بڑھا ہوا تھا) نظر ننھے ابو پر پڑی وہ اُس وقت تو پیچھے ہٹا۔ مگر پھر دو تین آدمیوں نے ملکر بیہوش صغریٰ اور ننھے ابو کو اُٹھا لیا اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ تو مرزا عبدالغفار کے بچے ہیں اور یہ اُس بیچاری نیک بیوی کی قبر ہی۔ آہ ایسے وقت یہ دونوں بیچارے مصیبت زدہ یہاں کیسے چلے آئے۔ اے نالائق باپ تو اس وقت آرام سے سوتا ہوگا۔ تجھے یہ بھی پروا نہیں کہ اس وقت میرے بچے اور بیوی کا کیا حال ہی۔ آہ تیسرے شخص نے صغریٰ کے منھ پر کچھ پانی چھڑکا جب اُسے کچھ ہوش آیا تو دونوں بچوں کو وہ لوگ گود میں اُٹھا کر لے گئے۔ دوسرے روز گاؤں کے اور چند آدمی ملکر ان دونوں بچوں کو مرزا عبدالغفار کے پاس جو قریب کے ایک شہر میں رہتا تھا لے گئے اور اُس کے پاس اُن کو چھوڑ آئے۔ مگر بیچاری صغریٰ کے لیے اپنے باپ کے گھر سے اُس مینھ میں، درندوں کے خوف، بجلی کی چمک، بادل کی گرج، سانپوں کی پھنکار اور اُس خوفناک قبرستان میں اپنی ماں کی قبر سے چمٹے ہوئے مرجانا بہتر تھا۔

راقـــــــمہ

مس۔ ایس۔ بی۔ ڈی۔

رسومات مروجہ
میں
اصلاح

بنت نذر الباقر صاحب نے اس مفید خیال کو پھر تازہ کیا ہے جسکے متعلق خاتون میں پہلے ہی تحریک ہوئی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری مروجہ رسمیں اصلاح کے قابل ہیں۔ اسلیے سبسے پہلے یہ ضروری ہو کہ بذریعہ خاتون کے وہ رسمیں مشرح طور پر ظاہر کیجائیں اور اسی طرح پر مختلف لوگ اپنے خیال کے مطابق اُس میں اصلاح کی تدبیر سوچیں پھر حسب منشار کوئی نہ کوئی اصلاح اُس میں ضرور ہو جائے گی۔ اور جب تک کہ وہ رسومات ہی خود پبلک میں اچھی طرح نہ پیش ہونگی اُسوقت تک اصلاح کی طرف زیادہ خیال لوگوں کا رجوع نہوگا۔

ہماری بھی یہ خواہش ہو کہ بیگمات سے جن رسوم کا تعلق ہو وہ ضرور معرض بحث میں لاکر اُس میں اصلاح کی کوشش کریں۔

اڈیٹر

اس زمانہ میں جبکہ مسلمانان ہندوستان کی آنکھیں کھُلی ہیں اور اپنی طرز معاشرت کے ہر ایک پہلو میں اصلاح کی ضرورت محسوس ہورہی ہو نہ صرف فرقہ زور آور یعنی مرد ہی اس فکر میں ہیں۔ بلکہ بے زبان بے علم بے سمجھ مستورات میں بھی قوی احساس پیدا ہو چلا ہے اور اسی احساس کا یہ نتیجہ ہو کہ وہی عورات جو فضول وغیر شرعی رسومات کی دل سے فدائی تھیں اب اُس کی مخالف نظر آتی ہیں۔ اگر یہی لیل و نہار رہے اور اسی قسم کی ہوا کچھ روز تک چلی اور اُنکے قسمت کے مالکوں نے علم میں اُنھیں حصہ دینے میں بخل نہ کیا تو یہی عورات ثابت کر دینگی کہ ہم وہی عورات ہیں جو کبھی تھیں اور جن پر اسلام کو ناز تھا

گو ہماری بدقسمتی نے کچھ دنوں کو مردوں کی عقلوں پر جہالت کا پردہ ڈالدیا جس کی وجہ سے ہم دولت علم سے محروم کر دیے گئے اور پھر کون کون بدعتیں نہ تھیں جنکے ہم حامی نہو۔

یا خدا حامی تعلیم نسواں اصحاب کے دماغوں کو ایسے خیال سے بھرا رکھ اور اُنکی ہمتوں و کوششوں میں برکت دے جو وہ ہمیں قعر ضلالت سے نکالکر علم کے پانی سے ہماری جہالت کی سیاہی کے لتھڑے کپڑے دہوکر دکھادیں کہ (یہ وہی مستورات ہیں جن پر ہمیں فخر و بجا فخر ہے اور یوں تو بیخبری میں سخت سے سخت چیز خراب ہوجاتی ہی۔ لوہے کے برتن کو اگر کئی سال ایک جگہ پڑا رہنے دیں تو زنگ آلود ہوکر کسی کام کا نہ رہیگا۔ ہماری غفلتوں نے ہمارے بائیں ہاتھ کو بیکار کر دیا اگر اپنی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ان کی بھی تربیت ہوتی رہتی تو بائیں نہیں بلکہ دائیں ہاتھ کے برابر ہمارا کام کرکے دکھا دیتیں) یا خدا ہمارے تعلیم کے حامیوں میں اضافہ کر۔

عرصہ سے میں معزز اخبار وکیل میں اسی سبجیکٹ پر بہن اہلیہ کرم آلہی صاحبہ گجرات پنجاب کی طرف سے تحریر دیکھتی ہوں۔ سخت حیران ہوں کہ ہوتے عصر جدید وا پنے خاص رسالہ خاتون کے بیگم صاحبہ وکیل میں کیوں لکھتی ہیں؟

وکیل کو ابھی بہت سے ضروری اُلجھیڑے سلجھانے ہیں علاوہ اسکے جوبات جسکے متعلق ہو جو کام جنکے ہاتھ میں ہو وہی خوب کر سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مضمون نگار اپنے مقصد میں کامیاب نظر نہیں آتیں یعنی کسی طرف سے تائیدی یا تردیدی آواز نہیں آتی جس کی وجہ شاید یہ ہو اور ضرور ہوگی کہ وکیل عام زنانخانوں میں خاتون کی طرح نہیں جاتا بوجہ ایک علمی پرچہ ہونے کے مبتدی لڑکیاں (اور اُنھوں نے ہی آجکل چول چال مچائی ہوئی ہی) ذرا اس میں بحث کرتے ہچکچاتی ہونگی ورنہ اگر یہ آرٹیکل خاتون میں ہوتا تو ابتک دیکھا ہوتا کہ کتنی بحث ہوتی۔ دوسرے مضمون نگار موصوفہ نے سلسلہ مضامین کا طریقہ بھی کچھ بیقاعدہ سا رکھا ہے کبھی چھٹے مہینے ۱۰ سطریں لکھ بھیجتی ہیں۔

میری رائے یہ ہے کہ اہلیہ کرم الٰہی صاحبہ اب اس سبجیکٹ کو وکیل سے اُٹھا کر خاتون میں لا ڈالیں۔ مجھے بھی ایک عرصہ سے اصلاح رسوم کا خیال کھٹک رہا ہے مگر اس خیال سے چپ تھی کہ لباس والے بحث سے کیا نتیجہ نکلا۔ اب سوچکر کہ خیر کچھ دنوں کو مضمون نگاران خاتون کو ایک نیا مضمون ملجائیگا اپنا خیال ظاہر کرنے بیٹھی افسوس کہ ہم میں اتنی جرات وہمت نہیں کہ جب چاہیں کسی مسئلہ کو زیر بحث کرکے نتیجہ نکال لیں پر اس خیال سے کہ شاید کوئی روشن خیال لیڈی فائدہ اُٹھائیں اپنا ناچیز خیال ظاہر کرتی ہوں۔

افسوس کہ میں بوجہ وطن سے دور اور پھر بچپن سے سرحد میں قیام رہنے کی وجہ سے ہندوستانی و پنجابی رسوم سے محض ناواقف ہوں اور اہلیہ کرم الٰہی صاحبہ غالباً ہندوستانی رسومات سے ناواقف ہوں گی اسوجہ سے اپنی لائق لیڈی ناظرین خاتون سے التجا کرتی ہوں کہ آپ سب میں سے کوئی لکھنؤ یا دہلی کی ایک فہرست رسوم تیار کریں جس میں بچے کی پیدائش کے وقت کی رسوم سے لیکر مُردے کے ساتھ کی روٹی وغیرہ وغیرہ جو جو خلاف شرع و خلاف ممالک اسلام رسومات ہیں نمبر وار درج کریں اور اگلی خاتون میں شائع کرادیں بعد کافی بحث ہونے کے اُس میں اصلاح کیجائے۔

مگر اصلاح کرنے والی بہنیں مبتدی طالب علم لڑکیاں یا حامی رسوم بہنیں نہوں زنانہ اصلاح کمیٹی مقرر کرنی چاہیے جس کی ممبر زہرا خانم صاحبہ، فیضی بمبئی و سہروردیہ صاحبہ کلکتہ و بنت نصیر الدین حیدر صاحبہ حیدرآباد و آبرو بیگم صاحبہ جیسی روشن خیال اعلیٰ تعلیم یافتہ لیڈیز ہونی چاہییں خواہ عام بہنیں مانیں یا نہ مانیں مگر ہمارا چھوٹا سا تعلیم یافتہ گروہ ضرور اُن کی پاس شدہ رسوم کے رائج کرنے اور خارج شدہ کو ہٹانے میں کوشش کریگا۔

افسوس کہ ہماری کانفرنس نہیں ہماری کوئی انجمن نہیں جہاں جمع ہوکر ایسے ایسے

امور میں اصلاح کیا کریں مگر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہی کہ اس حالت میں بھی اُسنے خاتون جیسی کانفرنس بلکہ کانگریس دی ہی جس میں ہم نہیں تو ہمارے قلم ہمارے دلی خیالات کو لاکر ظاہر کرسکتے ہیں - خاتون صرف اسلیے نہیں کہ چندوں کی فہرست شایع ہوجایا کرے یا لائق جنٹلمین مضمون نگاری کریں - یا ہم میں سے کوئی تعلیم یافتہ لیڈی مضمون نگاری کرکے لیاقت کی داد پائیں یہ سب کچھ تو دوسرے جرائد سے بھی ہوسکتا ہے - خاتون ہی وہ کام کرنے کو جو زنانہ کانفرنس کرسکتی ہی بس - رائیگاں جائیگی اڈیٹر خاتون کی محنت اور ضایع جائینگے خاتون کے قیمتی کاغذ اگر ہم نے اس سے کچھ بھی فائدہ نہ اُٹھایا - کیا اچھا ہوگا اگر لب س میں نہیں تو رسومات ہی میں اس خاتون کے ذریعے اصلاح ہوجائے - کام آئے ہمارے بیدار مغز اڈیٹر کی محنت اگر کانفرنس سے لینے والے کام ہمنے خاتون سے نکال لیے -

افسوس کہ آجکل میری آنکھیں اور بھی خراب حالت میں ہیں اور ڈاکٹروں کا حکم ہی کہ میں زیادہ دیر نظر جماکر بھی نہ دیکھوں مگر میرا دلی شوق مجبور کرتا ہے کہ اس حالت میں بھی اپنے ناقص خیال ظاہر کرکے اصلاح لیتی رہوں - میں کمال منت سے اُنھیں لائق بہنوں سے التجا کرتی ہوں کہ میری کمزور آواز کو یونہیں نہ جانے دیں اور اگلے ہی نمبر میں فہرست رسوم شایع کرنے کو بھیجدیں کامیابی ہو یا نہو کوشش ہمارا کام ہی -

مجھے سب سے زیادہ اپنی لائق بہن مسز عبداللہ صاحبہ علیگڈہ و مسز نیاز احمد صاحبہ بنارس والے ڈبلیو جی بیگم صاحبہ دہلوی پر یقین ہی ان میں سے کوئی بہن ضرور میری آرزو کو پورا کرینگی اگر اس سے اگلے نمبر میں فہرست رسوم نہ ملی تو تھوڑی بہت جیسی بھی ہوسکے گی میں ضرور لکھنے کی کوشش کرونگی اول تو یقین ہی کہ میری لائق بہنیں جنکے نام لیکر عرض کی ہی میری بیمار آنکھوں پر زور نہ پڑنے دینگی - فقط

خاکسار بنت ایس - ایم نذر الباقر -

ہندو لیڈیز سوشیل کلب کا تیرہواں جلسہ

یہ جلسہ ۱۶ جنوری روز چہار شنبہ کو مسس ہرشچندر ٹپیالہ کے یہاں منعقد ہوا کہ جسکا مختصر بیان خاتون کے ناظرین کے سامنے پیش کرتی ہوں۔ اس امید سے کہ شاید مفید ہو۔

اس کلب کو ۱۳ برس ہو چکے اور اس کلب کی اصل بانی مسز راما بائی رانا ڈے ہیں جنکے شوہر نامی گرامی مرحوم جسٹس رانا ڈے تھے کہ جو تعلیم نسواں اور حقوق نسواں کے بڑے حامی اور معاون تھے۔ اس کلب کا منشا یہ ہے کہ ہندو لڑکیاں جو بغیر تربیت کے آوارہ ہوتی ہیں اور جاہل رہتی ہیں ان لوگوں کو سکھانے پڑھانے علم کی تربیت دینے کے لیے اور ہنر کی مہارت پیدا کرنے کے واسطے اور دستکاری سے بہرہ مند ہونے کے لیے اور بی بیوں کو آپس میں ہفتہ میں ایک بار میل ملاپ اور محبت بڑہانے کی ترغیب اور کوشش ہوتی رہے۔ اور اب جو ہمنے دیکھا سو اسی کا نتیجہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کوشش اور الوالعزمی سے کیا کچھ نہیں ہو سکتا ہے۔ میں اکثر اُن کی سالانہ مجلسوں میں جایا کرتی تھی اور بڑی دلچسپی کی نگاہ سے انکی سعی اور کوشش کو دیکھتی تھی۔

نواب بیگم صاحبہ جزیرہ کو اس کلب کی طرف سے پارسال درخواست دی گئی تھی کہ ہمارے سالانہ جلسہ کی صدارت قبول فرمائیں۔ مگر کسی خاص ضروری کام کی وجہ سے وہ مجبور رہیں۔ مگر اُن بیبیوں نے اس عزم کو نہ چھوڑا اور کہا کہ اس برس تو وہ قبول ہی کرینگی اسیلیے ۲-۳ مہینے پیشتر جبکہ بیگم صاحبہ بمبئی تشریف رکھتی تہیں اُسوقت اُن اچھی بی بیوں نے اُنسے وعدہ لے لیا تہا اور اسوجہ سے بیگم صاحبہ خاص اسی جلسہ کی خاطر جزیرے سے بمبئی تشریف لاکر شریک جلسہ ہوئیں۔ ہمارے بمبئی کی بیگمات اسقدر آزاد خیال اور مہذب ہیں کہ جب کوئی بڑا جلسہ ہوتا ہے مسلمان ہندو پارسی اور یورپین بہنیں بلاتعصب شامل ہوا کرتی ہیں اور بخوبی اپنی اپنی رائے ہر کام میں یکجہتی سے دیا کرتی ہیں۔

ہم جب ہال ٹھیاب ۵ بجے پہنچے تو گول کمرہ مختلف قوموں کی بیگمات سے بھرا ہوا دیکھا کلب کی پریزیڈنٹ مسز کوٹھارے اور ایک دو سکریٹریاں بیگم صاحبہ کے استقبال کے لیے آئیں اور اُنکے ہمراہ موقع پر پہنچیں۔ ان کو ایک کوچ پر بٹھایا اور ہم سب قرینہ سے بیٹھ گئے۔ اتنے میں چند ہندو لڑکیوں نے ہارمونیم بجاکر خیر مقدم کا راگ گایا۔ بعد میں بیگم صاحبہ کے لیے درخواست اور تائید کر کے صدارت کی کرسی پر بٹھایا اور مجلس کی کارروائی شروع ہوئی رپورٹ پڑھی گئی وغیرہ وغیرہ۔ سب ختم ہونیکے بعد بیگم صاحبہ کھڑی ہوئیں اور نہایت عمدہ اور صاف آواز سے انگریزی زبان میں تقریر کی۔

مسز کوٹھاری اور لیڈیز! مجکو اس بات سے نہایت درجہ خوشی حاصل ہوئی ہے کہ آپ لوگوں نے مجکو اس سالانہ جلسہ میں صدر انجمن ہونے کا اعزاز بخشا۔ اور نیز میں اُس رپورٹ کو سنکر بہت خوش ہوئی جسکو آپ کے سکرٹریوں نے ابھی پڑھا۔ کمیٹی کا کام اس سال نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ لوگوں نے مجکو اس تقریب پر حاضر ہونیکا موقع دیا۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ یہ پہلا ہی موقع نہیں ہے جس میں ایک مسلمان لیڈی کو آپکے جلسہ کی صدارت کی عزت حاصل ہوئی ہے۔ کیونکہ چند سال پہلے میری مکرمہ چچی صاحبہ مسز بدرالدین طیب جی کو بھی یہ اعزاز حاصل ہوا تھا۔ لیکن میں یہ بھی کہتی ہوں کہ جب مجھسے صدارت کی درخواست کی گئی تو مجکو نہایت درجہ پاس اس بنا پر محسوس ہوئی کہ میرے پیشتر جن لیڈیوں کو یہ فخر حاصل ہوا تھا وہ نہایت درجہ ممتاز تھیں۔ بہرکیف میں نے اسکو قبول کر لیا صرف اس خیال سے کہ اگرچہ یہ ہندو کلب ہے تاہم آپ لوگوں نے اتفاق کا اظہار کیا ہے۔ اور آپ لوگ مسلمان بہنوں سے بھی رابطہ اتحاد رکھتی ہیں۔ جو نہایت درجہ قابل تعریف اور دلخوش کن امر ہے۔

لیڈیز! میں اس بات سے بہت خوش ہوں کہ آپ لوگوں نے اس کام کی مختلف شاخوں کو بہت کچھ ترقی دی ہی۔ اور اُس سے معلوم ہوتا ہی کہ آپ لوگوں نے نہایت ہوشیاری اور دلچسپی سے کام کیا ہی جس سے رفتہ رفتہ کلب کی عمدگی اور فوائد بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں اور نہایت خوشی ہوتی ہی کہ سوزن کاری اور شیشہ وگلاس کی روغن کاری نہایت خوبی کے ساتھ ہونے لگی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ مغربی صنائع کے ساتھ ہماری قدیم اور بے مثل زردوزی۔ اور سوزن کاری کے فنون کی طرف کافی توجہ مبذول کیجائے اور میں بہت خوش ہونگی اگر اس قسم کے کاموں کو مدد دیجائے۔ میں بھی اسکے لیے ایک تھوڑی سی امداد کرنا چاہتی ہوں جس سے اسکی ابتدا کیجائے۔ اور میں امید کرتی ہوں کہ آپ اسکو قبول کرکے مجھے اپنا ممنون بنائینگی۔ میں خصوصیت کے ساتھ اس بات سے خوش ہوں کہ مہارانی صاحبہ بڑودہ بھی اس کی خیرخواہ ہیں۔ اور نہایت درجہ اس میں دلچسپی لیتی ہیں۔ جو اس کلب کی آیندہ ترقی کا کافی ثبوت ہی۔ اور مجکو اس امر سے بھی نہایت خوشی ہی کہ رانی لکشمی بائی صاحبہ بھی اس کی ایک معزز ممبر ہوگئی ہیں جو اس میں نہایت درجہ دلچسپی لیتی ہیں۔ اور مینا کاری اور روغن کاری وغیرہ کے کاموں میں بہت مدد دیتی ہیں۔ میں خیال کرتی ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مسیز بھادیوگو دندر اناڈے کو مبارکباد دینے میں شریک ہونگی جو کہ پونا سے اس مبارک تقریب پر تشریف لائی ہیں۔ میں ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں کہ کچھ اشیا ممبروں نے ہفتہ وار جلسوں میں خیراتی کاموں کے لیے فروخت کرنیکے واسطے تیار کی ہیں اور میں امید کرتی ہوں کہ وہ چیزیں جلد فروخت ہو جائینگی۔ میں نہیں چاہتی ہوں کہ آپ لوگوں کا زیادہ وقت صرف کروں بلکہ اپنے ریمارکس کو ختم کرتی ہوں اور آپ کی بہبودی اور ترقی کی دل سے دعا دیتی ہوں۔

اگر اُردو میں تقریر کرتیں تو وہاں کم خاتونیں سمجھ سکتیں۔ بعد کو مسز کوٹھارے سنے بڑی گرمجوشی اور محبت آمیز فقرات سے شکریہ ادا کیا۔ اس میں خاص اسی بات کا ذکر کیا کہ کتنی مہربانی ہو کہ اتنے دور سے سمندر کا سفر اختیار کرکے آپ تشریف لائی ہیں۔ ہمارے لیے یہ باعث فخر و مسرت ہی۔ بلکہ میرے پاس وہ الفاظ نہیں ہیں جن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں۔

مسز جسٹس راناڈے نے بھی بڑی عمدہ تقریر کی اور اُسکا بھی مطلب بہت اچھا تھا۔

اور سب سے اخیر ہماری مہربان اچھی بہن پیاری دوست مس شیریں بائی خورشید جی نے نہایت پُر لطف عقلمندی سے بھری ہوئی فی البدیہ تقریر کی کہ جسکا مطلب اس طرح تھا کہ ”واقعی بیگم صاحبہ کا تشریف لانا باعث خوشنودی ہی اور جب تک ہماری ہندی قوموں میں ایک جہتی اور اتفاق پیدا نہوگا اور ہر شخص ایسا نہ سمجھے گا خواہ ہندو مسلمان فارسی کوئی بھی ہو کہ ہم (Daughters of India) ہیں اور ایک ماں کی بیٹیاں ہیں اور ہر کام میں ایک دوسرے کی دستگیری اور مدد کرنا فرض ہی تب تک ہمارے ملک کی ترقی اور بہبودی نہ ہوگی۔ اور ہماری یورپین بہنیں بھی البتہ ایک بادشاہ کی رعیت ہونے کی باعث رعیتی بہنیں ہیں۔ اگر ہم سب ایک دل ایک رائے سے ہر کام کو انجام دینگے تو ہم بیشک آسودہ ہونگے۔

اسکے بعد مجلس ختم ہوئی اور بیگم صاحبہ کو ہار گلدستہ عطر گلاب دیا گیا۔ حاضرین کو گلدستے اور پان تقسیم ہوئے۔ باقاعدہ مجلس ختم ہونے کے بعد سب آپس میں ملے جُلے اور اُس کمرے میں گئے جہاں نمایش اور خریدنے کے لیے چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہمنے بھی کچھ خریدا اور محظوظ ہو کر واپس آ گئے۔

راقمہ

ز۔ ف بیگم از بمبئی

بسلسلۂ سابق

ہمارے ہاتوں بچوں کی خرابی

اور کرایا ہی جاے تو بے سود لا حاصل۔ سیل بغیر گرمی کے جاتی نہیں ہاں اتنا ضرور
کہتی ہوں کہ پیرجی دہونی جو کرائینگے وہ مفید ہی ضرور ہو گی اور اسکی میں قائل ہی ہوں لیکن
یہ ان کی برکت نہیں بلکہ آگ کی تپش کا اثر ہے جس ہیں میں اور پیرجی برابر ہیں خواہ وہ کچھ ہی
کہیں سنیں لیکن اس میں ان کی کوئی کرامات نہیں آگ کی تپش کی کرامات ضرور کہیں گے
کہ جس سے سب جن بھوت جلکر بھاگ جاتے ہیں اور مکان صاف ہو جاتا ہے اور یہ بھوت
پریت ہی ہیں جنہیں خراب ہوا کہتے ہیں ورنہ اور کوئی اکا نشان و پتہ نہیں امید ہے کہ اگر
بہنیں ہوا اور دہوپ کا خیال رکھیں گی تو بہت سے بھوتوں کے ہاتوں سے امن میں رہینگی
اور جھوٹے فریبی پیروں کے دم میں نہ آئیں گی اور بچوں کی بہی وہموں اور مرضوں سے نجات
نہ آئیگی یہی خیال حافظ صحت اور رد بلا ہو گا۔ اگر گھر میں کوئی مرجائے تو بچہ کو چالیس روز
تک اس کی لحد اور جہاں وہ مرے نہیں جانے دیتے اور بڑے بڑے بھی جاتے ہوئے
ڈرتے ہیں ایک جوان بیوی جو دو تین بچوں کی ماں ہیں اتفاق سے نہیں بلکہ قصداً اس غرض سے
کہ دیکھیں مُردے کو کیونکر کفناتے ہیں اُسوقت جبکہ عزیز مُردے کا مُنہ دیکھنے جاتے ہیں
آپ بہی جاکر دیکھ آئیں اُسوقت سے ایسی دہشت دل میں بیٹھی کہ رنگ زرد پڑ گیا اور بخار
چڑھ آیا یہ صرف ڈر اور بزدلی ہے کہ ایسا ہوا ورنہ تھا کیا جو بیوی کو لرزہ چڑھ آیا۔ میں نے
ایک ڈرپوک نوجوان کی حالت سُنی جو میری ایک بہن نے بچشم دید بیان کی سُنکر سخت حیرت
ہوئی پھر جب ہمارے ایسے خیالات ہیں تو ہرگز حیرت انگیز نہیں۔

ان جوانمرد کی ممانی صاحبہ کا انتقال ہو گیا شب کو جہاں ان کی ممانی صاحبہ کا انتقال ہوا
تھا ان نوجوان بہادر کے سونے کیواسطے پلنگ بچھایا گیا جب حضرت تشریف لائے تو

اپنا پلنگ اُس دالان میں دیکھا اور وہاں سے پلنگ اُٹھاکر دوسرے کمرے میں لے گئے اور فرمانے لگے اگر ممانی اماں آکر پکارتیں تو میں کیا کرتا اور یہ بھی سُنا گیا ہی کہ اندھیرے میں ہرگز کہیں نہیں جاتے۔ ایسی حالت میں قومی ہمدردی اور مذہبی جوش ورحمدلی پیدا ہونی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہی۔ وائے برحال ما۔

آجکل کے مرد اگلے وقتوں کی عورتوں کی بھی ہمسری نہیں کرسکتے جن میں بہادری اور قومی ہمدردی حمیت و مذہبی جوش ایسا تھا کہ بغیر ہتیار خیموں کی چوبوں سے لڑیں۔ آجکل کے مرد گھوڑے پر سوار ہونے تک سے عاری ہیں کہاں لیڈیز گھوڑوں پر سوار ہوتی تھیں آجکل کے مردوں کی جوانمردی ہے تو یہ ہی کہ ہر وقت اپنے بانکپن میں رہتے ہیں بانکپن بھی کیا ہی صبح اُٹھکر سر میں تیل چنبیلی کا جو کم از کم پانچ روپیہ سیر کا ہوگا ڈالا گیا کنگھا ہوا پھر صابون سے مُنہ دُہلا تولیے سے مُنہ پونچھا آئینہ آگے رکھا گیا اور سُرمہ کی بلکہ کاجل کی کئی کئی سلائیاں لگائی گئیں پٹاری کا وار آیا ایک پان بنا کر کھایا گیا۔ رات کا لاکھا ابھی ہونٹوں پر سے نہ اُترا تھا کہ ایک تہ اور چڑھگئی گلے میں کڑہا ہوا کرتا اور فیتوں کی ٹکی ہوئی شیروانی اس ٹھاٹ سے بازار نکلے سبحان اللہ کیا شان ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ بدن ہاتھ پاؤں اور سر کی صفائی مقدم نہیں۔ نہیں نہیں بلکہ اعلیٰ فرض ہے لیکن سب کچھ اعتدال سے۔

ہاں آپ یہ نہ سمجھیں کہ پہلے زمانہ کا ذکر ہی نہیں نوجوان اس زمانہ کی پیدائش اور وہ بھی از سرزمین ہندوستان بس جناب یہی گھوڑے کی سواری سمجھیے یہی ورزش انھیں نہیں معلوم کہ ورزش کیا بلا ہے اور گھوڑے کی سواری کس جانور کا نام ہے جنکو مقدور نہیں ہوتا انکو تو یہ بہانہ ہی مگر جنکے ہاں چار چار گھوڑے ہیں اُنھیں یہی خیال نہیں صرف بگھی میں چڑھے چڑھے پھرنا ضرور آتا ہے۔ ورزش تو ایسی چیز ہی کہ ایک کم درجہ کا آدمی بھی کرسکتا ہے لیکن جب والدین کی ایسی حالت ہی تو بتائیے کہ اولاد کیا سیکھے گی اور جب مردوں کا یہ حال ہے تو عورتوں کا کیا ذکر۔ خیر کچھ پرواہ نہیں بہنوں ہمیں قدم بڑھانے دو ورزش

کی طرف توجہ کرکے اپنی صحت درست کرو چاند بی بی اور رانی جھانسی بھی تو ہماری ہی بہنیں تھیں
اُنسے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہیے اور اس بزدلی کو دور کرکے کوشاں رہنا چاہیے۔
اصل یہ ہی کہ خدا اس ڈر سے اور وہم سے سب بہنوں کو محفوظ رکھے علاوہ ازیں اس ڈر
کی بدولت بعض مرض ایسے پیدا ہوجاتے ہیں کہ جانبری محال ہوتی ہی۔ چنانچہ ڈر کی آپ بیتی
سناتی ہوں اور وہم کی کہانی آگے چلکر بیان کرونگی۔

میری عمر کوئی پانچ یا چار سال کی ہوگی میرے ہاتھ میں گھڑی تھی جو میری انا نے مجھسے
لینی چاہی مگر میں سنے ندی تو اُنھوں نے مجھے لبشادی کے نام سے ڈرایا اور گھڑی لے لی
فوراً بخار چڑھ آیا اور ایسا تیز ہوا کہ زندگی کی اُمید نہ رہی۔ اور ایسی ایسی مثالیں بہت ملسکتی ہیں
خدا اپنا فضل ہی رکھے بعض مرض ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی مرنے سے بدتر ہی ایسے مرضوں میں اگر
آدمی مبتلا ہوکر جیا بھی تو کیا۔

زندگی زندہ دلی کا ہے نام مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں ؎

بہت لوگ جن بھوت کے خیال میں پیاری جانیں ضائع کر دیتے ہیں اور اُن کو ذرا
خیال نہیں ہوتا سب سے بڑی خرابی جاہلوں کا مشورہ کرنا ہے۔ ایک بہن کو ہسٹیریا ہوا جسکو
کوئی کہتا آسیب زدہ ہیں کوئی کہتا کسی کے مزار کی بے ادبی ہوئی کوئی کہتا جن سوار ہے۔
کوئی صلاح دیتا کہ گوگل کی دہونی دو۔ کوئی کہتی مرچوں کی دہونی دو انکا یہی علاج ہی آپ ہی
بولینگے، کوئی کہتی کہ خدا کے واسطے اب بتائیں کہ آپ کون ہیں اور آپ کا مقصد کیا ہے
یہ بچہ بھی خدا کے لیے اسکا قصور معاف کیجیے اور جو لینا ہو وہ لو اسکی جان ہلاک ہوئی جاتی ہی
غرض ایسی ایسی باتیں آنے جانے والے کرتے تھے مگر اپنے عزیز ثابت قدم تھے اور ان باتوں پر
اعتماد نہ رکھتے تھے علاج کئی ڈاکٹروں کا ہوا آرام ہوگیا اور جن بھوت پریت سب کچھ
بغیر تعویذ گنڈوں کے رفو چکر ہوگیا۔ الغرض جنکا بھوت پریت نظر گویا دین و ایمان ہی وہ
اپنے بچوں کی عزیز جان مفت کھو دیتی ہیں۔ جیساکہ ہماری معزز بہن لے۔ بی صاحبہ

اپنے مضمون جسکا عنوان (تعویذ گنڈوں کی خرابی) ہی ماہ مارچ و اپریل کے پرچہ خاتون میں دکھا چکی ہیں ہمیشہ انسے احتراز کرنا چاہیے۔

وہم کی ایک تازہ کہانی جو میں نے سنی ہی اور واقعی سچی ہی بہنوں کے ملاحظہ کے لیے ذیل میں درج کرتی ہوں۔

کہا جاتا ہی کہ ایک لیڈی پیرس میں اس وہم میں گرفتار ہوئی کہ اسکے بدن میں چھپکلی ہی اسی طرح بری حالت ہوتی گئی خیالی مرض ہی ایسی بُری بلا ہے کہ جیسا اصل مہلک مرض اگر علاج ہو جائے تو یوں ہی ہو جائے ورنہ زندگی محال ہی کیونکہ مثل مشہور ہے کہ وہم کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں۔ چنانچہ وہ لیڈی شفاخانہ بلائی گئی اور ڈاکٹر جیسے اُسکے معالج بنے مگر وہ ئے معالج ہو تو ایسا ہو اس تجربہ کار ڈاکٹر نے بجائے اسکے کہ وہ یقین دلاتے کہ وہ وہم میں گرفت رہو اُسے اسی بات پر پختہ کر دیا کہ فی الواقع اُسکے بدن میں چھپکلی ہے اور یہ کہ اسکا علاج جلد ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ اسی طرح سمجھا سمجھو کر ڈاکٹر نے عمل جراحی کیا کیا ہی اس ہوشیاری سے کہ اُس لیڈی کو یقین ہو گیا کہ درحقیقت عمل جراحی اسپر پورے طور سے ہوا اور اس غریب کو اس وہم سے نجات ہوئی اور بالکل اچھی ہو گئی۔ ظاہرا اُسکو ایک سوکھی ہوئی مچھلی دکھا بھی دی گئی۔ اسکا کچھ دن خوب مذاق رہا۔ اسی لیڈی کی ایک رشتہ دار اسے دیکھنے آئی تو اس چھپکلی کو اُٹھا کر لیگئی اور اپنی دوکان پر اسے رکھ لیا اس خیال سے کہ لوگ اسکے حال سے دلچسپی لیں گے اور درصل ایسا ہی ہوا بھی کہ جب وہ اسکا حال بیان کرتی تو خاصی دل لگی رہتی لیکن ہر شخص ضعیف الاعتقاد نہ تھا لوگوں نے اسکا خوب تمسخر کیا پہلے تو کچھ کم مذاق اُڑتا تھا لیکن جب یہ حقیقت کُھلی تب تو خوب ہی اس سادہ طبیعت لیڈی کو بچہ بچہ نے بازار کی ٹرھیا بنایا آخر تنگ آکر غصہ ہوئی اور چھپکلی کو آگ میں ڈالدیا اور طبیبوں کی حقارت کرنے لگی اور بولی یہ کیونکر ہو سکتا ہے کیا ڈاکٹر ایسی بیہودہ کہانیاں بیان کرتے ہیں بھلا اگر میری بہن یہ سُنے کہ کوئی جانور نہیں نکلا تو کیا خیال کرے اب میں

ڈاکٹر چٹلے سے تو پوچھو نگی کہ اگر وہ سچ نہ تھا تو وہ لوگوں کی سادہ دلی کا تمسخر کیوں اُڑاتے ہیں
بہنوں اُمید ہی کہ اس کہانی کے سننے سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہم کا علاج ہو سکتا ہے تو
یوں ہی ہو سکتا ہی ورنہ جان لیے بغیر جانا مشکل ہی یہ ایسی آفت ہے کہ عام ہی گو اسکا درجہ کم ہے
لیکن بہ صورت ہر طرح مہلک و مضر ہی جیسا کہ جن بھوت کا خیال درختوں کا وہم دنوں کا سودا
کہ سفر کو آج دن اچھا ہے کل بُرا وغیرہ وغیرہ جن کی تفصیل مشکل ہے قابل انسداد ہے
امید ہی کہ اس کی خوب چھان بین ہو گی اور اس رسم اور خیال کو دور کرنے کے لیے سب
بہنیں کوشش کرینگی۔

بچوں کو بچپن میں ڈرانیکا بہت بڑا دستور پڑا ہوا ہی کہ جسکا زہریلا اثر نونہال پودوں پر
پڑکر آیندہ زندگی میں انکے ہزاروں کاموں میں باعث روک ہوتا ہے اور ایک یہ بھی بُری
بات ہے کہ اکثر بیویاں بچوں کو اس قسم کی کہانیاں سُناتی ہیں کہ اُنکے دل میں ہیبت بیٹھ جاتی
ہی اور وہ تمام عمر نہیں نکلتی جیسا کہ پہلے میں لکھ چکی ہوں اسکے برخلاف تہذیب یافتہ
قوموں میں بچوں کو بہادری کی کہانیاں سُناتے ہیں اور ہر طرح یہ کوشش کرتے ہیں کہ
بچے دلیر ہوں اور اکثر ایسے لوگوں کے حالات سُناتے ہیں کہ جو بہادری سے لڑے
یا جنہوں نے تعلیم پائی اور عمدہ عمدہ باتیں ایجاد کی ہوں بس یہی عمل ہمارے ہاں بھی ہونا
چاہیے۔ بچوں کا دل مثل سادہ لوح کے ہوتا ہے جیسا کہ تختی پر جو کچھ لکھیں وہ لکھا جاتا ہے اور
رفتہ رفتہ خط عمدہ اور پاکیزہ ہو جاتا ہے اسی طرح بچوں کی خصلتیں بھی ویسی ہی ہو سکتی ہیں
جیسی کہ اُنکے والدین بنانا چاہیں اور ویسی ہی پختہ اور پاکیزہ ہو سکتی ہیں جیسے تختی پر خط۔
بچپن کی عادتیں ایسی واثق ہو جاتی ہیں کہ وہ مرتے مرتے نہیں جاتیں جن کی مثال یہ ہی کہ
انگریزوں کے بچے اپنے طریقہ میں بہت پختہ ہوتے ہیں اور بڑے اور فاضل ہو کر بھی
اُس کے بڑے پابند رہتے ہیں برخلاف اسکے مقابلے میں ہمارے ہاں کے بچے ایسے
ہوتے ہیں کہ جنکو کلمہ تک پڑھنا نہیں آتا اور اُن کو سنہ ہجری تک کی اصلیت کی بھی خبر نہیں ہوتی

یہ بچوں کا قصور نہیں ہے بلکہ اُنکے والدین کا قصور ہے اور خاصکر اس میں بھی ماں کا ہے
بچہ کم از کم چھ سات برس تک بالکل ماں ہی کے پاس رہتا ہے اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ
جو بچہ کو سکھا دو اُس کی بچہ کو کہانی ہو جاتی ہے اگر اس زمانہ میں مائیں مذہبی تعلیم دیں تو
بچے خوب پختہ ہوں اور مدرسوں میں پہنچکر بے وضو کے نمازیں نہ پڑھا کریں اور نہ مدرسوں کا
نام بدنام کریں اکثر یہ اعتراض ہوتا ہے اور بعض اوقات صحیح بھی ہوتا ہے لیکن میرا یہ
خیال ہے کہ یہ صرف ہماری بہنوں ہی کی کارروائی کا نتیجہ ہے اور انہیں پر ہونا چاہیے مگر انکا
بھی کیا قصور ہے جب وہ اُس سے واقف ہی نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ لڑکے جو تعلیم کے لیے
بھیجے جاتے ہیں وہ ابتدائی عمر سے تو بھیجے جاتے ہی نہیں۔ جاتے ہیں بڑی عمر میں اور
مذہب کی طرف سے ہوتی ہے لاعلمی وہاں نماز کی تاکید ہوتی ہے سزا کے خیال سے بغیر وضو
کیے ہاتھ باندھکر کھڑے ہو جاتے ہیں نہ بیچاروں کو وضو کے ارکان کی خبر اور نہ نماز کی نیت
کا علم ایسا نہ کریں تو کیا کریں۔ بہنوں بھلا اگر لڑکے گھروں سے مذہب کے پابند ہو کر
جایا کریں تو اُن کو دقت ہو نہ سزا ملے اور نہ مدارس کو بدنام کریں اور نہ مجبور ہوں عادت
بھی آدمی کی طبیعت ثانی ہوتی ہے مثلاً وہ جو حقہ کے عادی ہیں اُنکا حقہ وقت پر تیار ملتا ہے
سگرٹ کے وقت میں فرق نہیں آتا اگر آیا تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے کیوں بوجہ عادت
اسی طرح یہ یقینی امر ہے کہ اگر وہ اچھی عادت کے عادی اور مذہب کے پابند ہوں تو اُنکو اسمیں
بھی وہی تکلیف ہو جو حقہ نہ ملنے یا سگار نہ سلگانے سے ہوتی ہے۔ بچپن عجب شاخ سبز
ہے جدھر چاہو موڑ دو۔ اگر بچہ کو اچھی باتیں سکھا دو گے تو بڑے ہو کر بھی اُنھیں کی طرف
راغب رہیگا اگر بُری باتیں سُنے گا یا سیکھے گا تو اُسی کا عادی ہو جائیگا اور اُسکی حالت جیسی
ہوگی ویسی ہی رہیگی دوسری طرف پھرنا مشکل ہے جیسا کہ سبز شاخ کا تنہ بنکر دوسری طرف
نہیں پھر سکتا ویسا ہی بچہ بڑا ہو کر نہیں سنور سکتا اسلیے یہ ماں کا فرض ہے کہ بچہ کو اچھے
عادات اور مذہبی تعلیم میں اُس کی عمر کے موافق جہانتک ہو سکے طاق کرے اور یہ

اسوقت کا طاق کرنا ساری عمر کام آئیگا یقین ہے کہ یہ بہنیں ضرور ملحوظ خاطر رکھیں گی اور کوشش کرینگی کہ وہ اپنے بچوں کو اپنے مذہب میں میموں کی طرح پختہ پابند بنا کر دکھائینگی اور اسکا بھی خیال کرینگی کہ آئیندہ بچوں کو جو آجکل عام ہیں بیہودہ کہانیوں کے بجائے تاریخ کی کہانیاں سنایا کرینگی اور جغرافیہ کی باتیں مثلاً یہ کہ افریقہ میں کیا جانور ہوتے ہیں اور امریکہ میں کیا سُنا کر بہلایا کرینگی۔ بہتر ہو اگر پہلے ان ہی جانوروں کی بچوں کو تصویریں دکھا کر انکا حال بیان کیا جائے اس طریق سے یقین ہے کہ بچوں کو بھاگنے کی نسبت پڑہنے کا شوق ہو جائیگا اور فائدہ پہنچے گا۔ بہنوں اگر گل کے قصے اور مہیب کہانیاں سُنانے سے سوائے نقصان کے اور کیا حاصل ہو سکتا ہے یہ کام ہے جو بہنیں انجام دے سکتی ہیں۔

ایم۔ جے بیگم بنت محمد فضل مبین
از دھلے

تعلیم نسواں

اسوقت ہندوستان میں تعلیم نسواں کی بڑی ضرورت ہی اور جب ہم اسکا مقابلہ اور ملکوں کے ساتھ کرتے ہیں تو ہم اپنے آپ کو بہت پیچھے دیکھتے ہیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ ہم بہت دیر کے بعد بیدار ہوئے ہیں لیکن ہر چیز کا آغاز کبھی نہ کبھی ہوتا ہی۔

اسوقت ہمارے سامنے کئی ملکوں کی تواریخیں موجود ہیں اُن میں صاف طور پر لکھا ہی کہ ہر ملک میں تعلیم نسواں کس طور پر پھیلی اور اُس سے کیا کیا فائدے ہوئے۔ اب ہمارا کام ہے کہ ان سب کو بڑے غور سے دیکھیں اور بخوبی سمجھ لیں کہ ملک میں تعلیم سے اور خصوصاً تعلیم نسواں سے کس طرح فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ اور ملکوں میں اکثر ہوا ہی کہ جب مردوں کی بہت اچھی تعلیم ہوگئی اُسوقت اُن کا خیال تعلیم نسواں کی طرف مائل ہوا۔

اور اُسوقت اُن کو بہت سی دقتیں پیش آئیں اور بڑی کوششوں کے بعد کامیابی حاصل ہوئی
ہمارے یہاں اسوقت مرد و زن دونوں کم تعلیم یافتہ ہیں اور اگر دونوں کی تعلیم اچھے طریقہ سے
ایک ساتھ شروع کیجائے تو بڑے عجیب و غریب نتائج پیدا ہوں۔

ہاں میں اتنا ضرور کہونگا کہ بعض اشخاص کا یہ قول ہی کہ پردہ اس میں بڑی روک ہے لیکن
پردہ کو ایسی، روک سمجھنا کہ جو مانع تعلیم ہو غلطی ہے۔ میرے خیال میں بلا پردہ توڑے بہت
آسانی سے تعلیم ہو سکتی ہے۔ یہ روک ایسی زبردست نہیں ہی۔ ہم کو اس پردہ کی روک سے
ناامید نہونا چاہیے۔ اسوقت میں پردہ کے عیوب وصفات نہیں بیان کرونگا کیونکہ یہ مضمون
بڑا وسیع ہی۔

آپ جانتے ہیں کہ تعلیم کے کیا کیا فائدے ہیں اب مجھے اتنا اور بیان کرنا ضرور ہی کہ
خاص عورتوں کی تعلیم سے کیا کیا فائدے ہیں اگر عورتیں معقول طور سے تعلیم یافتہ ہوں تو
اپنے فرائض کو اچھی طرح سے انجام دیسکتی ہیں اور اپنے کاموں کو بخوبی سمجھہ سکتی ہیں اور نیز اپنے
بچوں کی اچھی طرح سے پرورش کرسکتی ہیں۔ یہ بات آپ صاحبوں سے شاید ہی مخفی ہوگی کہ
بچوں کی طبیعت پر اُنکے والدین کے کاموں اور باتوں کا اثر کس آسانی سے ہوتا ہی۔ اور
خاص کرکے ماں کا جسکی روح بچے ہوتے ہیں اور وہ اُنسے ایسی محبت کرتی ہی کہ جسکا اندازہ
کرنا قریب قریب ناممکن ہی اگر اتنی محبت کے بعد اُس ماں کو اپنے بچوں کی تعلیم کا بھی خیال
ہو تو آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ کِن کِن آسان ترکیبوں سے وہ باتیں اُنکے ذہن نشیں کرسکتی
ہی اور بچے کو اُن سب باتوں کے سیکھنے میں کچھ بھی تکلیف نہوگی۔ جیسے کہ آجکل بچے ہاؤ کا ہونا
اور بھوت ڈاین چڑیلوں سے خوف اور منتر جنتر اور جادو سے آرام ہونا کس آسانی سے یقین کرلیتے
ہیں۔ اسکے علاوہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ضد کرنا اور رونے ہی کو کسی چیز کے حاصل کرنیکا ذریعہ سمجھنا۔
ان سب باتوں کو آناً فاناً میں سیکھ لیتے ہیں۔ اگر عورتیں تعلیم یافتہ ہوتیں تو اپنے بچوں کو ان خراب ہونیکے
بجائے اچھی اور کارآمد باتیں سکھا سکتیں۔

بیوی کے برابر دنیا میں اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا جو اپنے شوہر کے ساتھ ہمدردی کرنا اور اُسکو نیک صلاح دینا اور اُس کی طبیعت کا خوش کرنا اپنے اختیار میں رکھتا ہو۔ میرے خیال میں بیوی دنیا میں سب سے اچھی دولت ہے اس میں شک نہیں کہ اپنے مشرقی خیالات کے موافق بیوی فرمانبردار جاں نثار ہوتی ہے اور اپنے خاوند سے دل وجان سے محبت کرتی ہے۔ اگر ان سب وصفوں کے ساتھ تعلیم یافتہ بھی ہوتی تو کیا خوب ہوتا۔ انکے تعلیم یافتہ نہونے سے یہ دقت پیدا ہوتی ہے کہ اگر خاوند اچھا تعلیم یافتہ ہو اور بیوی جاہل مطلق یا کچھ یوں ہی سی لکھی پڑھی ہے تو اس بیچارے خاوند کے کاروبار میں بیوی کو نہ کچھ دلچسپی ہوتی ہے اور نہ اُسکے ساتھ کچھ ہمدردی اور نہ اُس خاوند کو کسی طرح کی بیوی سے مدد ملسکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خاوند اور بیوی میں جیسی محبت ہونی چاہیے نہیں ہوتی۔ ان سب دقتوں پر لحاظ کر کے میرے خیال میں اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ تعلیم نسواں میں جتنی کوشش اور جانفشانی ہو سکے کیجائے۔

اسوقت یورپ میں عورتوں کی تعلیم بہت اچھی ہو رہی ہے اور ہم اپنے ملک کے لیے اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ مگر اسکے ساتھ میں نے یہ بات بھی (جب میں انگلستان میں تھا) سنی کہ بعض کی رائے عورتوں کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دینے کے خلاف ہے۔ اور وہ لوگ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عورتوں کی زیادہ تعلیم ہونے کے بعد وہ اپنے اصلی فرائض سے بالکل دست بردار ہو جاتی ہیں یعنی اپنے بچوں کی تعلیم و پرورش اپنے سے بہت نیچے درجہ کی عورتوں کے ہاتھ میں دیدیتی ہیں اور اپنا تمام وقت کھیل تماشہ گارڈن پارٹی ناچ رنگ میں صرف کرتی ہیں نہ وہ اپنے بچوں کی پرورش جیسی کہ چاہیے کر سکتی ہیں اور نہ اپنے کاروبار خانگی کو اچھی طرح سے انجام دیسکتی ہیں۔

لیکن اسپر اگر آپ ذرا غور کرینگے تو یہ معلوم ہو جائے گا کہ تعلیم کے بُرے اثر نہیں ہیں بلکہ سوسائٹی کے ہیں جنکا توڑنا قانونی جرم سے بھی زیادہ بُرا گنا جاتا ہے۔

اپنے یہاں ہی بڑے درجے کے آدمیوں میں اور خصوصاً رئیسوں میں بغیر اچھی تعلیم کے بھی ایسا ہوتا رہا ہی کہ اُنکے بچوں کی پرورش وتعلیم بالکل دوسرے لوگوں کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ میرے خیال میں ہم سب کا یہ کام ہے کہ جہالت کے کاموں کو ترک کریں۔

سالانہ تولد وفوتی کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوا ہی کہ کمسن بچے جس کثرت سے ہندوستان میں مرتے ہیں اور کسی ملک میں نہیں مرتے اور اس کا بڑا سبب ہماری مستورات کا تعلیم سے محروم ہونا ہے۔ میرے مضمون کی یہ شاخ ایسی وسیع ہی کہ اسپر بہت کچھ بیان کیا جاسکتا ہے۔ لیکن چونکہ میں آپ صاحبوں کا زیادہ وقت لے چکا ہوں اسلیے ایک دو مثالیں اور دیکر اپنے مضمون کو ختم کرونگا۔ آپ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اس دنیا میں جتنے مشہور ومعروف اشخاص گزرے ہیں یا اسوقت موجود ہیں یا آیندہ ہونگے وہ سب ایک زمانہ میں معصوم بچے تھے یا اسوقت ہیں یا ہونگے۔ مثلاً ویلنگٹن۔ نپولین۔ نیلسن ہنیبال۔ کیمبر۔ اور اکرم۔ بھوج یہ سب کے سب ایک زمانے میں معصوم بچے تھے چونکہ ایسے شخصوں سے دنیا کو فائدہ پہونچتا ہے اسلیے عام طور پر بچوں کی حفاظت کرنا اُنکے والدین ہی کا کام نہیں بلکہ اس ملک کے سب باشندوں کا فرض ہی کہ اپنے ملک کے بچوں کی پرورش وحفاظت وتعلیم بڑے غور وفکر کے ساتھ کریں۔ ہمارے ہندوستان میں عورتوں کی اچھی تعلیم نہونے کے سبب سے نہ معلوم کتنے ہنیبال۔ نیلسن۔ کیمبر اور نپولین بچپن ہی میں اس دنیا کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ اس خون عظیم کی بانی وسبب افسوس کہ ہماری کم تعلیم یافتہ عورتیں ہیں۔

ایجوکیشن کے معنی اُردو میں نوشت وخواند ہیں یعنی صرف لکھنے پڑہنے سے مراد ہے لیکن اس لفظ کے معنی انگریزی زبان میں بڑے وسیع ہیں۔ تعلیم سے میری مراد صرف لکھنے پڑہنے سے نہیں ہی بلکہ اُن سب باتوں کے سیکھنے سے ہی جنکے ذریعے سے آدمی اس دنیا میں اپنی زندگی کامیابی سے بسر کرسکے یعنی جو کام اُسکو اس دنیا میں رہکر کرنا پڑینگے اُنکو عمدہ

طور پر انجام دیسکے پس تعلیم کی تین قسم ہیں۔ اول علمی۔ دوم جسمانی۔ سوم اخلاقی۔ یہ تینوں طرح کی تعلیمیں آدمی کے لیے ضروری ہیں۔

تعلیم علمی ہرطرح کے کاروبار میں مدد دیتی ہے۔ اور لکھنا پڑہنا بھی اسی کا ایک جزو اور ذریعہ ہے کیونکہ دماغی تعلیم بلا لکھنے پڑہنے کے اچھی طرح سے حاصل نہیں ہوسکتی وجہ اُسکی یہ ہے کہ انسان اپنے خاص تجربہ سے بہت کم سیکھ سکتا ہے اگر وہ لکھنا پڑہنا نہیں جانتا ہی تو تمام علما و پیشوایان مذہب و فلسفی جو گذرے ہیں اُنکے کلاموں سے وہ بالکل بے بہرہ رہتا ہی کیونکہ اُنکے کلام صرف اُن کی کتابوں میں مل سکتے ہیں۔

اگر ہم یا ہماری مستورات تھوڑی سی محنت سے اس بے اندازہ دولت کو اپنے قبضہ میں نہ کرسکیں تو ہمارے برابر اور کون بدنصیب ہوسکتا ہی۔

یہ بات تو درست ہے کہ ہماری لڑکیاں اتنی زیادہ عمر تک مدرسوں یا پاٹ شالاؤں وغیرہ میں نہیں جاسکتیں ہیں جتنی عمر تک یوروپین لوگوں کی جاتی ہیں۔ مگر معمولی کتابوں کے پڑہنے اور سمجھنے کی قابلیت تین چار سال میں بآسانی حاصل ہوسکتی ہے۔ مثلاً سات آٹھ برس کی عمر سے لکھنا پڑہنا شروع کیا جائے تو گیارہ بارہ برس کی عمر تک بخوبی آسکتا ہی اسکے بعد وہ بطور خود مطالعہ کرنے کے ذریعہ سے اپنی علمی لیاقت بڑہا سکتی ہیں۔ اور خصوصاً ایسے زمانے میں کہ جب علم کو ترقی دینے کے وسائل بہت ارزاں اور آسانی سے مہیا ہوسکتے ہیں۔

اب تھوڑی سی کتابوں کا اور ذکر کرنا ہی کہ وہ کس قسم کی ہونا چاہئیں۔ میرے خیال میں کتابیں چنداں نئی بنانے کی ضرورت نہیں ہی۔ یہی کتابیں جو آجتک مروج ہیں اچھی ہیں ان میں صرف اتنی ترمیم ہونی چاہیے کہ جس سے وہ لڑکیوں کے لیے موزوں ہوجاویں مثلاً چند کہانیاں اُن کتابوں میں ایسی داخل کیجائیں جو خاص طور پر لڑکیوں کو دلچسپ معلوم ہوں اور آسانی سے اُن میں اُنکی طبیعت لگ سکے اور جن عورتوں نے اس دُنیا میں نیک اور اچھے کام کیے ہوں۔

اور اپنی بہنوں کے لیے نمونہ بنی ہوں۔ اُنکے حالات درج کیے جائیں۔

جیسا لکھنا پڑہنا انسان کے لیے ضروری ہی ویسا ہی بلکہ اُس سے بدرجہا زیادہ اپنی صحت کا درست رکھنا ضروری ہے۔ کسرت و محنت سے جسم مضبوط ہوتا ہی اور اُسی کے ساتھ دل و دماغ بھی ترقی پاتے ہیں۔ اگر دماغ کمزور ہی تو لکھنا پڑہنا اچھی طرح نہیں ہو سکتا ہے اور اسکے ساتھ اور باتیں بھی ایسی ہیں کہ اگر جسم کمزور ہے تو نہیں ہو سکتیں اور جنکے نہ ہونے سے عورتیں اپنے ماں باپ یا بزرگوں کی خدمت اور بعد میں اپنی اولاد کی پرورش آسانی سے نہیں کر سکتیں۔ ان سب باتوں پر خیال کر کے ہی مناسب معلوم ہوتا ہی کہ کسرت و محنت بہت ضروری چیز ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہمارے ہاں پردہ ہونے کی وجہ سے اس آسانی کے ساتھ کسرت نہیں کیجا سکتی جیسے کہ یوروپین عورتیں کر سکتی ہیں۔ مگر یہ کوئی ضروری بات نہیں ہے کہ کسی خاص ڈہنگ ہی کی محنت یا کسرت کیجائے بلکہ ہر کام جس میں جسمانی محنت ہو اُسی کو ایک طرح کی کسرت سمجھنا چاہیے اور اُس سے وہی فائدے ہوتے ہیں جو کسرت سے ہوتے ہیں۔ مثلاً اپنے گھر کا کام جسکو صاحب خانہ بلا خدمت گاروں کی مدد کے خود کر سکتی ہے۔ میں نے خود ایسی عورتیں دیکھی ہیں کہ جو پانی اُنسے پانچ فٹ کے فاصلہ پر ہو اُسکو بھی وہ خود اُٹھکر پینا نہیں چاہتی ہیں اور ہمیشہ کسی ملازمہ سے منگا کر پیتی ہیں۔ میرے خیال میں اُن عورتوں کو لازم ہے کہ اپنے گھر کے کاموں میں خود دلچسپی لیں اور دیکھیں کہ وہ کام اچھے ڈہنگ سے ہوتے ہیں یا نہیں اور نیز یہ بھی دیکھیں کہ کھانا اچھی طرح سے پکتا ہے یا نہیں۔ اسکے علاوہ سینا کاڑہنا اور کشیدے کے کام سے بھی کماحقہ واقفیت حاصل کرنی چاہیے میرے خیال میں ہر عورت کے لیے یہ بڑی ضروری بات ہی کہ وہ کھانا پکانا جانتی ہو اور جو کام خانہ داری سے تعلق رکھتے ہیں اُنسے واقف ہونا اسکا فرض ہی۔

تیسری قسم کی اخلاقی تعلیم ہے۔ اخلاق کا درست کرنا بھی آدمی کے لیے نہایت ضروری

ہی مگر یہ شکر کی جگہہ ہے کہ عورتوں کے لیے جس قسم کی اخلاق کی درستی درکار ہے اُن میں سے بہت سی باتیں ہماری عورتوں میں پہلے ہی سے موجود ہیں جسکی تشریح کی چنداں ضرورت نہیں چند باتیں البتہ ایسی ہیں کہ جن میں تھوڑی سی تبدیلی کی جانا مناسب ہی مثلاً بے سوچے سمجھے شادی و غمی کی رسموں میں زیادہ خرچ کرنا و کم عمر لڑکے لڑکیوں کی شادی۔

اسی کے ساتھ میں یہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں کہ ہر ایک عورت کا یہ فرض ہی کہ وہ مکانات کی صفائی کے قواعد سے واقف ہو یعنی وہ اپنے مکان کو صاف اور ہوادار رکھ سکے کہ جس سے وہ رہنے والوں کے لیے صحت بخش ہو۔

بچوں کی عمدہ طور سے پرورش کرنا اور بیماری میں اپنے بچوں کی غور و پرداخت کرنا اور اپنے سے بڑوں کی خدمت کرنیکے طریقہ سے اچھی طرح واقف ہونا۔ یہ سب بہت ہی ضروری باتیں ہیں۔ ابتک جو میں نے کہا وہ سب کام ہی کی بابت تھا۔ اب میں ایک دو ایسی باتیں بیان کرونگا جنسے اُنکی طبیعت کو فرحت اور آرام پہونچے۔ اُن میں سے ایک یہ ہی کہ ہر ایک عورت کو کوئی ایسا باجہ سیکھنا چاہیے جس سے فرصت کیوقت وہ اپنی طبیعت کو بہلا سکے اور اپنے رشتہ داروں کے دلوں کو خوش کر سکے۔

میں اپنے خیال میں عورت کا جیسا کہ ہونا چاہیے نقشہ کھینچ چکا اب میں خاوندوں کی نسبت ایک دو لفظ بیان کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہیں کہ جتنے وصف میں نے مستورات کے لیے بیان کیے ہیں اگر اُن میں سے نصف بھی کسی عورت میں ہوں تو اُسکے خاوند کو لازم ہی کہ اپنی بیوی کی مرضی کے موافق کام کرے اور ہمیشہ اسکی کوشش کرے کہ کوئی بات اُسکی طبیعت کے خلاف ہونے نہ پاوے یہ حالت اگر کسی گھر میں ہو تو وہ گھر کسی طرح بہشت سے کم نہیں ہے۔

آپ صاحب جانتے ہیں کہ ہر شخص جو کچھ اپنے لیے اس دنیا میں کرتا ہی اُسکے مقابل میں اپنی اولاد کے لیے بہت زیادہ کر سکتا ہی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم اپنے گھروں کو بہشت بنا سکیں یا نہیں لیکن

ہمکو چاہیے بلکہ ہمارا فرض ہی کہ آیندہ آنے والی نسل کے لیے پوری پوری کوشش کریں جس سے اُنکے گھر واقعی بہشت بنجائیں - فقط

ٹھاکر امراؤ سنگھہ

ایک پُر درد اپیل

کچھ عرصہ ہوا کہ میسور کے ایک دیسی اخبار میں ایک نہایت دلچسپ مضمون ایک میسوری عورت کی طرف سے نکلا تھا جسکا ترجمہ انگریزی اخبار میسور اسٹنڈرڈ میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اُسنے اپنے ہموطنوں سے رقت آمیز اپیل ہندوستان کی عورتوں کی طرف سے کیا ہی۔ ہمارے خیال میں ایسا کوئی شخص سنگدل نہوگا جو اس سیدہے سادہے اپیل کو غور سے پڑھے اور اُسکا دل نہ پسیجے۔ فقرات ذیل سے پڑہکر اور کونسی عبارت زیادہ مؤثر اور رقت انگیز ہو سکتی ہی۔ وہ کہتی ہیں کہ جسوقت ہم محض نابالغ ہیں اور سن تمیز کو نہیں پہنچتی ہیں آپ لوگ کنیادان کے بہانہ سے جسے چاہتے ہیں ہمیں سپرد کر دیتے ہیں لیکن اسکے نتائج آیندہ کون بھگتتا ہے ہم یا آپ اسکا جواب لڑکیونکے والدین اپنے دلوں پر ہاتھ رکھکر خود دیسکتے ہیں۔ کل خط کا مضمون حسب ذیل ہے۔

اے میرے مہربان ہموطنو۔ یہ امر تو معمولی سمجھ کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے کہ صرف وہی ملک ترقی کے زینہ پر چڑہ سکتا ہے جہاں عورتوں کو کسی قسم کا رنج والم نہیں۔ اگر آپ ہندوستان کو چھوڑکر دوسرے ملکوں پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جس حد تک عورتیں رنج وغم سے آزاد ہیں اُسی حد تک وہ ملک ترقی کے راستہ میں آگے بڑھا ہوا ہے۔ لیکن آپ کی خوشحالی کس طرح ممکن ہی جبکہ آپ نے ہم کو موجودہ ذلیل حالت تک پہونچا دیا ہے باوجودیکہ آپ خوب جانتے ہیں کہ آیندہ نسلیں ہمیں سے پیدا ہونے والی ہیں آپ کس طرح سرسبز ہو سکتے ہیں جبکہ آپ نے ہم کو انواع واقسام کے غموں کا شکار بناکر دراصل ہم کو تباہ کر دیا ہے۔ کیا آپ

جانتے ہیں کہ اس ملک کے باشندے قوائے جسمانی اور دماغی میں کیوں دن بدن گھٹتے جاتے ہیں اور غیر حکومت کی غلامی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگرچہ آپ اس نابرداشتنی حالت کو بھو سمجھ گئے ہیں لیکن ہنوز آپ نے اس حالت کے اسباب کو نہیں جانا بلکہ آپ کا فعل مثل اُس شخص کے ہے جو ایک تناور درخت کو کاٹ کر خود اُسکے گرنے سے چکنا چور ہو گیا۔ اگر علم و عقل اور دولت کے ذریعے آپ خوش و خرم ہونا چاہتے ہیں تو خوب سمجھ لیجیے کہ یہ امر اُسی وقت ممکن ہے جبکہ آپ ہم عورتوں کو باآرام اور تکالیف سے باز رکھیں گے۔

افسوس ایشر آپ کی اس سخت دلی اور خود غرضی کو ہرگز جائز نہ رکھے گا۔ مہذب اور شائستہ اقوام کی نظروں میں تو آپ حقیر ہو ہی چکے ہیں۔ سرکار انگریزی نے رسم ستی کو موقوف کر کے ہم کو عذاب ابدی میں مبتلا کر دیا ورنہ ہم کو وہ تکالیف ہرگز برداشت نہ کرنا پڑتیں جو آج ہم سہ رہی ہیں۔ جو تکلیف ہم کو ستی ہونے میں صرف ایک دفعہ سہنا پڑتی وہ عمر بھر بھگتتی ہیں۔ اے پرماتمن ہم بالکل ہی مجبور ہو گئی ہیں آپ لوگوں کی فعل مختاری کو کوئی روکتا نہیں۔ سرکار اس بارہ میں مداخلت کرتی نہیں۔

گوکھلے۔ نبرجی۔ تلک اور میرے دوسرے بھائی جنھوں نے ملکی فلاح کی خاطر اپنی جان تک دیدینے کا ارادہ کر لیا ہے اور اس غرض سے عام پلیٹ فارم پر چڑھکر دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں لیکن افسوس وہ بھی ہماری طرف نظر توجہ نہیں پھیرتے۔ سری رام کرشن پرم ہنس کے شاگرد تمام دنیا میں ایک مذہب رائج کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بارہ میں وہ بھی خاموش ہیں۔ ہم اس امید میں انتظار کرتے کرتے تھک گئے کہ ہماری مادر مہربان مسیز اینی بسنٹ تو ضرور ہی اپنی ہندوستانی بہنوں کی طرف توجہ کرینگی لیکن افسوس کہ وہ بھی اپنے کاشی کالج کے بارہ میں تجاویز سوچنے ہی میں محو رہتی ہیں۔ سوشل ریفارم ایسوسی ایشن جو قائم ہوئی ہیں وہ ہنوز اپنے بچپن کی حالت میں پڑی ہیں۔ رہے ہمارے بڑے بڑے پجاری و مٹھ دھاری سو وہ شب و روز یہی جاپ کرتے رہتے ہیں کہ عورتوں کو آزادی ہی نہیں۔ اب

بتلایئے کہ ہم کس سے فریاد کریں اور کس سے مدد کے خواستگار ہوں۔ ہائے افسوس ہماری مشکلات کی کچھ حد ہی نہیں۔ برہمن عورتوں کو سب سے زیادہ مصیبت کا سامنا ہے اور برہمنوں میں بھی وہ جو اپنے تئیں کلین کہتے ہیں اور بیوگی کے عذاب ابدی میں مبتلا ہیں جب ہم نابالغ ہیں اور سن تمیز کو نہیں پہونچتی ہیں آپ ہم کو کنیاں دان کے بہانے سے جسے چاہیں دیدیتے ہیں۔ لیکن اسکے نتایج کون بھگتتا ہے آپ یا ہم۔ جب ہم سن بلوغ کو پہونچتی ہیں اور گرہست آشرم کو پہچاننے لگتی ہیں تو بہت سے خاوند تو اسقدر نکمے نکل جاتے ہیں کہ اپنی کمائی سے خاندان کی پرورش نہیں کر سکتے۔ بہت سے مرد اور عورت بسبب خانگی جھگڑوں کے گرہست آشرم سے متنفر ہو جاتے ہیں اور باہم محبت نہیں کرتے۔ جبکہ خود ہمارا جسم بخوبی نشو و نما نہیں پاتا اور ہم مائیں بنجاتی ہیں تو اس صورت میں اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے اور چند روز زندہ رہکر موت کا لقمہ بنجاتی ہے۔ کیا آپ صغرسنی کی شادی موقوف نہیں کر سکتے جو ان تمام خوفناک نتایج کا سبب ہے اور کیا ہم کو اجازت نہیں دیسکتے کہ ہم سن بلوغ کو پہنچکر اپنے والدین اور بزرگوں کی صلاح و مشورہ سے اپنی شادی آپ کریں اور اپنی خوفناک حالت کو تبدیل کر دیں۔ بالغ ہونے سے پیشتر ہم کو جمراج کے حوالہ نہ کیجیے۔ بلکہ اس سے تو یہ بہتر ہے کہ آپ ہماری آنکھوں پر پٹی باندھکر جنگل میں چھوڑ دیجیے جہاں جنگلی درندے ہم کو پھاڑ ڈالیں۔ بعض بدبخت مہاراج منو اور دوسرے رشیوں پر دھبا لگا کر کہتے ہیں کہ وہ صغرسنی کی شادی کی اجازت دیدیتے ہیں اور یوں ہمکو بیوہ بنا کر عذاب دوزخ میں گرا دیتے ہیں آپ کی معیوب کارروائی کے باعث ہمارے خاوند بچپن میں یم پور کی سیر کرتے ہیں اور ہم اپنا سر منڈوا کر لال بسترہ دھارن کرتی ہیں اور یوں بدشکل بنکر چڑیوں کی طرح خوفناک بنجاتی ہیں اور ہمارے ساتھ اُن کُتّوں سے بھی بُرا سلوک کیا جاتا ہے جو آپ کے دربان ہیں۔ ہماری صورت بدشگنی اور لعنت کا باعث ہو جاتی ہے۔ کیا ہمارے ساتھ ایسی بدسلوکی کر کے آپ دل میں خوش ہوتے ہیں ایشور کی یہ آگیا تم کو کہاں سے ملی کہ ہم کو اس قسم کی تکلیفیں دو کیا تم کو شرم نہیں آتی کہ

اپنے لیے تو تم اس قدر واویلا کرتے ہو کہ گورنمنٹ ہمارے ساتھ ایسی بدسلوکی کرتی ہے اور یوں تم پولیٹکل ایجی ٹیشن کر کے اپنی رہائی چاہتے ہو اور یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ہم مہذب قوم ہیں اور انسانیت رحم اور ہمدردی رکھتے ہیں اور اسواسطے پولیٹکل آزادی چاہتے ہیں کیا کبھی ممکن ہے کہ جو اپنی عورتوں کے ساتھ انصاف سے پیش نہیں آتے وہ ملک کا انصاف کرینگے کیا تمہاری حکومت کبھی محکوم کی خوشی و خرّمی کا باعث ہوگی۔ کس طرح تم پولیٹکل آزادی حاصل کرنے کی جُرأت کر سکتے ہو۔ اے جھوٹے بہادرو تم اُس غلامی سے آزاد ہونے میں تو کامیاب ہوتے ہی نہیں جس میں تم اپنی ماں بہنوں اور بیویوں اور لڑکیوں کو رکھتے ہو۔ کیا تم میں یہ دوراندیشی نہیں کہ تم بہادر لڑکوں کو پیدا کرو جو تم کو اس غلامی سے رہائی دیں جس سے تم خود آزاد نہیں ہو سکتے ہو۔ ہاں جب تم ہماری حالت کو پہونچو گے تب جانوگے کہ خانگی غلامی کس چڑیا کا نام ہے۔ ہمارے پجاری اور مٹھ دھاریوں نے سمرتی کاروں کے اس قانون کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے کہ سوشل رسم و رواج کو زمانہ کی ضروریات کے مطابق تبدیل کرنا چاہیے۔ ہم چونکہ کمزور ذات ہیں ہمارے چلّانے کو مثل نقارخانہ میں طوطی کی آواز کے کون سُنتا ہے۔ جس شخص کی عورت مرجاوے وہ تو چاہے جتنی دفعہ شادیاں کرے لیکن ہم بچاری اگر اتفاق سے اگر ہمارا پہلا ہی شوہر فوت ہو جائے ہمیشہ شوک ساگر ہی میں ڈوبتی رہیں جن لوگوں کے سینہ میں جیتا جاگتا دل ہے وہ اُسپر ہاتھ رکھ کے ذرا بتلاویں تو سہی کہ یہ کیا منطق ہے۔ جب تمہاری پہلی بیوی فوت ہو جاتی ہے تو تم بھی ہماری طرح سنیاس آشرم اختیار کر کے کیوں گوشۂ تنہائی میں نہیں بیٹھ جاتے اور دنیاوی عیش و عشرت کا تیاگ کیوں نہیں کر دیتے اسلیے کہ تم اپنے لیے اسکی ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ زندگی کی خوشیاں اور آرام بھوگتے رہتے ہو لیکن ہمیں کو طرح طرح کی مصیبتوں میں چھوڑ دیتے ہو۔ یہی تمہارا انصاف ہے۔

از آریہ پتر

ناظرین کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ یہ پُر درد اپیل خیالی ہے۔ نہیں نہیں بالکل واقعی ہے
ہم مسلمانوں کی ہی گو مذہبًا تو ہر قسم کی جائز آزادی حاصل ہے۔ لیکن رسم ورواج کے بندے
بہت سے مسلمان انہیں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں جیسکے قیدی اسی طرح فریاد کر رہے
ہیں اس سے مسلمان سوچیں سمجھیں اور غور کریں اور مذہب کو مضبوط پکڑیں۔

اڈیٹر

اڈیٹوریل

بارہ نصیحتیں جو جاپانی مائیں
اپنی بیٹیوں کو
اُنکی شادی کیوقت کرتی ہیں

(۱) جسوقت تمہاری شادی ہوگئی پھر تم میری لڑکی نہیں رہیں۔ اسواسطے تم کو اپنے ساس سسر کی ویسی ہی اطاعت کرنی چاہیے جیسی تم ابتک اپنے والدین کی کرتی تھیں۔

(۲) جب تمہاری شادی ہوگئی تو ایک اجنبی شخص یعنی تمہارا خاوند تمہارا مالک ہوگیا۔ پس تم حلیم و خلیق رہو۔ عورت کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ اپنے خاوند کی فرماں برداری کرے۔

(۳) ہمیشہ اپنی ساس سے اس طرح پیش آؤ کہ وہ تم سے محبت کرے۔ خاوند کی طرف سے کبھی بدگمانی نہ کرو۔ بدگمانی تمہاری محبت کو خاوند کے دل سے نکال دیگی۔

(۴) گو تمہارا خاوند کچھ خطا کرے لیکن تم غصہ مت ہو۔ بلکہ صبر کرو۔ اور جب اُسکا مزاج دھیما ہوجائے تو نرمی کے ساتھ اُس سے باتیں کرو۔

(۵) بہت بات مت کرو۔ اپنی پڑوسنوں کی بُرائی ہرگز نہ کرو۔ اور یاد رکھو کہ جھوٹ بولنے کی روسیاہی بہت شرم انگیز ہی۔ اسکو زہر ہلاہل سمجھو۔

(۶) سویرے اُٹھو۔ اور دیر سے سوؤ۔ دن کو ہرگز ہرگز نہ سوؤ۔ اور شراب مطلق نہ پیو۔

(۷) نجومیوں سے قسمت کا حال مت دریافت کرو۔ وہ کچھ نہیں جانتا ہی۔ اور دل میں ناحق وہم پیدا ہو جاتا ہے۔

(۸) عمدہ منتظم بنو۔ اور خاصکر گھر کے اخراجات میں جہانتک ممکن ہو کفایت شعاری کرو۔

(۹) عام جماعتوں میں شریک ہونا اچھی بات ہے۔ لیکن وہاں کچھ بولنے کے لیے پچاس برس کی عمر کا انتظار کرو۔

(۱۰) چمکیلے رنگ کے کپڑے مت پہنو۔ اور اوچھے مذاق کی چیزوں سے نفرت کرو۔

(۱۱) صاف کپڑے پہنو۔ اور صفائی سے رہو۔ شرمسار بننا اچھا نہیں ہی۔

(۱۲) اپنے باپ کی دولت پر فخر نہ کرو۔ اگر وہ کچھ بھی ہی خواہ نواب یا رئیس۔ لیکن سُسرال والوں کے سامنے اُس کی دولت کا تذکرہ نہ کرو کیونکہ یہ اوچھاپن ہی۔

سررشتہ تعلیم پنجاب

اس سررشتہ کی رپورٹ بابت ۰۶-۱۹۰۵ء سے معلوم ہوتا ہے کہ صوبہ پنجاب میں تعلیم نسواں کی برابر ترقی ہوتی جاتی ہے۔ لڑکیوں کے پرائیویٹ اسکولوں میں بہ نسبت سال ماسبق کے ۲۶ کی بیشی ہوئی ہی۔ اب اُس صوبہ کے تمام زنانہ اسکولز کی تعداد ۵۲۵ ہے اُن میں ۹۳۵۲ لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ سال گذشتہ سے ۳۱۹ کی بیشی ہوئی ہے۔

بدایوں میں عجیب شادی

بدایوں کی خبر ہے کہ وہاں ایک شخص کی دو بیویاں یکے بعد دیگرے فوت ہوگئیں۔ اب

وہ شخص تیسری شادی کرنے والا تھا کہ نئی دلہن کے گھر والوں نے دولھا کو کہلوا بھیجا کہ چونکہ یہ بات مسلم طور پر مانی گئی ہے کہ جس شخص کی دو بیویاں مرگئی ہوں اُس کی تیسری بیوی بھی مرجاتی ہے اسلیے آپ اول ایک گڑیا سے شادی کریں اور پھر اُسکے بعد دُلہن کو بیاہ کرلیجائیں - چنانچہ دولھا صاحب نے پہلے ایک گڑیا سے شادی کی اور یہ شادی خوب دہوم دہام سے کی گئی - بعد ازاں اس گڑیا کو مُردہ تصور کیا گیا اور اُسکا جنازہ بھی پوری حیثیت سے اُٹھایا گیا - اسکے بعد دولھا صاحب نے نئی دلہن کو بیاہا اور اپنے گھر لائے -

یہ شادی اگرچہ تیسری تھی مگر گڑیا بیاہنے کے باعث چوتھی قرار پائی - اب دولھا دُلہن کے گھرانوں کے لوگ بشاش پائے جاتے ہیں - ابھی تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ دولھا تعلیم یافتہ ہے یا پُرانے اُصولوں کا قائل ہے ؟

حیدر آباد میں زنانہ مدرسہ

حضور نظام کی اجازت خاص سے بلدۂ حیدر آباد و مضافات کے ذی رتبہ اشخاص کی لڑکیوں کے لیے پردہ کے انتظام کے ساتھ ایک مدرسۂ زنانہ کا افتتاح بمقام حیدر آباد ۲ - فروری سنہ ۱۹۰۷ء مطابق ۲ - فروردین ۱۳۱۶ ف م ۱۸ - ذالحجہ سنہ ۱۳۲۴ ہجری روز شنبہ کو ہوا - فی الحال اس مدرسہ کے لیے ایک مکان لیا گیا ہے جو اسٹیشن کے سامنے نواب سربلند جنگ بہادر کے بنگلہ کے شمال کی جانب واقع ہے - اس مدرسے کا انتظام چند خواتین کی ایک مجلس کے تفویض رہے گا - جس کی صدر نشین مسز کیسن واکر رہینگی - صدر معلمہ کی خدمت کے لیے سرکار نے مس جافری کا انتخاب کیا ہے جنہوں نے اکسفورڈ یونیورسٹی کے فائنل سکول کا امتحان اونرز کے ساتھ سنہ ۱۹۰۵ء میں پاس کیا ہے اور اُسی زمانہ سے معلمہ کا کام کر رہی ہیں - فی الحال دو مددگار معلمہ مقرر کی گئی ہیں ان میں سے ایک انگلش لیڈی ہیں اور دوسری حیدر آباد کی ایک خاتون ہیں - پانچ سال سے زائد عمر والی لڑکیوں کی ضروریات

کے لحاظ سے نصاب تعلیم معین کیا جائیگا اور مندرجہ ذیل مضامین کی تعلیم کا لحاظ خاص طور سے رکھا جائیگا۔

تعلیم زبان اُردو۔ فارسی۔ انگریزی۔ حساب موسیقی۔ سوزن کاری سادہ کاری اور گلکاری۔ حصول انتظام خانہ داری وہنر شیار دکھا کر تعلیم دینے کا جو طریقہ ہو اُسکے بموجب حسب مناسب تعلیم دیجائے گی۔ تعلیم کا وقت دن کے پونے گیارہ بجے سے شام کے چار بجے تک ہوگا اور بیچ میں ایک گھنٹہ کی چھٹی رہے گی۔ ہر ہفتہ اتوار اور جمعہ کی تعطیل ہوا کریگی اور تمام تعطیلات سرکاری بھی دیجائینگی۔

چونکہ مدرسہ مخصوص اعلیٰ خاندان کی لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کھولا جا رہا ہے اس لیے یہ قرار پایا ہے کہ مدرسہ میں داخل ہونے کے لیے تمام درخواستوں پر قبل اسکے کہ وہ مجلس خواتین میں بغرض لحاظ پیش ہوں مجلس مذکور کی کم سے کم ایک خاتون کی سفارش ہونی ضرور ہے لیکن اسکا قطعی فیصلہ خواتین کریں گی کہ درخواست منظور کیجائے یا نہیں۔

سوئیزرلینڈ کی لایق عورتیں

بڑے بڑے کاموں پر ہیں کوئی انجنیر ہی کوئی پروفیسر اور کوئی بیرسٹر کوئی وکیل۔ ایک عورت اخبارات سوئیزرلینڈ کی طرف سے نامہ نگار بنکر جاپان و روس کی جنگ میں گئی تھی جسنے وہاں کے اخبارات کو تازہ تازہ اور عمدہ عمدہ حالات دیئے تھے۔ ہمارے نزدیک یہ کام نازک خصوصاً جنگ کے وقت دُنیا میں کسی عورت نے انجام نہ دیا ہوگا۔ مدعا یہ کہ لایق عورتیں سب قسم کے کاروبار انجام دے سکتی ہیں۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ عورت اپنی ہنئاخت اور بناوٹ میں مردوں سے بہت ضعیف ہے اور وہ مردوں کی برابری نہیں کر سکتی۔

ایک روسی لیڈی کی فیاضی

شہر تفلیس میں وہاں کے ڈاکٹر اسیسوف کی لیڈی نے ایک خاص گرل اسکول اپنے ذاتی خرچ سے کھولا ہے۔ جس میں ماہوار اپنی جیب سے اسی روبل خرچ کرنے کے علاوہ روسی زبان کی تعلیم بھی خود ہی دینا گوارا کیا ہے۔ شیخ حسین آفندی مفتی تفلیس کی لائق بیٹی گوہر خانم جنھوں نے اس شہر کے بڑے زنانہ اسکول سے اعلیٰ تعلیم کی سند حاصل کی ہے وہ مذکورہ بالا مدرسہ میں دستکاری کے کاموں اور ترکی زبان اور علوم دینیات کی مفت تعلیم دیتی ہیں تاکہ مسلمان لڑکیوں کو اپنے مذہب کی طرف سے لاعلمی نہ رہے۔

آگرہ میں ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال، امیر صاحب سے ملیں امیر صاحب نے اُن سے کہا کہ "میں نے آپ کے عمدہ انتظام کے حالات اخباروں میں دیکھے ہیں چونکہ آپ عورت ہیں۔ لہٰذا یہ امر بہت ہی قابل تعریف ہے"۔ بیگم صاحبہ نے شستہ اور برجستہ فارسی زبان میں جواب دیا کہ "یہ تمام کامیابی برٹش راج کا اقبال ہے"۔ امیر صاحب نے فرمایا یہ سچ ہے۔ مگر جو نظیر آپ نے قائم کی ہے۔ ہر عورت یہ نہیں کر سکتی"۔ یہ کہکر امیر صاحب نے یہ شعر پڑھا ؎

نہ انجیر شد نام ہر میوۂ
نہ مثل زبیدہ است ہر بیوۂ

عورتوں کے ووٹوں کا جھگڑا

عورتوں کے ووٹ دلانے کی حامی عورتوں نے ایک سخت کوشش کرکے ہوس آف کامنز میں پہنچنے کی کوشش کی۔ پولیس کو بہت زور لگانا پڑا۔ گھڑ چڑھی پولیس

عورتوں کے ہجوم کے مابین جاگھسی اور اُن کو ریل ڈھکیل کر ایبی میں لیگئی۔ پولیس نے ۲۵ عورتوں کو گرفتار کیا۔ جن میں جنرل فرنچ کی بہن اور مسز ڈسپارڈ بھی ہیں۔

عورتوں کی تعداد آٹھ سو تھی۔ دو مرتبہ ہوس آف کامنز پر حملہ کیا چھ گھنٹے تک کشمکش ہوتی رہی۔ گرفتار عورتیں کہتی ہیں کہ پولیس نے نہایت وحشیانہ کارروائی کی۔ اور بہت سختی سے پیش آئی۔

ایک امریکن اخبار نے عجیب خبر دی ہے کہ برٹش کولمبیہ کے علاقہ میں جو ہندی مزدور کام کرتے ہیں اُن میں ایک سو سے زیادہ مزدور دریافت کیے گئے جو اصل میں عورتیں ہیں اور مردوں کے بھیس میں کام کرتی ہیں۔ ان کی پوشاک اور طرز تقریر بالکل مردانہ تھا۔ یہ زنانہ مزدور لکڑیوں کے چیرنے میں بہت ماہر پائے گئے ہیں اور جو لوگ ان سے کام لینے پر مقرر ہیں رپورٹ کرتے ہیں کہ زنانہ مزدور بمقابلہ مردوں کے زیادہ محنتی اور جفاکش پائے گئے ہیں۔

جاپانیوں کی حب الوطنی

ترقی کرنے والی اقوام کے حرکات و سکنات ابتدا ہی سے کچھ اس قسم کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں کہ قدرت ہر قدم پر اُنکا ساتھ دیتی ہے اور ایسی قوم کے افراد کو مقررہ وقت پر پہنچکر اُن اوصاف حمیدہ اور اخلاق ستودہ کی تحصیل میں کسی قسم کی دقّت محسوس نہیں ہوتی جو برگزیدہ اقوام کا مایۂ ناز ہوتے ہیں۔ حال کی جنگ ورُوس و جاپان نے قلیل عرصہ میں تمام دنیا کو منوا دیا ہے کہ جاپانیوں میں ترقی کرنے والی اقوام کے کیسے قابل قدر اور نایاب جوہر موجود ہیں منجملہ اُنکے جاپانیوں کی حب الوطنی خاص طور پر زبان زد خلائق ہوگئی ہے۔ اس حب الوطنی کے کئی قصے جو وقتاً فوقتاً سُننے میں آتے ہیں جو ہم ہندوستانیوں

سامنے بالکل نئے عالم کا منظر پیش کرتے ہیں۔ جاپانی ابتدا ہی سے اپنے بچوں کو حب الوطنی کی تربیت ایسے پیرایے میں کرتے ہیں کہ بڑے ہو کر وہ لازمی طور پر حب الوطنی کی مجسم تصویر بنجاتے ہیں۔ ولایت کے ایک صاحب سٹوڈیل نے حال میں جاپان کی ترقی پر ایک کتاب لکھی ہے اور اُس میں ایک غریب جاپانی طالب علم کا خط درج کیا ہے جو اپنی ترقی کا راز خود اپنی زبان سے بیان کرتا ہے۔ اسکا اختصار درج کرنا دلچسپی سے خالی نہو گا۔ طالب علم لکھتا ہے کہ "اب میں آپ کو امن اور جنگ کی حالتوں کی ایک کہانی سناتا ہوں۔ جنگ شروع ہونے کے بعد اب اگر کوئی بچہ روتا ہے تو اُسکے والدین نرمی کے ساتھ اُس سے پوچھتے ہیں" توکیا تم روسی ہی بنوگے" اسپر بچہ شرمسار سا ہو کر فوراً چپ ہو جاتا ہے لیکن اگر بچہ اسپر بھی رونے چلانے سے باز نہ آئے تو والدین اُسے سختی سے ملامت کرتے اور کہتے ہیں کہ "معلوم ہوتا ہے تم سچ مچ روسی لڑکے ہو" یہ الفاظ سُننے کی کوئی لڑکا تاب نہیں لاسکتا۔ بلکہ فوراً درشتی سے جواب دیتا ہے کہ "میں روسی نہیں جاپانی ہوں اور بڑا ہو کر لڑنے بھی جاؤنگا جتنا جی چاہے مجھے پیٹ لو۔ مگر ایسی بے عزتی کے الفاظ مت کہو" جناب من! ان الفاظ سے آپ کو معلوم ہو گا کہ کسی کام میں کامیاب نہونا ہمارے لیے نہایت مشکل ہے۔ یہ ہے وہ تربیت جس سے ترقی کرنے والی قومیں بنتی ہیں ایک ہم ہیں کہ جہالت کے نشہ میں سرشار ہیں۔ اور خواب غفلت سے بیدار ہونے کا نام نہیں لیتے۔

تقریر ہر ہائینس نواب بیگم صاحبہ بھوپال

بھوپال میں نوبل اسکول کے طلبار کو تقسیم انعامات کا جلسہ حال میں منعقد ہوا تھا، ہر ہائنس نواب بیگم صاحبہ دام اقبالہا بذات خود صدر جلسہ تھیں۔ سب سے اول مسٹر پین پرنسپل اسکول نے سالانہ رپورٹ سُنائی اُسکے بعد ہر ہائنس نے تقریر فرمائی جو اپنے مطالب کے لحاظ سے بھوپال کی تاریخ میں ایک عدیم المثال چیز ہے۔ ہر ہائنس کی

تقریر بہت طویل اور از سر تا پا اس شکایت سے مملو ہے کہ باوجود متعدد مدارس دینی اور دنیاوی تعلیم کے مہیا کر دینے کے اہل ریاست جیسا کہ چاہیے تعلیم سے فائدہ حاصل نہیں کرتے اور دل چراتے ہیں، یہانتک کہ تعلیم یافتہ لوگ جو ریاست کی خدمت سرانجام دے سکیں اس قدر عنقا ہیں کہ بیرون ریاست سے بلائے جاتے ہیں اور مختلف خدمات اُن کو سپرد کیجاتی ہیں ہر ہائینس نے فرمایا کہ "یہ بخوبی معلوم ہے کہ اعلیٰ تعلیم آجکل گراں شے ہے اور اسی خیال سے میں نے والدین کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے تعلیم مفت کر دی ہے۔ نوبل اسکول کا خرچ سالانہ بیس ہزار روپیہ ہے اور اسکے لیے ایک تازہ عمارت بہت شاندار زیر تجویز ہے جو قریباً ایک لاکھ روپے میں تیار ہوگی۔ بہت سے اسکالرشپ بھی مستحق طلبار کے لیے مقرر ہیں۔ مگر یہ صرف کثیر میں صرف اپنے بیٹے حمید اللہ خان کے لیے گوارا نہیں کرتی، اُس کی تعلیم کے لیے تو صرف مسٹر پین کافی ہیں اور ڈیلی کالج اندور اور حسب کا میور کالج موجود ہیں۔ میں نے اپنے لڑکے کو یہاں اسلیے داخل کیا ہے کہ جاگیرداران ریاست کو اس مثال سے اپنے بچوں کو یہاں بھیجکر پڑھانے کی ترغیب ہو، لیکن افسوس ہے کہ لڑکوں کی تعداد بہت قلیل ہے اور میری تمام تنبیہیں اور تاکیدیں بے اثر ثابت ہوئیں، آخر میں نے حکم دیا ہے کہ بے عذر معقول اسکول سے غیر حاضر طلبار اور اُنکے والدین کی آمدنی کا ایک حصہ قرق کرکے ہونہار اور شوقین طالبعلموں کے وظائف و امداد میں خرچ کیا جائے۔ اگر امیر ہی لوگ علی الخصوص جاگیردار متنبہ نہوئے تو میں اور بھی زیادہ سخت تدابیر اختیار کروں گی جیسی کہ شہنشاہ جاپان نے اپنی رعایا کی بہتری کے لیے اختیار کی تھیں۔ بہت افسوس کی بات ہے کہ آجکل کے مسلمان تعلیم کی قدر و قیمت نہیں سمجھتے اور اپنے پیغمبر صلعم کی تاکیدوں سے بھی بے پروا ہیں۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ نہ صرف ہمارے مرد بلکہ عورتیں بھی علوم و فنون حاصل کرتی تھیں۔ ہماری مہربان گورنمنٹ نے بھی ملک میں بصرف زر کثیر مدارس تعلیمی کھول دیتے ہیں مگر مسلمان اُنسے جیسا کہ واجب ہے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ دیسی ریاستوں میں مثل بڑودہ، میسور، گوالیار نے بھی خاصی ترقی کی

اور وہاں کی رعایا اپنے حکمرانوں کی فیاضی سے پورے طور پر مستفید ہوتی ہے، لیکن افسوس ہی کہ میری ریاست کی رعایا بالکل بے پرواہ بلکہ تعلیم کی مخالف ہی۔"

اسکے بعد ہر ہائنس نے شکایت کی نہ صرف تعلیم میں بلکہ اپنے آبائی ہُنر اور کرتبوں سے جیسے کہ شہسواری۔ نیزہ بازی، نشانہ بازی وغیرہ کا جو افغان قوم کی اسقدر عزیز صفات ہیں نیز تجارت اور صنعت و حرفت سے ہی اہل بھوپال اور اُسکے جاگیردار بے پرواہ ہیں اور ان سب مشکلات کا علاج تعلیم ہے۔ ہر ہائنس نے فرمایا کہ تعلیم سے میری مراد یہ نہیں کہ طوطے کی طرح چند کتابیں زبانی یاد کریں۔ ایسے لوگ چارپائی بر دکتا بے چند کے مصداق ہیں۔ حقیقی تعلیم انسان کے حق میں ایک برکت ہے وہ اُسکے دل کو روشن کر دیتی ہی اور تعلیم ہی کی روشنی میں انسان اپنے تئیں پہچان سکتا اور خدا کی ہستی کو جان سکتا ہے اور اُسکے رسول پر ایمان لا سکتا ہی۔ نیک و بد کی تمیز بھی اُسے علم سے ہی حاصل ہوتی ہی۔ خلوص و صداقت سے وفاداری کا سبق ہی علم سے حاصل ہوتا ہی، تنگدلی اور تعصب سے طبیعت آزاد ہوتی ہی اور خودداری۔ ایمانداری، محبت، رحمت، تہذیب و شایستگی کی روح انسان میں پیدا ہوتی ہی۔

ہر ہائنس کی بیش بہا تقریر نہ صرف بھوپال کی موجودہ تعلیمی حالت کا افسانہ ہی بلکہ آیندہ ترقی کی پیشین گوئی بھی اس میں پڑھی جا سکتی ہے۔ یہ امر مسلم ہی کہ والی ملک کے ترقی کرانے سے رعایا برسوں کے بجائے ہفتوں اور مہینوں کی جگہ دنوں میں ترقی کی راہ طے کرتی ہے۔ اسپر ہر ہائنس کی یہ تنبیہہ کہ وہ آیندہ سخت تر تدابیر اختیار کرینگی" اپنا اثر کیے بغیر نہ رہے گی۔ اور وہ دن دور نہوگا کہ ترقی یافتہ دیسی ریاستوں میں بھوپال کا نام بھی فخر کے ساتھ لیا جائیگا۔

مردوں اور عورتوں کی آبادی میں نسبت

ہمارے دوست مسٹر ضیاء الحسن علوی مردم شماری سے ایک دلچسپ اعداد و شمار دکھلاتے ہیں

جس سے عمدہ نتیجہ خیز معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس مضمون میں یہ دکھانا منظور ہے کہ عورتوں مردوں کی باہم آبادی میں کیا نسبت ہے۔ اور یہ خیال کہ "عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت زیادہ ہے" کہانتک ٹھیک ہے۔ اسی کے ساتھ اس مسئلہ پر بھی روشنی پڑیگی کہ تعداد ازدواج کہانتک جائز ہے اور موجودہ مردم شماری کے لحاظ سے تمام دنیا میں ممکن ہے یا نہیں اگر تم زید سے یہ پوچھو کہ عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں کیا ہے تو وہ یہ کہیگا کہ مردونکی تعداد عورتوں سے کہیں زائد ہے۔ اور عمرو سے یہی سوال کرو تو وہ یہ جواب دیگا کہ نہیں عورتوں کی تعداد مردوں سے بہت بڑہی ہے۔ اور ان میں سے دونوں شخص ایسے بہت سے گھروں کا پتہ دینگے جن میں عورتیں زیادہ ہیں یا مرد۔ مگر ظن غالب ہے کہ عورتوں اور مردوں کی پیدائش کے لیے کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہے اسلیے کہ یہ نہیں معلوم ہوسکتا کہ ایک عورت سب لڑکے ہی پیدا کرتی ہے اور دوسری کی سب اولاد میں لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اور تیسری کی آدہی اولاد لڑکے ہیں اور آدہی لڑکیاں۔ یا کسی چوتھی کے لڑکے تعداد میں لڑکیوں سے زیادہ ہیں یا اُسکے برعکس معاملہ ہے۔

لیکن اگر ہم کسی خاص شہر یا ملک یا اقلیم کی آبادی کا شمار کریں تو ہم کو تقریباً عورتوں اور مردوں کی تعداد برابر معلوم ہوتی ہے۔ یا مردوں کی تعداد عورتوں سے ایک دو تین فیصدی یا اس سے کچھ زیادہ ہوتی۔ اور کہیں ایسا ہوتا ہے کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے کسی جگہ اسی تناسب سے زائد ہوتی ہے۔ اسکے چند اسباب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد فکر معیشت میں اپنے وطنوں کو چھوڑکر باہر نکل جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں عورتوں کی تعداد مردوں سے اس ملک یا شہر میں زیادہ ہوجائیگی۔ اور اسی طرح مردوں کی تعداد اُن ممالک میں جہاں وہ چلے گئے ہیں عورتوں سے بڑہجائیگی جسکی توضیح ذیل کی جدولوں سے خوب ہوتی ہے۔ جو ہم المقتطف سے ترجمہ کرکے لکھتے ہیں۔

اضلاع مصر

ملک	سنہ شمار	مرد	عورت	تناسب مرد	باہمی عورت
مصر	۶۱۸۹۷	۴۹۴۷۸۵۰	۴۷۸۶۵۵۵	۱۰۳	۱۰۰

مردوں کی زیادتی بعض ممالک میں بھرتی کی فوج کی وجہ سے بھی ہوتی ہے۔

سلطنت انگریزی

ملک	سنہ شمار	مرد	عورت	تناسب مرد	عورت
انگلینڈ و ویلز	۱۹۰۱	۱۵۷۲۱۷۲۸	۱۶۸۰۴۳۴۶	۱۰۰	۱۰۷
اسکاٹلنڈ	۱۹۰۱	۲۱۷۳۷۵۵	۲۲۹۸۳۴۸	۱۰۰	۱۰۶
آئرلینڈ	۱۹۰۱	۲۲۰۰۰۴۰	۲۲۵۸۷۳۵	۱۰۰	۱۰۳
آسٹرالیا	۱۹۰۱	۱۹۷۹۲۹۱	۱۷۹۶۷۸۲	۱۰۷	۱۰۰
نیوزیلینڈ	۱۹۰۱	۴۰۵۹۹۲	۳۶۶۷۲۷	۱۱۱	۱۰۰
کینیڈا	۱۹۰۱	۲۸۶۲۹۵۶	۲۷۲۵۳۶۶	۱۰۵	۱۰۰
جنوبی افریقہ	۱۹۰۴	۵۷۸۳۵۹	۴۴۱۳۳۸	۱۳۱	۱۰۰
میزانکل		۲۵۹۲۲۳۲۱	۲۶۶۹۱۶۷۳	۱۰۰	۱۰۳
برٹش انڈیا	۱۹۰۱	۱۱۷۷۷۴۴۱۲	۱۱۴۰۸۱۱۲۱	۱۰۳	۱۰۰
یونائیڈ کنگڈم	۱۹۰۱	۳۲۱۴۶۸۸۲	۳۰۳۱۴۶۶۷	۱۰۶	۱۰۰
سیلون	۱۹۰۱	۱۸۶۹۲۱۲	۱۶۶۶۷۴۲	۱۱۲	۱۰۰
میزانکل		۱۵۱۸۱۷۵۰۶	۱۴۶۰۶۵۵۳۰	۱۰۴	۱۰۰
ٹرانسوال	۱۹۰۴	۴۹۹۷۱۹	۴۳۷[illegible]۰۸	۱۱۴	۱۰۰
اورنج	۱۹۰۴	۱۲۸۵۲۴	۱۱۶۱۱	۱۱۱	۱۰۰
کیپ کالونی	۱۹۰۴	۹۰۰۳۶۶	۹۲۹۶۶۷	۱۰۰	۱۰۳

ملک	سنہ شمار	مرد	عورت	تناسب مرد	عورت
میزان کل		۱۵۲۸۶۳۹	۱۷۴۲۴۰۳۹۰	۱۰۳	۱۰۰
ممالک متحدہ امریکہ					
ملک	سنہ شمار	مرد	عورت	تناسب مرد	عورت
گورے	۱۹۰۰	۳۴۳۴۹۰۰۷	۳۲۲۶۴۱۷۸۱	۱۰۵	۱۰۰
حبشی	۱۶۰۰	۴۳۹۳۲۲۱	۴۴۴۷۵۶۸	۱۰۰	۱۰۱
ہنود امریکہ	۱۶۰۰	۱۳۴۵۶۰	۱۳۲۲۰۰	۱۰۲	۱۰۰
جاپان	۱۹۰۳	۲۳۶۰۰۰۳۱	۲۳۱۳۰۲۰۷	۱۰۲	۱۰۰
ممالک یورپ					
روشیا علاوہ فنلینڈ	۱۸۹۷	۶۳۲۳۹۸۸۶	۶۳۲۷۶۵۴۷	۱۰۱	۱۰۰
فرانس	۱۹۰۱	۱۸۹۱۲۹۸۹	۱۹۵۳۳۸۶۹	۱۰۰	۱۰۳
جرمن نو سے زیادہ عمر کے	۱۹۰۰	۲۷۷۳۷۲۴۷	۲۸۶۲۹۹۳۱	۱۰۰	۱۰۳
آسٹریا 〃	۱۹۰۰	۱۲۸۵۲۶۶۳	۱۳۲۶۸۰۱۵	۱۰۰	۱۰۳
اٹلی 〃	۱۹۰۱	۱۲۵۴۱۸۰۸	۱۲۸۴۴۶۶۶	۱۰۰	۱۰۳
مانٹی نیگرو 〃	۱۹۰۱	۹۵۰۲۱۷۲	۹۶۷۲۳۸۷	۱۰۰	۱۰۳
ہالینڈ	۱۹۰۴	۲۷۳۰۵۰۵	۲۷۷۹۱۵۴	۱۰۰	۱۰۲
بلجیم	۱۹۰۰	۳۳۲۴۸۳۴	۳۳۶۸۷۱۴	۱۰۰	۱۰۱
ڈنمارک نوزائدہ عمر سے کے	۱۹۰۱	۱۱۹۳۴۴۸	۱۲۵۶۰۹۲	۱۰۰	۱۰۵
سویڈن 〃	۱۹۰۴	۲۵۶۶۶۳۴	۲۶۹۳۸۷۷	۱۰۰	۱۰۵
ناروے 〃	۱۹۰۰	۱۰۸۷۶۰۳	۱۱۵۲۴۲۹	۱۰۰	۱۰۶
اسپین 〃	۱۹۰۰	۹۰۸۷۸۲۱	۹۵۳۰۲۶۵	۱۰۰	۱۰۵
پرتگال 〃	۱۹۰۰	۲۵۹۱۶۰۰	۲۸۳۱۵۳۲	۱۰۰	۱۰۹

ممالک	سنہ شمار	مرد	عورت	تناسب مرد	عورت
سوئیسرا۔ شادی کے بعد سے	۱۸۸۸	۸۶۴۰۷۶	۱۰۰۲۱۴۴	۱۰۰	۱۰۳
میزان کل علاوہ اُسکے		۱۰۵۰۸۷۶۳۰	۱۸۵۹۳۱۳۸	۱۰۰	۱۰۳

جنوبی امریکہ

ممالک	سنہ شمار	مرد	عورت	تناسب مرد	عورت
مکسیک	۱۹۰۰	۶۷۱۶۰۷	۶۸۲۲۴۵۵	۱۰۰	۱۰۲
برازیل	۱۸۹۰	۷۲۳۷۹۳۲	۷۹۵۹۸۳	۱۰۲	۱۰۰
ارگنٹن	۱۸۹۵	۲۰۸۸۹۱۹	۱۸۶۵۹۶۲	۱۱۲	۱۰۰
چیلی	۱۸۸۵	۱۲۶۳۶۴۵	۱۲۶۳۶۷۵	۱۰۰	۱۰۰
اورگوائی	۱۹۰۰	۴۷۴۸۱۱	۴۴۰۸۳۶	۱۰۸	۱۰۰
میزان کل		۱۷۷۸۱۳۱۴	۱۷۴۶۵۹۴۱	۱۰۲	۱۰۰

یورپ کی اور اُن نسلوں کی جو جنوبی و شمالی امریکہ افریقہ اسٹرالیا اور نیوزیلنڈ میں ہیں تعداد ۲۴۲۴۷۰۱۲۸ مرد اور ۲۴۰۶۶۹۰۰۰ عورتیں ہیں۔ لہذا مردوں کی نسبت عورتوں سے ۱۰۰ اور ۱۰۱ کی ہے۔

اور ایشیائی اقوام میں ہندی مردوں کو ۱۰۴ کی نسبت ہے ہندی عورتوں سے اسکی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے لوگ لڑکیوں کی بچپنے میں پرورش و پرداخت کی اتنی زیادہ فکر نہیں کرتے جتنی بچوں کی کرتے ہیں۔ جاپان میں ۱۰۲ اور ۱۰۰ کی نسبت ہے اسکا بھی یہی باعث ہے۔ امریکہ کے حبشیوں میں ۱۰۰ اور ۱۰۱ کی نسبت ہے۔
ان تمام لوگوں کی تعداد جنکا شمار ایشیا یورپ امریکہ افریقہ اسٹرالیا و نیوزیلنڈ میں کیا گیا ہے لہذا مردوں کی نسبت عورتوں سے وہی ہے جو ۱۰۱ کو ہے ۱۰۰ سے یعنی مرد فیصدی ایک عورتوں سے زائد ہیں۔
اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرد و عورتوں کی تعداد ایک قاعدہ مقررہ پر جاری ہے۔ اسلیے تعداد ازدواج دنیا میں نہیں شائع ہو سکتا ہے کیونکہ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ نہیں ہے بلکہ کم ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

زنانہ نارمل اسکول

جب ابتداً علی گڈہ میں زنانہ نارمل اسکول کے جاری کرنے کی تجویز سکرٹری صیغہ تعلیم نسواں
نے لکھنؤ کی کانفرنس میں جلسے کے سامنے پیش کی تو لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ تجویز تو مفید ہے
لیکن یہ بتاؤ کہ لڑکیاں کہاں سے آئینگی اور استانیاں کہاں سے پڑہانے کو ملیں گی۔ ان سوالات کا
جواب بجز اسکے اور کچھ نہیں تھا کہ بلا کوشش کیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ مدرسے میں لڑکیاں کوئی
بھیجے گا یا نہیں۔ بعض بزرگوں نے یہانتک بھی کہا کہ کوئی شریف آدمی اپنی لڑکی مدرسے میں
نہیں بھیجے گا۔ ہم نے جواب دیا کہ اگر شرافت کے خلاف کوئی بات ہوگی تو واقعی کسی کو نہیں بھیجنا
چاہیے لیکن اگر ہمارے مدرسے کی تعلیم خیالات اور عادات کی شرافت اور شایستگی کو تقویت دینے والی
ہوگی تو کوئی وجہ نہیں کہ شرفا اپنی لڑکیوں کو تعلیم کے لیے نہ بھیجیں۔ خدا کا شکر ہی کہ اس وقت
ہم اپنے تجربہ سے اس بات کے کہنے کے مستحق ہیں کہ ہماری پیشین گوئی غلط نہیں تی۔ اور شرفا کو
ایک ایسے مدرسے میں اپنی لڑکیوں کو بھیجنے میں کوئی عار نہیں جہاں پر رسم و رواج کی قیود کے ساتھ
مذہب اخلاق اور عام علوم کی تعمیل ہوسکتی ہے۔ لیکن اب پبلک سے امداد کی ضرورت ہی۔ اور
اس مدرسہ کو فوراً وسعت دینی لازم ہے۔ ہمارے خاتون کے معزز خریدار جو ہر طبقہ اور ہر درجے کے
شریف بزرگ اور شریف بیگمات ہیں اُنسے خاص طور پر ہم اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس قومی مدرسہ کی
توسیع اور ترقی کی طرف توجہ فرمائیں۔

نہایت افسوس اور حسرت کی بات ہے کہ گذشتہ دو مہینوں میں ملک کے کئی سر برآوردہ اور
خاصکر صیغہ تعلیم نسواں کے حامیوں نے یکے بعد دیگرے انتقال فرمایا جس سے ملک کو سخت
صدمہ پہنچا۔ منجملہ اُنکے نواب صاحب بھاولپور کا انتقال ہے جو ایسا جانگداز واقعہ ہے جس پر
جتنا افسوس کیا جائے بجا ہے۔ نواب مرحوم کی جوانا مرگ کا غمناک حادثہ عدن میں پیش آیا
جبکہ آپ حج کعبہ سے واپس ہندوستان کو تشریف لارہے تھے۔ نواب مرحوم نہایت

روشن خیال محب ملک و قوم اور تعلیم نسواں کے پُر جوش حامی تھے۔ علیگڈھ کالج کے مقاصد سے اُن کو خاص ہمدردی تھی اور وہ اسکے لیے اجلاسوں میں شریک ہوئے۔ ایسے علم دوست والی ریاست کی وفات ہندوستان کی مسلمان آبادی کے لیے ایک دردناک حادثہ ہے۔

دوسرا واقعہ سردار محمد یعقوب خان بہادر وزیر ریاست خیرپور میرس سندھ کا ہے۔ مرحوم نے اپنے زمانہ وزارت میں سندھ کے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور اُنکی خدمات کا رعایا سے لیکر گورنمنٹ تک اعتراف کیا گیا تھا۔ مرحوم ہمارے صیغہ تعلیم نسواں کے بالخصوص بہت بڑے حامی تھے اور اُنکی قبل از وقت کی وفات سے ہم کو نہایت رنج ہوا۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خداوند عالم اُنکے پس ماندوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہمیں یہ سُنکر خوشی ہوئی ہے کہ ریاست نے اُنکی قابل قدر خدمات کے صلہ میں اُن کی بیگم صاحبہ کے لیے سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

خان بہادر ڈپٹی الٰہی بخش صاحب مرحوم کی موت بھی ہمارے لیے ایک صدمۂ عظیم ہے۔ مرحوم حضر میں سفر میں ہیں ہی صیغہ تعلیم نسواں کو نہیں بھولتے تھے اور ہر طرح پر اسکی امداد کرتے تھے۔

اسی طرح عطیہ خانم و زہرا فیضی صاحبہ کی نانی صاحبہ کی وفات بھی سخت افسوس کے ساتھ ہم نے سُنی گو عمر طبعی سے زیادہ کوئی جی نہیں سکتا لیکن ملک کے سچے محسنوں اور خیرخواہوں کی وفات سے ہمیشہ صدمہ ہوتا ہے اور جب اُنکے احسانات یاد آتے ہیں تو اور بھی رنج ہوتا ہے۔ خداوند عالم ان سب لوگوں کو غریق رحمت فرمائے۔ آمین

نمایش صنعت و حرفت نسواں کے فوٹو

ناظرین خاتون کو غالباً معلوم ہو چکا ہو گا کہ مثل سالہائے گذشتہ کے امسال بھی اجلاس کانفرنس کے ساتھ ڈھاکہ میں صنعت و حرفت نسواں کی نمایش کی گئی تھی - جس ہال میں نمایش کی چیزیں سجائی گئی تھیں اُسکے چاروں اندرونی رخوں کے فوٹو لیے گئے ہیں - تین فوٹو نمایش صنعت و حرفت نسواں کے ہیں اور ایک نمایش آلات کنڈرگارٹن اسکول کا - گھر بیٹھے ہوئے جن کو نمایش کی سیر کرنے کا شوق ہو تو وہ فوٹو منگا کر ملاحظہ کریں - قیمت فی فوٹو ۸/ ہر چہار فوٹو عسکا/

گروپ افتتاح نمایش - جس میں نواب صاحب بہادر ڈھاکہ اور اکثر مربیان و ممبران و سکرٹری صاحب صیغہ تعلیم نسواں کے فوٹو موجود ہیں - قیمت عسعہ/

اجلاس ہائے کانفرنس و کیمپ کانفرنس و اجلاس آل انڈیا مسلم لیگ کے فوٹو بھی تیار ہیں - قیمت فی کاپی فل سائز اسعہ

پتہ ابو الکمال اینڈ کو - بانس بریلی محلہ نالہ

زینت البنات

یہ کتاب ا - م - خ عظیم آبادی اہلیہ جناب محمد تمیز الدین خانصاحب ٹیلیگراف انسپکٹر کالکا شملہ ریلوے نے حال ہی میں تصنیف کر کے روز بازار پریس امرت سر میں چھپوائی ہے - چھپائی معمولی کاغذ کسیقدر اچھا حجم ۵۰ صفحہ ہے اور چار آنہ قیمت ہے -

ہم آجکل کی عورتوں کی تصانیف کو خصوصیت کے ساتھ غور سے پڑھتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے خواتین کے خیالات کی وسعت اور انکا پایہ علمی کیا ہے اور ہم کس ذریعے سے اُسکو ترقی دیسکتے ہیں -

مندرجہ عنوان تصنیف گو ا - م - خ بیگم کا اپنا ایک مکالمہ ہے جو مسز ملر و مسز ولیم سے ہوا تھا مگر اسمیں بہت سی باتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے - انتظام خانہ داری - زیور و لباس - تعلیم نسواں کی ضرورت - نصاب تعلیم - غرض ایک ضروری عنوان پر بحث کیگئی ہے - اور پردے کے دلائل بیان کرنے میں تو بڑی توجہ صرف کی ہے - زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے - گو اس کتاب میں مذہبی رنگ زیادہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ عمدہ نہایت درجہ پابند اسلام ہے مگر تاہم مکالمہ کی لطافت باقی ہے -

لیجئے اب تو حد ہو گئی

اُردو علم ادب کے بہترین و مشہور رسالہ

مخزن کی تیسری قسم

۱۵ - دسمبر ۱۹۰۶ء سے ہو بہو اُسی تقطیع - ضخامت ۶۴ صفحہ - لکھائی - چھپائی اور اُنھیں
مضامین کے ساتھ شائع ہو گی - اور باوجود ان خوبیوں کے چندہ صرف

ایک روپیہ سال بھر کے لیے

(۲ر محصولڈاک)

اس سے زیادہ اب اور کیا ارزانی ہو سکتی ہے - اب تو گویا

موتی کوڑیوں کے مول ہیں

ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی بامذاق شخص کا ہاتھ اس بے بہا اور دلاویز گلدستے سے خالی نہ رہے
اگر اسوقت بھی شایقین اُردو نے اس رعایت سے فائدہ نہ اُٹھایا تو افسوس ہو گا

درخواستیں بنام (منیجر مخزن - لاہور) ہوں

مخزن کے ہر نئے خریدار کو انتخاب مخزن بجائے عہ کے صرف ۱۰ر (مع محصول) میں دیا جاتا ہے
چندہ قسم اول ؎ قسم دوم عہ

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۷۱

خاتون

جلد ۴	ماہ محرم الحرام ۱۳۲۵ھ مطابق مارچ ۱۹۰۷ء	نمبر ۳

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

علی محمد خاں کے اہتمام سے
مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

خاتون

۱- یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علیگڑھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہی اور اسکی سالانہ قیمت (عہ/) اور ششماہی ۱۲/ ہے

۲- اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہی یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳- مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہی اور جبتک مرد اس طرف متوجہ نہوں گے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہورہے ہیں اُس کی طرف ہمیشہ مردوں کو متوجہ کرتے رہینگے۔

۴- ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جاوے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی اُنکو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اُس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہی معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵- ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶- اس رسالہ کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی مدد آپ کرنا ہی اگر اسکی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائیگا۔

۷- تمام خط وکتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علیگڑھ ہونی چاہیے۔

سودیشی تحریک کے متعلق میرا خیال

ناظرین خاتون صابرہ بیگم کے نام سے ناواقف نہیں ہیں۔ ابھی حال میں اُن کی کتاب مشیر نسواں پر خاتون میں ریویو ہو چکا ہے۔ اب وہ سودیشی تحریک پر اپنی بہنوں کو متوجہ کرتی ہیں۔

اڈیٹر

تحریک مذکور الصدر کے متعلق مجکو اپنے خیالات کے اظہار کی اسلیے ضرورت معلوم ہوئی کہ میں نے رسالہ خاتون کے ورقوں میں ایک لفظ بھی اس کی نسبت کسی بہن کا لکھا ہوا کبھی نہیں دیکھا غالباً اس مفید اور اہم مسئلہ کو فرقہ نسواں نے اپنے لیے غیر ضروری یا پولیٹکل مبحث کا کوئی ایسا جزو تصور کرکے جو گورنمنٹ ہند کی پولیسی کے مخالف ہو نظر انداز کر دیا ہی۔ اس میں شک نہیں کہ اہل بنگالہ کے بعض افراد نے اس تحریک کے پھیلانے میں ضرورت سے زیادہ جوش و خروش ظاہر کیا اور ایسی بدعنوانیاں اور رنگ آمیزیاں کیں کہ

حکمران قوم کے اعلیٰ عہدہ داروں میں ایک گونہ بدظنی پیدا ہوگئی غالباً یہی وجہ ہوگی کہ جو بنگالہ کے مسلمانوں نے اس تحریک کی مخالفت پر کمر باندہی۔ میرے خیال میں وہ لوگ جو بیجا اور بری ترکیب سے اس کی تائید کرتے ہیں اور وہ اشخاص بہی خواہ مخواہ مخالفت کرنے پر تلے بیٹھے ہیں نا عاقبت اندیشانہ افعال کے مرتکب ہیں۔ درصل یہ کوئی ایسی تحریک نہیں ہی جو گورنمنٹ ہند کے سیاسی اغراض کے مخالف ہو بلکہ یہ ایک ایسا خیال ہی جسکو ملکی تجارت سے تعلق ہی اور جسپر ایک بڑی حدتک قومی و ملکی ترقی و بہبودی کا دار مدار ہے۔ گورنمنٹ ہند ایک شفیق گورنمنٹ ہی جسکو ہر وقت ہمارے ملک کی ترقی و بہبودی منظور و مدنظر ہی وہ تو ایسے معاملوں میں ہماری ہر طرح مدد کرسکتی ہے۔ چنانچہ حضور ویسرائے اور گورنر صاحب بمبئی نے اس خصوص میں جو کچھ اپنے اپنے خیالات ظاہر فرمائے ہیں اُنسے صاف تائید ٹپکتی ہے۔

پس ایک سرسری نظر ڈالکر اس قابل قدر تحریک کی تائید نہ کرنی قومی ہمدردی سے بالکل بعید ہی ہر فرد بشر کا جسکو اپنا ملک پیارا اور اپنی قوم عزیز ہے یہ فرض منصبی ہونا چاہیے کہ قومی و ملکی ترقی و تہذیب کے اسباب فراہم کرے اور ملک کی خدمت دامے درمے رقمے قلمے سخنے جس طرح ممکن ہو کرنے میں دریغ نہ کرے۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ کوئی قوم سرسبز نہیں ہوسکتی جب تک کہ حرفت وصنعت وتجارت میں ترقی نہ کرے امریکہ وجاپان کی زندہ نظیریں ہمارے پیش نظر ہیں ان ملکوں کی مادی ترقی کا زیادہ تر باعث قوم کا احساس وخیال تجارت سے ہے یہ ظاہر ہی کہ جب تک ہم اپنی دیسی چیزوں کی قدر نہ کریں اور اُنکا استعمال کثرت سے نہ کریں ہماری قوم کے صناعوں اور تجارت پیشہ لوگوں کو ترغیب نہیں ہوسکتی اور نہ اُنکا کسی کام کو جی آگے بڑہ سکتا ہی گو ہماری صنعت وتجارت اسوقت گئی گذری ہی جب بھی وہ کونسی چیز ہماری ضرورت کی ہے جسکو ہمارا ملک پیدا نہیں کرسکتا یا ملک کے کاریگر تیار نہیں کرسکتے۔ یہ مانا کہ آرایشی ونمایشی اشیا جس صفائی ونفاست سے یورپ امریکہ میں تیار ہوتی ہیں ہمارے دیسی بھائی اُس طرح نہ تیار کرسکتے ہوں یا بعض چیزیں یہاں کے کاریگر بنانے میں عاری ہوں

مگر میں پوچھتی ہوں کہ اس میں قصور کس کا ہے۔ سراسر قوم کا قصور ہے مشین سے جو صفائی پیدا ہوتی ہے وہ عموماً ہاتھ سے نہیں ہو سکتی۔ ہم کو چاہیے کہ ضروری و مناسب مشینیں منگوائیں جو چیزیں نہ بنانی آتی ہوں اُنکا بنانا سیکھنے کی کوشش کریں۔ سیکھنے کے دو طریقے ہیں یا تو متعدد طلبا قومی سرمایہ سے امریکہ و جاپان حرفت وصنعت سیکھنے کے لیے بھیجے جایا کریں یا یہاں ہر ہر پریسیڈنسی کے دارالامارت میں ایک ایک درسگاہ قومی سرمایہ سے قایم کیجائے جہاں جاپان و امریکہ کے کاریگروں کو رکھکر دیسی طلبا سکھائے جائیں اور ایک طرف قومی سرمایہ سے کارخانے کھولے جائیں جہاں نوتعلیم یافتہ صناعوں کی کھپت ہو۔ اس سے یہ بھی ہوگا کہ قوم کا وہ حصہ جو بتلاش روزگار در در مارا پھرتا ہے روٹیوں سے لگ جایا کریگا اور ملکی پیداواریں جو یورپ و امریکہ میں آئے دن کھنچی جاتی ہیں اور شکلیں بدل بدلکر پھر یہاں آتی اور چوگنی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں۔ یہیں کام میں آیا کرینگی۔ اور ان کارخانوں کے منافع سے قومی دولت کو دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی رہے گی۔ ایسی درسگاہیں اور کارخانجات اُسی وقت کھلیں گے بلکہ مجبوراً ہم کو کھولنا پڑینگے جبکہ ہندو بھائیوں کی طرح ہم مسلمان بھی اسکا عہد واثق کرلیں کہ جو چیز خریدیں یا استعمال میں لادیں وہ دیسی ہو۔ یہ مانا کہ ابتدا میں اس قید سے تھوڑی تکلیف سہنی ہو یا جبر اُٹھانا پڑے مگر رفتہ رفتہ ایک تو ہم عادی اپنی چیزوں کے ہوجائینگے اور ہمارا ملک بھی ہمارے مذاق وخیال کے موافق اشیا تیار کرنے لگے گا۔ سردست کم از کم ہم کو اتنا کرنا تو ضرور چاہیے کہ جہانتک دیسی چیزیں مل سکیں اُنکے مقابلے میں پردیسی چیزوں کو ترجیح و توفق نہ دیں۔ یہ بھی ایک بہت بڑی خدمت ملک و قوم کی ہوگی اب مجھے یہ دکھانا ہے کہ ہم عورتوں کو اس تحریک سے کس حد تک تعلق ہے۔ ہر گھر میں خرید و فروخت کا زیادہ حصہ عورتوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ خصوصاً جن گھروں میں مرد موجودہ تہذیب مغربی سے بہرہ مند ہو چکے ہیں وہ عموماً خانہ داری کا انتظام مکان کی آرایش کا اہتمام اپنی بیویوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ پس یہ عورتوں کا فرض ہے کہ اپنے مکانوں کو دیسی اسباب

سے آراستہ کریں لپنے اور اپنے بچوں کے کپڑے دیسی بنائیں۔ ایک ہمارے سرکار عالی کے ممالک محروسہ میں عمدہ سے عمدہ قالین ایک سے ایک بڑھکر کپڑا مختلف شہروں میں بُنا جاتا اور تیار ہوتا ہے نمکنڈہ مٹھوارہ ناندیڑ اورنگ آباد وغیرہ ہماری ضرورتوں اور شوق پورا کرنے کے لیے کم نہیں ہی۔ اسباب چوبنیہ وغیرہ ہر قسم کی ضرورت کی چیز ملکی کاریگر بنا سکتے ہیں۔ ہماری بہنیں اگر یہ عہد کرلیں کہ اپنے گھروں میں دیسی چیزوں کے سوا پردیسی چیز نہ آنے دیں تو ملک کو معتدبہ فائدہ ہوسکتا ہے۔ میں نے تو اپنے گھر میں ایسا ہی اہتمام کر رکھا ہے[1]۔ فقط

الراقم

ص۔ب۔ المتخلص بہ حیا

اہلیہ سید ہمایوں مرزا بیرسٹرایٹ لا

خیرات کہاں جاتی ہی

اس مضمون کی طرف ہم ناظرات خاتون کی توجہ منعطف کرتے ہیں کہ وہ بھی سلطانہ بیگم کی طرح خیرات پر غور کریں اور اُسکے اصلی مصرف کو سمجھیں۔ حقیقت میں خیرات اور زکاۃ کی بابت ہماری قوم ابھی تک غلط فہمی میں مبتلا ہی۔

اڈیٹر

ہمارا موجودہ طریقہ خیرات کا مرد عورت کو بیکار کرنے والا ہی۔ ہم سوائے برقعہ پوش عورتوں کے اور کسی کو خیرات کا مستحق نہیں سمجھتے۔ جو اصل محتاج ہیں اُنکو خیرات نہیں پہنچتی۔ خاصے بھلے چنگے مرد عورت بھیک مانگتے پھرتے ہیں محنت مزدوری کرتے ہوئے دل

[1] مگر تعجب ہی کہ جس کاغذ پر بیگم صاحبہ نے یہ مضمون بھیجا ہی وہ بدیشی ہی۔ اڈیٹر

چراتے ہیں۔ اسلام میں جتنی بے ضرورت سوال کرنے کی ممانعت ہے۔ اُتنی ہی مسلمان فقیروں نے اپنا پیشہ بھیک مانگنا اختیار کر لیا ہے۔ جتنے مسلمان مرد عورت سائل ہیں اسقدر کسی قوم اور ملت کے نظر نہیں آتے۔ ان فقیروں نے اسلام کو ایسا ڈبویا ہے کہ چمار اور پنچ قوم تک سے سوال کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ خیرات مانگتے وقت تو خدا اور رسول صلعم کا واسطہ دیں اور اُسکے دین کی ایسی توہین کریں۔

برخلاف مسلمان فقیروں کے ہندو سائل آجتک ہم نے نہیں سُنا علاوہ اور شہروں کے دہلی کے حالات سے مجھے اچھی وقفیت ہے۔ وہاں ہی عورتوں نے بھیک کو فخر سمجھ لیا ہے۔ ہاتوں میں مہندی لگی ہوئی ہے۔ جھوٹے سچے گہنے پہن لیے گھر گھر مانگنے پھرنے ہی پر بس نہیں کرتیں جمعرات کو کوڑی دکان مانگتی ہیں۔ شام کو مرد عورت مزاروں پر جا بیٹھے کسی کو نادر شاہی حکم لگا دیا کہ جا تری مراد بر آئیگی ہم کو اتنا دے۔ بس دینے والے ہی فقیر کو چاہے وہ چرس پی کر ہی بڑ ہانکتا ہو۔ خدائی مخبر سمجھکر جو کچھ مانگے دیتے ہیں۔ مسلمان فقیروں کی اشاعت کرنے والے خود مسلمان ہی ہیں۔ فقیروں کی زیادتی اسلام کی اہانت ہے۔

فقیروں کو اپنے خیرات کرنے والے محسنوں کے دینے پر اتنا بھروسہ ہے کہ اپنے نونہال بچوں کو بھی فقیری کے پیشے میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ کاش بچوں کو محنت مزدوری سکھائیں اور اپنے ہی تک فقیری کو بس کریں۔ سائلوں کی کثرت اور سوالوں کی بوچھار ہم کو بے جا خیرات پر مجبور کرتی ہے۔

جب تک گورنمنٹ کی طرف سے فقیروں کا انسداد نہوگا۔ سوال کرنا جرم نہ ٹھہرے گا۔ کبھی فقیروں میں کمی نہوگی جبتک کہ گورنمنٹ اسکا انتظام نہ کرے۔ لوکل کمیٹیاں ہی کچھ کوشش کریں خصوصاً عورتوں کی فقیری تو بالکل بند ہونی چاہیے۔ اگر سب مذہب کے فقیر حشرات الارض کی طرح پھرتے ہوتے تو بھی صبر تھا کہ باد سموم کا اثر سب پر یکساں پڑا ہے۔ لیکن نہیں اس زہریلی ہوا میں سوائے مسلمان مرد عورت کے اور کوئی نہیں آیا۔ اور اگر ہونگے بھی تو اتنے کم کہ ہم تک

اُن کا سوال نہیں آیا۔ ہندو مسلمانوں کی مردم شماری پر نظر کرتے ہوئے مسلمان فقیروں کی تعداد کے سامنے ہندو فقیر کچھ بھی نہیں۔

سُنا ہی کہ سلطان المعظم نے بھی اپنی قلمروِ عثمانیہ میں فقیری کی جھولی ڈالنے والے پر بیس روپیہ اور سوال کرنے والے پر پانچ روپیہ جرمانہ مقرر کر دیا ہے۔ اور محتاجوں کے مہینے مقرر کر دیے ہیں۔ بھلے چنگے فقیروں کو جبکہ اسلامی بادشاہ نے بھی خیرات دینی ناجائز سمجھی ہے تو ہم لوگ کیوں دیں۔

خدا تعالیٰ کو عبادت اور خیرات کی پروا نہیں ہے۔ اُسنے جو عبادت اور خیرات کا حکم دیا ہے اسلیے کہ خیرات سے محتاجوں اور بیواؤں کو مدد ملے۔ عبادت کرنے سے دل میں نیکی پیدا ہو اور ہمجنسوں سے اچھا سلوک کریں انصاف سے پیش آئیں۔ صاحب مال پر زکاۃ اسلیے فرض کی کہ محتاجوں کو یوں نہ دیں تو زکاۃ فرض سمجھکر ضرور دینگے اور ان کی ضرورت رفع ہوگی۔ لیکن معمولی خیرات کے علاوہ زکاۃ کے بے جا مصرف نے اور معذوروں کو بھلا کر فقیروں کی زیادتی کر دی رجب شب برات کے مہینے میں عورتوں کو نوکری کرنی یا اور محنت ضروری قسم ہو جاتی ہے۔ بُرقعہ لیا اور نکل کھڑی ہوئیں دس گھر پھر کر مانگ لائیں۔ "مُفت ملے کھانے کو تو بلا جائے کمانے کو" اور اصل محتاج غریب گھر کی بیٹھنے والیوں کا خیال ہی نہیں آتا۔

یہ تو یقین ہے کہ باعقیدہ مسلمان اسلامی ارکان میں کا ایک رکن زیور یا نقد روپیہ دیکر ضرور پورا کرتے ہیں۔ اُسیقدر زکاۃ ہی برقع پوش عورتیں لے جاتی ہیں۔ اسلیے زکاۃ کا روپیہ جمع کرنے کے لیے ایک فنڈ مقرر کیا جائے۔ اُس میں سب زکاۃ بھیجدیا کریں۔ اور اس جمع سے محتاج خانوں اور شفاخانوں کے معذوروں کی امداد کی جائے۔ رجب اور شب برات کے مہینوں میں جس طرح سائل لیتے پھرتے ہیں فنڈ والے ہی پھریں تو شرعی ٹیکس کا اصل مطلب حاصل ہو جائیگا۔

جیسا کہ مکرمہ ایڈیٹرس صاحبہ تہذیب نسواں نے ہم جنسوں کا مجمع محتاج عاجز کی

خبرگیری کے لیے قایم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ ایسا ہی سب شہروں کی خاتونوں کو مقرر کرنا چاہیے۔

امید ہو کہ اس خیرات میں بہت بی بیاں شریک ہونگی کیونکہ فرض تو سب ادا کرتے ہیں مگر اسکا مصرف اچھا نہیں ہوتا۔ فقط

راقمہ
سُلطانہ بیگم

تربیت

ہندوستان کے ایک بڑے شہر کے عظیم الشان اسٹیشن پر گھنٹی کو ریل کی آمد کی خبر دیے چند ہی سکنڈ گذرے تھے کہ گاڑی چیختی۔ چلّاتی۔ شور مچاتی ہوئی پلیٹ فارم سے آلگی۔ فوراً ہی سکنڈ کلاس کا دروازہ کھُلا اور ایک نہایت مہذب وشایستہ خوشرو نوجوان گاڑی سے اُترنے لگا۔ نوجوان نے جسکا نام محسن تھا ابھی پلیٹ فارم پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک چھ سال کے بہت خوبصورت لڑکے نے جسکے لباس اور اطوار سے شایستگی برستی تھی آگے بڑھ کر نہایت مودبانہ سلام کیا۔ جسکے جواب میں ہمارے نوجوان دوست محسن نے بہت ہی مہربانی سے نہایت محبت بھرے لہجہ میں کہا۔

"آہا حامد! تم ہی ہمیں لینے آئے"

لڑکے نے بڑی ہی سنجیدگی سے نہایت سُریلی دلکش آواز میں جواب دیا کہ۔

"ہاں ابّا! امّی نے کہا تم ہی جاؤ۔ خوب سیر ہوگی"

"زہرا اچھی ہے"

"ہاں ابّا! اچھی ہے"

اسکے بعد محسن دوسرے نوجوانوں سے جو چھوٹے حامد کے ساتھ تھے مخاطب ہوا

اس اثنا میں ایک ریشائیل بزرگ جن کی عمر تقریباً چالیس برس کی ہوگی اُسی گاڑی سے اُترے جس میں سے ابھی محسن اُترا تھا۔ اُن کو بھی چھوٹے حامد نے اُسی آداب و شایستگی سے سلام کیا۔ یہ ریشائیل بزرگ محسن کے سگے بڑے بھائی اور حامد کے چچا احسن تھے۔ اور نوجوانوں میں سے ایک تو جس کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی تھی احسن کا لڑکا سعید تھا اور دوسرا نوجوان جسکی عمر تقریباً پچیس سال کی ہوگی حامد کا ماموں نادر تھا۔

جب یہ پارٹی اسٹیشن کے باہر نکلی تو دو گاڑیاں ان لوگوں کے منتظر تھیں۔ جن میں سے ایک تو نہایت خوبصورت فٹن تھی جو اپنے مالک کی نفاست و سلیقہ کا اعلان کر رہی تھی۔ اُسپر محسن۔ نادر اور حامد سوار ہو گئے۔ اور دوسری گاڑی جو تھی تو اُسی پہلی گاڑی کی وضع قطع کی لیکن اپنے مالک کی بدتمیزی کا صاف صاف پتہ دیرہی تھی اُسپر مولوی احسن مع اپنے صاحبزادہ سعید کے سوار ہو گئے اور دونوں نے اپنے اپنے گھر کا رستہ لیا۔ رستہ میں نادر نے محسن سے کہا۔

نادر۔ "بھائی جان! حامد آپ کی عدالت میں ایک استغاثہ دائر کرنیوالا ہے"۔

محسن۔ "وہ کیا"۔

نادر۔ "اپنی امّی جان کے مظالم و بیدادیوں کی فریاد (حامد کی طرف متوجہ ہوکر) مظلوم حامد! فہرست مظالم سناؤ"۔

محسن۔ "ہاں حامد! کہو تمہاری کیا فریاد ہے"۔

حامد (آبدیدہ ہوکر) "صبح کو آدھا ناشتہ ملتا ہے"۔ ......"شام کی چائے پر میوہ نہیں ملتا"۔..... ......"شام کو امّی ہواخوری کو نہیں بھیجتیں"۔ .... (روتے ہوئے) "امّی نے چار دن سے اپنے ساتھ چائے پلانا چھوڑ دیا"۔

محسن (مسکراکر) "اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم نے کیا کیا تھا جس کی یہ سزا تجویز ہوئی"۔

حامد۔ (اسی طرح روتے ہوئے) "ابا میں سویرے نہیں اُٹھا"۔ .... بلا اجازت

امیؔ کے کمرے میں گھس گیا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آموختہ بھول گیا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (اور زیادہ روسنے لگا)

محسن۔ مگر ان تین خطاؤں کی چار سزائیں کیسی؟ ضرور تم نے کچھ اور بھی کیا ہو۔

چھوٹا حامد اسکے جواب میں" ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہکر اسی طرح رونے لگا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ بیشک اسنے کوئی اور قصور بھی کیا ہی اور اب اپنی حرکت پر اسقدر نادم اور غمزدہ ہی کہ اُسکا نام بھی نہیں لینا چاہتا۔

اس اثناء میں گاڑی ایک خوبصوت و خوش قطع مختصر کوٹھی کے احاطہ میں داخل ہوئی اور زینے کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ ہمارے تینوں دوست یکے بعد دیگرے گاڑی سے اترکر داخل ہوئے۔ جہاں محسن کی خوبصورت۔ سلیقہ شعار اور نہایت لائق بیوی عذرار مع اپنی لڑکی زہرار کے جس کی عمر تقریباً پانچ سال کی ہوگی ان لوگوں کی منتظر تھی۔ نادر دوسرے دن ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوا۔

اپنی بیوی اور لڑکی سے ملنے کے بعد محسن نے عذرار سے کہا۔

عذرار! غریب حامد تمہارے مظالم اور زیادتیوں کا فریادی ہی۔

عذرار۔ میں جوابدہی کو موجود ہوں۔ لیکن ابھی جلدی کیا ہے۔ سردی کی شدت ہے۔ سفر سے چلے آتے ہو۔ پہلے چائے تو پی لو (نظر اُٹھاکر) ایلو! وہ سوسن چائے لارہی ہے۔ چائے پی کر کسیقدر گرم ہو لو۔ سستا لو (ہنستے ہوئے) پھر مجھسے جواب طلب کرنا۔

محسن۔ "ہاں اب بیان کرو کہ حامد نے کیا خطا کی تھی جسکی سزا تم نے یہ تجویز کی۔ لیکن حامد اپنے تین قصوروں کا تو صاف صاف اعتراف کرتا ہی اور چوتھی خطا کو بیان کرنے کے عوض "اور" اور" کہکر رونے لگتا ہی۔ لیکن اسکو ملی ہیں چار سزائیں۔ اسلیے میں اسکی چوتھی خطا کے معلوم کرنیکا بیحد مشتاق ہوں۔"

عذرا۔ اسی سے پھر پوچھو!"

محسن۔ "حامد! بتاؤ کن خطاؤں پر تم یہ سزائیں بھگت رہے ہو؟"

حامد۔ (روتے ہوئے) اباجان ... میں سویرے نہیں اُٹھا۔ ..... امّی کے کمرے میں بلا اجازت مانگے چلا گیا۔ ... آموختہ بھول گیا ..... اور ... اور ... (زیادہ رونے لگا)

محسن۔ "اور۔ اور۔ کیا؟"

حامد اسکے جواب میں اُسی طرح رو رہا تھا۔

عذرا۔ اچھا اب مجھ سے سُنو۔ اسنے تمہارے جانے کے دو ہفتوں بعد سے سویرے اُٹھنا چھوڑ دیا۔ بعوض پانچ کے چھ بجے اُٹھنے لگا۔ تین دن تک تو میں نے چشم پوشی کی لیکن جب یہ بدستور اسی طرح ایک گھنٹہ دیر سے اُٹھنے لگا تو میں نے اسکو دھمکی دی کہ اگر دوسرے دن ٹھیک وقت پر نہ اُٹھے گا تو آدھا ناشتہ ملیگا۔ لیکن اسنے کچھ پرواہ نہ کی اور آجتک اسی طرح اُٹھتا رہا۔

دوسرا قصور جو اس سے سرزد ہوا یہ کہ ایک روز یہ بلا کُنڈی کھٹکھٹائے یا اجازت طلب کیے میرے کمرے میں گُھس آیا۔ جب میں نے اسے سمجھایا کہ یوں چوروں کی طرح گُھس آنا بدتہذیبی ہے تو اُلٹا مجھ سے اُلجھ پڑا اور کہنے لگا "امّی اس کی کیا ضرورت ہے" اسکے بعد متواتر اسنے دو دفعہ یہی حرکت کی جسپر میں نے شام کی چائے پر میوہ دینا بند کر دیا۔

تیسری خطا اسنے یہ کی کہ آموختہ بھول گیا۔ ایک گھنٹہ دیر سے اُٹھنے کے باعث تمام دن کے مقررہ اوقات میں ردّ و بدل ہوگیا اور اس وجہ سے پڑھنے کے اوقات میں ایک گھنٹہ کی کمی ہوگئی۔ آموختہ دُہرانے کی نوبت نہیں آتی تھی اس لیے یہ لازمی بات تھی کہ سب پڑھا ہوا بھول جاتا اس کی سزا میں نے یہ تجویز کی کہ جب یہ دماغ سے

کام ہی نہیں لیتا اور محنت ہی نہیں کرتا ہے تو اسے ہوا خوری کی کیا ضرورت ہے۔

چوتھا قصور جسکی پاداش میں میں نے اپنے ساتھ چائے پلانا چھوڑ دیا ذیادہ سنگین خطا ہے یہ کہ اسنے زہرا کو گالی دی۔ اسکی اس ذلیل اور کمینہ حرکت نے ثابت کر دیا کہ یہ ہرگز میرے ساتھ چائے پینے کے قابل نہیں۔

محسن۔ اہا تو اسکی چوتھی خطا زہرا کو گالی دینا ہے (حامد سے) تم نے زہرا کو گالی کس لیے دی تھی۔

حامد۔ ابا جان! مجھ سے خطا ہوئی۔

محسن۔ خیر تو انصاف اس بات کا مقتضی ہے کہ تمہیں ایک اور سزا اس بات کی دیجائے کہ باوجود ان غلطیوں کے تم نے اپنی ماں کی شکایت کی جرأت کی۔ جب تم جانتے تھے کہ تمہارے حرکات نے خود تمہاری ماں کو ان سزاؤں کی تجویز پر مجبور کیا ہے تو پھر تمہیں ان کا شکایت کی طور پر میرے سامنے بیان کرنا تمہارا پانچواں جرم ہے۔ لہذا آزمایش کے طور پر تمہیں صرف اس اخیر جرم کی یہ سزا دیجاتی ہے کہ جبتک تم اپنی پہلی خطاؤں کی تلافی نہ کر لوگے تمہیں ہمارے ساتھ کھانے پر بھی نہ بلایا جائیگا۔ اگر اسکے بعد پھر کوئی اس قسم کا جھوٹا شکوہ شکایت کروگے تو یاد رکھنا کہ تمہیں اس سے بڑی سزا دیجائے گی۔ پچھلی خطاؤں کی تلافی یہ ہوسکتی ہے کہ کل سے ٹھیک وقت مقررہ پر اُٹھا کرو۔ خوب محنت کرکے اپنا آموختہ یاد کر ڈالو۔ بلا اجازت کمرے میں گھس جانے اور پھر ہدایت کرنے پر بھی اس سے باز نہ آنے اور حکم کی خلاف ورزی کرنے کی اپنی امّی سے معافی مانگو۔ زہرا سے اُسے گالی دینے کی بابت معافی چاہو۔ اور جب یہ سب باتیں طے ہوجائیں پھر اپنی امّی سے ان کی بیجا شکایت میرے سامنے کرنے۔ ان کو اپنی مبتذل حرکات سے سزا دینے پر مجبور کرنے کی معذرت چاہو۔ اسکے بعد تمہاری سب سزائیں اُٹھالیجائیں گی۔ بس اب یہاں سے جاؤ۔ خود تمہارے

کمرہ میں تمہارا کھانا آجائیگا۔

غریب حامد کو دم مارنے کا موقع نہ تھا۔ ایک لفظ منہ سے نکالنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اسکے ماں باپ کا کہا کالنقش فی الحجر ہوتا ہے۔ اسکے والدین کی زبان سے جو بات نکلی وہ ہوسے بغیر نہیں رہتی۔ اُسے معلوم تھا کہ اگر میں اب مر بھی جاؤں تو اس حکم ناطق میں سر مو فرق نہیں آنے والا۔ پس وہ والدین کے سامنے سے نہایت ادب سے اُٹھا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ دونوں کو سلام کیا اور نظر نیچی کیے ہوئے سیدھا اپنے کمرہ کو چلا گیا۔ والدین کے دل حامد کی اس مظلومانہ حالت۔ معصومانہ ادا اور واجب الرحم صورت کو دیکھکر نہایت بے چین ہو گئے۔ لیکن اپنے دلی جذبات کا افشا اسوقت بیجا سمجھکر اُنہوں نے بمشکل ضبط کیا اور ساکت رہے۔ حامد کے پیچھے ہی اُس کی خدمتگار کنیز نرگس کھانا لائی جسے دیکھکر مظلوم حامد بیقرار ہو گیا اور بے تحاشا رونے لگا۔ نرگس نے بڑی ہی ہمدردی سے تسلی و تشفی دی اور سمجھایا کہ میاں کل صبح سویرے اُٹھو۔ خوب جی لگا کر محنت کرو آموختہ یاد کر ڈالو۔ سب سے معافی چاہو۔ توبہ کا دروازہ کُھلا ہوا ہے۔ رونے سے فائدہ نہیں۔ نرگس کے سمجھانے پر اسنے بادل ناخواستہ اپنا رنج والم بہت ہی ضبط کر کے چند لقمے تناول کیے۔ کھانے کے بعد ہی اپنی کتاب اُٹھائی اور مطالعہ میں غرق ہو گیا۔

دوسرے دن حامد اپنے وقت مقررہ سے کوئی آدھا گھنٹہ پہلے جاگ پڑا اور حوائج ضروریہ سے فارغ ہو کر نہایت غور و محنت سے آموختہ پڑھنا شروع کر دیا۔

دن کے دو بجے جبکہ محسن اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا "علی گڈھ منتھلی" دیکھ رہا تھا اور اُسکی بیوی عذرا ایک دوسری کوچ پر بیٹھی ہوئی "خاتون" پڑھ رہی تھی کسی نے نہایت شیریں آواز میں بہت آہستگی سے دروازہ کے پاس سے پوچھا۔

ابا جان۔ "میں آسکتا ہوں"

"بیشک"

چھوٹا حامد اپنی کتاب بغل میں دبائے کمرے میں داخل ہوا اور محسن کے سامنے کھڑا ہو کر بہت ہی متانت سے کہنے لگا۔ "ابا جان! میں نے تمام آموختہ یاد کر لیا ہے سُنانے کو آیا ہوں"۔ اسکے بعد اجازت پاکر اُسنے اپنا تمام آموختہ بلا کسی وقفہ یا غلطی کے سُنا دیا۔

محسن اپنے ہونہار لڑکے کی اس قابل تعریف محنت پر نہایت خوش ہو کر کہنے لگا۔

حامد! میں تم سے اب خوش ہوں۔ لیکن اب اپنی دوسری خطاوں کی بابت اپنی ماں اور اپنی بہن سے معافی چاہو"

حامد (عذرا کے سامنے ہاتھ جوڑکر) "امی جان مجھسے بڑی خطا ہوئی۔ اب سے پھر کبھی ایسا قصور نہ کرونگا۔ معاف کیجیے"

عذرا (نہایت بیچین ہوکر اور اپنے دلی جذبات کو ضبط کرتے ہوئے) "پہلے زہرا سے معافی چاہو۔ پھر میرے پاس آنا"

فوراً گھنٹی بجائی گئی جس کی آواز پر سوسن دوڑتی ہوئی آئی اور دروازہ پر کھڑی ہوگئی

عذرا "سوسن! زہرا کو بُلا لا"

چند لمحوں کے بعد زہرا اس کمرہ میں آن موجود ہوئی اور حامد ادب کے ساتھ اپنی چھوٹی بہن سے اپنی زیادتی کی معافی چاہنے لگا۔ زہرا نے بکشادہ پیشانی اپنے بڑے بھائی کی خطا معاف کر دی اور پھر اپنے کمرہ کو جہاں اُس کی معلمہ منتظر تھی چلی گئی۔

حامد۔ امی جان! زہرا نے تو میری خطا معاف کر دی۔ اب آپ بھی میرا قصور معاف کیجیے میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب سے ایسا کبھی نہ کرونگا۔

عذرا کو اب ضبط کی تاب نہ رہی۔ اسنے فوراً حامد کو گلے سے لگا لیا۔ اور اُسکی تمام خطائیں معاف کر دیں۔

محسن۔ حامد! اب میں تم سے اور زیادہ خوش ہوا کہ تم نے اپنی ساری خطاؤں کی تلافی کر دی۔ کل سے تمہیں صبح کو پورا ناشتہ ملیگا۔ آج سے شام کی چائے پر میوہ برابر

ملا کریگا۔ شام کی ہواخوری کو بھی بدستور بھیجے جاؤ گے۔ اور ہمارے ساتھ چائے پر اور کھانے پر شریک رہو گے۔ تمہاری اس محنت کے صلہ میں تمہیں ایک چھوٹی گھڑی دیجاتی ہے جسے اپنے پڑھنے کی میز پر رکھو۔ لیکن اسکے پرزوں سے واقفیت پیدا کرنیکی خبردار کوشش نہ کرنا۔ میں تم سے اسقدر خوش ہوں کہ آج شام کو تمہیں اپنے ہمراہ ہواخوری کو لیجاؤنگا۔ اور وہاں سے نادر کے ہاں دعوت میں بھی تمہیں اپنے ساتھ رکھونگا۔

جیسے ہی محسن نے یہ جملہ ختم کیا عذرا نے فوراً ایک چھوٹا سا خوبصورت بکس جس میں سے ٹک ٹک کی آواز آرہی تھی حامد کے حوالہ کیا جسے لیکر حامد نے بادب والدین کو سلام کیا اور خوش خوش اپنے کمرہ کا راستہ لیا۔

ہمارے دوسرے دوست احسن جب اپنے صاحبزادہ بلند اقبال کے ساتھ اسٹیشن سے روانہ ہوئے راستہ میں ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اثنائے تقریر میں مولوی احسن صاحب نے فرمایا کہ "سعید! ایک ہفتہ ہوا مختار نے مجھے ایک خط بھیجا تھا جس میں منجملہ دیگر کیفیتوں کے ایک بات یہ بھی تھی کہ تم نے میری روانگی کے بعد سے یک لخت اسکول جانا چھوڑ دیا۔

سعید۔ (پہلے تو پریشان ہوا لیکن فوراً ہی سنبھلکر) "نہیں ابا۔ یہ بالکل غلط۔ میں برابر اسکول جاتا ہوں۔ آپ چلکر اماں جان سے پوچھ لیں"

اس عرصہ میں گاڑی مکان پر پہونچگئی اور یہ دونوں اتر کر اندر داخل ہوئے۔ مولوی احسن صاحب نے ابھی بمشکل زنانہ کے دروازہ میں قدم ہی رکھے تھے کہ ایک بڑا سا مجمع گیا۔ مولوی صاحب کی دو کمسن صاحبزادیاں جن میں سے ایک تو پانچ اور دوسری نو برس کی تھی اور ایک کمسن صاحبزادے جو حامد کے ہمعمر معلوم ہوتے تھے دوڑ کر لپٹ گئے اور

فریادافریادی شروع کردی۔

بڑی لڑکی۔ اباجان! مسعودنے میری سونے کی بالی چرالی۔

چھوٹالڑکا (مسعود) نہیں اباجان! یہ جھوٹ کہتی ہے۔ اسکی بلی تومیراکبوتر کھاگئی۔ چل جھوٹی مت دود (مردود) کہیں کی۔"

مولوی احسن نے اپنے چھوٹے فرزند مسعود کی مت دود پر خوب قہقہہ لگایاکہ انکے صاحبزادے اپنی زبان فیض ترجمان سے کیسی کچھ گلفشانی کرتے ہیں۔

چھوٹی لڑکی۔ اباجان! کل مسعود بھائی نے مجھے تھپڑمارا۔ میری مرغی پر پتھر پھینکے۔"

مسعود۔ پھر تیری مرغی میرے کبوتر کادانہ کیوں کھاگئی۔

مسعود۔ اباجان! بھائی جان نے پرسوں میرا روپیہ چھین لیا مجھے دلادو۔"

سعید۔ وہ تواماں جان نے مجھے دینے کے لیے تیرے پاس دیے تھے۔ وہ تیراکہاں تھا۔ جھوٹ کیوں بکتاہے۔

مسعود۔ توجھوٹاہے! مت دود کہیں کا!!"

مولوی احسن پر اب کی دفعہ "مت دود" کا کوئی اثر نہوا۔ کیونکہ اس طوفان بدتمیزی نے انھیں سخت پریشان کردیاتھا۔ لیکن مولوی صاحب کی بی بی بے اختیار ہنس پڑیں۔

بڑی لڑکی۔ اباجان! جلدی میری گڑی کی بالی دلادو۔"

چھوٹی لڑکی۔ اباجان! کل بھائی مسعودنے مجھے تھپڑمارا۔ میری مرغی پر پتھر پھینکے۔"

مسعود۔ لامیرے کبوتروں کادانہ۔"

احسن ان فریادیوں کے شوروغل سے اور بھی پریشان ہوگیا۔ بیچارہ سفر سے چلاآرہاتھا۔ سفر کی کلفت سے پہلے ہی ناک میں دم تھا اس ہلڑ سے اور بھی تکلیف ہونے لگی۔ اس کی بیوی سامنے کھڑی ہوئی ہنس رہی تھی اور بعوض اسکے کہ ان شیاطین کو چپ کرتی اپنے بچوں کی ان حرکات پر باغ باغ ہورہی تھی۔ آخر خود احسن نے چیخکر کہا۔

بھئی ذرا دم لو۔ مجھے سستا لینے دو۔ پھر تمہارے شکوے شکایت سُنوں گا۔ اسوقت میں سخت تھکا ہوا ہوں۔ سلام کرنا۔ ملنا تو درکنار دروازہ ہی پر شکایتوں کا طومار باندھ دیا۔ مجھے منہ ہاتھ بھی نہ دہونے دوگے؟ (اپنی بیوی سے مخاطب ہوکر) حامد اسٹیشن پر آیا تھا۔ اُسکی شایستگی۔ اسکی تہذیب۔ اُسکے سعادتمندانہ اطوار دیکھکر میرا دل لوٹ گیا۔ مجھے محسن پر رشک آتا ہی کہ اسنے کیسا برخوردار فرزند پایا ہی۔ افسوس میری اولاد ایسی نہیں۔

احسن کی بیوی۔ "محسن ایک نیچری۔ عذرا محسن کی ہمخیال۔ ان دونوں کی اولاد ویسی ہی ہونی چاہیے۔ ہر بات میں فرنگیوں کی تقلید۔ ہر بات میں فرنگیوں کی تقلید۔ میاں بی بی بس اس بات پر مٹے ہوئے ہیں کہ جہانتک ہوسکے فرنگیوں کی تقلید کریں۔ حامد تو بس ایک فرنگی کا بچہ معلوم ہوتا ہے۔ اسکی صورت۔ شباہت اطوار۔ خصائل سب فرنگیوں کے سے ہیں۔ وقت پر سونا۔ وقت پر اُٹھنا۔ وقت پر کھانا۔ وقت پر بات کرنا کیا یہ آدمیوں کی خصلت ہے۔ نابھئی خدا نہ کرے میرے بچے بھی ایسے ہوں۔ میرے بچوں میں کونسی ایسی بُری بات ہے۔

بیچاری یہیں تک کہنے پائی تھی کہ پھر اُس شیطانی پلٹن نے وہی شور وغل شروع کردیا اور اپنی اولاد کی ثناخواں ماں کو انھیں دو چار چپت رسید کرکے چپ کرنے کی کوشش کرنی پڑی۔ لیکن اس تادیب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بچوں نے گریہ وزاری شروع کردی اور اس طرح دہاڑیں مار مار کر رونے لگے جیسے کسی نے انھیں خوب پیٹا ہی۔

بڑی لڑکی۔ (بڑے زور سے آہ وبکا کرتی ہوئی) پھر مجھسے کیوں کہا تھا کہ اباجان کے آنے کے بعد میری گڑیا کی گُندھنے کی بالی مسعود سے دلادینگے۔ ... ...''

چھوٹی لڑکی۔ (خوب روکر) میں بھائی مسعود کے کبوتر اُڑادونگی۔"

مسعود۔ (زمین پر لوٹ کر) تم نے نہیں کہا تھا ابا آتے ہی مجھے دوسرا کبوتر منگادینگے۔

میرا روپیہ دلا دینگے ۔۔۔۔۔۔۔"

احسن کو سوائے اسکے کوئی ترکیب نہ سوجھی کہ فوراً اپنا سفری ٹرنک کھولے اور تینوں کو کوئی نہ کوئی چیز دیکر سمجھائے۔ لیکن افسوس بیچارہ اسپر بھی بچوں کو چپ کرنے میں ناکامیاب رہا۔ آہستہ دو تین منٹ تو سبھوں نے اپنی اپنی چیزیں دیکھنے بھالنے کی وجہ سے سکوت کیا لیکن پھر وہی مار کٹائی شروع ہوگئی۔ لیکن اب کے وجہ فساد دوسرا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ میری چیز اچھی نہیں، کوئی کہتا تھا کہ مجھے تو ایسی خراب چیز دی اور اسے اتنی عمدہ۔ ایک نے تو سخت غضبناک ہو کر اپنا چینی کا کتا بڑی ہی زور سے زمین پر دے مارا اور پاش پاش کر دیا۔ مولوی احسن نے بھیترا سمجھایا کہ میں کل اس سے زیادہ کھلونے لا دونگا اب خاموش رہو لیکن کسی نے نہ مانا۔ بچوں کو مولوی صاحب کی بات پر اعتبار ہی نہ آتا تھا کیونکہ وہ بیسیوں دفعہ دیکھ چکے تھے کہ انکے والدین انہیں مارنے کی دھمکی دیتے ہیں لیکن مارتے نہیں۔ عمدہ عمدہ کھلونے منگا دینے کا حتمی وعدہ کرتے ہیں لیکن کبھی اپنا وعدہ ایفا نہیں کرتے۔ غرض یہ طوفان بدتمیزی کسی طرح بند نہ ہوتا تھا۔ اس اثنار میں مولوی احسن صاحب کے دوست مختار تشریف لائے زنانہ میں اطلاع کرائی گئی اور غریب احسن نے اسے امداد غیبی سمجھکر فوراً باہر کا راستہ لیا۔ دونوں دوست بڑی ہی گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے ادہر اُدہر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اثنار گفتگو میں میاں سعید کا ذکر آیا۔

احسن۔ میں نے سعید سے اُسکے اسکول جانیکے بارے میں دریافت کیا تھا وہ تو کہتا ہے کہ میں برابر اسکول جاتا ہوں۔

مختار۔ لیکن کل پھر انکے اسکول کے ہیڈ ماسٹر مجھسے شکایت کر رہے تھے کہ اُن حضرت نے تمہارے جانے کے بعد سے کبھی اپنی صورت ہی نہ دکھائی۔

احسن۔ ہائیں! یہ کیا!! وہ تو اپنی ماں سے بھی اس بارے میں دریافت کر لینے کو کہتا ہے۔"

مختار۔ ہاں اُنھیں تو یقین ہے کہ ان کی والدہ صاحبہ کبھی اپنے بچہ کے خلاف شہادت نہ دینگی۔"

حسن۔ (ایک ٹھنڈا سانس بھر کے) بھائی مختار! تمہارے عالمانہ و فاضلانہ لکچروں اور مشفقانہ وعظ و پند کا اثر اگرچہ آجتک مجھپر کچھ بھی نہ ہوا تھا لیکن آج جسوقت میں نے گھر میں قدم رکھا ہی تمہاری تمام باتوں کی صداقت میرے دل پر منقوش ہوگئی۔ بھائی! تم سچ کہتے ہو کہ اولاد کی تربیت تمام و کمال ماں ہی پر منحصر ہے۔ اگر ماں تعلیم یافتہ ہو تو اپنے بچوں کی ایسی تربیت کرتی ہو کہ وہ انسانوں کی اولاد دکھلائی جانے کی مستحق ہوں لیکن ایک جاہل ماں اپنی اولاد کو بربادی و مذلت کے قعر میں جھونک دیتی ہو اور انھیں بالکل ایک انسان نما بندر بنا دیتی ہو۔ اور اُسے خبر بھی نہیں ہوتی کہ اُسنے کیا کیا۔ آج میں کس وفور مُسرت و شوق میں گھر پہونچا۔ لیکن افسوس اندر قدم رکھتے ہی میری تمام مُسرّتیں خاک میں مل گئیں اور میری تمام خوشیاں مبدل بہ رنج و غم ہوگئیں۔ نہایت سچ ہے کہ۔

زن نیک خوش سیرت و پارسا
کند مرد درویش را بادشا

اور

زنِ بد در سرائے مرد نکو
ہمدریں عالم ہست دوزخ او

بھئی میں کیا کہوں جبسے میں گھر پہونچا ہوں بچے ایک عجیب ہلڑ سا مچا رہے ہیں۔ انکی ماں ان اخوان الشیاطین کی ان بیہودہ حرکات پر بیحد نازاں ہو۔ تقریباً ایک گھنٹہ سے سردی کی وجہ سے میرا بُرا حال ہو رہا ہے۔ تکان سفر مجھے الگ ستا رہا ہی میں نے ابتک مُنہ ہاتھ نہیں دہویا ہے لیکن اُس خدا کی بندی کو اسکا کچھہ بھی

خیال نہیں۔ غرض میں کیا کیا بیان کروں۔ مجھے اپنی قسمت پر رونا آتا ہے۔
مختار۔ قسمت پر رو۔ سوسائٹی کے بیہودہ رسم ورواج نے تمہاری یہ گت بنائی ہے
تمہاری بی بی قابل الزام نہیں بلکہ ہماری سوسائٹی نے اس بیچاری کو ایک جاہل۔
کندۂ ناتراشش بنا رکھا ہے۔ افسوس میں ہمیشہ تم کو سمجھایا کرتا تھا اور اپنے بچوں کی
نگہداشت کی طرف تمہیں متوجہ کرتا رہتا تھا لیکن اُسوقت تم کو میرا کہنا سخت ناگوار
معلوم ہوتا تھا لیکن اب بفحوائے "قدر عافیت کسے داند کہ بہ مصیبتے گرفتار آید"
تم کو میرے بیان کی تصدیق ہوئی۔ تم لایق ذی علم آدمی ہو۔ تم خود خدا کے لیے
غور کرو کہ اولاد پر ماں کا اثر کیا ہوتا ہے۔ مس سوسی سہراب جی نے بمبئی کی کانفرنس
میں کیا خوب کہا تھا کہ۔

"وہ (ماں) تاج شاہی نہیں رکھتی لیکن اسکے پاس وہ تاج ہے جو خداوند عالم نے
اُسے ماں بناتے وقت عطا فرمایا تھا۔ اگرچہ اُسکے نرم نرم ہاتھ میں عصائے
شاہی نہیں۔ لیکن اُسکے پاس عصائے محبت ہے جسکے ذریعے سے وہ اپنے
گھر میں ایسی زور دار حکومت کرتی ہے۔ جو بادشاہ اپنی رعایا پر نہیں کرسکتا ہے"

مسٹر پارنل کہتے ہیں۔

"عورت ہماری آیندہ نسلوں کی تہذیب و ترقی کی معیار ہے"

مسٹر بمبن ہندوستانی عورتونکے بارے میں کہتے ہیں کہ۔

"کیا کسی کو یہ امید ہوسکتی ہے کہ اسقدر ذلیل و خوار پست و ناچار عورتوں کے پیٹ سے
جو اپنی نوعی صفات عالیہ اور حقوق مدنیت سے بالکل برہنہ اور عاری ہیں۔ بڑے بڑے مدبر
فیلسوف اور بہادر اشخاص پیدا ہونگے۔ یہ امر توصریح فطرت کے خلاف ہے۔ اور اس امید کا برآنا
تو بالکل ناممکن ہے"

دنیا کے بڑے بڑے اہل الرائے اس بارے میں متفق اور متحد الرائے ہیں کہ اولاد کیلیے

تربیت کی حسب سے زیادہ ضرورت ہے بلکہ تعلیم سے بھی زیادہ اور اہم اور ضروری تربیت ہی۔ فی الحقیقت اسکے بغیر تعلیم کا عدم اور وجود ہر دو مساوی ہیں۔ تربیت ہی انسان کو اعلیٰ رتبہ تک پہونچاتی ہے اور تربیت ہی انسانی فضیلتوں کو بہم پہونچاتی ہے۔ اسکے بغیر آدمی کسی مصرف کا نہیں رہتا۔ یہ ہماری فاش غلطی ہے کہ ہم لوگ تربیت اولاد کا آلہ زیادہ تر زجر و توبیخ۔ تعلیم و تلقین۔ زدوکوب۔ پند و نصیحت کو سمجھتے ہیں مگر حقیقتاً یہ تمام وسائل محض بیکار اور سراسر فضول ہیں۔ انسے ہرگز کوئی اثر دل پر نہیں ہوتا اور اگر کبھی ہوتا بھی ہے تو بہت جلد نقش آب کی طرح مٹ جاتا ہے ہاں تربیت کا کوئی ذریعہ ہے تو عمدہ سوسائٹی اور اچھی صحبت ہی یہ قاعدہ کی بات ہی کہ جو جیسے کی صحبت میں رہا وہ ویسا ہی ہوا۔ پس اطفال جیسی سوسائٹی میں نشو و نما پاتے ہیں وہی اخلاق و اطوار سیکھ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بچے جب اپنے بزرگوں میں منجملہ اور خصائل کے چند خصلتیں جیسے مذہبی تعصبات۔ باہمی نزاع۔ رشک و حسد بدگمانی۔ ادائے فرائض میں سستی۔ کاہلی۔ غیبت۔ غصہ۔ نافرمانی۔ تضیع اوقات بے اعتدالی۔ تن آسانی۔ خود پسندی وغیرہ دیکھتے ہیں تو اُن کی طبیعت میں بھی آہستہ آہستہ یہی عادتیں سرایت کرتی جاتی ہیں اور رفتہ رفتہ طبیعت ثانی بنجاتی ہیں۔ جوان ہونیکے بعد بھی یہ عادتیں اُنسے نہیں چھوٹ سکتیں اور انہیں عادتوں کی بدولت وہ قعر مذلت میں پڑے رہتے ہیں۔ ہماری قوم کی اخلاقی حالت جیسی کچھ ہے اسکے بیان کی ضرورت نہیں۔ ہماری اس اخلاقی کجی کا اصلی سبب محض ہماری عورتوں کی جہالت ہی۔ بچہ زمانہ پیدائش سے چھ سات سال تک بالکل زنانہ میں ہی رہتا ہے اور اسوقت تک عورتیں ہی اسکی محافظ۔ مصاحب اتالیق۔ معلم۔ رفیق وغیرہ سب کچھ ہوتی ہیں اسکے بعد مدرسہ میں داخل ہونے پر بھی رات دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے تقریباً سولہ سترہ گھنٹہ انہیں کی صحبت میں گذارتے ہیں۔ پس جو شخص اتنا وقت جاہلوں اور ناقص العقلوں کی صحبت میں گذارے۔ اُسکا اُٹھنا بیٹھنا انہیں میں رہے تو بھلا چھ سات گھنٹوں کی مکتبی تعلیم اور اساتذۂ ذیشعور کی تربیت کا کیا خاک اثر ہوگا

کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے کہ ہماری مائیں۔ ہماری بہنیں۔ ہماری بیویاں اور ہماری لڑکیاں ناتعلیم یافتہ ہیں توخود ہماری تعلیم ضرور بہت ناقص قسم کی ہوگی۔ ہم کیونکر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی اُمید کرسکتے ہیں جب ان کی مائیں جاہل ہیں۔ ہم کیونکر اعلےٰ اخلاقی اصول انکے دلوں پر نقش کراسکتے ہیں جب بچے ایسی عورتوں میں زندگی بسر کرتے ہیں جو خود اعلےٰ اخلاقی اور دماغی تربیت سے بے بہرہ ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ ماں اپنے بچے کو اُٹھتے۔ بیٹھتے چلتے۔ پھرتے۔ بے تکان وہ کچھ سمجھا سکتی ہے۔ اور ایسی عمدگی سے اس کی تربیت کرسکتی ہے کہ اُستاد۔ مولوی۔ پنڈت۔ اور ماسٹر برسوں میں ہی نہ کرسکیں۔ سرسید کا یہ قول آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ "بیشک ایک اچھی ماں ہزاروں اُستادوں سے بہتر ہے"

لیکن جاہل اور اَن پڑھ عورتیں بچوں کے خیالات پست و ذلیل کر دیتی ہیں اور اپنی جہالت و نادانستگی کی بدولت ان کی صحت کو خراب ان کی جسمانی ساخت کو کمزور۔ بیجا نازبرداریوں سے ان کے مزاج کو چڑچڑا۔ لاڈ پیار سے انکے اخلاق کو برباد۔ عادات و اطوار کو خراب و مبتذل بیجا چشم پوشی یا بیجا تنبیہہ اور زجر و توبیخ سے ان کی خلقی جودت اور فطری ذکاوت کو خاک میں ملادیتی ہیں انکو ضعیف الاعتقاد۔ کوتاہ خیال۔ کاہل الوجود۔ پست ہمت۔ مکار۔ دغاباز۔ فریبی ضدّی اور ڈرپوک بنا دیتی ہیں۔ لڑکوں کے اخلاق کی درستگی جیسی کچھ عورتیں دنوں میں کرسکتی ہیں مرد سالہا سال میں بھی نہیں کرسکتے۔ ماں کو بچہ کا شفیق اتالیق۔ مشفق ناصح اور مہربان اُستاد کہنا بہت موزوں ہوگا۔ کیونکہ اس کی تعلیم و تربیت بچہ کی پھول سی طبیعت پر شبنم کا کام کرتی ہے قانون فطرت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خدائے تعالےٰ نے آغوش مادر کو بے پروبال اور بے بس مخلوق کے لیے خواہ حیوان ہو خواہ انسان مامن وملجا اور تربیت گاہ بنایا ہے اور ماں کے دل میں اپنے ننھے سے بچے کی حفاظت اور تربیت کا بے نظیر و بےمثال درد و شوق ودیعت فرمایا ہے۔ حیوان مائیں تو اپنی اولاد کی جسمانی تربیت کے بعد ہی اپنے فریضہ سے سبکدوش ہوجاتی ہیں لیکن انسانی ماؤں کو تربیت جسمانی کے ساتھ

اپنی اولاد کی روحانی پرداخت کا بھی ذمہ دیا گیا ہے۔ پس جو لوگ اپنی اولاد کی عمدہ تربیت کے خواستگار ہوں اُن کا فرض ہے کہ وہ اول اپنی عورتوں کی اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت کا کافی انتظام کریں تاکہ اسکا نیک ثمرہ ان کی اولاد میں ظاہر ہو اور وہ انسان کی اولاد اسکے اصل معنوں میں کہلائی جاسکے۔ ورنہ اولاد کا پیدا کرنا اور اُس کی تربیت کی طرف توجہ نہ کرنا ملک اور قوم میں وحشیوں کی تعداد بڑھانا ہے۔ نیک اولاد پیدا کرنا ملک کی بڑی ضرورت کو رفع کرنا ہے۔ پھر تیری ہری جی فرماتے ہیں کہ۔

"اعلیٰ ترین اور سب سے بڑی خدمت جو تم اپنی قوم یا ملک کی کرسکتے ہو یہ ہے کہ تم ملک و قوم کے لیے ایک ایسی (سنتان) اولاد تیار کرو جو اپنی اعلیٰ درجہ کی جسمانی دماغی۔ اور روحانی اوصاف میں اپنی نظیر آپ ہی ہو"

پس بھائی محسن! میری اس تمام بکواس کا ماحصل یہ ہے کہ تمہاری بی بی نے کسی نہ کسی طرح گذار دیا لیکن خدا کے لیے اپنی لڑکیوں کی خبر لو۔ ابھی سویرا ہے۔ تمہاری بی بی اُن کی تعلیم و تربیت بالکل نہیں کرسکتیں اور ہرگز نہیں کرسکتیں۔ اسکا کوئی معقول انتظام کرو۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ انہیں یا تو محسن کی بی بی کے حوالہ کردو یا کسی معلمہ کو نوکر رکھو یا اگر تم بُرا نہ مانو تو میں کہوں کہ سب سے بہتر تجویز یہ ہے کہ اپنی دونوں لڑکیوں کو زنانہ نارمل سکول علی گڑھ بھیجدو۔ میں نے اپنی لڑکی کو وہاں بھیجنے کا قطعی ارادہ کرلیا ہے اگر تم بھی آمادہ ہوجاؤ تو بڑی آسانی ہوگی۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ناعاقبت اندیش جُہلا ہمیں نشانۂ ملامت بنائینگے پھر ہم پر کفر کا الزام لگائینگے لیکن ہم کو اس کی مطلق پرواہ نہ کرنا چاہیے۔ اور مولنا حالی کے ان گرانمایہ و قابل قدر اقوال کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ۔

اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کے سدا
پر فتح جب پائی سچائی ہی نے آخر پائی ہے
ہے رائی بھی پربت اگر دل میں نہیں عزم درست

پر ٹھان لی جب جی میں پھر پربت بھی ہو تو رائی ہے

یہ جیت کیا کم ہے کہ خود حق ہے تمہاری پشت پر

جو حق پہ منہ آیا ہے آخر اُسنے مُنہ کی کھائی ہے

ولہ

کہنا واعظ کا مومنوں کو بے دین ہے آجکل ایمان کے لیے شرط یقین

غالب ہے کہ قبر میں ہو مومن سے سوال تکفیر بھی واعظوں نے کی تھی کہ نہیں

میں جانتا ہوں کہ تمہاری بی بی اس بات پر کبھی راضی نہونگی لیکن تم اُنھیں سمجھانے کی کوشش کرو۔ بھائی احسن! اب وہ پہلا زمانہ نہیں ہے۔ اس زمانہ کے تمامی لڑکے اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی کی تعلیم پا رہے ہیں اور یہ تعلیم ایسی ہے کہ خود بخود ان کی آنکھیں کھولدیتی ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسے لڑکے ہماری ان ناتعلیم یافتہ۔ جاہل لڑکیوں کو پسند کرینگے ؟ ہرگز نہیں۔ پھر ان کا کیا حشر ہوگا ؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ بعض نوجوان انھیں مجبوریوں کی وجہ سے عالم تجرد میں اپنی زندگی بسر کرنا پسند کرتے ہیں اور بعضوں نے تو دوسری اقوام میں اپنا رفیق عمر تلاش کرلیا ہے۔ ان تعلیم یافتہ لڑکوں کی یہ جائز آرزو اور مستحسن تمنا ہے کہ ان کو انہیں کی طرح کی تعلیم یافتہ۔ لائق۔ مہذب اور شائستہ بیبیاں ملیں۔ وہ اپنے لیے بٹر ہاف (Better half) چاہتے ہیں بٹرہاف (Better half) نہیں چاہتے۔ پس احسن ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت پر بدل متوجہ ہوں اور اُن کو اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اعلیٰ تعلیم یافتہ بیبیاں بننے کے قابل بنائیں۔ اب وہ اگلا زمانہ نہیں رہا اب اگر کوئی لڑکی جاہل رہے گی تو یاد رکھنا کہ کوئی ناتعلیم یافتہ مرد بھی اُسے جھوٹوں نہ پوچھے گا۔ تم اس بارے میں آج رات بھر خوب غور و خوض کرو۔ اپنے بھائی محسن سے بھی اس بارے میں رائے لو۔ اسکے بعد جو تمہاری رائے قرار پائے اور جو تجویز مناسب سمجھی جائے اسپر عمل کرنا۔ تم نہایت تھکے ہوئے ہو اسلیے میں نہیں اس سے زیادہ تکلیف دینا نہیں چاہتا۔

میں پھر کل آؤنگا"

مولوی احسن مختار کو رخصت کرکے پھر گھر میں داخل ہوئے لیکن اسوقت خدا کے فضل سے فتنہ محشر فرو ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب کی بی بی نے بچوں کو اور بہت سے کھلونے اور پیسے وغیرہ دیکر سمجھا دیا تھا لیکن ہنوز میاں مسعود پر اس نادان خاتون کی احمقانہ حکمت عملی کا کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ رو رہا تھا اور اسلیے وہ بیچاری اپنی نادان بچہ کی محبت میں ایک تکیہ کو فرضی مولوی احسن قرار دیکر مار رہی تھی اور مسعود کو سمجھا رہی تھی کہ لو ہم نے تمہارا عوض لے لیا۔ اور یوں بچہ کے دل میں باپ سے نفرت و عداوت کرنے کا بیج بویا جا رہا تھا۔ فقط

رقمہ

سید خورشید علی

(حیدر آباد دکن)

ماں کی مامتا

جزیرہ آئس لینڈ کے گورنر کا چھوٹا لڑکا نہایت ہی فضول خرچ اور کمزور طبیعت کا تھا۔ علاوہ اور مصیبتوں کے جو اُسکے ہاتوں گھر پر آئیں سب سے زیادہ یہ تھی کہ جب وہ یورپ اور انگلستان میں اپنی بیوی اور سالی کے ساتھ ہنی مون[1] گذارنے گیا تھا اُسنے اپنی سالی کے بہکائے سے جسکے اطوار بہو بیٹیوں کے سے نہ تھے اور اُسے اُس کی خاطر بیحد منظور تھی۔ اپنے باپ کے اور خسر کے جعلی دستخط کرکے کوپن ہیگن کے بنک سے ایک لاکھ روپیہ لیکر خوب گلچھرے اڑائے۔ کوپن ہیگن کے مالک بنک کو دستخطوں پر کچھ شبہ ہوا اور اُسنے اپنے دو گماشتوں کو تصدیق کے لیے آئس لینڈ بھیجا۔ سب سے پہلے یہ دونو وارد شریف

[1] شادی کے بعد جو پہلا مہینہ ہوتا ہے۔

آئس لینڈ کے پاس گئے اور پھر یہ تینوں ملکر گورنر کے مکان پر تصدیق کے لیے آئے۔ گورنر مکان پر موجود نہ تھا بلکہ وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ اُسکا بڑا لڑکا گھر پر موجود تھا جسنے اُس کی بابت کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور اُن کو یہ کہکر کہ کل ابا جان آجائینگے اور وہ خود اس کی تصدیق کرینگے ٹالدیا۔ قبل اسکے کہ گورنر اُن لوگوں سے ملے اُسکے بڑے لڑکے نے اُسکو معاملہ سے آگاہ کردیا۔ اول اول تو اُسنے بہت پیچ و تاب کھایا اور ارادہ کیا کہ میں اُس کی تصدیق نہ کروں اور اس بدکردار کو اسکا نتیجہ بھگتنے دوں۔ مگر لڑکے کی ماں کی انتہادرجہ کی منت سماجت سے اُس نے روپیہ ادا کر دینے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ گورنر نے لڑکے کے خسر سے اسکے متعلق تذکرہ کیا اور کہا کہ فی الحال نصف رقم تم ادا کردو بعد کو رفتہ رفتہ میں خود تم کو تمہارا کُل روپیہ ادا کردونگا۔ مگر اُسنے ادا کرنے سے صاف انکار کردیا۔ آخرکار وہ لوگ آگئے اور اُسنے دستخطوں کی تصدیق کرہی دی اور اپنی کل جائداد کو رہن رکھکر روپیہ ادا کردیا۔ لیکن اسکے بعد فوراً ہی اپنے بیٹے کو بلاکر کہا کہ اب تمہارا اس گھر میں کوئی کام نہیں ہے۔ فوراً آئس لینڈ چھوڑدو اور پھر کبھی اپنی صورت مجھے نہ دکھاؤ۔ آخرکار اُس بدبخت کو گھر چھوڑنا پڑا اور وہ لندن پہنچا۔ کچھ دنوں بعد لندن میں اُس کی حالت نہایت ذلیل ہوگئی۔ نہ بدن پر کپڑے تھے۔ نہ پیر میں جوتا تھا اور نہ کچھ کھانے کو تھا۔ جو روپیہ اُس کی ماں نے اُس کو چلتے وقت دیدیا تھا (جیسے کہ اکثر مائیں اپنے بچے کو کالج یا اسکول جاتے وقت یا کسی مصیبت کے وقت علحدہ دیدیا کرتی ہیں) خرچ ہوچکا تھا۔ اپنی خیریت کا خط لکھتے وقت اُسنے اپنی ماں کو اسلیے کہ اگر اُسنے اپنی اصلی حالت کی اسکو اطلاع دی تو وہ نہایت کڑھیگی ایک جھوٹا خط لکھا کہ میں نہایت اچھی حالت میں ہوں اور یہاں اچھی صحبتوں میں اُٹھتا بیٹھتا ہوں اور بڑے بڑے لوگوں سے میری ملاقات ہوگئی ہے۔ ماں اس آوارہ گرد کے خط کا جسنے صرف اپنی ہی زندگی تباہ نہیں کی بلکہ اپنے ساتھ اپنے خاندان کو مفلس و تباہ کیا اور والدین کی زندگی کو تلخ کردیا۔ ذیل کے سادہ اور محبت آمیز الفاظ میں جواب دیتی ہے جن سے

ماں کی انتہائی محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خدا کی عطا کی ہوئی چیزوں میں انسان کے لیے ماں ہی ایک ایسی برکت ہے کہ جس کی نظیر ملنا مشکل کیا محال ہے۔ اُس کی خوشی اولاد کی اچھی حالت پر ہے اور اُسکا رنج وصدمہ اولاد کی تکلیف پر۔ وہ اپنے آپ کو اُس کی موجودگی میں بُھلا دیتی ہے اور ایثار نفس جو انسان کی اعلیٰ صفات میں سے ہے اس میں سب سے زیادہ موجود ہے قدرتی طور پر انسان میں رشک کا مادہ موجود ہے۔ ہر انسان اپنے سے بہتر کی حالت پر رشک کرتا ہے اور اُس سے بہتر ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا میں جسقدر تعلقات اور رشتے پائے جاتے ہیں کوئی بھی اس سے خالی نہیں حتیٰ کہ بھائی بھائی کی حالت پر رشک کرتا ہے اور بیٹا باپ کی مگر قدرت نے اس امر سے اگر کسی کو مستثنےٰ کیا ہے تو وہ اولاد کا رشتہ ہے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسے کمبخت والدین ہونگے کہ جو اپنی اولاد کی حالت پر رشک کرتے ہوں۔ مگر افسوس کہ باوجود ان تمام باتوں کے ہم ماں کی اُتنی قدر نہیں کرتے جتنی کہ کرنا چاہیے۔ عموماً عورتیں مردوں سے زیادہ مذہبی ہوتی ہیں جسکی ایک جھلک اس خط میں بھی موجود ہے۔

خط (ترجمہ)

میرے پیارے بچے۔

تیرا خط ایک انتظار کے بعد پچھلے جہاز میں آیا اور جو مسرت کی باتیں اُس میں لکھی تھیں اُنہوں نے اُس انتظار کو بالکل بُھلا دیا۔ میرے بچے اس سے زیادہ مجھے اور کس چیز کے سُننے سے خوشی حاصل ہو سکتی ہے کہ تو اچھی حالت میں ہے اور انگریزوں کے سب سے بڑے شہر میں اپنی زندگی لطف سے گذار رہا ہے۔ مجھے اکثر یہ خوف پیدا ہوتا ہے کہ تو بُری حالت میں ہوگا مگر اب تیرے خط سے معلوم ہو کر میں مطمئن اور خوش ہوں۔ مجھے اسپر ناز ہے کہ میرا بیٹا ایسی اعلیٰ اور نیک صحبت میں ہے اور اگرچہ تمہارا باپ بہت کم اظہار مقصد کرتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ بھی میرے ہم خیال ہے۔

رہا میری بابت سو تقاضاے عمر سے بائیں کان میں درد ہوا کرتا ہے اور اب نظر بھی سننے اور باریک کام کرنے کے لیے کمزور ہی۔ مگر مجکو اسکی شکایت نہیں کرنا چاہیے کیونکہ یہ بھی خدا کی ہم بوڑہوں پر رحمت ہی کہ وہ رفتہ رفتہ ہماری قوتوں کو کم کرتا رہتا ہی تاکہ وہ دفعتاً معدوم نہوں بلکہ رفتہ رفتہ زائل ہوں۔

اگرچہ تو اب ایسی آسایش میں ہی تاہم تو اپنی ماں کے ایک ناچیز تحفہ بھیجنے پر خفا نہوگا میریا تمام دن تیرے کالج کے صندوق کے پارسل کرنے میں مصروف رہی ہے اور خدا ہی جانتا ہی کہ اُسنے کیا کیا اس میں رکھدیا ہے۔ لیکن میں تجکو بھورے رنگ کی اون کی جرابوں کا ایک جوڑہ بنکر بھیجتی ہوں اور امید ہی کہ انکے پہننے میں تجھے کوئی ندامت نہوگی کیونکہ وہ سردی کے موسم میں تیرے پیروں کو گرم رکھینگی۔ اُسوقت انگریزی موزے سوتی اور پتلے ہونیکی وجہ سے کام نہیں دیسکتے۔ مجھے یاد ہی کہ تو یہاں کے دہوئیں سے گرم کیے ہوئے مکھن کا کسقدر شائق تھا اور اسلیے میں نے میریا سے کہدیا ہی کہ وہ بھی رکھدے اور کچھ مٹھائی۔ میں گورنر سے اسکا ذکر کرنے کی جرأت نہیں کرتی کیونکہ وہ اسے حماقت اور غیر ضروری امر خیال کریگا۔ اور درحقیقت ایسی ایسی عمدہ عمدہ چیزیں کھانے اور پینے کے لیے ہوتی ہیں یہ نہیں چاہتی کہ اپنے انگریز دوستوں کو اُسکو تحفتاً دے بلکہ تو اُسے کہیں چھپا رکھنا اور تنہائی کے وقت اُس میں سے کچھ کھالیا کرنا۔

میرے پیارے بچے اپنی خوشحالی کے وقت میں اس بات کو یاد رکھو کہ تمام نیک باتیں خدا کیطرف سے ہیں اور اُسپر بھروسہ اور ایمان رکھنا چاہیے۔ اُسکی حفاظت میں میں تجکو سپرد کرتی ہوں کیونکہ وہی ہماری ضرورِیات۔ تکالیف اور بھیدوں سے واقف ہی وہ ہمیشہ ہماری نگہبانی کرتا ہی اور وہ کبھی نہیں سوتا۔

تیری پیاری ماں

انیا

محمد بدرالدین سہواردی

ایک اولوالعزم بیگم

عہد شاہجہاں بادشاہ میں جن امیروں کو عروج ہوا تھا اُن میں نواب علی مردان خاں سب سے ممتاز ہیں۔ اس نامور امیر کی شان و شوکت اور جوانمردی و دانائی کی نظیر دیجاتی تھی۔ کشمیر اور پنجاب ۲ دو صوبوں کے حاکم تھے۔ گرمی کی بہار کشمیر میں جاڑے کا لطف پنجاب میں حاصل تھا۔ امیرالامرا دربار شاہی سے خطاب ملا تھا۔ بلخ میں اُزبک بہادروں کے مقابلہ میں اُن کی تلوار نے جوانمردی کے جوہر دکھائے تھے۔ اپنے ولی نعمت شاہجہاں بادشاہ کی ایک بار دعوت کی تو سنو قابیں مع سرپوش سونے کی اور تین سو قابیں مع سرپوش چاندی کی نعمت خانہ میں لگائی گئیں۔ دارالسلطنت لاہور میں دریائے راوی سے نہر لاکر چشمۂ فیض جاری کیا تھا۔ یہ وہی نہر تھی جسکے کنارہ پر مشہور شالامار باغ خلیل اللہ خاں کے اہتمام سے آٹھ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا تھا چند اونچے نیچے ٹیلے تھے جنکو کاریگروں نے بہار نظر بنا دیا۔ اسی نامور امیر کی بیٹی وہ بیگم تھی جسکے حیرت انگیز کارنامے آج ہم سُناتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں بہت سی بیگمات ایسی گذری ہیں جنکا نام قابلیت کے جوہر آجتک روشن کر رہے ہیں۔ مثلاً بادشاہ بیگم نورجہاں۔ شاہزادی جہان آرا بیگم۔ زیب النسا بیگم وغیرہ وغیرہ۔

یہ بیگمات علم و ادب سلیقہ و تمیز میں ایسی ممتاز تھیں کہ ابتک ہمارے سوسیٹی اُنکے ہُنر کی اور ہمارا لٹریچر اُنکی تصنیفات کا ممنون ہے۔ لیکن ہماری ہیروئن کے کارنامے اُنسے مختلف ہیں۔ اُس کی لیاقت کے جوہر ملک داری اور جنگ کے میدان میں چمکے ہیں۔ کابل کا صوبہ پہاڑوں کی کثرت اور پٹھانوں کی جرأت کے سبب ہمیشہ سے سرکش اور خودسر رہا ہے تیموریہ سلاطین کے زمانہ میں وہاں بڑے بڑے معرکے ہوئے ہیں۔ بادشاہی فوج کو غلبہ ہوا تو دب گئے جب موقع ملا پھر بگڑ بیٹھے۔ عالمگیر بادشاہ کے زمانہ میں بھی وہاں شورش

دیکھو ماثرالامرا حالات نواب امیر خاں میر میراں۔ باب الف۔

کا زور شور تھا۔ ایمل خاں افغان نے بادشاہی کا خطاب لیکر سکہ اپنے نام کا جاری کر رکھا تھا۔ بہت سی ناکامیابی کے بعد کابل کی حکومت امیر خاں میر میراں کے سپرد ہوئی۔ اس امیر میں بہادری و تدبیر دونوں جمع تھیں۔ اول اُسنے تلوار کے زور سے سرکشوں کو قابو میں کیا اُسکے بعد تالیف قلوب کے ذریعے سے اُنکے دل ہاتھ میں لیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شورش برطرف ہوگئی۔ اور ہر طرف امن و امان کی برکت نظر آنے لگی۔ بائیس برس میر میراں باجاہ و جلال اس صوبہ پر فرماں روا رہا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ سر اُٹھاتا یا پاؤں نکالتا۔ میرالامرا علی مردان کی بیٹی جن کا لقب صاحب جی تھا امیر خاں میر میران کی بیگم تھیں۔ اس بیگم کو جو تدبیر اور اولوالعزمی عالیجاہ باپ سے ترکہ میں ملی تھی اُس میں والا مرتبہ شوہر کی ہمنشینی سے اور زیادہ ترقی اور قوت حاصل ہوگئی تھی۔ صوبہ کابل کے بندوبست اور انتظام میں اپنے شوہر کی شریک اور مشیر رہتی تھی۔ اور بہت سے عمدہ کام اُس کی معاملہ فہمی اور تدبیر کی وجہ سے انجام پذیر ہوتے تھے۔

عالمگیر بادشاہ ایک روز شب کو تخلیہ میں صوبوں کی رپورٹیں ملاحظہ فرما رہے تھے۔ صوبۂ کابل کی رپوٹ جو پڑھی تو اُس میں نواب امیر خاں کی وفات کی خبر درج تھی۔ بادشاہ کو سخت تردد ہوا اور فوراً نواب ارشد خاں کو (جو مدت تک کابل میں دیوان رہے تھے اور وہاں کی حالت سے خوب واقف تھے) یاد فرما کر ارشاد کیا۔ "امیر خاں نے انتقال کیا ایسے سرکش ملک کا بے سر رہجانا خطرہ سے خالی نہیں۔ اندیشہ ہے کہ دوسرے صوبہ دار کے پہنچنے تک وہاں بغاوت نہ پھیل جاوے" ارشد خاں نے جرأت کر کے عرض کی کہ پیر و مرشد امیر خاں زندہ ہیں۔ کون کہتا ہے کہ مرگئے۔ بادشاہ نے کہا کہ کابل کی رپوٹ ابھی ملاحظہ ہوئی ہے۔ ارشد خاں نے کہا کہ پیر و مرشد نے بجا ارشاد فرمایا۔ لیکن افغانستان کا انتظام صاحب جی کی تدبیر و دانشمندی کے دامن سے وابستہ ہے۔ جب تک وہ وہاں ہیں بدانتظامی ناممکن ہے۔ فوراً اُس مدبرہ روزگار کے نام فرمان شاہی صادر ہوا

کہ جب تک شاہزادہ شاہ عالم وہاں پہنچیں افغانستان کو قابو میں رکھو۔

صاحب جی کو جو مشکل مرحلے پیش آئے اُن کا بیان دشوار ہے۔ مآثر الامرا میں لکھا ہے کہ اُس خطرناک کوہستان میں سے لشکر سلامت بے آنا بڑے بڑے جوانمردوں کو نصیب نہیں ہوا۔ اس قول کی تائید ہمارے زمانہ کے معرکوں سے بھی ہوتی ہے۔

الغرض سب سے اول مرحلہ صاحب جی کو یہی پیش آیا کہ لشکر کا انتظام قایم رکھنا اور سلامتی سے کوہستان طے کر کے میدان میں پہنچنا تھا۔ اور اس کی باتدبیر بیگم نے وہ تدبیر سوچی کہ ذرا بھی بدنظمی نہیں ہوئی۔ امیر خاں کی وفات کا حال پوشیدہ رکھا امیر خاں کا لباس ایک ہمشکل شخص کو پہنا کر اور آئینہ دار پالکی میں بٹھا کر فوج کا کوچ جاری رکھا افسر و سپاہی یہ سمجھتے کہ اُن کا سردار زندہ ہے۔ چنانچہ ہر روز صبح کو حسب قاعدہ پالکی کے سامنے آکر مجرا کرتے تھے۔ جب فوج کوہستان کو طے کر آئی تو صاحب جی نے صورت حال سے پردہ اُٹھا دیا۔ اور وفات امیر خاں کا اعلان کر کے سوگ میں بیٹھیں۔ یہ خبر سُنکر کثرت سے افغانستان کے سردار تعزیت کو آئے۔ تعزیت کے پردہ میں غالباً یہی مطلب ہو گا کہ لشکر کی حالت جانچکر یہ فیصلہ کریں کہ اب اُنکو کیا کرنا ہے اطاعت یا بغاوت۔ صاحب جی نے سب کو نہایت تپاک اور عزت سے لیا اور ٹھہرایا۔ فاتحہ کے بعد اُنسے کہلا بھیجا کہ اگر بادشاہ کی فرماں برداری کرو گے تو جو تمہارا وظیفہ مقرر ہے وہ بدستور جاری رہے گا۔ اور اگر سرکشی کا حوصلہ ہے تو بسم اللہ آؤ اسی میدان میں فیصلہ ہو جائے۔ اگر میں عورت ذات غالب آگئی تو قیامت تک نام روشن رہیگا۔ افغانی سردار جانتے تھے کہ یہ الفاظ کسی معمولی پردہ نشین بیگم کے نہیں ہیں صاحب جی کی زبان سے نکلے ہیں سب نے سر جھکا دیا اور اطاعت و فرماں برداری کا ازسرنو عہد کر کے اپنے اپنے گھروں کو واپس گئے۔ شاہ عالم کے کابل پہنچنے میں عرصہ لگا اور اس مدت میں صاحب جی نے بندوبست و انتظام پوری قوت سے جاری رکھا۔

دو برس کامل کابل کا انتظام کرکے یہ بانوے عصمت آئیں بمقام برہان پور دربار شاہی میں پہنچی اور بادشاہ مجازی سے اجازت لیکر خداوند حقیقی کی بارگاہ میں حاضر ہونے کے واسطے سفر حجاز اختیار کیا۔ ملک عرب میں بھی اُسکے فیض و سخاوت نے اپنے جوہر دکھائے اور شریف مکہ وغیرہ عمائد نے نہایت اعزاز و توقیر سے اُنکا استقبال کیا۔ صاحب جی کی کوئی اولاد نہ تھی اپنے شوہر کے بچوں کو مثل اپنی اولاد کے پالا تھا۔

جب برہان پور میں بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوئیں تو اس امانت کو دربار کے سپرد کیا ان لڑکوں میں کئی نامور عہدوں پر ممتاز ہوئے۔

ایک بار صاحب جی کی پالکی ایک کوچہ سے گذر رہی تھی کہ ناگاہ ایک مست بادشاہی ہاتھی سامنے سے آگیا۔ بیگم کے چوبداروں نے ہرچند فیلبان کو آواز دی کہ ہاتھی ہٹاؤ مگر مہاوت شاہی ملازمت کے نشہ میں تھا ایک نہ سنی اور ہاتھی کو برابر لے آیا جب قریب آگیا تو بیگم کے آدمیوں نے سونڈ میں تیر مارے۔ ہاتھی ان لکڑیوں کو کیا خطرہ میں لاتا جھپٹ کر پالکی پر سونڈ ڈالی کہاروں نے خوف زدہ ہو کر پالکی زمین پر پٹک دی اور اک طرف کو بھاگ گئے۔ بہادر بیگم کے حواس اب بھی قائم تھے۔ جوں ہی ہاتھی کی سونڈ پالکی پر آئی جست کرکے ایک صراف کی دوکان میں جو قریب تھی ہو رہی۔ اور کوٹھری میں گھُس کر دروازہ بند کرلیا۔ اُس زمانہ کی غیرت بھی عجیب تھی۔ امیر خاں اسپر بگڑ گئے۔ کیوں پردہ سے باہر نکلی۔ کچھ عرصہ تک کھنچے رہے آخر رعیت نواز بادشاہ نے یہ سمجھا کر باہم مصالحت کرادی کہ بیگم نے اپنا پردہ اور تمہارا ناموس قایم رکھا اگر ہاتھی سونڈ میں لپیٹ کر اُچھال دیتا تو کیا ہوتا۔

سشرانی

زنانہ حاضر جوابیاں

(بقیہ)

امانی زیب النسا کی ایک کنیز تھی جو بہت موزوں طبع تھی، ایک دفعہ زیب النسا نے اُس سے کہا کہ فلاں کمرہ سے ذرا میری بیاض اُٹھا لانا۔ اُس بیاض میں زیب النسا نے عمدہ عمدہ اشعار اپنی پسند سے انتخاب کرکے درج کر رکھے تھے۔ امانی بیاض لیکر آ رہی تھی کہ اُسکا گذر شاہی محل کے ایک کنارہ پر ہوا، جس میں رنگ برنگ کی مچھلیاں تیر رہی تھیں، ذرا سی دیر کے لیے وہ کنارہ پر کھڑی ہوگئی اور مچھلیوں کی خوش فعلیوں کا تماشا دیکھنے لگی۔ اتفاقاً اُسکے ہاتھ سے وہ بیاض چھوٹ گئی اور حوض میں گر پڑی، مجبوراً خالی ہاتھ زیب النسا کے سامنے آئی، جب زیب النسا نے اپنی بیاض مانگی تو اُسنے یہ دو شعر فی البدیہ لکھکر پیش کیے۔

آں بیاض خاصۂ شاہی کہ در روے ہر طرف
چوں کواکب نقطہ ہائے انتخاب اُفتادہ است
ایں زماں از دستِ ایں مستوجب قہر و عتاب
چوں بیاضِ سینۂ ماہی در آب افتادہ است

یعنی شاہی بیاض جس میں ہر صفحہ کے حاشیہ پر انتخاب کے نشان ستاروں جیسے چمک رہے ہیں مجھ نالائق بندی کے ہاتھ سے جو کہ غصہ کرنے اور سزا دینے کے لائق ہو۔ ابھی ابھی پانی میں گر پڑی ہو اور اُس میں ایسی دکھائی دیتی ہے جیسے مچھلی کے سینہ کی بیاض، یعنی سفیدی۔

(۲)

ایک دفعہ حضور کی طبیعت مکدر تھی، نور جہاں نے جرأت کرکے سبب پوچھا، جہانگیر کے آنسو نکل آئے اور اُسنے یہ مصرع موزوں کرکے پڑھا۔

نمی آید بغیر از گریہ دیگر کار از چشم

یعنی میری آنکھوں کو رونے کے سوا اور کوئی کام نہیں آتا۔

نورجہاں نے فی البدیہ یہ مصرع کہا۔

بلے از مردم بے دست و پا دیگر چہ می آید

یعنی بیشک بے ہاتھ پاؤں کے (یعنی اپاہج) مردم (یعنی آدمیوں) سے اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس مصرع میں لطف یہ ہے کہ مردم کا لفظ دو معنیوں میں آتا ہے آدمی اور آنکھ کی پتلی۔

(۳)

مہستی ایک مشہور شاعرہ خاتون کا نام ہے جو سلطان سنجر سلجوقی کے ہاں نہایت عزت و حرمت سے زندگی بسر کرتی تھی، رباعیاں کہنے میں اُس کی طبیعت بہت موزوں تھی۔ ایک دفعہ بادشاہ محل میں تھا۔ مہستی باہر سے ہوا خوری کر کے آئی، اُسوقت ہوا سرد تھی، برف آسمان سے برس رہی تھی، بادشاہ محل میں بیٹھا بیٹھا اکتا گیا تھا اور چاہتا تھا کہ ہوا خوری کو نکلے، اُسنے مہستی سے پوچھا کہ اب ہوا کیسی ہے؟ مہستی نے فی البدیہ یہ رباعی کہکر سنائی۔

شاہا فلکت اسپ سعادت زیں کرد

واز جملۂ خسرواں ترا تحسیں کرد

تا در حرکت سمند زریں نعل ہست

بر گل نہ نہد پائے، زمیں سیمیں کرد

یعنی بادشاہ سلامت! آسمان حضور کے اقبال کے گھوڑے پر زین کستا ہے اور تمام بادشاہوں میں صرف آپ کی تعریف کرتا ہے، اس خیال سے کہ آپ کا زریں نعل گھوڑا مٹی کیچڑ پر قدم نہ رکھے اُسنے زمین کو چاندی کا بنا دیا ہے۔

(۴)

ایک دفعہ نورجہاں نے موتیوں کی لڑیاں اپنی مانگ پر آویزاں کیں، جہانگیر نے اُسکو دیکھکر

یہ مصرع کہا۔

سلک مروارید بر فرق سرش دانی کہ چیست

یعنی تم جانتے ہو کہ موتیوں کی لڑی جو اُسکے سر پر ہے کیا چیز ہے ؟

نور جہاں نے فی البدیہ یہ دوسرا مصرع اس طرح کہا۔

تشنگان شوق را جُویست از آب حیات

یعنی شوق کے پیاسوں کے لیے یہ آب حیات کی ایک نہر جاری ہے۔ فقط

خاکسار

مس امراؤ بیگم

(پانی پت)

ہفت عجائبات عالم

اوّل۔ پہلا ایک برنجی قوی ہیکل بت جزیرہ رہوڈس (واقع بحر روم) میں تھا جو سورج دیوتا کے نام پر بنایا گیا تھا۔ یہ بارہ برس میں تیار ہوا تھا۔ اس کی تیاری میں سو ٹیلنٹ یا تقریباً ستانوے ہزار پاؤنڈ انگریزی سکے صرف ہوئے تھے۔ اسکا قد ستر ہاتھ تھا۔ ٹھیک بندرگاہ کے سامنے ایستادہ تھا۔ اسکے انگوٹھے اتنے بڑے بڑے تھے کہ ایک کو بھی ایک آدمی اپنے بازوؤں کے حلقے میں نہیں لا سکتا تھا۔ اور اُس کی ٹانگیں اتنی دور تک پھیلی ہوئی تھیں کہ بڑے بڑے جہاز اُسکے درمیان سے گذر جاتے تھے۔ یہ بُت بائیں ہاتھ سے جہازیوں کی رہنمائی کے لیے ایک روشنی کے مینارے کو پکڑے ہوئے تھا۔ اور اُسکے دہنے ہاتھ میں ایک نیزہ اس انداز سے تھا کہ گویا وہ ہر جنہبی سبقت کرنے والے پر وار کرنے کو تُلا ہے۔ نصب ہونیکے پچاس برس بعد زلزلہ سے اُکھڑ کر گر پڑا۔ اور تقریباً نو صدی کے بعد ایک یہودی نے اس پُرانی دھات کو خرید لیا جسکی باربرداری کے لیے اُسے نو سو اونٹ مہیا کرنے پڑے تھے۔

دوم - دوسرے اہرام مصری ہیں - جن میں کے تین ابتک موجود ہیں - پہلے کا قاعدہ مربع ہر طرف سے چھ سو ساٹھ فیٹ عریض ہی - عمارت کی بلندی پانچسو فیٹ ہے - یہ بڑے بڑے پتھروں سے بنا ہوا ہی - جن میں سے چھوٹے سے چھوٹے پتھر کا طول تیس فیٹ ہی - اسکے اتمام میں تین لاکھ ساٹھ ہزار مزدوروں کو بیس برس تک لگاتار کام کرنا پڑا تھا - بقیہ دو پہلے سے کچھ چھوٹے ہیں - جنکے دیکھنے سے بیساختہ زبان سے تحسین کے کلمے نکلجاتے ہیں - بعضوں کا قیاس ہی کہ بنی اسرائیل نے اپنے قید کے زمانہ میں انہیں تعمیر کیا ہوگا لیکن یہ قیاس درست نہیں ہوسکتا کیونکہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہی کہ بنی اسرائیل سے اینٹ بنانے کا کام لیا گیا تھا -

سوم - تیسرے شہر بابل کی دیوار جسکو ملکہ سیمیرامس نے بنوایا تھا - اسنے ایک صحیح مربع کی شکل تیار ہوئی تھی - جسکا قطر یا اندرونی دور ساٹھ میل - طول دو سو فیٹ اور عرض پچاس فیٹ تھا - ان دیواروں کی وسعت اتنی تھی کہ ان پر چھ رتھ بیک وقت بیک قدم چلسکتے تھے -

چہارم - چوتھا شہر افیتس میں ڈائنا (چاند) دیوی کی مندر جو ایک نہایت ہی شاندار عمارت تھی - اسکے اندر بے انتہا خزانے تھے - اس دیوی کی پرستش بڑی مذہبی دہوم دہام کے ساتھ ہوتی تھی - دو سو بیس برس میں یہ عمارت اتمام کو پہونچی تھی - حالانکہ سارا ایشیا اسکی تعمیر پر مامور تھا - یہ عمارت ایکسو ستائیس جزیرہ پارس (واقع بحر ایجین) کے خوبصورت سنگ مرمر کے ستونوں پر ایستادہ تھی - ہر ستون ایک ہی پتھر کا اور ا ناسی بادشاہوں کی طرف سے تعمیر کیا ہوا تھا - ہر ستون کا طول ساٹھ فیٹ تھا - سینتیس ستونوں میں قلمکاری کی گئی تھی - شہتیر اور چوکھٹ صنوبر کے تھے - اور بقیہ لکڑیاں قبرس کی تھیں - دیوی کی مورت آبنوس کی بنی ہوئی تھی - ایک سو دس برس کے بعد بروز پیدائش سکندر اعظم ایروسٹریٹس نامی ایک غیر معروف شخص نے اس بت کو جلا ڈالا -

پنجم - ساٹبرس شاہ میڈپا کا شاہی محل - اس کی تعمیر میمن کے ہاتوں سے ہوئی تھی یہ شخص بے نا بیدریغ خرچ کرنے والا تھا اتنا ہی فنِ معماری میں کامل الفن تھا - بیان کیا جاتا ہے کہ اُسنے واقعی پتھروں کو سونے سے چپکا دیا تھا - بعض ہیکل سلیمانی واقع بیت المقدس کو بحیثیت افضل ترنمونہ معماری ترجیح دیتے ہیں -

ششم - شہر اولمپس میں جو پٹبر اولمپس کا بُت (جو پٹبر دیوتانیوں کا دیوتا تھا) تھا یہ عظیم الجثہ - فیل زنداں کا بنا ہوا تھا جسکو فیڈیاس ایک مشہور بُت تراش نے نہایت اُستادی کے ساتھ تراشا تھا -

ہفتم - مُسولس شاہ کیریا کا مقبرہ - جسکو اُس کی ملکہ آرٹیمیسیا نے خوبصورت سنگ مرمر کا تعمیر کرایا تھا - یہ مقبرہ اعلیٰ درجہ کی صناعی کا نمونہ تھا - اسکا طول تریسٹھ فیٹ - دور چار سو فیٹ - اور بلندی پنتیس فیٹ تھی - ہر چہار طرف چھتیس ستون تھے - جس میں نہایت اعلیٰ درجہ کی پچیکاری کی گئی تھی - بعض ہفت عجائبات عالم میں سے اُسی کو ایک تصور کرتے ہیں لیکن بعض اسکندریہ (واقع مصر) کے روشنی کے مینارے کو ترجیح دیتے ہیں - موخر الذکر ایک سفید سنگ مرمر کا مینارہ تقریباً چار سو فیٹ بلند تھا - اس میں عالیشان غلام گردش اور بڑے بڑے آئینے لگے ہوئے تھے - چوٹی پر ایک بہت بڑی لالٹین تھی - جو ہر وقت روشن رہتی تھی - اس کی روشنی جہاز والے سو میل کے فاصلہ سے معلوم کر سکتے تھے - فقط

راقم
سید عبد النعیم دسنوی - بی - اے -
دسنہ ضلع پٹنہ

اڈیٹوریل

ہندوستانی عورتوں کی تعلیم

ٹائمز آف لنڈن میں آنریبل مسٹر ماریسن جدید ممبر انڈیا کونسل و سابق پرنسپل مدرسۃ العلوم کے ایک لکچر کا خلاصہ شائع ہوا ہی۔ جو مسٹر موصوف نے مندرجہ بالا عنوان پر ایم اے او کالج ایسوسی ایشن لندن کی ایک میٹنگ منعقدہ کیکسٹن ہال میں ۱۹ جنوری گذشتہ کو دیا تھا۔ سرایم ایم بھاونگری اس میٹنگ کے پریسیڈنٹ تھے۔ لکچر میں مسٹر ماریسن نے فرمایا کہ ہندوستان کی اعلیٰ سوسائٹی میں ایک واقعی انقلاب جاری ہی اور جس تیزی کے ساتھ اس سوسائٹی کی حالت میں تغیر ہو رہا ہی، وہ اگر یورپ میں بھی ہوتی، تو حیرت انگیز شمار کی جاتی۔ یہ انقلاب دماغ وعقل کا جو ابتک ہندوستان کی علم پیشہ جماعت میں محدود تھا، اب ہندوستان کی آبادی کے تمام طبیعتوں میں سرایت کرتا جاتا ہی اور اُسکے مقابل کوئی اور قوت ایسی نظر نہیں آتی، جو "انگریزیت" کے سیلاب کو، جو بڑھتا جاتا ہی، کافی طور پر روک سکے۔ اس عہد میں جو اسٹیم اور برقی قوت کے کرشموں کا عہد ہی، پُرانے اور ناقص انسٹیٹیوشنز مغربی تمدن وتہذیب کے طاقتور حملہ کے سامنے بے پناہ ہیں اور اس حملہ کا اثر دیسی علوم وکمالات کو رونق دینے کے بجائے اُن کی بربادی کا باعث ہو رہا ہی۔ سب سے بہتر ثبوت اسکا وہ ہندوستانی ہیں، جو اسقدر انگریز بن گئے ہیں کہ ہندوستانی یا ایشیائی لٹریچر سے چاشنی لینے کی صلاح کا بھی بُرا مانتے ہیں اور خفا ہوتے ہیں۔ ابتک اس انقلاب نے صرف جنس ذکور پر اثر کیا ہی۔ طبقہ اُناث کو اس اثر کی ہوا بھی نہیں لگی، جسکا نتیجہ یہ ہی کہ ہندوستان کی معاشرت اور تمدن پر انگریزیت کا کوئی گہرا اور پائدار اثر نہیں ہوا ہے۔

گرمجوش رفارمروں کے پردہ سسٹم پر ناکام حملوں نے ہندوستانی مستورات میں ایک عجیب استقلال کا ثبوت دیا ہی، جس کی توقع نہ تھی۔ مستورات نے پردہ کی حمایت میں صنفِ نازک

کی نزاکت کو سپر بنایا ہے، جو ممکن ہے کہ اُن کی غلط فہمی ہو، لیکن اُنکے اس عذر کی نیک نیتی میں شبہ
نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بڑی بڑی اصلاحیں جنکے انگریزیت کے دلدادہ اپنی خانگی زندگی کی تمام
عمارت میں خواہشمند ہیں۔ سوسائٹی کی مشین کے کل پرزے تبدیل کر دینے سے فوراً عمل
میں نہیں آسکتیں۔ اصلی انقلاب اب شروع ہو رہا ہے، کیونکہ عورتوں کی تعلیم کی طرف توجہ
مبذول ہو رہی ہے۔ زمانہ میں انگریزیت اپنا اثر کرتی جاتی ہے اور یقین ہے کہ چند سال میں وہ تبدیلیاں
جن کی ابتک بکوشش تمام مقاومت کی گئی تھی، مقبول ہونگی۔ عورتوں کی تعلیم کا مسئلہ بہت
سے پُرجوش ہندوستانیوں کی رائے میں اسوقت کا سب سے اہم اور اشد ضروری مسئلہ ہے،
کیونکہ ہزارہا خاندانوں کی مسرت زندگانی کا اسی پر انحصار ہے، لیکن ساتھ ہی اسکے یہ مسئلہ بہت
ہی مشکل ہو رہا ہے۔ تاہم بعض خام طبع لوگ ایسے تشدد کے ساتھ اسکے پیچھے پڑے ہیں کہ
خطرناک نتائج کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اگر عورتوں کی تعلیم کے ساتھ تمام ضروری انقلابات بھی قاطبتاً
عمل میں لائے جائیں، یہانتک کہ اُسکو خالص مغربی طریقہ کی تعلیم کا، جیسی کہ مردوں کو دی گئی ہے
دوسرا نمونہ بنا دیا جائے، تو خاص وخالص ہندوستانی روایات کی بقا و سلامتی کی کیا اُمید
کیجا سکتی ہے۔ قبل اسکے کہ ہندوستانی سوسائٹی بالکل مسمار ہو، میں سوال کرتا ہوں کہ کیا
ہندوستان کی ہوم لائف یعنی خانگی معاشرت میں ایک چیز بھی بچانے کے لائق نہیں ہے، کیا
ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے۔ جس کی بربادی سے بچانے کے لیے ہم مطلق ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں
اور اُس کی تباہی کا تماشا دیکھتے رہیں، یہ کچھ ضروری نہیں ہے کہ جو چیزیں قابل اصلاح ہیں اُنکا
خاتمہ بھی لازمی ہو۔ مجھے خوف ہے کہ پُرجوش رفارمر مسلم عیوب کے دفع کرنے کے جوش میں
کہیں ہندوستان کی ہوم لائف کے تمام ایوان کو بیخ وبنیاد سے اُکھیڑ کر نہ پھینکدیں اور
اُس کی جگہ مغربی نمونہ پر از سر نو اُسکے قائم کرنے کا سودا اُنکے دلوں میں نہ سمایا ہو۔ اگر ہندوستانی
عورتوں کی تعلیم بھی اُنہیں خالص یورپین طریقوں پر ہوئی، جیسی کہ اُنکے شوہروں اور بھائیوں
نے پائی ہے، تو ہندوستانی سوسائٹی کے نقش ونگار، جو صدہا سال سے چلے آتے ہیں،

بالکل نیست و نابود ہو جانے کے خطرہ میں ہونگے. ہندوستانی عورتوں کی تعلیم لازمی ہونی چاہیے لیکن میرا سوال یہ ہے کہ کیا انگریزی کتابوں اور انگریزی خیالات سے اُن کو آشنا کرکے توقع کیجا سکتی ہے کہ وہ یورپین خیالات کے اثر وانقلاب سے محفوظ رہیں گی، کیا انکو ایسی تعلیم دینی جو تازہ اثر کے ساتھ اُن کی قدیم خوبیوں کو قائم رکھے ناممکن ہے۔

لکچر کے ختم ہونے پر اس موضوع پر بحث ہوئی۔ جس میں مسٹر ہیرلڈ کاکس ممبر پارلیمنٹ شیخ عبدالقادر صاحب اور میجر سید حسن وغیرہ نے حصہ لیا۔ صدر انجمن نے اپنی اسپیچ کے آخر میں بیان کیا کہ مسٹر ماریسن کے سوالات کو دوران بحث میں اکثر اسپیکروں نے مدنظر نہیں کھا سب نے اسی پر زور دیا کہ مغربی تعلیم سے، جیسی کہ مردوں کو دیجاتی ہے، عورتوں کو محروم رکھنا عملاً غیر ممکن ہے اور اُسکا اعتراف مسٹر ماریسن نے بھی اپنے لکچر میں کیا ہے۔ مردوں میں جو انگریزیت کا غلو بڑہتا جاتا ہے، اُسکے جواب میں عورتوں کی قدرتی قدامت پسندی اور فطرتی قدیم پرستی کو پیش کیا گیا اور اُس کی بنا پر سب نے اُس قدر اندیشہ کو، جیسا کہ مسٹر ماریسن نے ظاہر کیا تھا غیر واجبی جانا، تاہم مغربی تعلیم کے ساتھ مشرقی قدیم لٹریچر کو ترکیب دینے کی ضرورت سب نے تسلیم کی اور یہ تجویز ہوئی کہ آئندہ میٹنگ میں مسٹر ماریسن کے پیش کردہ علمی سولات پر مس عطیہ فیضی جو طیب جی کے خاندان کی مشہور لیڈی ہیں اور ولایت میں آجکل تعلیم پاتی ہیں نیز اس جلسہ میں بذات خود موجود تھیں، ایک مضمون تیار کرکے پڑہینگی۔

مسز سروجنی نائڈو کی تقریر

سوشیل کانفرنس کلکتہ میں ایک رزولیوشن پیش ہوا تھا جس میں ہندو قوم کو تعلیم نسواں کی طرف توجہ دلائی تھی کہ جو کچھ گورنمنٹ تعلیم نسواں کے متعلق کر رہی ہے اُس میں وہ مدد دیں۔ مسز سروجنی نائڈو صاحبہ نے جو زمانہ حال کی نہایت تعلیم یافتہ اور روشنخیال خاتون ہیں۔ اور انگریزی علم ادب کی ماہر اور بہت بڑی شاعرہ ہیں۔ انہوں نے رزولیوشن میں ذیل کی یہ ترمیم پیش کی کہ

تعلیم نسواں کے متعلق صرف ہندو کا نہیں استعمال ہونا چاہیے جس سے کہ صاف ایک نفرین پائی جاتی ہے بلکہ لفظ ہندوستان کا استعمال ہونا چاہیے جس سے کہ تمام اقوام اس میں شامل ہوسکیں۔ بعد اس ترمیم کے مسز موصوفہ نے ایک نہایت عمدہ تقریر فرمائی جسکا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اس رزدلیوشن پر تقریر کرتے وقت سب سے اول میں لفظ ہندو کے بجائے لفظ ہندوستان تبدیل کرنا چاہتی ہوں کیونکہ تعلیم کسی مذہب یا فرقے یا صوبے سے خصوصیت نہیں رکھتی ہے اور نہ کسی میں تفریق کرتی ہے۔ اس عجیب بحث پر مجھکو ہنسی بھی آتی ہے اور افسوس بھی ہوتا ہے کہ آج بیسویں صدی کے آغاز میں ہمکو اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ پبلک پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر تعلیم نسواں کی حمایت میں اس ہندوستان میں تجویز پاس کریں۔ حالانکہ یہ وہی ہندوستان ہے جس میں اول ہی صدی کے شروع میں تہذیب نے پختگی کے ساتھ اپنے قدم جمائے تھے اور جسنے دنیا کی ترقی کے لیے بڑی اعلیٰ درجہ کی ذہین فہیم تعلیم یافتہ عورتوں کی مثالیں مہیا کی ہیں لیکن اصول ارتقا[1] کی کسی غلطی سے یہ عجیب بحث ہم کو شرم دلانے کے لیے ہمارے سامنے موجود ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اس پر غور کریں کہ یہ دھبا ہم اپنے اوپر سے کیونکر دور کرسکتے ہیں۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم بجائے تعلیم نسواں کی حمایت میں سال بسال خالی رزدلیوشن پاس کرنے کے کچھ زیادہ مفید کام انجام دےسکیں۔ اس بڑے بڑے کش مکش اور جد وجہد کے زمانہ میں جبکہ اقوام ہندوستان اس بات کی فکر میں ہیں کہ انجام کار ایک متحد قومی مقصد کیونکر حاصل ہوسکیگا۔ اس بات کو نہایت اچھی طرح ذہن نشین کرلینا چاہیے کہ اسی کل مسئلہ کی کامیابی موقوف ہے۔ صرف ایک مرکز کے حصول پر اور وہ مرکز مسئلہ ترقی نسواں ہے۔

[1] ایک فلسفی کا یہ خیال ہے کہ جماد سے ترقی کرکے نبات نبات سے حیوان اور حیوان سے انسان بنا ہے اسی کو مسئلہ ارتقا کہتے ہیں۔

(مردوں کی طرف مخاطب ہوکر)

حضرات! قومی عمارت کے معمار آپ نہیں ہیں بلکہ ہم ہیں۔ لیکن سب مجھے یہ بات تعجب انگیز معلوم ہوتی ہے کہ لوگوں میں ابھی تک اس بات پر بھی اتفاق رائے نہیں ہے کہ قومی عمارت کی تکمیل میں عورتوں کی تعلیم بھی کوئی ضروری جزو ہے۔ آپ میں سے اکثر صاحبوں کو یاد ہوگا کہ مسیز سینیا ندھاں نے جب انڈین لیڈیز میگزین پہلے جاری کیا تھا تو کس سرگرمی کے ساتھ اس بات کی بحث چھڑی تھی کہ آیا عورتوں کو تعلیم دلانی چاہیے یا نہیں۔ عورتوں نے تو ہم آواز ہو کر سب نے اپنے حقوق کی وکالت نہایت فصاحت سے کی لیکن جب یہ مسئلہ مردوں میں پہونچا تو اُن میں اختلاف ہوا۔ بہت سے آدمی تو بلاشبہ سچے محب قوم ثابت ہوئے کہ انھوں نے قوم کی ماؤں کی تعلیم کی حمایت کی۔ لیکن ایسے بھی لوگ تھے جو عورتوں کی تعلیم کا نام سُنکر لرز گئے۔ اور تعجب سے پوچھنے لگے کہ کیا ہم عورتوں کو تعلیم دیں۔ اگر ہم ایسا کریں تو ہمارے با امن گھروں کا کیا حشر ہوگا۔ ہمارے لیے ذائقہ دار حلوے اور لذیذ کھانے کون تیار کرے گا۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ جو نہ ادھر کے تھے نہ اُدھر کے وہ دونوں فریقوں کو راضی کرنا چاہتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ پڑھاؤ تعلیم دو لیکن فلاں چیز کی تعلیم دو۔ اور فلاں چیز کی نہ دو۔ لیکن صاحبو! تعلیم کے مسئلہ میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہاں تک پڑھو یہاں سے آگے نہ پڑھو۔ آپ آسمان کی طوفانی ہوا کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ جہاں تو چل سکتی ہے وہاں مت چل۔ نہ آپ سمندروں کی لہروں کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں حد سے آگے مت بڑھ۔ نہ آپ انسان کے دلی خیالات کے لیے کوئی فرضی حد مقرر کر سکتے ہیں کہ وہاں سے آگے نہ بڑھے۔ تعلیم کے معنی سمجھنے میں ہر زبان میں لوگ غلطیاں کرتے ہیں۔ ہندوستان کے باشندے

جو زیادہ تر خیال میں مستغرق رہتے ہیں اُنہوں نے انسٹرکشن[۵۱] اور ایجوکیشن[۵۲] میں
ایک بیّن فرق نکالا ہے۔ اور ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس فرق کو ہم بھی تسلیم
کریں۔ انسٹرکشن کے معنی ہیں صرف علم کا حاصل کرنا۔ لیکن ایجوکیشن ایک
غیر محدود شے ہے۔ ایک خوبصورت چیز ہے۔ اور ایک ایسی آب و ہوا ہے۔
جس میں رہنا۔ چلنا پھرنا اور اپنی زندگی بسر کرنا ایک لازمی امر ہے۔ کیا کوئی
آدمی اس بات کی جرأت کر سکتا ہے کہ کسی دوسرے کو اُس خداداد موروثی حق
سے محروم کرے جو اسکو خدا کی پاک وصاف ہوا میں رہنے کا حاصل ہے۔
اگر کوئی شخص ایسی جرأت نہیں کر سکتا تو پھر کسی کو دوسرے انسانوں کی آزادی اور
زندگی کے موروثی حقوق سے محروم کرنے کی کیونکر جرأت ہو سکتی ہے۔

اور باوجود اسکے ہندوستانی عورتوں کے بارے میں یہاں کے مردوں نے
ایسی جرأت کی ہے۔ اے ہندوستان کے مرد صاحبان! آج آپ کی وہ حالت
کیوں ہے جس میں کہ آپ ہیں۔ وہ صرف اسلیے ہے کہ تمہارے باپوں نے تمہاری
ماؤں کو آزادی کے حق سے محروم کیا۔ آج تم کو جو اُنکے فرزند ہو تم بھی اپنے
اصلی ورثہ یعنی آزادی سے محروم ہو۔ لہذا میں آپ کا یہ فرض قرار دینا
چاہتی ہوں کہ آپ عورتوں کے اصلی حقوق (آزادی) اُن کو واپس دیں۔ کیونکہ
میں تم سے ابھی کہہ چکی ہوں کہ قومی عمارت کے اصلی معمار تم نہیں ہو بلکہ ہم ہیں۔
اور ترقی کے ہر پہلو میں بلا ہماری ذاتی امداد کے آپ کی کُل کانگرس اور کانفرنسوں
کی محنت رائگاں جائے گی۔ اپنی عورتوں کو تعلیم دو۔ پھر قوم اپنی خبر آپ لیگی۔ یعنی خود بخود
ترقی کر جائے گی۔ کیونکہ یہ قول کہ وہ ہاتھ[۵۳] جو جھولے کو جھلاتا ہے وہ ایک طاقت ہے

---

[۵۱] پڑھنا یا پڑھانا۔ [۵۲] جامع علوم ہونا اور اپنے اخلاق و عادات کو اُس سے متاثر کرنا۔ [۵۳] مُراد ماں کا ہاتھ ہے۔

جو دنیا پر حکومت کرتی ہے" جیسا کل صادق تھا ویسا ہی آج بھی ہے اور ویسا ہی ہمیشہ رہے گا۔

شورش طلباے مدرسۃ العلوم

ناظرین خاتون نے اخبارات میں شورش طلباے مدرسۃ العلوم کے متعلق اسوقت تک بہت کچھ دیکھا ہوگا۔ واقعات جو کچھ بشیر و دیگر اخبارات میں چھپے ہیں اُن کی صحت یا عدم صحت کی نسبت رائے زنی کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہماری قوم کو ان ناگوار واقعات سے رنج ضرور ہوا ہوگا اور ہم اسکو مسلمانوں کی بدقسمتی سمجھتے ہیں کہ اس قدر قومی تنزل اور افلاس کے زمانہ میں جو ایک ذریعہ اپنی ترقی کا انہوں نے اپنی متفقہ کوشش سے پیدا کیا تھا اُسکو اسٹاف۔ ٹرسٹیوں یا طالب علموں کی غلطی یا بے عنوانی سے اسقدر سخت صدمہ پہونچے کہ طلبا سب اُسکو چھوڑ کر چلے جائیں اور قوم ساری اُس سے بددل ہو جاوے۔ ہماری رائے میں اگر کالج کے ٹرسٹی اور اُستاد اور طالب علم اس کالج کو محض ایک درسگاہ سمجھکر ترقی دینے میں ساعی ہوتے تو یہ کالج قوم کے حق میں بہت زیادہ مفید ہو سکتا تھا۔ لیکن سرسید کی جامع صفات ذات کی وجہ سے یہ کالج علاوہ تعلیمی مرکز ہونے کے اور بھی بہت سی باتوں کا مرکز قرار پاگیا۔ اب چونکہ نہ وہ صفات باقی رہے نہ وہ ذات باقی رہی اسلیے مرکز بھی کمزور ہوگیا۔ اور جو باتیں سرسید خود اپنی ذات سے کر سکتے تھے اور کیا کرتے تھے اُن میں یہاں کے اُستادوں کو بھی حصہ لینے کا اور طلبا کو بھی رائے زنی کرنے کا وسیع میدان ہاتھ آگیا اور اُس سے ہر شخص کو اپنی حالت اور حیثیت کا اندازہ کرنے میں مغالطہ ہوا۔ ہماری قطعی یہ رائے ہے کہ آیندہ اگر مسلمان اس قومی درسگاہ کو اپنے لیے مفید بنانے کی خواہش رکھتے ہیں تو اُن کو چاہیے کہ وہ اس بات پر اصرار کریں کہ ایم۔ اے۔ او کالج محض ایک قومی صدر درسگاہ ہو۔ اور اُسکو پولیٹکل یا دیگر معاملات سے جو خارج از تعلیم ہیں مطلق واسطہ نہو۔ اور اگر یہ نہو گا

توپیچیدگیاں بڑہتی جائیں گی۔ اور کالج کے منتظمین پر پبلک کو بدظنی پیدا ہوتی جائیگی کہ وہ اپنے ذاتی اغراض کو پورا کرنے کے لیے کالج کو ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور نیز اُسکے ساتھ طلبار کالج کی تعلیم اور اُنکے اخلاق و عادات کی تربیت میں یقیناً خلل واقع ہوگا۔

بالفعل جو کچہ شورش ہوئی ہے اُسکے متعلق ٹرسٹیوں کی طرف سے ایک کمیشن مقرر ہوا ہے اور وہ تحقیقات کر رہا ہے کہ وہ کیا وجوہات ہوئے جن کی وجہ سے اسقدر برہمی پیدا ہوئی۔ طلبار کی عام شکایت یہ ہے کہ کالج کے یوروپین اسٹاف طلبار سے اچھا برتاؤ نہیں کرتے۔ اور یا تو بلاوجہ یا چھوٹے چھوٹے قصور پر جس کی طرف پیشتر کوئی توجہ ہی نہیں کرتا تھا طلبار کو سزائیں دیتے ہیں۔ اُنکے دلوں میں طلبار کے ساتھ ہمدردی نہیں اور اُن کے برتاؤ میں خلوص نہیں۔ برخلاف اسکے اسٹاف کے ممبر کہتے ہیں کہ یہ الزام ہم پر غلط ہے۔ ہم کسی سے نہ بدسلوکی کرتے ہیں نہ بے انصافی سے پیش آتے ہیں۔ اب دیکھیے کمیشن تحقیقات آیندہ کے لیے کیا انتظام تجویز کرتا ہے۔ اور ٹرسٹی اُس انتظام کو پسند اور قبول بہی کرینگے یا نہیں۔

زنانہ نارمل اسکول۔ زنانہ نارمل اسکول کی نسبت اس سے پیشتر ہم دو تین پرچوں میں نوٹ دیچکے ہیں اور آیندہ بھی دیتے رہیں گے۔ ہندوستان کی کل مستورات کو عموماً اور مسلمان خواتین کو خصوصاً **ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال دام ملکہا** کا ممنون و مشکور ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے اپنی فیاضی سے ایک نہایت نیک اور مفید کام کی بُنیاد ڈالی۔ ہم پبلک کے بہی مشکور ہیں اور بالخصوص خواتین کے کہ اُنھوں نے اسوقت تک نارمل اسکول کے ساتھ پوری ہمدردی ظاہر کی ہے۔ اب نارمل اسکول کی طرف سے گورنمنٹ میں امداد کی درخواست پیش ہے۔ اور گورنمنٹ نے اپنی جانب سے جناب مس لے۔ گانجا صاحبہ انسپکٹریس آف گرلس سکول حلقۂ اول کو زنانہ نارمل اسکول کے معائنہ کے لیے بھیجا تھا جنھوں نے ۱۱۔ مارچ

سنہ رواں کو علیگڈہ میں قدم رنجہ فرماکر اسکول کا معائنہ فرمایا۔ اُنکے معائنہ کی رپورٹ کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۱۔ مارچ سنہ کو میں نے زنانہ نارمل اسکول علیگڈہ کا معائنہ کیا۔ منجملہ ۵۶ لڑکیوں کے جنکا نام اس تاریخ تک رجسٹر میں درج تھا ۱۵ لڑکیاں حاضر تھیں۔ یہ مدرسہ حال ہی میں کھولا گیا ہے۔ اور لڑکیوں کی تعداد اور حاضری کی اوسط سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہردلعزیز مدرسہ ثابت ہوگا۔ اس کی وجہ غالباً یہ معلوم ہوتی ہے کہ بہت سے بااثر مسلمان اس مدرسہ کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں اور اس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں دو لیڈیز سے ملکر بہت خوش ہوئی۔ یہ دونوں لیڈیز مسٹر شیخ عبداللہ سکرٹری تعلیم نسواں کی قریبی رشتہ دار ہیں۔ اور جو بذاتِ خود مدرسہ کی نگرانی کرتی ہیں۔ اور جنکے دل میں مدرسہ کی ہمدردی بھری ہوئی ہے۔

موجودہ مکان جس میں مدرسہ جاری ہے اُس میں دو بڑے بڑے کمرے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ہیں۔ لڑکیاں بند ڈولیوں میں مدرسہ میں آتی جاتی ہیں۔ دو استانیاں اور ایک ملازمہ مدرسہ کے اندر کام کرتی ہیں۔ مدرسہ کی ابھی ابتدائی تعلیم شروع ہے۔ لڑکیاں کثرت سے ایسی ہیں جو چھوٹی عمر کی ہیں۔ چھ لڑکیوں سے میں نے سبق سُنا تو اُنھوں نے نہایت تیزی سے اپنا سبق پڑھا۔ مجھے مسٹر شیخ عبداللہ اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد پروفیسر ایم۔ اے۔ او کالج سے باتیں کرنے کی خوشی حاصل ہوئی انسے مجکو معلوم ہوا کہ انہوں نے اکیس سو روپیہ کو شہر سے باہر ایک زمین خریدی ہے جس میں اسکول کی عمارت بنائی جائیگی۔ اور جب بورڈنگ ہاؤس کھلے گا تو آٹھ دس لڑکیاں پہلے سے بھرتی ہونے کے لیے تیار ہیں۔ اُسوقت باقاعدہ طور پر ٹرینگ کلاس کھولی جائیگی۔ اور موجودہ جماعت

بہت تانیوں کے لیے فن تعلیم کی مشق سیکھنے کے لیے کام آئیگی۔ چونکہ چھوٹی لڑکیاں اس کلاس میں ہیں اسلیے کنڈرگارٹن کی کلاس کھولنے میں بہی آسانی ہوگی۔ مسٹر ضیاءالدین احمد جنہوں نے یورپ میں اپنی تعلیم کے زمانہ میں کنڈرگارٹن کے متعلق مفید واقفیت حاصل کی ہے۔ وہ اس مدرسے کے فائدے کے لیے اردو میں کچھ کتابیں تیار کرینگے۔ مجکو یقین ہی کہ بہت سے مسلمان اس مدرسہ سے ہمدردی رکھتے ہیں اور وہ یہ چاہتے ہیں کہ تعلیم نسواں کے بارے میں کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہی۔ اور اپنی قوم کی عورتوں کی حالت کی اصلاح ہونی ضروری ہے۔

اسوقت کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان لیڈی کا پرنسپلی کے عہدہ کے لیے ملنا قریب قریب ناممکن ہے۔ اسلیے یہ خیال کیا گیا ہی کہ کسی یوروپین لیڈی کو ۱۰۰ روپیہ ماہوار پر پرنسپلی کے کام کے لیے مقرر کیا جائے اس میں گورنمنٹ سے مدد چاہی گئی ہی۔ کیونکہ مسلمان اسوقت اتنا روپیہ مہیا نہ کرسکیں گے۔ اگرچہ اُنہوں نے اسوقت تک تیرہ ہزار روپیہ مدرسے کے لیے فراہم کرلیا ہے۔ میں اپنی ذات سے اس تجویز کو نہایت مفید خیال کرتی ہوں۔ اور میں بڑے زور سے سفارش کرتی ہوں کہ گورنمنٹ کم از کم دوسال کے لیے امتحاناً اس مدرسہ کو کافی امداد دے۔ یہ قدرتی بات ہے کہ مسلمانوں کی قوم اپنی قوم کے منتظموں پر زیادہ اعتبار کرے گی اور کسی وقت میں یہ مدرسہ بہت ہی سرسبز ہوگا۔ ہمیں یہ بہی امید رکھنی چاہیے کہ اس مدرسہ سے قابل استانیاں کل صوبے کی ضرورت کے لیے مہیا ہوسکینگی کیونکہ اسوقت تک جو صوبہ کی حالت ہے وہ قریب قریب مایوسی کی حد تک پہونچی ہوئی ہے۔ خاتمہ پر میری یہ دعا ہے کہ یہ مدرسہ کامیاب اور سرسبز ہو۔

اعلان چندہ

علم دوست مس زہرا فیضی صاحبہ نے جو ہمارے زنانہ نارمل اسکول کی سچی بہی خواہ اور قوم میں تعلیم نسواں کے رواج کی پُرجوش حامی ہیں۔ اور کسی وقت صیغہ تعلیم نسواں کی ہمدردی سے غافل نہیں رہتیں اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ چندہ بھیجا کرتی ہیں اس مہینہ میں اپنی معزز نانی صاحبہ کی وفات کی یادگار میں ۵ روپیہ تعلیم نسواں کے لیے ہمارے پاس بھیجدیے ہیں۔ ہم دلی شکریہ کے ساتھ اسکا اعلان کرتے ہیں۔

اعلان چندہ نمبر ۲۔ پندرہ روپیہ جناب مسز غلام محمد منشی صاحب بیرسٹرایٹ لا راجکوٹ نے اس مہینہ میں تعلیم نسواں کے لیے ہمارے پاس بھیجدیے ہیں۔ غلام محمد منشی صاحب جو ہمارے صیغہ کے حامی نہیں بلکہ سرپرست ہیں اور جنکی امداد کی بدولت ہمارے صیغہ کی جیب بھر گئی ہے۔ اُنکے اثر نے مسز غلام محمد منشی صاحبہ کو اسی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ اور اپنی بہنوں کی تعلیم سے انکو بھی بیحد ہمدردی ہے۔ ہم خدا کا شکر کرتے ہیں جسنے بیگمات اور خواتین کے دل میں اپنی قوم کی بہبودی کا خیال پیدا کر دیا ہے۔

اعلان چندہ نمبر ۳۔ جناب مسٹر عبدالحمید صاحب جو خاتون کے خریدار اور تعلیم نسواں سے بیحد دلچسپی رکھتے ہیں اُنہوں نے ۱۰ روپیہ تعلیم نسواں فنڈ میں بھیجدیے ہیں۔

تصحیح۔ گزشتہ جنوری نمبر میں ۱۰ روپیہ کا جو فاطمہ محمدی صاحبہ بنت عالیجناب سید محمد علی صاحب جج مرزاپور نے بھیجے تھے غلطی سے اُن کی بہن زہرا محمدی صاحبہ کے نام سے اعلان کر دیا گیا ہے بجائے زہرا محمدی صاحبہ کے فاطمہ محمدی ہونا چاہیے تھا۔

ریویو

جہان آرا بیگم

کتابیں بہت سی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اور دن رات ہمارے پریس چھاپتے میں ہی مصروف رہتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ سالہا سال میں کبھی کوئی ایسی کتاب نکل آتی ہے جو بیشک صحیح معنوں میں کتاب کہی جا سکتی ہے۔ ورنہ اکثر تو پریسمینوں کی تکان اور پڑھنے والوں کا دردِ سر ہوتی ہیں کتاب جہان آرا بیگم

جسکو ہم اُردو کی چمن تصنیف کا ایک نہایت خوشرنگ اور نازک پھول کہہ سکتے ہیں۔ علامہ محبوب الرحمٰن صاحب کلیم بی۔ اے کی تصنیف ہی جنھوں نے اس نامور بیگم جہان آرا (بنت شاہجہاں بادشاہ) کے حالات نہایت کہنہ۔ کرم خوردہ۔ بوسیدہ۔ قلمی۔ تواریخ۔ مستند تواریخ۔ معتبر تواریخ کی کتابوں سے چھان بین کر مرتب کیے ہیں۔ ہم انکی اس محنت کی داد گو کتنی ہی فصاحت و بلاغت خرچ کریں ہرگز نہیں دے سکتے اسکا صلہ صرف یہ ہو سکتا ہی کہ پبلک اس کتاب کو پڑھے۔ اس کتاب میں بہ نسبت اُن کتابوں کے جن میں زیب النسا بیگم یا نورجہاں کے حالات لکھے گئے ہیں بہت ہی خصوصیتیں ہیں۔

(۱) مصنف نے اس کتاب کو نہایت تحقیق اور تدقیق کے ساتھ لکھا ہی۔ تمام حالات معتبر ہیں اور جہاں سے لیے گئے ہیں انکا حوالہ بھی ساتھ ہی ساتھ ہے۔

(۲) یہ کتاب بالکل نئی طرز پر لکھی گئی ہی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں اُن تمام اُصول کو مرعی رکھا ہی جو آجکل کے اعلیٰ سے اعلیٰ مصنف رکھتے ہیں۔

(۳) یہ کہنا بالکل صحیح ہی۔ اور ہم بڑی خوشی سے اس امر کو کہتے ہیں کہ اس تصنیف کی بدولت زنانہ علم ادب ہمارے یہاں کا ایک زینہ اور بلند ہو گیا ہی۔ کیونکہ یہ کتاب بحیثیت زبان یقیناً اردو کی موجودہ تمام تصنیف سے بہتر ہی اور گو وہ ظرافت اس میں نہیں ہی جو ڈپٹی نذیر احمد صاحب ایل۔ ایل ڈی کی کتابوں میں ہے لیکن اُس سے کہیں بالا اس میں زبان کی خوبی ہی جو صرف دیکھنے سے معلوم ہو سکتی ہی۔

(۴) یہ کتاب جس قدر و قیمت کی ہی اُسی کے لحاظ سے اسکی چھپائی اور لکھائی بھی اسقدر اعلیٰ درجہ کی ہی اور کاغذ اتنا اچھا لگایا گیا ہی کہ ابتک علیگڈھ کے مطابع سے "اہل بیت" کے سوا کوئی دوسری کتاب اس خوبی کے ساتھ چھپکر نہ شائع ہوئی ہو گی۔

سب سے بڑی بات اس کتاب میں جو ہی وہ یہ ہی کہ ہمیں ایک ایسی بیگم کے مذہبی۔ علمی۔ ادبی۔ اور تمدنی کارنامے ہیں جو اسی زمین اور اسی ملک میں گذری ہی جسمیں ہم تعلیم نسواں کے لیے کوشش کر رہے ہیں ہمیں امید ہی کہ یہ کتاب ہر گھر میں بڑے شوق سے پڑہی جائیگی۔ اور زنانہ لٹریچر میں ایک نہایت عمدہ اضافہ ثابت ہو گی۔ ملنے کا پتہ دفتر خاتون علیگڈھ قیمت ۸؍

لیجیے اب تو حد ہو گئی

اردو علم ادب کے بہترین و مشہور رسالہ

مخزن کی تیسری قسم

۱۵- دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء سے ہو بہو اُسی تقطیع- ضخامت ۶۴ صفحہ- لکھائی چھپائی اور نئے مضامین کے ساتھ شائع ہوگی- اور باوجود ان خوبیوں کے چندہ صرف

ایک روپیہ سال بھر کے لیے

(۲/ محصول ڈاک)

اس سے زیادہ اب اور کیا ارزانی ہو سکتی ہے- اب تو گویا

موتی کوڑیوں کے مول ہیں

ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی باذوق شخص کا ہاتھ اس بے بہا اور دلاویز گلدستے سے خالی نہ رہے
اگر اس وقت بھی شائقین اردو نے اس رعایت سے فائدہ نہ اٹھایا تو افسوس ہوگا

درخواستیں بنام (منیجر مخزن- لاہور) ہوں-

مخزن کے ہر نئے خریدار کو انتخاب مخزن بجائے ۸/ کے صرف ۱/ (مع محصول) میں دیا جاتا ہے-
چندہ قسم اول ۲/ قسم دوم ۸/

خاتون

جلد ۴ | ماہ صفر المظفر ۱۳۲۵ھ مطابق اپریل ۱۹۰۷ء | نمبر ۴

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی۔اے۔ایل ایل۔بی۔سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

علی محمد خاں کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علیگڑھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہی اور اسکی سالانہ قیمت (عہ/) اور ششماہی عہ/ ۱۲ ہے

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہی یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑہی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہی اور جبتک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہورہے ہیں اُس کی طرف ہمیشہ مردوں کو متوجہ کرتے رہینگے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جاوے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑہنے کی اُنکو ضرورت محسوس ہوتا کہ وہ اپنی اولاد کو اُس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہی معیوب تصوّر کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالے کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہی اگر اسکی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے گا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علیگڑھ ہونی چاہیے۔

لباس کس قسم کا پہننا چاہیے

لباس اور وضع کی خوبی انسان کو معزز بناتی ہے۔ مثل مشہور ہے "الناس باللباس"
ہمارا ایشیائی لباس بلاقید خواہ وہ مسلمانوں کا ہو یا ہندوؤں کا خواہ لکھنؤ کا ہو یا دہلی کا
اس زمانہ میں عام طور پر ہر تعلیم یافتہ طبقہ اُسکو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتا
اسکے ساتھ ہی وہ یوروپین لباس کو بھی جو اپنی نمود اور قیمت کے لحاظ سے نہایت درجہ
ناقابل استعمال ہے پسند نہیں کرتا۔ اسلیے ضروری ہے کہ اپنے ہی موجودہ لباس میں
ترمیم کرکے ہم اُسکو ٹھیک کریں۔ ہمیں امید ہے کہ اور بہنیں بھی اسکی طرف توجہ کرینگی۔

اڈیٹر

"لباس کس وضع کا پہننا چاہیے" یہ ایک بڑا اہم سوال ہے۔ جو آجکل نئی روشنی
کی تعلیم یافتہ بی بیوں کے دل میں پیدا ہوا ہے۔ اور اُسکے جوابات جو اُنکے دلوں میں پیدا
ہوتے ہیں۔ ہر ایک دل کے مذاق کے موافق مختلف ہوتے ہیں۔
کسی کا خیال یہ ہوتا ہے کہ ساڑی اور جاکٹ یعنی پارسی خاتونوں کا لباس اختیار کرنا چاہیے

کوئی لکھتی ہیں کہ "لمبے پائچوں کا ڈھیلا پاجامہ انگریزی جاکٹ ودوپٹہ ہونا چاہیے"۔
کسی کا دل چاہتا ہے کہ "ایک بالکل نیا لباس ایجاد کرنا چاہیے۔ اور پھر وقتاً فوقتاً فیشن ایبل لباس ایجاد ہوتے رہیں۔ اور نئے مروجہ فیشن کی پابندی نہایت سختی کے ساتھ ہونی چاہیے"۔

بعض انگریزیت کی دلدادہ نئی روشنی کی تعلیم یافتہ یورپین اندھی تقلید کرنیوالیاں کہتی ہیں۔ کہ "اپنا ملکی و قومی لباس تو پہننے کے قابل ہی نہیں۔ اب رہی نئے قسم کے لباس کی ایجاد سو اس کی دردسری کون گوارا کرے۔ بس آنکھیں بند کرکے انگریزی لباس اختیار کرلینا چاہیے۔ کیونکہ مردوں نے بھی انگریزی لباس اختیار کرلیا ہے"۔

تو یہ ایسی ہی اندھی تقلید ہے کہ جیسا آجکل کے بعض نئی روشنی کے تعلیم یافتوں نے بہت یوروپین باتیں صرف انگریزیت کے خیال سے اختیار کرلی ہیں حالانکہ وہ اُن کی حالت قوم و دولت کے خلاف بلکہ مذہباً بھی نامناسب و ناجائز ہیں۔

یہ انگریزی لباس عورتوں کے واسطے کیونکر مناسب ہوسکتا ہے۔ ہرگز نہیں ہماری حالت کے مناسب نہیں ہے۔ اگر دیکھا جاے تو ہمارا ہندوستانی لباس ہی ہمارے لیے مناسب ثابت ہوسکتا ہے۔ اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں کہ ہم سب ہندوستان کی مسلمان عورتیں ایک ہی قسم و ایک ہی وضع کا لباس ایک وقت میں نہایت پابندی فیشن کے ساتھ پہنیں۔ ہر ایک حصے ملک کی بی بیاں جب ایک جگہ جمع ہوتی ہیں اور سب اپنے اپنے شہروں و صوبوں کے لباس میں ہوتی ہیں یہ مجمع بہ نسبت اُس مجمع کے بہت دلچسپ اور اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جس میں کہ ایک ہی وضع کے لباس ساری بی بیاں پہنے ہوئے ہوں۔ ایک طرف کی بی بی دوسری طرف کی بی بی کے لباس سے کوئی نئی وضع پسند کرکے ایزاد کرتی ہیں جو اور زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ غرضیکہ جہانتک سوچا جائے ہمکو ہمارا ہی لباس پہننا چاہیے۔

لیکن ہاں موجودہ وضع میں ترمیم کرکے ضرور پہننا چاہیے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب مسلمان بیبیوں کو ایک لباس کا قیدی ہوجانا چاہیے۔ نہیں! اس کی تو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مگر چونکہ بعض ہندوستانی بی بیوں نے انگریزی لباس اختیار کرلیا ہے۔ لہذا ان کے لیے یہ ضرور دکھانا چاہتی ہوں کہ ہمارے ہندوستان میں جو لباس مروّج ہیں وہ یورپین لباس سے بدرجہا بہتر ہیں۔ اگر ایک لباس سے دل گھبرا جائے تو دوسرا بھی اگر وہی لباس بعد ترمیم پہننا چاہیے تو اور اچھا ہے لیکن کیا ضرورت ہے کہ بلا سوچے سمجھے انگریزی لباس کو اختیار کرلیا جائے۔

ہمارے ہندوستان میں ہی بہت مختلف وضع و قطع کے لباس جاری ہیں۔ (۱) عموماً تو ہندوستان کی مسلمان عورتیں کُرتا دوپٹہ پائجامہ تنگ موہری کا یا ڈھیلا پہنتی ہیں (۲) کُرتا، دوپٹہ لہنگا (۳) کُرتا یا چولی و ساڑھی۔ ان لباسوں میں چند باتیں واقعی قابل اعتراض ہیں۔ اور ترمیم طلب ہیں۔ لیکن یورپین لباس سرتاسر قابل اعتراض ہے اور خصوصاً ہندوستان کی عورتوں کے لیے تو بالکل ناموزوں ہے۔ لباس میں چار باتیں قابل غور کرنیکے ہیں جو ضرور ہونی چاہییں۔

(۱) پردہ۔

(۲) حفاظت جسم۔

(۳) زیبائش۔

(۴) آرام دہ لباس۔

یہ چار باتیں ہیں جو ہر وضع کے لباس میں قابل خیال کرنے کے ہیں۔ مگر انگریزی لباس سے سوائے زیبائش کے اور تو کوئی مقصود نہیں ہے۔ نہ تو پردہ ہی مقصود ہے نہ حفاظت جسم نہ آرام۔ آرام دہ تو وہ کسی طرح بھی نہیں ہے بلکہ بہت زیادہ تکلیف دہ ہے۔ دوسرے انگریزی لباس باہر پھرنے یا گھر میں کام کاج کرنے کے واسطے زیادہ

مناسب ہے۔ اور ہندوستانی پردہ نشین مستورات کو باہر پھرنا تو ہے نہیں۔ رہا گھر میں کام
کاج کرنا سو ہمارے اپنے لباس میں بھی ذراسی ترمیم کے بعد سلیقے سے پہننے سے حاصل
ہو سکتا ہے۔ انگلستان میں چونکہ بسبب سردی و آب و ہوا کے فرق کے ہمہ وقت گھر
میں رہنا دشوار ہے۔ بلکہ وہاں جتنا آدمی چلے پھرے اُتنا صحت کے لیے مفید ہے۔ وہاں کا
موسم خواہ جاڑا ہو خواہ گرمی ہمارے ہاں کے موسم سے بالکل ہی مختلف ہے۔

تیسرے حالت قوم و دولت و تمدن کے لحاظ سے انگریزی لباس نہیں پہننا
چاہیے کیونکہ انگریزی لباس کا فیشن بہت جلدی جلدی بدلتا رہتا ہے۔ اور مرّوجہ
فیشن کی پابندی نہایت سختی کے ساتھ لازم آتی ہے۔ اور اگر کیسا ہی قیمتی جوڑا ہو مگر بعد
فیشن بدلنے کے بالکل بیکار ہے۔ اور مفت کی زیرباری ہے۔ یہ زیرباریاں متمول قومیں
تو برداشت کر بھی سکتی ہیں۔ لیکن ہم یعنی مسلمان جو کہ پہلے ہی مفلس ہوئے ہیں۔ کیونکر
یہ زیرباریاں اُٹھا سکتے ہیں۔ انھیں باتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی لباس
ہمارے لیے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے۔ پھر نہ معلوم یہ خبط یعنی انگریزی لباس کا کیوں
ہماری قوم کی (عورتوں ہی میں نہیں) بلکہ مردوں کے بھی دماغ میں سمایا ہے۔ خیر مرد تو چند در چند
وجوہات مجبوریوں اور ضرورتوں کے باعث پہنتے ہیں سو اُنکا لباس اسقدر زیرباری کا بھی
نہیں ہے جیسا کہ عورتوں کا۔ اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے ہندوستانی لباس میں
کون کون باتیں قابل ترمیم ہیں۔

اول۔ تو چھوٹی کُرتی جیسا کہ دہلی و لکھنؤ و رامپور کی بیگیات پہنتی ہیں۔ یہ واقعی بہت
ہی بُرا اور بے سود لباس ہے۔ اسکے بجائے کُرتا پہننا چاہیے۔ مگر نہ اتنا لمبا۔ جتنا کہ آجکل
کی بعض شوقین مزاجوں نے بڑھایا ہے۔ بس اتنا لمبا جو کہ گھٹنوں سے تین گرہ اونچا ہو۔
دوسرے۔ لمبے پائچوں کا پائجاما۔ اور بہت چست تنگ آڑا پائجاما۔ آڑا۔ پائجاما
تو بالکل ہی ترک کر دینا چاہیے۔ ڈھیلا پائجاما۔ بیشک پہننا چاہیے۔ مگر اُسکے پائنچے اتنے

چھوٹے ہوں جنکو کہ اُٹھا کر چلنا نہ پڑے۔ اور کام کاج میں کوئی ہرج نہ ہو۔

بس دوپٹہ وہی اتنا ہی لمبا وچوڑا پہننا چاہیے لیکن اُسکا کونا جو لٹکتا رہتا ہی اُسکو ایک سیفٹی پین سے اٹکا دینا چاہیے۔

بس اب یہ ترمیم شدہ لباس اچھا پہننے کے لائق ہوگیا۔ مگر اسکو بھی یہ نہیں کہنا چاہیے کہ کل مسلمان عورتیں یہی پہنیں۔ اس سے تو پھر وہی قید اور زیر باری رہی جیسا جسکے دل میں آئے لباس پہنے مگر اُس میں وہی چار باتیں جو پہلے لکھی گئی ہیں ضرور خیال کرنی چاہییں۔ (باقی آئندہ)

راقمہ

فاطمہ محمدی

ایک میٹنگ

مس سجّاد احمد ایک روشن خیال اور تعلیم یافتہ لڑکی ہیں وہ ہمیشہ اپنی بہنوں کی بھلائی کے لیے کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہیں۔ اُنکے باپ نے اُنھیں اعلیٰ تعلیم دلائی ہی اب جس طرح استعمال کریں یہ اُن کی مرضی پر منحصر ہی مگر اُنھوں نے ایسی اعلیٰ تعلیم کو اُسی کے لیے نہیں سمجھ رکھا کہ اعلیٰ فرنیچر کے کمرے میں میز کرسی پر اپنے وقت کو صرف کر دیں یا ہارمونیم اور دوسری لیڈی دوستوں کی دلچسپی میں گزاریں بلکہ ہر وقت سوچتی رہتی ہیں کہ مجھے ایسے نازک وقت میں کیا کرنا چاہیے جس سے میری تعلیم ٹھکانے لگے۔

ایک روز کا ذکر ہی کہ اُنھیں ایک ڈپٹی صاحب کے گھر جانے کا اتفاق ہوا جنکی لڑکی بیمار تھی۔ ڈپٹی صاحب کی بیگم صاحبہ ماشاءاللہ جاہل بیبیوں کا نمونہ بلکہ سرتاج تھیں وہاں اُس بیماری میں کیا کچھ نہ ہوتا۔ ڈاکٹر یا دوا کا ذکر نہ تھا مولوی مُلّاں فقیروں کا زور تھا گھر کی کچھ ایسی حالت تھی کہ سارا دن کے رہنے میں مس سجّاد کے سر میں درد

ہوگیا۔ یہ افسوسناک حالت دیکھکر اُنکے دل پر ایک خاص چوٹ لگی اور گھر آکر اُنھوں نے
اپنی ایک روشن خیال دوست کو بُلاکر یہ صلاح کی۔

مس سجاد احمد۔ میرا ارادہ ہی کہ اپنے مکان پر ایک زنانہ میٹنگ منعقد کروں کہو
کیا رائے ہی کیا تم بھی کوئی اچھی تقریر کروگی؟

مس ایم این۔ میں آپ سے بالکل متفق ہوں جہانتک ہوسکیگا مدد دوں گی لیکن
جلدی کرو۔

مس سجاد۔ کیوں ایسی جلدی کا ہیکی ہے؟

مس ایم بی۔ میں نے بھی زنانہ ضعیف الاعتقادی کا ایک خاص منظر دیکھا ہی اُسوقت
سے دل کو چین نہیں میں چاہتی ہوں کہ بیگم صاحبہ محمد رفیق کو بھی بلایا جاوے اور ڈپٹی
صاحب کی مستورات بھی مدعو ہوں

مس سجاد۔ اچھا پرسوں صبح دس بجے کا اعلان کروں۔ میں چاہتی ہوں کہ صبح
کا کھانا سب ساتھ کھائیں۔

مس ایم بی۔ خرچ زیادہ ہوگا ایسا ہی کرلو اس میں دو ایک اور اصلاحوں کی بھی
امید ہی۔

مس سجاد۔ نہیں خرچ کا تو یہ ہی کہ میں اپنے سوشیل جلسوں کا خرچ زیادہ تر اپنے
والد صاحب کے سر نہیں ڈالتی بلکہ اپنے اُن روپیوں میں سے کرتی ہوں جو والد صاحب
ماہوار میرے جیب خرچ کیواسطے دیتے ہیں۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ روپیہ جمع ہو اور
ضرورت رُکی رہے۔ تو دس بجے اتوار کے دن کا اعلان کروں نا۔

مس ایم بی۔ ٹھیک ہی مگر میری صلاح یہ ہی کہ اسکے لئے ڈنر دیا جاوے کیا آپ
مہربانی کرکے ایسا نہیں کرسکتیں کہ آدھا صرف آپ کا ہو اور آدھا میرا۔

مس سجاد۔ بجائے اسکے کہ ایک ہی دعوت میں دونوں کا لگ جاے یہ اچھا

ہوگا کہ اگلے اتوار کو آپ دعوت دیں اور کوئی مفید تقریر کریں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اتوار کو دس بجے صبح سب تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ بہنوں نے یہ دیکھا کہ مسٹر سجاد حمد کے مکان میں عجب دلفریبی ہے گو بنگلہ نہیں لیکن کسی تربیت یافتہ طبیعت نے کچھ ایسے ڈھنگ سے سجایا ہے کہ اچھی کوٹھی سے بھلا معلوم ہوتا ہے ذرا ٓپ بھی تھوڑا سا حال سُن لیں۔ گاڑی سے اُتر کر صحن کیسا دیکھا؟ ایک خوبصورت چوکور قطعہ زمین جسکے چو طرفہ عمارت ہے (کیونکہ ایک ہندو کا اسی طرز کا مکان تھا) جسکے بیچ میں خوبصورت کیاریاں اُنکے گرد گملے رکھے ہیں برآمدوں کے ہر ایک ستون کے طرف گملا رکھا ہے گنجان بیلیں چڑھ رہی ہیں ہر ایک برآمدے میں کُرسیاں پڑی ہیں اور کمروں کا حال تو معلوم نہیں ہاں جس کمرے میں مہمان لیڈیز بٹھائی گئی ہیں یعنی ڈرائنگ روم کا حال سُنیے ایک خوبصورت نیلی دری کا فرش جسپر کچھ بیطریقے یعنی نکونیے وضع کے قالین اور کسی کسی جانور کی خوبصورت کھالوں نے دری کو چھپا دیا ہے بیچ میں خوبصورت میز رکھی ہے جسپر خوشبودار پھولوں کے گلدستے کے گرد اچھے فوٹو فریمز میں بہت سی تصویرات لگی ہیں۔ علاوہ خوبصورت پردوں کے دیواروں پر بھی سجاوٹ کا سامان ہے چمنی پر (دو دکش) علاوہ چاندی کی خوبصورت چیزوں کے ایک بڑا کلاک رکھا ہے۔ غرض مس سجاد کی اعلیٰ تربیت اور ہنرمندی نے معمولی مکان کو دلفریب بنا دیا ہے جسوقت مہمانوں کی گاڑی آتی ایک ملازمہ جاکر اُتروا لاتی اور برآمدے میں خود مس صاحبہ آکر استقبال کرتیں اپنی والدہ و دیگر گھر کی بیبیوں سے آنے والی لیڈیز کا انٹروڈکشن بھی خود ہی کرایا۔ قریب ایک گھنٹہ کی باتیں ہوتی رہیں پھر خادمہ نے اطلاع دی میز چنی گئی آپ مع مہمان لیڈیز کے کھانے کے کمرے میں گئیں جہاں فرش پر دو بڑی میز اور بہت سی کُرسیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا ہاں ایک خوبصورت ۴ درجوں کی الماری کھڑی تھی جسپر طرح طرح کے مربّے جام جلی وغیرہ کے ڈبّے چُنے تھے ایک اچھے طریقہ سے

کھانا کھایا اور پھر وہیں آکر بیٹھیں۔

مس سجاد۔ مس ایم بی کیا آپ کوئی تقریر کرنے کو تیار ہیں کیونکہ ہماری یہ میٹنگ اسلیے نہیں کہ چند گھنٹے ادھر اُدھر کی باتیں کر کے رخصت ہو جائیں بلکہ میں چاہتی ہوں کہ یہاں ایسی باتیں ہوں کہ جنکا کچھ اثر مہمان بہنوں کے دل میں قائم رہ سکے اور میری کوشش ٹھکانے لگے۔

مس ایس بی۔ بیشک یہ ٹھیک ہے اور میری بھی یہی رائے ہے۔

چنانچہ مس سجاد حمید کھڑی ہوئیں اور یوں تقریر کی۔

معزز لیڈیز اینڈ گرلز۔ سب سے پہلے میں آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور پھر اپنا مطلب بیان کروں گی۔ قاعدہ ہے کہ پہلے لیکچر دیدیتے ہیں پھر کھانا کھلاتے ہیں لیکن اسلیے کہ مجھے بہت کچھ بیان کرنا ہے پہلے کھانے سے فرعنت کرلی کیونکہ میری مہمان چھوٹی بچیاں بھی ہیں شاید وہ گھبرا جاتیں۔ لہٰذا وقت صرف کرنے سے میری تقریر کا عنوان ہے "جہالت کی خرابیاں" یہ ایک وسیع اندھیرا یا دلدل یا سنگین قیدخانہ ہے جس کی گرفتار زیادہ تر ہم ہی ہیں اس کی مشکلات اس کی خرابیاں اس کی بُرائیاں گو گرفتاران جہالت کو معلوم نہوں لیکن ایک وہ آنکھ جسنے عالموں کے خیالات صفحات کاغذ پر دیکھے ہیں بخوبی جانچ سکتی ہے۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ وہی ہاتھ جس میں قوم کی باگ ہو بیکار ہو اور بجاے اچھے راستے لیجانے کے اس دلدل کی طرف موڑدے یہی قومی ممبر جو گویا وجود قوم ہیں زمانۂ ناسمجھی میں ہمارے ہاتھوں میں ہوتے ہیں اوف پھر ہم کیا کیا بدسلوکیاں اُنکے ساتھ نہیں کرتے اگر یہ بیمار ہوں تو بجاے دوا کے تعویذ ٹوٹنے ٹوٹکے اگر جوان ہوں تو بجاے تعلیم کے جاہل رکھنے کی کوشش کرتی ہیں ایک ماں کا حال بیان کرتی ہوں۔

وہ ایک دولتمند گھرانے کی معزز بیوی ہیں اُنکے دو لڑکے ہیں ایک کوئی، سال کا

ایک ۲ سال کا۔ بڑا لڑکا ایک دن مکان کے پائیں باغ میں گیا چونکہ دن بھر ننگے پاؤں ننگے سر پھرتا رہا تھا پھر دسمبر کا مہینہ اور شام کے وقت حوض میں ہاتھ مارتا رہا وہاں سے آکر بخار چڑھ گیا اور پڑا رہا اماں جان کو خبر لگی تو گھبرا گئیں اور کہا کہ دیکھو باغ میں چلا گیا وہاں انار کے درخت پر جن رہتا ہے اُس کی جھپٹ میں آگیا اب جتنا بھی زور لگائیں کہ علاج کراؤ وہ بی بی ایک نہ مانیں۔ کہیں فقیر کو بلوایا تعویذ لیے کہیں فلیتوں کی دہونی دی۔ غرض تین دن یہی کچھ رہا بچے کو زکام ہوا پھر نمونیا تک ہوگیا اُس ماں کو علاج نہ کرانا تھا نہ کرایا چوتھے دن مرگیا۔ ماں کے خواب میں آیا کہ اُسی درخت پر جن کی گود میں بیٹھا ہے آپ نے گھر تبدیل کیا اب رہا ایک بچہ اُسکا یہ حال تھا کہ جہاں رویا دہوم مچادی کہ توے چڑہی آئی۔ دیکھنا کوئی شادی بیوی کو بلانا یہ نہیں مانتا اور باتیں کسوقت ہوتی ہیں جب وہ صبح چار بجے جاگنا چاہتا اور اماں چاہتیں ابھی اور سوئے۔

ہائے ہائے کیسی کیسی فطرتی اچھائیوں کو مٹایا جاتا ہے جب بچہ ان ڈھکوسلوں سے بھی نہ سویا تو اُسوقت کچھ کھلانے کی عادت ڈالدی وہ کیا لڈو یا کوئی ایسی ہی ثقیل چیز گُل گُلے یا پیڑے یہ کس لیے؟ اسلیے کہ ہماری نیند خراب نہو اُسکے آگے کھانیکو ڈالدیا وہ کھاتا رہا ہاتھ منہ بچھونا چپکتا رہا اماں جاں خراٹے لینے لگیں مٹھائی کھاکر بچے نے پانی مانگا اب نہ سوچا کہ کھانسی ہوگی اُسکو بہلا دیا جائے ویسے ہی سوتے میں پٹی تلے ہاتھ لٹکا کر لوٹا اُٹھا مُنہ کو لگا دیا اور سو گئیں صبح کو خوب کھانسی ہوئی ایسے بچوں کی صحت ہمیشہ خراب رہتی ہی جس سے طرح طرح کی خطرناک بیماریوں کا اندیشہ ہی۔ بعضی بیبیاں یہ بیان کرتی ہیں کہ ہمارا بچہ دن میں ۸ آنہ کھالیتا ہے اور رات کو جب تک ۲ آنہ کی چیز نہ کھالے پلنگ پر نہیں پڑتا۔ بعض فخریہ کہتی ہیں کہ ہمارا بچہ تو رات میں بھی اُٹھکر ۲ آنہ کی جلیبیاں یا کھویا کھاتا ہی۔ افسوس یہی وجوہات ہیں بڑے ہونے تک طرح طرح کی صورتیں اختیار کرتے ہیں اور چھوٹے بچے جوان

ہو کر تنگ کرتے ہیں اگر نہ دیا جاے تو ماں بہنوں کا زیور چُراتے ہیں غرض ہر طرح قوم کی خرابی ہی۔ بس ہمیں چاہیے کہ ننھے بچوں کو بلا تامل سکول میں داخل کریں تاکہ آیندہ نسلیں اچھی طرح نشو نما پائیں۔ معزز لیڈیز میری تقریر کوئی علمی لیکچر یا سپیچ نہیں ہی بلکہ معمولی گفتگو ہی جو باقاعدہ اسوجہ سے کی کہ آپ لوگ ہمہ تن میری طرف ہو جائیں ویسے گفتگو میں سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ اسوقت تعلیم نسواں کی زیادہ تر یوں ضرورت ہے کہ قوم کے وہ ننھے پودے جو ایک دن بارآور درخت ہونگے آپ ہی کے ہاتوں میں ہیں اگر بچپنے میں اچھی تربیت نہ دی گئی تو آیندہ بدنام کنندۂ قوم ہونگے۔ اور اس طرح ہماری قوم رفتہ رفتہ نابود ہو جائے گی۔ بس میری معزز بہنوں کیا آپ میں ایک بھی مجھے یقین دلا سکتی ہو کہ ہم قوم کی بھلائی کی کوشش کرینگے یعنی اپنی ننھی بچیوں کو تعلیم دلاؤ اور خود بچوں کی پرورش اچھی طرح کرو۔ میں اُن بیگم صاحبہ کی خدمت میں عرض کرتی ہوں کہ آپ کی لڑکی بیمار ہے بجاے تعویذوں کے آپ دوا کرائیں۔ پیاری بہنوں انھیں خیالات میں اُلجھے رہنے سے یہی نہیں کہ اولاد کی خرابی ہو۔ بلکہ تم خود بھی خوش نہیں رہ سکتیں اسلیے کہ مرد اکثر تعلیم یافتہ روشن خیال ہیں وہ اپنی ہر وقت کی رفیق کو بھی ایسا ہی چاہتے ہیں بہت سے گھروں میں میں نے اسوجہ سے اَن بن دیکھی کہ میاں کی کچھ رائے ہی بیوی کی کچھ۔ اسی محلے میں ایک تھانہ دار ہیں جن کی بی بی بہت ہی قدامت پسند ہیں وہ چاہتے ہیں میرا گھر اُجلا ہو کمرہ میں صاف فرش ہوں اور میری بی بی میز کرسی پر کھانا کھائیں دن میں بیوی دوسری جگہ بیٹھیں رات کو دوسری جگہ سوئیں۔ میرے گھر میں یورپین لیڈیاں آویں میری غیر موجودگی میں دوست آویں تو ویسی ہی خاطر ہو جیسی میں کرتا ہوں۔ بیگم صاحبہ بہت سی بالیاں پتے بھر کر نہ پہنیں پیروں میں اتنا زیور نہ ہو جس کی آواز بازار میں جاے لباس میری خوشی کا پہنیں یہ اُن کی آرزوئیں ہم نے اپنے مردوں سے سُنی ہیں۔ لیکن وہ ہیں کہ

ایک نہیں مانتیں۔ دری قالین خوشی کے لیے میاں لاتے ہیں تو کیے کسی کونے میں پڑے ہیں ایک کمرے میں پلنگ بچھا رکھے ہیں وہیں رات کو سوتی ہیں اور وہیں دن بھر پڑی رہتی ہیں۔ گھر کی صفائی سے غرض نہیں بچوں نے گنّے کھائے چھلکے بھرے پڑے ہیں میاں گملے لائے وہ اُلٹے پڑے ہیں۔ اگر کوئی میاں کے دوست آگئے تو ہاں کی پرسش نہیں بچے ننگے پیر بھاگتے پھرتے ہیں گنّے کھائے پھر کہا اماں پیسہ دو ہم برفی لینگے اماں نے دیدیا وہ بازار سے لیکر کھالیں پھر کہا ہم چنے لیں گے غرض ۳ بچوں نے ان میں روپیہ صرف کردیا رات کو شوہا بخار چڑھا ایسی حالت کی بیوی اور نیو فیشن انگریزئیت کی دلدادہ بیاں بھلا نباہ ہو تو کیسے۔ غرض ہماری جہالت نے ہمیں تباہ کیا ہماری قوم کو برباد کیا خدا کے واسطے اب بھی سنو اور بچیوں کو تعلیم دلاؤ اکثر صحاب نے دل پکّا کرلیا ہی کہ ہم لڑکیوں کو علیگڑھ بھیجکر تعلیم دلائیں لیکن مائیں کہتی ہیں اے ہے نوج بچّی دوسرے شہر غیر مردوں کے حوالے کیجائے۔ بلکہ لڑکوں کو نہیں بھیجتیں۔ پیاری بہنوں اب وقت ہی زمانہ کے قدم بقدم چلنے کا جس طرح زمانہ چلوائے چلو ورنہ مٹا دیگا اور کوئی دوبارہ سدھارنے کی کوشش بھی نکریگا۔ فقط اس میٹنگ میں ایک میری دوست شریک تھیں جنہوں نے کل لکھکر بھیجا کہ تم شریک نہیں تو اس طرح اس میٹنگ کا مزا لیلو۔ میں نے سوچا کہ خود ہی پڑھکر چپ نہ ہو رہوں بلکہ اپنی بہنوں ناظرین خاتون کو بھی سُنا دوں۔

افسوس کہ میری رہائش ایک ایسی جگہ ہی جہاں کچھ نہیں کرسکتی میرے دلی شوق پر خیال کرکے میری دوسری بہنیں اپنی کارروائی سے آگاہ کرکے خوش کرتی رہتی ہیں جنکی میں احسان مند ہونگی۔ والسّلام۔

راقمہ

بنت نذر الباقر

بسلسلۂ سابق

مسز ہالیبرٹن کی مصیبتیں

مجھے بحد ندامت ہے کہ میں اتنے دنوں کے بعد اس قصہ کا سلسلہ بھیج رہی ہوں کئی مہینے سے میری صحت ایسی مخدوش رہی کہ اسکے جاری رکھنے سے میں معذور رہی۔ اب میری طبیعت کچھ سدہر رہی ہے اسلیے جوں توں اس قصہ کو ختم پر پہنچا دیتی ہوں تاکہ بشرط خیریت اور مضامین کی طرف توجہ کر سکوں۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ سلسلہ گلے کا ہار ہونے کی وجہ سے میں اتنے دنوں تک دوسرے مضمون لکھنے سے بھی قاصر رہی۔ میں اپنی اس کوتاہی کی اپنی ناظرین بہنوں سے بہ ادب معافی چاہتی ہوں۔

ولیم کو اینشلی صاحب کے کارخانے میں کام کرتے ہوئے کئی ہفتے ہو گئے ایک دن شام کو مسٹر اینشلی نے اُسکو ایک چٹھی دی کہ بڑے ڈاک خانے میں لگا آئے۔ اور اس امر میں اُسنے تاکید بلیغ کی کہ دیکھو ہرگز ہرگز غفلت نہ ہو۔ ولیم نے خط لیا اور ڈاکخانے کی راہ لی۔ جب بڑی سڑک پر پہنچا تو دیکھا کہ اسکول کے لڑکوں کا جھنڈ آرہا ہے۔ اُن لڑکوں میں فرانک اور اڈگار ولیم کے دونوں بھائی بھی تھے۔ ولیم پرے ہٹ گیا اور لڑکوں کو گذرنے کی راہ دی۔ اُن لڑکوں میں سرل ڈیر۔ ڈیر صاحب اٹرنی کا سنجلا بیٹا بھی تھا وہ لڑکا ولیم سے سن میں کچھ ہی بڑا تھا۔ مگر تن و توش میں کہیں زیادہ و قدآور۔ جاتے ہوئے اُسنے ولیم کو گھور کر نگاہ حقارت سے دیکھا اور ایک ناسزا جملہ سے اُسکو خطاب کیا۔ فرانک سرل کے پیچھے ہی تھا یہ ولیم کی بہ نسبت ذرا مزاج کا تیز تھا اُسنے ترشرو ہوکر سرل کے مقابلہ میں بھائی کی طرفداری کی۔ فرانک کی اتنی شوخی سے غضب ہو گیا۔ سرل اُسکے اوپر شیر کی طرح جھپٹا۔ بیچارے فرانک کو پیس ہی ڈالا ہوتا

ولیم کو یہ دیکھکر برداشت کی تاب نہ رہی۔ اُسنے بھائی کی حمایت کی اور سرل کے پنجہ سے اُس مظلوم کو چھڑایا۔ ولیم کو اس گستاخی کی سزا دیئے بغیر بھلا سرل کب رہ سکتا تھا۔ اُسکے ساتھ دست وگریباں ہوگیا۔ سرل کا اُدھر رُخ کرنا تھا کہ سارے لڑکے جو سرل کی ٹولی کے تھے ولیم کو ہر طرف سے چمٹ گئے اور بیچارے کو سبنے ملکر اتنا کچلا اتنا کچلا کہ ادھ موا بنا کر چھوڑ دیا۔ اسی اثنا میں ہنری ایشلی۔ ایشلی صاحب کا بیٹا گھوڑے پر سوار اُس راہ سے گزر رہا تھا۔ اُس نے جو یہ ساری روداد دیکھی اُسکو سرل پر بڑا غصہ آیا اور چونکہ سرل سے اُس سے کچھ قرابت بھی تھی (یعنی ہنری کی ماں ڈیر صاحب کی رشتہ کی بہن تھیں) اُسنے سرل کو اُس کی اس حرکت پر بڑے شدّومد سے ملامت کی۔ سرل بُرا شرمندہ ہوا پہلے تو رفع خجالت کے لیے صفائی کرنی چاہی مگر جب ہنری نے ایک نہ سُنی تو بہت بڑبڑایا اور جھٹ وہاں سے چلتا ہوا۔ ہنری کو ولیم کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ اُس کی طرف مخاطب ہو کر اُس کی کمال ہمدردی کی۔

فرانک اور اڈگار تو اُس ہنگامہ کے بعد گھر پہنچے۔ ولیم کے سر میں ضعف سے چکر آنے لگا تھا اسلیے وہ وہیں سڑک کے کنارے کچھ دیر بیٹھا۔ پھر اپنا چہرہ جو خاک و خون میں لتھڑ گیا تھا دھویا۔ صبح کو کام پر آتے ہوئے اُسکی ماں نے کسی چیز کی فرمائش کی تھی کہ کارخانے سے لوٹتے ہوئے خرید لائے۔

اس خیال سے مکان نہ جاکر پہلے بازار گیا وہاں وہ چیز خریدی اور گھر پہنچا۔ مسز ہالیبرٹن اپنے لڑکوں کی زبانی ولیم کی جو گت بنی تھی سُنکر سخت مضطر تھیں کہ ولیم پہنچا تو اُن کی جان میں جان آئی۔ بیٹے کے سر آنکھوں کو چوما اور اُس کی بے کسی پر بہت روئیں۔

شب کو ولیم جب بستر پر لیٹا ہی اُسکو خط ڈالنے کا خیال آیا۔ مار پیٹ کھا کر غریب ولیم جو چکرایا تھا خط ڈالنے کی بات ہی اُسکے دماغ سے اُتر گئی تھی۔ خط کی بات یاد

آتے ہی اُسکے ہاتھ کے طوطے اُڑ گئے۔ بیتابانہ ڈاک خانہ دوڑا گیا۔ خط تو اُسی وقت ڈاک میں ڈالدیا مگر لاحاصل۔ کیونکہ ڈاک روانہ ہوچکی تھی۔ اس فکر میں تمام رات ولیم کو نیند نہ آئی۔ صبح کو افسردہ خاطر ماں کے پاس آیا اور اپنی تشویش کا سبب بیان کیا۔ اُس عقلمند بیوی نے یہ صلاح دی کہ تم فوراً اس امر کی اطلاع اپنے آقا ایشلی صاحب سے کردو۔ ممکن ہے کہ اُس خط میں کوئی ایسی اہم بات ہو کہ اُسکے نہ پہنچنے سے تمہارے آقا کا بڑا نقصان ہوجاے۔ اگر ابھی معلوم ہوجاے تو دوسری تلافی کر بھی سکتے ہیں۔ ولیم نے کہا "بہت خوب" اور اپنے کام پر چلا گیا۔ ولیم نے یہ صلاح ماننے کو تو مان لی مگر جی ہی جی میں ڈر رہا تھا۔ اُسکا دل بیٹھا جاتا تھا اور ہمت پست ہوئی جاتی تھی۔ مگر اُسنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ کچھ ہی ہو پر کہونگا ضرور۔

ایشلی صاحب حسب معمول ساڑھے نو بجے اپنے کارخانے میں آئے پہلے تو کاروباری خطوں کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ پھر نصف گھنٹہ تک لین صاحب سے کاروبار کے متعلق گفتگو کی۔ اُسکے بعد تنہا حساب کے کمرے میں جاکر میز کے پاس حساب کتاب دیکھنے میں مشغول ہوئے۔

ولیم ڈرتے ڈرتے اُن کی میز تک پہنچا۔ مسٹر ایشلی نے نگاہ اوپر اُٹھائی اور پوچھا "کیا ہے"؟ ولیم کا چہرہ اندرونی جوش سے سرخ ہوگیا اور زبان لڑکھڑائی۔ مسٹر ایشلی کو بڑا تعجب ہوا اُنھوں نے بےصبری سے پوچھا "بھئی کہو بھی کیا ماجرا ہے"؟ ولیم کی زبان کو یارا ہی نہ تھا مگر بڑی کوششوں سے کہا "خداوند مجھے نہایت افسوس ہے کہ اُس خط کو" اور آگے نہ بڑھ سکا۔

مسٹر ایشلی۔ کونسا خط وہی جو میں نے تمہیں کل ڈاک میں ڈالنے کو دیا تھا۔

ولیم۔ جی ہاں وہی۔

مسٹر ایشلی۔ تو پھر کیا ہوا۔

ولیم۔ میں بدنصیب اُسکو بر وقت ڈاک میں ڈالنا بھولگیا۔

مسٹر ایشلی۔ بھول گئے؟ اتنی بے پروائی! ایسی غفلت تو ہرگز نہیں ہوسکتی اچھا اب بتاؤ وہ خط کہاں ہے۔

ولیم۔ جناب مجھے رات کو اُسکے بارے میں جوں ہی یاد آیا میں بستر سے اُٹھ فوراً دوڑا گیا اور ڈاک میں ڈال آیا مگر مجھے اُسی وقت معلوم ہوا کہ ڈاک روانہ ہوچکی تھی اور ناوقت ہوگیا تھا۔

مسٹر ایشلی۔ بھلا تمہارے اس بھولنے کا بھی کوئی ٹھکانا ہے کیوں تم یہیں سے سیدے ڈاکخانہ نہیں چلے گئے تھے۔

ولیم۔ جناب میں تو اسی وقت اُدھر روانہ ہوا تھا مگر۔

مسٹر ایشلی۔ مگر کیا؟

ولیم۔ کالج کے لڑکوں نے مجھپر حملہ کیا۔ سرل ڈیر میرے چھوٹے بھائی کو پیٹ رہا تھا میںنے اُسکو بچانے کی کوشش کی اسپر سارے لڑکے مجھپر پل پڑے۔ اسی ہنگامہ میں خط کی بابت یکقلم بھول گیا۔

مسٹر ایشلی۔ اخاہ۔ کل تم ہی پر لڑکوں نے یورش کی تھی۔ کل ہنری بیان کرتا تھا اور تمہارے سبب سے نہایت افسوس کرتا تھا۔ خیر۔ اب ایسی غفلت نہ کرنا۔

یہ کہکر ایشلی صاحب اپنے کام میں مشغول ہوئے ولیم حکم کے منتظر وہیں کھڑا رہا۔

ایشلی صاحب نے کچھ دیر کے بعد اوپر آنکھ اُٹھائی دیکھا کہ ولیم میز کے پاس کھڑا ہوا ہے پوچھا یہ کیوں۔

ولیم نے لڑکھڑاتے لہجہ میں کہا جناب میں اُمید کرتا ہوں کہ میرے اس قصور پر حضور مجکو کارخانے سے علیحدہ نہ کردینگے۔

مسٹر ایشلی نے مسکرا کر کہا "نہیں تو" مگر میں تمھیں صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ اگر تم مجھسے اس امر کے چھپانے کی کوشش کرتے اور میں کسی طرح جان لیتا تو البتہ میرے سامنے یہ بہت بڑا جرم تھا۔ چاہے کوئی قصور ہو اُسکا اعتراف کر لینا سب سے آسان طریقہ معافی حاصل کرنیکا ہی۔ اچھا اب تم اپنے کام پر جاؤ۔ ولیم خوشی خوشی اپنے کام میں مشغول ہوا۔ اور ایشلی صاحب دل ہی دل میں اُس لڑکے کی راستبازی پر عش عش کرتے رہے کہ واہ رے پالنے والی بچوں کو کیسا شایستہ اُٹھایا ہی۔

اُس دن اتفاقاً پھر ولیم کو مسٹر ایشلی کا سامنا ہوا۔ شام کو کاروبار کے متعلق کوئی شخص مسٹر ایشلی کے پاس کارخانہ میں آیا۔ ایشلی صاحب کارخانے میں نہ تھے لین صاحب نے ایک رقعہ لکھکر ولیم کو دیا کہ مسٹر ایشلی کے مکان پر دے آئے۔ ولیم چٹھی لیکر بھاگا ہوا گیا اور ایشلی صاحب کے دروازے پر پہنچکر اندر خبر بھیجی۔ ایشلی صاحب سامنے ٹہل رہے تھے اور ہنری میز پر بیٹھا ہوا باپ سے پوچھ پوچھکر اپنے لاٹینی سبقوں کا مشق کر رہا تھا ولیم کو آتے دیکھکر ایشلی صاحب نے کہا آہا تم ہو اندر آؤ۔ چٹھی ہاتھ سے لیکر پڑہی اور ایک کرسی کی طرف اشارہ کرکے ولیم کو کہا کہ تم بیٹھو۔ میں اسکا جواب لکھکر لاتا ہوں۔ یہ کہکر ایشلی صاحب اپنے کتب خانے میں چلے گئے ولیم کے دل میں ایک بشاشت سی معلوم ہونے لگی کہ خیر مجھے اور اُن سیاہ فام لونڈوں سے ایشلی صاحب نے اتنا تو امتیاز کیا کہ مجھے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت دی۔

ہنری نے بھی ولیم کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی لڑکا ہی جسکے ساتھ اسکول کے لڑکے بُری طرح پیش آئے تھے۔ مگر وہ اپنے سبق کی پیچیدگیوں میں اتنا پریشان تھا کہ اُسنے ولیم کی طرف توجہ نہ کی۔ کچھہ دیر بعد وہاں مسز ایشلی صاحبہ آئیں اُنھوں نے ہنری کو تنہا دیکھکر کہا کہ مجھے تو گمان تھا کہ تمھارے ابّا تمھارا سبق تیار کر وا رہے ہیں۔

ہنری۔ نہیں امّاں جان میں مشکل میں پڑا ہوا ہوں۔ اب کوئی دم جاتا ہی اور ماسٹر صاحب آپہنچتے ہیں۔ اور میری مشق ادہوری رہی جاتی ہی۔ ابّا کو تو تمام دن فرصت نہ ملی کہ اُنسے کچھ پوچھتا ابھی جو اُنھوں نے توجہ کی تو کارخانہ سے اور ایک پروانہ آموجود ہوا اُسکے جواب لکھنے میں وہ مشغول ہوگئے۔ حیران ہوں کہ اس جملے کو حالت مفعولی میں لکھوں یا اضافی میں۔ پھر میرے کوٹھے بھی بے طرح دُکھ رہے ہیں مجھسے زیادہ بیٹھا بھی نہیں جاتا۔

مسز اینسلی۔ اے ہے بیٹا تم تو گھبرا ہی اُٹھے ذرا صبر کو راہ دو۔ یہ کہکر وہ چلی گئیں اور ہنری اپنے سبقوں کے پیچھے سر دُھننے لگا۔ ولیم یہ دیکھکر اُٹھا اور میز تک پہنچا اور دبی زبان سے کہا "مجھے اجازت ہو تو میں آپ کی مدد کروں"

ہنری (متعجب ہوکر) تم اور میری مدد۔ کیا تمھیں لاطینی بھی معلوم ہی؟

ولیم نے اُس کی مشقوں کو دیکھکر کہا کیوں یہ تو میرے لیے نہایت سہل ہی۔ میرا چھوٹا بھائی اُڈگار بھی اس سے زیادہ جانتا ہی۔

دیکھیے آپ نے اس جملے کو از روے نحو غلط لکھا ہے۔ یہ کہکر اُس نے صحیح طریقہ بتایا۔

ہنری۔ تو خیر بھائی اگر تم میری مدد کر سکتے ہو تو کرو میں بہت پریشان ہوں یہ کمبخت سبق کہیں جلد ختم بھی تو ہو چکے۔ لو یہیں بیٹھ جاؤ۔

ولیم نے بیٹھنے کی پروا نہ کی وہیں کھڑے کھڑے اُسنے اس خوبی سے سبق کی پیچیدگیوں کو حل کرنا شروع کیا کہ کُل قواعد ہنری کے ذہن نشین ہوتے گئے۔

ہنری متعجب ہوکر پکار اُٹھا۔ اے ہے ایسا نفیس طریقہ تعلیم تمھیں کسنے بتایا۔

ولیم۔ ابّا نے۔ اُنھوں نے اپنا بہت وقت ضائع کیا ہی جب کہیں مجھے اتنا کچھ سکھایا ہی۔ اللہ اُن کو غریق رحمت کرے۔ یہ دیکھیے اور ایک غلطی اس ورق کے سرے پر آپ نے کی ہی۔ اس لفظ کو یوں لکھنا چاہیے۔

ہنری۔ نہیں تم غلطی پر ہو کیونکہ میرے ابّا نے ہی لکھوایا ہی۔ گو وہ ایک کارخانہ دا

ہیں مگر السنۂ قدیمہ کے بڑے عالم ہیں۔

ولیم۔ ضرور ہیں مگر یہ جملہ تو مجھے کھٹکتا ہے۔

ہنری۔ نہیں اسکو میں بدل نہیں سکتا۔ خیر اب میرے بنائے ہوئے سبقوں کو دیکھو۔ اس طرح ہنری نے ولیم کی مدد سے سبق کو پورا کیا تھا کہ مسٹر ایشلی داخل ہوئے۔ اُنھوں نے چٹھی ولیم کو دی کہ لین صاحب کو دیدے۔ ولیم سلام کرکے رخصت ہوا۔

مسٹر ایشلی ہنری کی طرف متوجہ ہوے کہ اُس کے ادھورے سبق کو پورا کرادیں۔

ہنری۔ ابا وہ لڑکا تو لاطینی جانتا ہے۔

مسٹر ایشلی۔ کون لڑکا۔

ہنری۔ وہی آپ کا ملازم۔ اُسنے میرے سبقوں کو پورا لکھوا دیا۔ آپ یہ نہ سمجھیے کہ اُسنے میری طرف سے لکھدیا ہے۔ نہیں بلکہ اُسنے اس خوبصورتی سے نحو کی پیچیدگیاں حل کردیں کہ کُل قواعد میرے ذہن نشین ہوگئے۔

مسٹر ایشلی نے کاغذ ہاتھ میں لیکر جو دیکھا تو تمام جملے صحیح تھے۔ اور اُسکو خوب معلوم تھا کہ ہنری کا یہ سواد نہیں ہے۔

ہنری۔ وہ تو کہتا تھا کہ اُسکے ابا نے اُسکو اسی طریقے سے لاطینی سکھائی تھی۔ تعجب ہے کہ آپ کے کارخانے کا ایک لونڈا اپنے باپ کو ابا کہکر پکارے۔

مسٹر ایشلی۔ کیوں کیا تم نے اُسکو عوام ملازم لڑکا سمجھ رکھا ہے۔ اُسنے بھی ایسی ہی اعلیٰ طرح پرورش پائی ہے جیسی کہ تم پارہے ہو۔

ہنری۔ مینے بھی یہی سمجھا تھا کیونکہ اُس میں رکھ رکھاؤ بہت ہے۔

مسٹر ایشلی۔ کیا وہ تمہارے سامنے شیخی دکھاتا تھا۔

ہنری۔ نہیں تو بلکہ مجھسے بہت ہی خُلق اور انکسار کے ساتھ گفتگو کی اُسکی حیثیت کو قطع نظر کیجاے تو اُسکے اطوار بالکل شریفانہ تھے بلکہ یں تو اُس سے گفتگو میں بالکل

بھول گیا تھا کہ وہ کون ہے اور اُس سے برابری کے درجے کا برتاؤ کیا۔ البتہ اُس کی ایک بات مجھے نہ بھائی کہ اُسنے آپ کی لاطینی میں غلطی نکالی۔ یہ کہکر اُسنے اُس لفظ کی طرف اشارہ کیا۔

مسٹر ایشلی نے مسکرا کر دیکھا اور کہا واقعی یہ غلط ہے۔

ہنری۔ مگر ابّا آپ ہی نے تو لکھوایا تھا۔

مسٹر ایشلی۔ نہیں بیٹا مجھے تو یاد نہیں شاید تمھارے سُننے کی غلطی ہو۔

ہنری۔ جب ہی میں بار بار اُس لڑکے کو کہتا رہا کہ میرے ابّا نے اسکو لکھوایا ہے یہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا مگر وہ اپنی ہی رائے پر قائم رہا۔ ابّا یہی لڑکا ہے جسکو سرل نے پٹوایا تھا۔ کیا افسوس ہے کہ ایسا لائق اور ذہین لڑکا اس طرح کارخانے میں بند پڑا رہے۔

مسٹر ایشلی۔ کارخانے میں کام کرنا تو کوئی عیب یا بُرائی نہیں ہے۔ البتہ افسوس تو یہ ہے کہ اس چھوٹی سی عمر میں جو اس کی تحصیل علم کا زمانہ ہے۔ اُس میں اُسکو روٹی کمانی پڑتی ہے ورنہ کارخانے میں کام کرنے سے اُسکے علم اور شرافت میں کیا فرق آسکتا ہے۔ آخر میں تمھارا باپ بھی تو کارخانے ہی میں ہوں۔

ہنری۔ مگر ڈیر صاحب کے لڑکوں سے سُنا تھا کہ کارخانے میں کام کرنے سے انسان نیچ قوم کہلاتا ہے۔

مسٹر ایشلی۔ ڈیر صاحب کے لڑکوں کا نام نہ لو اُن کی شرارت افترا اور غرور سے خدا سارے جہان کے لڑکوں کو محفوظ رکھے۔ اُن کی باتوں پر اگر کان دہرو گے تو میں تمھارا اُن لوگوں سے ملنا جُلنا موقوف کرا دوں گا۔ کیوں ڈیر صاحب بھی تو اپنے سنجھلے بیٹے کی بدشوقیوں سے عاجز آکر اُسکو کارخانے میں بھیج رہے ہیں۔ اور غالباً ہمارے ہی کارخانے میں وہ آئے۔

یہ سُنکر ہنری دم بخود رہ گیا۔

اپریل مہینے کے وسط میں ایک دن صبح کو مسز ہالیبرٹن اپنے مکان کا سہ ماہی کرایہ ادا کرنے کو ایشلی صاحب کے مکان پر گئیں۔ مسٹر ایشلی نے احترام سے اُن کو بٹھلایا اور ادہراُدہر کی باتیں کیں۔ مسز ہالیبرٹن نے باتوں باتوں میں دریافت کیا کہ ولیم کیسا کام کرتا ہے۔

مسٹر ایشلی۔ مجھسے تو اُسکو سروکار کم ہے۔ کارخانے میں لین صاحب ہمارے مینیجر سے اُسکو سابقہ پڑتا ہے۔ مجھے جہانتک معلوم ہے وہ بھی اُس سے بہت راضی ہیں۔ کئی دن ہوے لین صاحب کہتے تھے کہ وہ لڑکا بڑے درجے کا راستباز اور دیانتدار ہے۔

مسز ہالیبرٹن۔ ہاں یہ صفت اُس میں ضرور ہے۔ مگر میں نے کام کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ اب تو دیکھتی ہوں کہ اُسکا دل کام کاج میں لگ چلا ہے ورنہ پہلے تو بہت برداشتہ خاطر تھا۔

مسٹر ایشلی۔ یہ کیوں۔

مسز ہالیبرٹن۔ اب دیکھیے کہ اس نوکری سے اُسکے لکھنے پڑہنے میں کہانتک ہرج ہوا۔ میں چاہتی تھی کہ اُسکو کسی آفس میں نوشت وخواند کی نوکری ملجائے۔ تاکہ شام کو مکان پر رہکر اُسکو پڑہنے کا موقع ملے۔ اُس کی بھی یہی دلی خواہش ہونی چاہیے۔ کیونکہ نہو بچپن سے اُس کی اعلیٰ التعلیم کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ اور اُسکے مرحوم ابا یونیورسٹی کے لیے اسکو تیار کر رہے تھے۔ مگر بے وقت ہی ایسا آن پڑا کہ مجبوراً اُسکی ترقی روکنی پڑی۔

مسٹر ایشلی۔ مگر وہ بڑا زیرک اور جفاکش لڑکا ہے۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ ضرور وہ کچھ نہ کچھ کرکے رہیگا۔

مسز ہالیبرٹن۔ کیا بتاؤں اس کوشش میں ایک عمر کی محنت صرف کردی اور

اچھی باتوں کا بیج بچوں کے دلوں میں بویا۔ ان کی تقدیر بھی ایسی ہی ہوئی کہ اس سن میں اور اور بچوں کو سوائے کھانے اور کھیلنے کے دوسرا خیال نہیں مگر میرے بچوں کو زمانے کی گردش نے مصیبت جھیلوا کر زندگی کی سختی کا تجربہ سکھایا۔ اُنکے ابا کی بیوقت موت کیا اُنکے لیے کم آزمائش تھی۔

مسٹر ایشلی۔ اس میں کیا شک ہے خدا یہ دن دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ اچھا ولیم نے کبھی اس کی شکایت بھی کی ہے۔

مسز ہالیبرٹن۔ نہیں وہ بیچارہ اس کی شکایت کیا کرتا اُسکو تو میں نے سمجھا دیا ہے کہ وہ میرا بڑا لڑکا ہے اُسکا فرض ہے کہ میری مدد جان و دل سے کرے اس میں اگر اُسکو کچھ ایثار نفسی ہی کرنا ہو تو اُسکے لیے اجر عظیم ہے۔ مگر اُسکے اور دو بھائی کینسہ کے اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں۔ یہ دیکھکر اُسکے دل میں فطرتاً کچھ خیال پیدا ہوتا ہوگا۔ میں تو ہمیشہ اُسکا دل بڑہاتی رہتی ہوں کہ خدا نے چاہا کہ ایک دن ایسا آئیگا کہ یہ دشوار راہ تمہارے لیے آسان ہو جائیگی۔ دنیا بہ اُمید قائم ہے۔ اسی طرح میرے بیوگی کے دن کٹتے جاتے ہیں

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

مسز ہالیبرٹن رخصت ہوئیں۔ گھر میں گھستے ہی جین دوڑی آئی اچھی اماں جان آپ کو کچھ خبر بھی ہے۔ آج میری سالگرہ ہے آج کیا ہونا چاہیے میں کبھی بھولنے کی نہیں ہوں

مسز ہالیبرٹن (ٹھنڈی سانس بھر کر) ہاں پیاری مجھے خوب یاد ہے۔ اُنکو یاد آیا کہ آج سے ایک سال پیشتر اسی دن اُنکے شوہر ڈاکٹر سے معائنہ کر کے مایوس و محزون آئے تھے۔ ایک خیال کے ساتھ کتنی باتیں لگاتار یاد آئیں۔ رنج و غم سے دل اُمنڈ آیا۔ سر جھکا کر چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گئیں۔

کچھ دیر بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جین نے جا کر دروازہ کھولا تو مسٹر لین

آئے ۔ اُنھوں نے مسز ہالیبرٹن کو انیشلی صاحب کا یہ پیام پہنچایا کہ اب سے ولیم چھ بجے جو مکان پر آیا کرے تو شام کو پھر نہ جایا کرے بلکہ گھر میں رہکر اپنے لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھے ۔

مسز ہالیبرٹن نے خدا کا شکر ادا کیا اور انیشلی صاحب کو سیکڑوں دُعائیں دیں ۔

ایک دن مسز ایلس کی خادمہ نے آنکر مسز ہالیبرٹن کو بہت ملامت کی اور کہا کہ آپ تو تمام دن کام کاج سینے پرونے میں رہتی ہیں بھلا یہ بھی خیال ہے کہ آپ کی لڑکی جین کی حالت کیوں تبدیل ہو رہی ہے ۔ مسز ہالیبرٹن نے لاعلمی دکھائی تو خادمہ نے بہت کچھ طیش کھایا بہت بڑبڑاتی رہی کہ اوئی کیسی ماں ہے ذرا لڑکی کا خیال نہیں ۔ لڑکی روز بروز دبلی ہوتی جاتی ہے کیا تمھیں نہیں سوجھتا جب دیکھو دونوں گال سرخ ہوئے ہیں ہاتھ پیر جلتے ہیں ۔ مینے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ راتوں کو پسینہ بھی آتا ہے ۔ مجھے تو شبہ ہوتا ہے کہ کہیں اُسکے باپ کی بیماری اُسکو بھی ہوئی ہو ۔ میں اب کے جب شہر میں جاؤنگی ضرور کسی ڈاکٹر سے اُسکو دکھلاؤنگی ۔

مسز ہالیبرٹن نے ایک آہ سرد بھر کر کہا ۔ کیا بتاؤں کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑتا ۔ ایک جان ہزار سودا میں کن کن باتوں کی فکر کروں ۔ میں تو ایک ڈھیر پھٹے اُدھڑے کپڑے بیٹھی سی رہی ہوں ۔ ابھی تو میں جین کو اپنی مدد کو بلانے کو تھی ۔

خادمہ ۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں جین کو سینے کی اجازت دوں ۔ اچھا کچھ کپڑے مجھے دو کہ اُس کی عوض میں سی دوں ۔ مسز ہالیبرٹن انکار کرتی رہیں مگر خادمہ نے سلائی کے کچھ کپڑے اُٹھا لیے اور اپنے قطعے میں چلی گئیں ۔

کچھ دیر بعد فرانک اور اڈگار ہنگامہ کرتے ہوئے پہنچے ۔ فرانک کو وہانکے ہیڈ ماسٹر نے کہا تھا کہ تمھاری آواز اچھی ہے ۔ تم کوشش کرکے سُریلی آواز سے حمد پڑھنا سیکھلو تو کنیسہ میں تمھیں ایک کام ملجائیگا ۔ اسی میں عزت کی عزت ہوگی اور دس پاؤنڈ سالانہ

کی آمدنی بھی ہوگی۔ اس کو سُنکر فرانک پھولا نہیں سماتا تھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی پکارا اماجان ماسٹر نے کہا ہے کہ میری آواز اچھی ہے۔ ضرور مارگیرٹ خالہ کی طرح میری آواز ہے۔ کنیسہ میں حمد گانے کے کام پر مجھے مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیجیے تو آج سے سیکھنا شروع کروں۔

مسز ہالیبرٹن نے اس آمدنی کو تائید غیبی سمجھا اور فوراً راضی ہوگئیں۔

امتحان کے دن سرل وغیرہ شہر کے اکابر کے لڑکے بھی امیدوار تھے۔ سب ہی نے حمد گا گا کر سُنایا۔ مگر فرانک اور ایک غریب منشی کا لڑکا منتخب کیے گئے۔

امیر اسکول کے لڑکے بہت بگڑے۔ ائے دن فرانک کو اُسکے بھائی کی ملازمت کرنیکا طعنہ اور ماں کی غربت کی تشنیع دیتے رہتے تھے۔

سرل کے ایما سے اسکول کے لڑکوں نے اُسکو ذلیل و خوار کرنے کا کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ لڑکوں نے ملکر اُسکو اتنا ستایا اتنا ستایا کہ فرانک سا شیر دل لڑکا عاجز آکر رو رو دیا کرتا اکثر ماں کے پاس بھی رو رو کر فریاد کرتا۔ ماں ولیم کی طرح اُسکو بھی پیار کر کے سمجھاتی بجھاتی رہتی۔ اے نور چشم علم کی خاطر یہ سب ذلت سہہ لو۔ علم ایسی نعمت ہے کہ اسکے ذریعے سے دنیا میں عزت ہے عقبیٰ میں بہشت ہے۔ اسکے حصول کے لیے انسان جو کچھ سختی اُٹھائے کم ہے۔ بغیر کان کھودے ہوئے کبھی لعل ملتا ہے۔ بحر ذخار میں بغیر غوطہ دیے موتی ملتے ہیں پس بیٹا یہ علم ہے جسکے سامنے لعل و موتی ہیچ ہیں کیا اسکے لیے تم اتنی سختی بھی نہ گوارا کروگے ایک دن تم دیکھنا کہ تم کو اس صبر کا کیسا اچھا پھل ملیگا اور ضرور ملکر رہیگا۔

(باقی آیندہ)

رقمہ عذر خواہ

سہروردیہ

غمِ مرگ

کسی کے انتقال کا رنج بھی عجیب رنج ہوتا ہے۔ اس رنج سے بڑھکر اور کوئی رنج نہیں اس درد سے بڑھکر اور کوئی درد نہیں اور اس صدمے سے بڑھکر اور کوئی صدمہ نہیں۔ یہ ایک ایسا رنج ہے جسے ہم اپنے دل سے نکالنے کی ہرگز کوشش نہیں کرتے۔ یہی ایک ایسا درد ہے جسے ہم اپنے دل میں بڑی محبّت سے رکھتے ہیں۔ یہی ایک ایسا صدمہ ہے جسے ہم بھول جانے کا خیال تک نہیں کرتے۔ تنہائی میں ایک مرحوم کی یاد ہمارا دل بہلاتی ہے۔ اُس کی زندہ تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔ اور اُسی کے تصور میں ہم دن رات غرق رہتے ہیں۔ ہر تکلیف کو ہم رفع کرتے ہیں ہر مشکل کو حل کرتے ہیں اور ہر زخم کو بھرنے کے لیے علاج کرتے ہیں مگر یہی ایک ایسا زخم ہے جسے ہم مرحوم کی یاد سے ہمیشہ تازہ رکھتے ہیں اور اُس میٹھے میٹھے درد کا مزا لیتے ہیں۔

کیا دنیا میں کوئی ایسی ماں ہوگی جو اپنے پیارے ننھے سے بچّے کی موت کو بھول بیٹھی ہو۔ کیا ایسا کوئی بچہ اس دنیا میں ہوگا جسنے اپنے نازوں کے اُٹھانے والے ماں باپ کو دل سے بُھلا دیا ہو۔ کیا ایسا کوئی دوست ہوگا جو اپنے سچّے دوست کے اس دنیا سے چلدینے کے غم میں سر نہ پٹکتا ہو۔ حالانکہ مرحوم کی یاد سے دل کو سخت صدمہ پہنچتا ہے مگر اُسے اپنے دل میں حفاظت سے رکھنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

آہ ایک سچّے دوست کے جسے ہم دنیا میں سب سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ جو ہمارے دُکھ سُکھ کا ساتھی ہو۔ جسکے دل میں ہماری سچّی محبت اور ہمدردی ہو۔ غرضکہ جسکی دوستی پر ہمیں فخر ہو۔ ایسے دوست کے دم توڑتے وقت۔ قبر میں سوتے وقت اور

ہم سے ہمیشہ کے لیے جُدا ہوتے وقت ہماری کیا حالت ہوتی ہے کیسا سخت صدمہ پہنچتا ہی۔ کیسا کاری زخم لگتا ہی۔ دل کیسا تڑپتا ہے۔ دھڑکتا ہی۔ اُچھلتا ہی اور یہ معلوم ہوتا ہی کہ پاش پاش ہوگیا۔ کیا ایسی حالت کو ہم بھولجاتے ہیں۔ کیا ایسے رنج کو ہم فراموش کر دیں۔ کیا ایسے زخم کو مرہم فراموشی سے بھر دیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں وہی محبّت سچی اور اصلی ہے وہی اُلفت پاک وصاف ہی اور وہی ہمدردی قابل قدر ہے جو ایک مرحوم دوست کے انتقال کے بعد نہ سُنیں۔ بلکہ اُسکی قبر کے مسمار ہونیکے بعد اُسکے زندہ دوستوںکے دل میں ویسے ہی محفوظ رہے۔

وہ درد بھی کیا میٹھا معلوم ہوتا ہی جو غم بنکر دل میں آتا ہی۔ بخار بنکر اوپر چڑہتا ہی اور آنسو بنکر بہنے لگتا ہی۔ وہ یاد بھی کیا بھلی معلوم ہوتی ہی جو رنج کے ساتھ دل میں پیدا ہوتی ہی اور ایک زندہ تصویر بنکر ہماری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہی۔ وہ خیال بھی کیا مزیدار معلوم ہوتا ہی جو ایک تیر بنکر دل پر اثر کرتا ہی اور پھر تصوّر بنکر ہمیں اس دنیا سے بالکل بے خبر کر دیتا ہی۔

مگر ہاں اس دنیا کی بے ثباتی کو بھولجانے والے۔ ان دلکش تماشوں پر پھسلجانیوالے اور اس دلفریب منظر پر مرمٹنے والے یہی کہینگے کہ اس بیہودہ رنج سے کیا نتیجہ۔ کسی مرحوم کے خیال سے بھی ہمارے عیش اور لطف میں خلل ہوجاتا ہی۔

مگر نہیں ایسا نہیں بلکہ اُس رنج میں خوشی اور تسکین ہی۔ اس درد میں فرحت اور تازگی ہی۔ اس زخم میں مزا اور لطف ہی۔ ایک قبر میں سونے والے کا خیال نہیں بلکہ صرف اس خیال کی جھلک بھی اس دنیا میں رہنے کی خوشی سے کہیں بڑھکر ہی۔ آہ قبر جو تجھ میں کسی کا ہر عیب چھپ گیا۔ ہر نقص دب گیا۔ ہر بُرائی کا پردہ ہوگیا۔ آہ اب صرف تجھ میں سے اُس سچّی محبت کی خوشبو نکلکر دور دور مہک رہی ہی اور ہر دل و دماغ کو معطر کیے دیتی ہے اور مرحوم کی یاد دلاتی ہی۔ تیرے سینہ پہ یہ جو پوشیدہ ہیں

اُن کی ہر ٹہنی ٹہنی اور پتّی پتّی سے محبت ٹپک رہی ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے مرحوم دشمن کی قبر پر چلا جائے تو وہاں کیا وہ یہ کہیگا کہ یہاں میرا دشمن سو رہا ہے' نہیں ہرگز نہیں۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آدینگے اور زبان سے یہی نکلیگا کہ" کاش اس مشت خاک سے میں نہ لڑا ہوتا۔ اسکا دل نہ دُکھایا ہوتا اور زانو پیٹ پیٹ کر یہی کہے گا کہ کاش اس سے میں نے اخیر وقت معافی تو مانگ لی ہوتی۔

آہ ایک دوست کی قبر بھی عجیب جگہہ ہوتی ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم اپنی نیک دلی اور بدنیتی کی تمیز کر سکتے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم اپنے برتاؤ شریفانہ یا مفسدانہ کو اچھی طرح سے دیکھ سکتے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم اپنے مرحوم دوست کو اچھی طرح تصور کر سکتے ہیں۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں اس دوست کو صدق دلی۔ سچی ہمدردی محبت اور اُلفت کی داد دیتے ہیں اور ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ تنہائی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ہے۔ مصیبت میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمارا ساتھ دے رہا ہے۔ کیسے ہی رنج و غم میں مبتلا ہو' مگر ایک سچے دوست کی قبر پر جانے سے ہمیں تسکین ہوتی ہے۔ ناکامی نے ہم پر کیسا ہی اثر کیا ہو مگر یہاں جانے سے ہمارے حوصلے بڑھتے ہیں۔ آہ یہی وہ جگہ ہے جہاں اس دوست کی زندہ تصویریں ہماری آنکھوں کے سامنے پھرتی ہے۔ یہیں اس پُر اثر نازک وقت نزع کی۔ وہ وقت جبکہ ہمارے پیارے دوست نے اس دنیا سے سدھارنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ وقت جب اُس دوست کی روح آہستہ آہستہ پرواز کر رہی تھی۔ جب وہ دم توڑ رہا تھا۔ جب وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ آنکھیں پھیر رہا تھا اور سوے عدم کو رم کر رہا تھا۔ اُسوقت کا سماں آنکھوں میں بندھ جاتا ہے۔ آہ اس قریب المرگ مریض کا کمرہ۔ اسکا بستر۔ وہ سکوت کا عالم' وہ آنسوؤں کی قطاریں، وہ یٰسین کی آواز اور ایسے وقت نازک ناتوان کانپتے ہوئے ہاتھوں کی ہلکی گرفت۔ آہ وہ سچی محبت کی اخیر نگاہ۔ ان کمزور

لاغر آنکھوں سے اخیر وقت نظر بھر کے دیکھ لینا۔ آہ وہ چلتے چلتے ایک وقت اپنی محبت کا ثبوت دے جانا۔ یہ سب باتیں ہمیں ہمیں اسی قبر پر یاد آتی ہیں۔

جا اور اپنے پیارے دوست کی قبر پر جا اور وہاں اُس کی زندگی کی یاد کر نہیں یہ بھی یاد کر کہ تو نے اسکے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ تیری بیوفائی بے التفاتی اور بے پروائی نے اُسکے دل پر کیسا اثر کیا ہوگا۔ اُسکے سینہ پر کیسے کیسے داغ ہونگے۔ تیری وجہ سے اُسکے دل پر کیا کیا رنج اور صدمہ پہونچا ہوگا۔ مگر پھر بھی وہ سچا دوست اپنی محبت کا ثبوت دے ہی گیا۔ اب اپنی اس بداخلاقی کو یاد کر پچھاڑیں کھا اور مرجا مگر ایسے کہ کوئی سُن نہ سکے۔ آہ و گداز کر مگر ایسے کہ کسی کے کانوں کان خبر نہ پڑے۔ آنسو بہا مگر ایسے کہ کوئی دیکھ نہ سکے۔ تاکہ اسکا زیادہ اثر ہو۔ پھر اس قبر پر پھول چڑھا اور چلا جا مگر سُن اس رونے دہونے اور پچتانے سے یہ نصیحت لے کہ آیندہ اپنے زندہ دوستوں کے ساتھ اپنے فرائض کو ادا کرنے میں سچائی۔ محبت۔ اُلفت۔ وفاداری۔ اخلاص اور ہمدردی سے پیش آئیگا۔

راقم
محمد احمد خدنگ

ایک دلچسپ و مفید مکالمہ

(زاہدہ اور عابدہ)

عابدہ۔ کیوں بہن زاہدہ آج کدھر چاند اگا جو تمہاری صورت نظر آئی۔ خیریت ہے نا۔ اتنے دنوں کہاں رہیں۔

زاہدہ۔ نہیں بہن میں تو روز آنا چاہتی تھی مگر نہیں آتی تھی۔

عابدہ۔ آخر تش اسکی کوئی وجہ تو ہوگی۔ کیا میری طرف سے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی۔ اگر یہی وجہ ہے

تو میں معافی چاہتی ہوں۔

زاہدہ۔ نہیں بہن ایسا نہیں ہے۔ آپ کی نوازش و عنایت جو میرے حال پر ہے۔ اُس کی میں دل سے قدر کرتی ہوں جسکا شکریہ مجھ ناچیز سے کچھ بھی ادا نہیں ہو سکتا ہے۔ بجز اسکے کہ میرے رُوئیں رُوئیں سے آپ کے حق میں دعا نکلتی ہے۔ اور جبتک جیتی ہوں آپ کی بے داموں کی بندی ہوں۔ جو کچھ قصور ہے وہ میری قسمت کا ہے۔ میری سی قسمت کی جیسی دنیا میں کوئی نہ ہو گی۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنا دُکھڑا آپ کے سامنے ڈہرا کر آپ کی طبیعت کو مکدر کروں۔ اسی وجہ سے میں اتنے دنوں نہ آئی۔

عابدہ۔ اللہ تمہاری مصیبت کو دور کرے۔ مجھ سے کچھ بھی محبت رکھتی ہو گی تو اپنا حال ضرور کہہ سناؤ گی۔ میرے بس کی بات ہو گی تو تمہاری مدد سے دریغ نہ کرونگی۔

زاہدہ۔ میرے ماں باپ مجھے زہر کا پیالہ پلا دیتے تو اچھا ہوتا مگر ایسے ظالم اور بے رحم کے پلّے نہ ڈالتے۔ جب سے میں بیاہ کر آئی۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو ایک دن بھی ہنسی خوشی سے بسر کرنا نصیب نہوا۔ اور اب تو میری مانگ ہی میں آگ لگ گئی۔

عابدہ۔ خدا کے لیے ایسی فال بد زبان سے نہ نکالو۔ یہ تو میں جانتی ہوں کہ تمہارے میاں تم پر مہربان نہیں ہیں۔ مگر تمہاری آج کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھوں نے تم پر کوئی نیا ستم ڈہایا ہے اور کوئی نیا گُل کھلایا ہے۔

زاہدہ۔ وہ تو میں اُسکے الگ الگ رہنے اور رُوکھی سُوکھی باتوں ہی کے کرنے سے سمجھتی تھی کہ میری قسمت میں کچھ بدا ہے۔ اور دال میں کچھ کالا ہے۔ آخرش اُسکا ظہور ہو ہی گیا۔ ایک ہفتہ ہوتا ہے کہ اُسنے دوسرا نکاح پڑہا لیا۔ گھر کا آنا جانا بھی موقوف۔ اسے روؤں نہ تو کیا کروں۔

عابدہ۔ بیشک تم پر بڑا ظلم ہوا۔ بعض مردوے بڑے سنگدل ہوتے ہیں۔ خدا اُنسے سمجھے اور ضرور سمجھیگا۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ رسم و رواج نے اُن کو ہمارے حقوق پائمال کرنے کی ایسی آزادی دے رکھی ہی کہ وہ جتنا بھی ظلم و ستم ڈہائیں اُنکے لیے روا ہی اور ہماری جائز آزادی بھی اس درجہ چھین لی گئی ہی کہ ہم کو لب ہلانا منع ہی۔ دہکتی آگ میں ڈالدی جائیں مگر حکم ہی "اُف نہ کرو" کیوں! اسلیے کہ ہم عورت ہیں، جسقدر حیا و شرم واجب اور غیر واجب انسان کو عطا ہوئی ہے وہ سب فرقہ اناث کے لیے مخصوص کر دی گئی ہی۔ مگر بہن خوش ہونیکی بات ہے کہ اب وہ زمانہ آتا ہی جب ہمارے اور ہماری آنے والی بہنوں کے حقوق کی نگہداشت ویسی ہی ہونے لگے گی جیسی ہمارے پیغمبر صلعم اور اُن کے قائم مقاموں کے وقت میں ہوتی تھی۔ خدا اڈیٹر خاتون کی ہمت میں برکت دے کہ اُن کی مستعدی نے ایک حد تک لوگوں کے خیالات میں اصلاح کا بیج بونا شروع کر دیا ہی۔

زاہدہ۔ (بات کاٹ کر) کون آدمی! وہاں تو نہیں رہتے ہیں۔ لے بھلا سا نام ہے ہاں اب یاد آیا۔ علی گڑہ۔ مگر بہن! میں نے سُنا ہی کہ علی گڑہ کے مردوے سب کی بہو بیٹیوں کو باہر بے پردہ ہو کر پھرنے۔ غیر مردوں سے ملنے جُلنے اور نوکری کرنے کو کہتے ہیں۔ اور بعض کے بارے میں یہانتک سُنا ہی کہ فرنگن کا کپڑا پہنا کر ٹمٹم پر ہوا کھلانے کو لیجاتے ہیں۔ بھلا یہ کیسی خراب اور بیحیائی کی بات ہے۔ مجکو تو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اب عورت بھی مرد کا کام کرے گی تو ہانڈی چرد ئی۔ چولھا چکی یعنی خانہ داری کا انتظام اور بال بچے کی پرورش و پرداخت کون کریگا۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ بیوی کمائے اور میاں کھائے۔ بہن! میں تو ٹھہری جاہل لکھ لوڑھا۔ پڑھ پتھل۔ الف کے نام کو بھالا بھی نہیں جانتی۔ یہ جو کچھ جلوہ ہے وہ محض آپ کی صحبت کا ہے۔ مگر بہن یہ بات تو مجھے

عجب طرح کی معلوم ہوتی ہے۔ سُن کے کلیجہ دھڑکنے لگتا ہے

عابدہ - میں تو سمجھتی تھی کہ تمہیں دنیا کی کیا خبر۔ الحمدللہ کہ علی گڑھ نے وہ شُہرت حاصل کی کہ سات پردوں کے اندر رہنے والیاں بھی اُسے جانتی ہیں۔ میرے دل کی اصل بات جو میں تمہیں کہنا اور سمجھانا چاہتی تھی رہی جاتی ہے مگر تمہارے درمیانی سوال سے اب یہ ضرور ہوا کہ میں اپنے سلسلۂ گفتگو کو توڑکر واقعہ زیر سوال کے چہرہ سے غلط بیانی اور غلط فہمی کا پردہ ہٹاکر تم کو اُس کی اصلی اور حقیقی صورت دکھادوں اور ماشاءاللہ تم ہو سمجھدار۔ امید تو ہے کہ اصلیت کی تہ تک پہنچ جاؤ گی۔ جو کچھ تمنے سُنا ہے۔ اُس کی اصلیت تو کچھ ضرور ہے کیونکہ جب تک کچھ بات نہو وہ بڑھا چڑھا کر کہاں سے مشہور کیجا سکتی ہے مگر مخالفین نے اُس ذراسی بات کو رنگ آمیزی اور ملمع سازی کرکے عوام کو بدظن کرنے اور بھڑکانے کے لیے۔ رائی سے پربت پھنسی کو بھگندرا اور تل کو پہاڑ بنا ڈالا ہے۔ قصور تو دو ایک خاص مذہب والوں کا اور سان ڈالا سارے علیگڑھ والوں کو۔ لشکر میں اونٹ بدنام۔ بیچارے اڈیٹر خاتون۔ ساری آئی گئی اُنکے سر۔ اب وہ بیچاریاں جو نہ کبھی اخبار دیکھتی یا سُنتی ہیں۔ اور نہ کبھی کسی باخبر صحبت میں بیٹھتی ہیں کیونکر جان سکتی ہیں کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ بات اصل یہ ہے کہ دو چار مرد ایسے ہیں جو ولایت کی ہوا کھا آئے ہیں۔ جہاں عورتیں مردوں کی طرح کھُلے بازاروں پھرتی ہیں۔ بے حجابانہ غیر مردوں سے ملتی جلتی ہیں وہی یہاں آکر عورتوں کی پردہ دری کے اُدھیڑ بن میں پڑ گئے ہیں۔ اُن ہی میں سے ایک وہ ہیں جنکا لکھا ہوا قصہ "بدرالنساء کی مصیبت" میں تم کو ایک روز سُناتی تھی۔ مگر ابھی وہ دن بہت دُور ہے جبکہ شاید اُن کی تمنا بر آئے۔ ابھی تو علیگڑھ والے جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ اسی قدر کہ عورتوں کو پردے کی پوری نگہداشت کے ساتھ تعلیم جو ایک بڑی نعمت ہے اور جسکا حاصل کرنا مرد اور عورت دونوں پر فرض ہے دیجائے۔ بہن عورتوں کو تعلیم دینے کی اشد ضرورت ہے

سمجھ لو کہ جب عورت و مرد دونوں تعلیم یافتہ ہوجاوینگے تو بڑی ٹھیک بیٹھے گی اور طرفین کو لطفِ زندگی خاطر خواہ حاصل ہوگا۔

اب میں پھر اپنے اصلی مقصد گفتگو پر آتی ہوں۔ بیشک تمہاری حالت اسوقت بہت کچھ قابل افسوس ہے۔ خداوند کریم تم پر رحم کرے اور تمہاری مشکل آسان صبر کرو صبر کا پھل میٹھا ہے اور جو کچھ میں کہتی ہوں اُسکو گوش دل سے سنو اور اُسپر عمل کرو۔ کیا عجب ہے کہ پھر تمہارے بھلے دن پھریں۔

مرد عموماً ایسے سنگدل نہیں ہوتے ہیں جیسا ہم لوگ سمجھے ہوے ہیں۔ اور اگر ہوں بھی تو یہ بہت کچھ ممکن ہے کہ ہم لوگ اُن کو اپنے حُسن سلوک سے نرم دل بناڈالیں ہماری لاپروائی اور بے اعتنائیاں بھی اکثر اُنکے دلوں میں نفرت کا بیج بوتی اور تفرقہ ڈالتی ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ وہ کتنی محنت و مشقت سے کماتے ہیں اور اپنی کمائی ہمارے ہاتھ میں لاکر دیتے ہیں۔ اب ہم اگر اُسکو حُسنِ انتظام سے نہ خرچ کریں۔ پھوہڑ کی چال چلیں۔ اُن کی راحت و آرام کا خیال نہ رکھیں تو بھلا کیونکر اُن کا دل متنفر نہ ہوگا وہ دن بھر کے تھکے ماندے گھر آئیں اور ہم اسوقت اپنی حُسن خدمت اور میٹھی میٹھی باتوں سے اُنکے دل خوش کرنے کے عوض ناک بھوں چڑھی ہوئی کمان کی طرح چڑھائے بیٹھی رہیں۔ یا دائی ماما۔ نوکر چاکر کی شکایت کا دفتر اور چاول دال تیل نمک کا دُکھڑا لے بیٹھیں تو پھر کیوں نہ اُنکو نفرت ہوگی۔

انگریز جسقدر اپنی عورتوں کی قدر کرتے ہیں۔ اُن کی عورتیں اُس سے دو چند اُن کو سر آنکھوں پر لیے رہتی ہیں۔ جب انگریز کچہری سے کام کرکے گھر پہنچتا ہے تو اُس کی بیوی ایسی خوش اخلاقی سے اُسکا استقبال کرتی ہے اور ایسی میٹھی میٹھی باتوں سے اُس سے ہمکلام ہوتی ہے کہ وہ اپنی تکان کو ایکدم بھول کر پھر تر و تازہ اور شگفتہ دل ہوجاتا ہے۔

برخلاف اسکے ہم لوگوں کو اپنے مردوں کو خوش رکھنے کا طریقہ بھی نہیں معلوم ہے
جو مرد سمجھدار اور متحمل مزاج ہیں وہ ہماری جہالت کے کرشموں کو برداشت کرلیتے ہیں۔
اور جن کو یہ قدرت حاصل نہیں ہے وہ آخر متنفر ہو کر الگ ہوجاتے ہیں جس سے اُن کی
عورتیں اپنی قسمت کو روتی اور جنم بھر سوکناپے کے انگاروں پر لوٹتی ہیں۔ اس لیے
ہم کو چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنی طرف سے کوئی ایسی بات نہونے دیں جو اُنکے
ملال و کدورت کا باعث ہو۔ مردوں کو خدا ہی نے ہمارا سرتاج بنایا ہے ہم پر اُن کی
اطاعت و فرماں برداری واجب ہے۔ جو عورتیں اس گھمنڈ میں رہتی ہیں کہ مرد ہمارے
غرض مند ہیں۔ وہ خود ہماری خوشامد کرینگے یا مرید بنینگے وہ بہت غلط خیال میں مبتلا
ہیں۔ اور اپنے حق میں آپ کانٹا بوتی ہیں۔ اُن کی عقل پر پردہ پڑا ہوا ہے اُن کو یہ بھی
نہیں سوجھتا کہ مردوں کے لیے سیکڑوں دروازے کھُلے ہوئے ہیں اور ہمارے لیے
ایک بھی نہیں۔ اب میں اپنی گفتگو کی باگ خاص تمھارے معاملے کی طرف موڑتی ہوں۔ اور بُرا
نہ مانو تو اتنا ضرور کہوں گی کہ تم نے اپنے حق میں آپ کانٹا بویا ہے۔ تم نے بھی تو اپنی طرف
سے اپنے میاں کو ناچ نچانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ نمک پڑھا کر کھلانے۔ دعا،
تعویذ کرانے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو بیوقوفوں سے روپیے اینٹھنے کے لیے نیم مُلّاؤں نے
فریب کا جال پھیلا رکھا ہے۔ عاجزی۔ خوش خلقی اور ملنساری وہ چلتا جادو ہے کہ دشمن کے
دل کو بھی رام کرلے چہ جائیکہ شوہر کا دل ہاتھ میں نہ آئے مگر شعور اور سلیقہ چاہیے۔
میں نے بارہا تم کو سمجھایا کہ اپنا طرز عمل بدلو مگر تم کو تو اپنی صورت کا وہ گھمنڈ تھا کہ میری
باتیں کیا اثر کرتیں۔ تم کو برابر یہی بھروسہ رہا کہ میری ماں نے میرے بیاہ میں وہ ٹونے
اور سلونے کرکے میرے دولھا کو پھنسایا ہے کہ وہ جنم بھر میری جوتیاں کھاتا رہیگا مگر میری پٹی
نہ چھوڑیگا۔ مگر یہ تمہاری خام عقلی تھی۔ خیر اب جو ہونا تھا سو ہوچکا۔ اب بھی سنبھلو۔ اپنا
رُویّہ بدلو۔ اپنے پوچ خیالات کو دماغ سے نکال پھینکو۔ اور جو تدبیریں میں بتلاتی ہوں وہ کرو

تم مجھ سے یہ عہد کرو کہ اب جو تمہارے میاں تم سے ملیں گے تو تم اُنکے پاؤں پڑو گی اور اپنے اگلے قصوروں کو معاف کراؤ گی اور اُنکے خلاف مزاج کبھی کوئی بات نہ کرو گی اور اپنا سلوک اور برتاؤ اچھا رکھو گی۔ اُن کی خوشی اور راحت و آرام کو اپنی خوشی وغیرہ پر مقدم جانو گی اور میں یہ کرتی ہوں کہ آج جو وہ (عابدہ کے میاں) گھر آدینگے تو اُن پر یہ بار ڈالوں گی کہ زاہدہ کے میاں کو کسی طرح سمجھا بجھا کر گھر آنے جانے پر راضی کرو۔ جب تمہارے میاں پھر گھر آنا جانا شروع کر دیں تب یہ تمہارے اختیار کی بات ہو گی کہ تم اُن کو اپنا بنا لو۔

زاہدہ تھی تو جاہل اور تیز مزاج عورت مگر صحبت کے اثر سے کُتّا بھی آدمی بنجاتا ہے اور صحبت بھی کس کی۔ عابدہ کی سی عاقل و نیک بخت عورت کی۔ جس کی صحبت نے بہت کچھ اس میں صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ مگر آج کے پند و نصائح نے چلتے جادو کا کام کیا کہاں تو بات بات پر اُلجھ جاتی تھی۔ مگر آج کُل باتوں کو متانت و سنجیدگی سے سر جھکائے چُپ چاپ سنتی رہی۔ اور اُٹھی تو یہ کہتی اُٹھی کہ بیشک جیسا کیا ویسا پایا اور یہ بولتی ہوئی رخصت ہوئی کہ بہن عابدہ اگر تمہاری کوشش سے میرے دن پھرے تو میں تمہارے سیکڑوں گن گاؤں گی اور عہد کرتی ہوں کہ تمہاری نصیحتوں کو گلے کا تعویذ بنا کر رکھونگی۔

عابدہ نے اپنے میاں کو کہہ سُنکر زاہدہ کے کام کے لیے آمادہ کیا۔ جسکو اُنھوں نے بہت ہی حُسن و خوبی سے انجام دیا۔ زاہدہ کے میاں پھر گھر آنے جانے لگے اور اسکے بعد نہ زاہدہ کو کوئی شکایت اپنے میاں سے پیدا ہوئی اور نہ اُسکے میاں میں وہ نفرت و بے اعتنائی باقی رہی۔ ایسی خوش زندگی دونوں کی کٹنے لگی کہ خدا سب کو نصیب کرے۔ خدا کا کیا دیکھو کہ زاہدہ کی سوکن بھی ملک عدم کو چل بسی۔

جس طرح عابدہ کی نصیحت کا ایک ایک لفظ گوہر بے بہا تھا اُسی طرح وہ باتیں بھی نہایت ہی باوزن تھیں جو عابدہ کے شوہر میاں محمود نے زاہدہ کے شوہر اور اپنے دوست اصغر سے کی تھیں۔ جس سے زن و شو کے تعلقات پر ایک گہری روشنی

پڑتی ہے۔ اور جو مردوں کے لیے اسی طرح دستور العمل بن سکتی ہیں جس طرح عابدہ کی گفتگو عورتوں کے لیے۔ اگر طبیعت شامل حال رہا تو انشاء اللہ وہ مکالمہ بھی قلمبند کر کے ہدیہ ناظرین خاتون کرونگا۔ فقط

"ابوالکمال دیسنوی"

واشنگٹن اور اُس کی ماں

جیورج واشنگٹن اپنے وقت کا بہت بڑا موجد اور ممالک متحدہ امریکہ کا پہلا حاکم تھا ۱۷۳۲ء میں ورجینیا میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کی عمر نے سن کے دسویں سال میں قدم رکھا تھا کہ اُسکے باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ الغرض کہ اسکی ماں جو ایک پارسا اور محترم عورت تھی تنہا اُسکی تعلیم کی خبر گیراں رہگئی۔ ایک مرتبہ اس کی ماں سے پوچھا گیا "تمنے اپنے لڑکے کی تعلیم میں کونسا رستہ اختیار کیا ہے"۔ اسنے جواب دیا کہ "وہ رستہ جس سے اطاعت، ہوشیاری اور سچائی حاصل ہو" فی الحقیقت تعلیم کا یہ ایسا اچھا طریقہ ہے کہ جس سے سوائے عمدہ نتائج کے کوئی دوسری بات متصور ہوہی نہیں سکتی ہے۔

واشنگٹن آخر کو ایسا لڑکا ہوا جو نہ کبھی جھوٹ بولا اور نہ بول سکتا تھا۔ اُس کی ماں نے وہ تعلیم دی تھی جس سے اخلاق کے سادے مگر خالص قواعد مستحکم ہو کر اُس کے چال چلن کے ابتدائی اُصول میں گھُل مل گئے اور اس طرح اُسکی آیندہ رفتار زندگی پر ایک مضبوط اور قائم رہنے والا اثر پڑا۔

اس کی ماں نے ابتدا سے اسکو راست گوئی کی تعلیم دی تھی جسکا اثر یہ ہوا کہ وہ کبھی اپنی غلطی اور قصور کے اظہار اور اقرار کرنے میں پس و پیش نہ کرتا تھا۔ ایکمرتبہ وہ اپنے بچپن کی لاپروائی کے دام میں آکر اپنی ماں کا کوئی قابل لحاظ نقصان کر بیٹھا۔ لیکن حسب عادت اپنی ماں سے اصلی واقعہ کو کہدیا۔ جسپر اُس کی ماں نے نہایت ہی متانت اور خودداری

کے ساتھ آنکھوں میں آنسو لا کر کہا کہ "ایسا ہونا بہتر ہوا بہ نسبت اسکے کہ میرا بیٹا جھوٹ بولنے کے گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا"۔

اس کی شریف ماں نے اُسکو سادی زندگی بسر کرنے، سویرے اُٹھنے اور ہمیشہ مشغول بکار رہنے کے کبھی بیکار نہ رہنے کی خوبیاں بھی ذہن نشین کر دی تھیں۔ یہی بیش بہا چیزیں جنکو اُسنے زمانہ طفولیت میں اپنی ماں کی بدولت حاصل کی تھیں اُسکو کاروباری زندگی کے دربار میں بڑائی کے تخت پر بہادری وہر دلعزیزی کا جگمگاتا ہوا تاج پہنا کر لا کھڑا کرنے میں معین و مددگار بنیں۔

واشنگٹن نے جوان ہونے پر اپنے حرکات وسکنات سے ثابت کرکے دکھلا دیا کہ باوجود غریب پسر ہونے، باپ کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے انسان صرف ماں کی توجہ سے وہ اعلیٰ صفات حاصل کر سکتا ہے جو اسکو ممتاز بنا دینے کے لیے کافی ہیں۔ وہ محض اپنے نیک خصائل اور حُسن خدمات کی بدولت اعلیٰ اعلیٰ مراتب پر پہنچتا گیا اور نہایت نیکنامی اور شہرت کے ساتھ اپنی زندگی کے دنوں کو ختم کیا۔ وہ ملک اخلاق کا بادشاہ تھا اور تخت راستی کا تاجدار۔ نیکی کا مجسم پُتلا تھا اور دل وزبان کو مطابقت کا عملی جامہ پہنا کر اُن پر فرماں روائی کرنے والا۔ یہ خوبیاں اُس میں کیونکر آئیں؟ جس ماں کی گود میں پلا اور سایۂ عاطفت میں بڑھا۔ اُسی کی تربیت ونگہداشت کا سب کچھ ثمرہ تھا اور اُسکو صرف اُسی ایک ماں کا ممنون احسان ہونا پڑا۔ ماں ہو تو ایسی ہو۔ پھر بیٹے کا نام آور ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔

"ابوالکمال دیسنوی"

انگریزی خواتین کی مردانہ وار حرکتیں

ذرائع آمد و رفت کی وسعت سے فاصلہ و مباینت کالمعدوم ہوتے جاتے ہیں اور

مہذب دُنیا کے دور دراز ممالک میں ایک قسم کا اتحاد پیدا ہوتا جاتا ہے۔ جس طرح علوم طبیعات کی ترقی سے جسمانی حالت میں ایک تغیر عظیم واقع ہوا ہے۔ اسی طرح علمی اشاعت کی ارزانی اور تبادلۂ خیالات کے عام ہونے کی وجہ سے کیا مرد کیا عورت سب میں ایک ہی جنس کی خواہشیں اور ایک ہی نوع کی آرزوئیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

جو اُمنگیں مردوں میں ہوا کرتی تھیں وہی عورتوں میں جوش زن ہونے لگی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دلی دماغی اور نیز جسمانی خلقت دونوں کی واحد ہے۔ ظاہرا جو فرق معلوم ہوتا ہے اور فی الواقع قدیم تاریخ اور موجودہ تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان بیّن فرق ہے اسکا باعث یہ ہے کہ صدہا سال سے عورتوں کی نازک طرز رہائش نے ضعف اور کمزوری آہستہ آہستہ بڑھا دئیے گو اس موروثی تخلیق کے ازالہ کے لیے اور اصلی قویٰ بحال کرنے کے لیے اتنے ہی عرصے کی ضرورت ہے تاہم انگلستان کی خواتین نے گذشتہ ماہ سے عجب شور و غل مچا رکھا ہے اور ٹھیک اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ شورش کا کیا نتیجہ ہوگا۔

زمانہ حال کی روشنضمیری کو زیادہ تیز کرنے کے لیے تاریخی مثالیں موجود ہیں۔ نہ صرف دنیوی تواریخ بلکہ مذہبی کتابیں بہت سی نظیریں پیش کرتی ہیں جنسے خواہ مخواہ بھی تعلیم یافتہ مستورات کو تحریک ہوتی ہے کہ وہ مردوں کے ساتھ برابری کا دعویٰ کریں۔ اسوقت جبکہ حضرت سلیمانؑ کی شان و شوکت دہوم تمام دنیا میں مچی ہوئی تھی۔ سبا کی شہزادی بے کھٹکے آزادانہ حکومت کرتی تھی۔ ایک ملکہ کی عظمت کا اثر سکندر بادشاہ کے دل پر ایسا گہرا ہوا کہ وہ خود ایلچی بنکر اُسکے دربار میں گیا اور اگر ملکہ اولعزمی اور فراخ حوصلگی سے پیش نہ آتی تو قید کیا قتل بھی ہو جاتا تو کچھ تعجب نہیں اس ہولناک زمانہ میں جبکہ فرنگستان کے دو بڑے مذہبی فریق ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے ملکہ الزبتھ نے کسی مصلحت اور حسن تدبیری سے ان دونوں کو اتفاق اور اتحاد میں قائم رکھا۔ اسوقت جبکہ انگلستان کی حکومت دنیا کے اتنے حصوں میں نافذ ہوگئی جہاں آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا تو عنان حکومت ایک عورت کے ہاتھ میں تھی یعنی

ہماری ملکہ معظمہ وکٹوریہ مرحومہ کے۔

گزشتہ زمانے کی زبردست مستورات کے حال پر غور کرکے حال کی عورتوں کو ضرور خیال ہوتا ہے کہ وہ بھی ملکی اور تمدنی امورات میں شامل ہوں اور انکے متعلق جتنے قوانین اور مراسم ہیں انکی ترمیم و اصلاح کرنے میں مردوں کا ہاتھ بٹائیں۔ انگلستان میں ابھی تک عورتوں نے صرف اتنی آرزو ظاہر کی ہے کہ جو لوگ حکمرانی کے لیے منتخب ہوتے ہیں انکے انتخاب میں عورتوں کی بھی رائے لیجائے۔ چونکہ بہت سے منتخب کنندگان کی نسبت عورتیں زیادہ لائق اور زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اسلیے کیا وجہ ہے کہ امراؑ و وزراء کے تقرر میں عورتوں کو رائے زنی کا حق حاصل نہو۔ مذکورۂ ذیل بیان سے ظاہر ہوگا کہ انگلستان کی عورتیں اپنے لیے کیا کوشش کر رہی ہیں ایسے وقت میں جبکہ ہماری مستورات کو ان باتوں کا وہم و گمان بھی نہیں۔

تھوڑے عرصے سے انگلستان میں وزارت کی تبدیلی ہوئی ہے۔ قبل اسکے وزیر و امیر اس گروہ کے حامی تھے جو قدامت پسند کیے جاسکتے ہیں۔ اب وزراء و امراء علیحدہ گروہ کے آدمی ہیں اور انکے اُصول زیادہ تر جدید اُمور کا رواج دینا اور قدیم رسموں کی اصلاح کرنا ہیں۔ اس نئی حکومت کے قیام کو ابھی زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ چند مستورات نے آپسمیں ملکر مشورہ کیا کہ اب اپنے حقوق کے حاصل کرنیکا موقع ہے۔ کیونکہ پھر کب ایسی آزادی پسند وزارت ہوسکتی ہے جو ہمارے حالات پر توجہ کرے اور ہمیں ملکی معاملات میں دخل دینے کی اجازت دے۔

لورپول میں ایک مجلس منعقد ہوئی جسکے صدر وزیر اعظم سر ہنیری کیمبل بنیرمن تھے وہ ایک نہایت ضروری امر پر تقریر کر رہے تھے کہ ایک عورت نے باآواز بلند پوچھا کیا ہمارا بھی کچھ خیال ہے۔ جب کسی نے التفات نہ کی تو دو تین عورتیں اُٹھیں اور اونچی آواز سے کہا ہم نے مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ اپنے حق لیکر چھوڑینگے۔ جب اسپر بھی وزیر اعظم اپنی تقریر میں مشغول رہے تو بہت سی عورتوں نے چلانا شروع کیا۔ نوبت یہانتک پہنچی کہ وزیر اعظم نے سرزنش شروع کی کہ عورتیں جو اخلاق میں ہمیشہ سبقت لیجاتی رہی ہیں کیا اب

اس ذلت کو پہنچ گئی ہیں کہ اہم ملکی معاملات میں اس طرح خلل اندازی کریں۔ یہ کہکر وزیر اعظم نے اپنی تقریر دوبارہ شروع کی۔ چند لمحوں کے بعد عورتوں نے پھر آواز بلند کی کہ ہمیں پہلے ہماری حقوق یابی کا اطمینان دلائیے۔ اب تحمل کہاں ہو سکتا تھا۔ تمام عورتوں کو جو شور مچاتی تھیں یک لخت دھکے دیکر باہر نکالدیا۔ بیچاری شکایت و فریاد کو سینہ پر رکھکر واپس آئیں جب یہ تجویز کارگر نہوئی تو کچھ عرصے تک جمع ہو کر اور تدابیر سوچتی رہیں۔ مستورات کی ایک ملکی اور معاشرتی انجمن ہے جسمیں سب اکٹھی ہوا کرتی تھیں۔ آخر ش اسمیں یہ صلاح قرار پائی کہ وزیر اعظم کے مکان پر یا دفتر میں جاکر درخواست کیجائے۔ چنانچہ چالیس پچاس عورتیں ایک دن سرکاری دفتر کی طرف روانہ ہوئیں۔ اور چپراسی سے کہا کہ وزیر صاحب کی خدمت میں عورتوں کے آنے کی اطلاع کردو مگر اُسنے چھوٹتے ہی جواب دیا کہ وہ پارلیمنٹ کے کسی کام میں سخت مصروف ہیں اور اُنکو ذرا بھی فرصت نہیں۔ جب باہر شور ہوا تو ایک ملازم اندر سے آیا اور عورتوں کی بھیڑ دیکھکر دروازہ بند کر کے لوٹ گیا۔ ابتو سبنے ملکر شور مچانا شروع کیا۔ اس مجمع میں تین خاتونیں سب سے زیادہ سرگرم تھیں۔ ان میں سے مس آئرن ملرنے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ گو انجیل میں ارشاد ہے کہ کھٹکھٹاؤ اور تمہارے لیے کھولا جائیگا مگر باوجود خوب زور سے کھٹکھٹانے کے بھی کسی نے پروانہ کی بلکہ اُلٹی پولیس کو اطلاع کی گئی اور اُنھوں نے مس آئرن ملر کو گرفتار کر لیا۔ اسپر دوسری سربرآوردہ خاتون بنام مس ڈرمنڈ فوراً سرہنری وزیر اعظم کی موٹر گاڑی پر جو سامنے کھڑی تھی چڑھ گئی اور نہایت موثر آواز سے باقی ماندہ مستورات کو خطاب کرنا شروع کیا اور علانیہ سب کو بتا دیا کہ ہمیں اپنے ارادہ پر مستقل رہنا چاہیے اور جبتک ہم دل وجان سے متواتر بلا خوف سعی نہ کرینگے کامیابی محال ہے اس کی تقریر کا اثر یہ ہوا کہ مس کینی نے پھر دروازہ کھٹکھٹانا شروع کیا۔ مگر بیچاریوں کی شامت پولیس پھر آموجود ہوئی اور مس ڈرامند مس کین اور سب عورتوں کو تھانے میں لیجاکر حوالات میں بند کر دیا۔

انگلستان میں پولیس ایک نہایت شائستہ اور شائستگی قائم رکھنے والا محکمہ ہی لوگ علاوہ خوف کرنیکے اس طبقہ کے ملازموں کی عزت کرتے ہیں۔ برخلاف اسکے ہندستان میں لوگ پولیس سے ڈرتے تو بہت ہیں مگر دل سے کوئی انہیں پسند نہیں کرتا کیونکہ بوجہ جہالت اور بعض اوقات رذالت کے پولیس اپنے رعب کا ناجائز فائدہ اُٹھانے سے نہیں چوکتی۔ اسلیے درست کہا گیا ہے کہ پولیس انگلستان کے لیے تو برکت ہی اور باعث رحمت ہی۔ مگر ہندوستان کے لیے لعنت اور موجب زحمت ہی۔

الغرض پولیس نے قریبًا ایک گھنٹہ تک انگلش خواتین کو بند رکھا اس اثنا میں وہ افسرون سے دریافت کرتی تھیں کہ کس جرم کی سزا میں وہ پکڑی گئی ہیں مگر خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ ملتا تھا۔ درحال وزیر اعظم کی ہدایت کے مطابق وہ تھوڑی دیر کے لیے محبوس کی گئی تھیں۔ آخر کار وزیر اعظم نے اُن کی خلاصی کا حکم صادر کیا اور نیز یہ بھی فرمایا کہ ان کی درخواستوں پر توجہ کیجائیگی۔ مگر یہ جواب کافی تشفی بخش نہ تھا۔ کیونکہ پہلے اُنھوں نے ایک دو عریضے وزیر اعظم کے نام لکھے تھے اور اُن کا جواب تک نہ ملا تھا۔ اب مایوسی کے سوا طیش و غضب میں ہوئیں کہ شریف گھرانوں کی عورتیں یوں سربازار گرفتاری کی حالت میں کوتوالی تک بھیجی جائیں۔ اُنھوں نے پارلیمنٹ میں شکایت دائر کی ہی اور وزیر اعظم سے اپنی بے عزتی کا جواب طلب کیا ہی چند ممبروں نے ذمہ لیا ہے کہ انعقاد پارلیمنٹ پر پرسش کریں اور خاطر خواہ جواب حاصل کریں۔

گمان غالب کسی طرف نہیں ہو سکتا آیا مستورات کو انگلستان میں رائے زنی کا حق نصیب ہوگا یا نہیں تاہم اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ابھی انگلستان بھی اس اعلیٰ پایہ کو نہیں پہنچا کہ عورتیں اور مرد مطلق مساوات میں ہو جائیں۔ موجودہ مدبران ملک گو آزادی خیال اور آزادی افعال کے پتلے ہیں مگر تشویش میں ڈالنے والا امر یہ ہی کہ اگر عورتوں نے ملکی معاملات میں قدم رکھا تو خانگی امورات کی کون خبر لیگا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت

کی اصلی بنا مائیں ہی ہیں اور اگر وہ دیگر کاموں میں مصروف ہوئیں تو بنیاد کی کمزوری سے قومی عمارت کے مخدوش ہونیکا خطرہ ہے۔ عورتوں کا یہ اعتراض ہے کہ کیا وجہ ہے کہ گھر بار کے کام کاج کا بوجھ تو اُنکے سر پر ڈالدیا جاے اور مرد اس سے بری رہیں۔ علاوہ ازیں کیا مرد کچہریوں دفتروں کارخانوں اور زمینوں وغیرہ میں کام نہیں کرتے اور پھر بھی قومی اور ملکی مہمات میں حصہ لیتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے سیکڑوں ممبر مختلف پیشوں میں مشغول ہیں اور اپنی فراغت کو ملکی امور میں صرف کرتے ہیں۔ اسی طرح عورتیں بال بچوں کا فکر کرینگی ان کی تعلیم وغیرہ کا سامان مہیا کرینگی اور فرصت کو قوم کے لیے وقف کرینگی۔ کیا جب عورتوں کو مدبرانہ لیاقت حاصل ہوگی تو وہ اپنے بچوں کو بچپن ہی اس کی تعلیم نہ کرسکینگی۔ یہ تو ہے حالت یورپ کی مستورات کی مگر ہمارے یہاں ابھی تعلیم ہی سے نفرت ہے۔ گو ہم یورپ کی بلا سوچے سمجھے تقلید کرنا پسند نہیں کرتے تاہم جو باتیں اُنکی عورتوں کی عظمت کا سبب ہوئی ہیں ان پر عمل کرنے سے کیوں تامل کریں۔ ہماری اپنی مثالیں ذیوقار اور مدبر عورتوں کی موجود ہیں کیا عائشہؓ کی ملکی اور قومی تدابیر مردوں سے کچھ کم قابلیت ظاہر کرتی ہیں۔

مہدی حسین
طالبعلم کالج علی گڑھ

اڈیٹوریل

ایک دردناک آواز

بعض شوہر جبروت اور سطوت خداوندی سے ایسے غافل اور صرف اپنے عیش وآرام کے خواہاں۔ خود غرض حقوق ناآشنا ہوتے ہیں کہ اُن نازک دلوں کو جو اُن کی محبت میں مخمور، اور اُن کی اُلفت میں چور ہوتے ہیں اپنی جہالت اور ناقدری سے

ایسا صدمہ پہنچاتے ہیں کہ وہ پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اُنکے سخت دل میں جسکو سنگ آہن سے بھی زیادہ کوئی خطاب دینا چاہیے مطلق دوسرے دل کے درد کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کی تکلیف کو تکلیف نہیں سمجھتے۔ مگر اُن کو یاد رکھنا چاہیے کہ اُن کی اس غفلت کی سزا وہ خدا جو کبھی غافل نہیں ہوتا بُری طرح دیگا۔ وہ اپنی پاداش کو پہنچینگے۔ اور وہ پچھتائیں گے۔ کیا ان برتاؤں کے بعد بھی پُرانے رسم ورواج کا بندہ خود غرض۔ غاصب حقوق۔ ظلم پسند گروہ ہم سے اس بات کے کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ تم عورتوں کو تعلیم مت دو۔ اُن کو اُنکے حقوق دلانیکی کوشش نہ کرو۔

کیا وہ نازک دل جسکا خمیر محبت اور صرف محبت ہی اُس کی قدردانی یہی ہی کہ جس طرح چاہو اُسکو ستاؤ۔

آہ۔ یہ درد انگیز آواز آسمانوں کو توڑیگی۔ خدا کے عرش کو ہلادیگی۔ خدا کے سوتے غصّے کو جگادے گی۔

ہم اس آواز کو جو گمنام ہمارے پاس لکھنؤ سے آئی ہی بجنسہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ کہ ناظرین دیکھیں اور سُنیں۔ سوچیں اور سمجھیں کہ یہ بیتابانہ آہ باوجود اسکے کہ بہت ضبط لب فغاں پر ہی کسقدر پُر درد اور پُرتاثیر ہے۔

اڈیٹر

کون حالِ دلِ ناشاد سُنے
بیکسوں کی تو ہی فریاد سُنے

ہندوستان کی بیویاں جو ہر طرح شوہروں کے اختیار میں ہیں اور جنکو دنیا کی بیجا رسم ورواج کی پابندیوں نے اُنکے ہاتھوں میں مُردہ بدست زندہ کر رکھا ہی اگر اپنے کسی ہمدرد کے پاس بیٹھکر دل کے درد کی کچھ داستان بیان کریں تو اُنسے بھی یہی جواب ملتا ہے۔ بہتیا صبر کرو۔ اور اپنے دل کو قابو میں رکھو۔ رونے اور رنج کرنیسے

سوا اسکے کہ تمہاری تندرستی خراب ہو اور کیا فائدہ۔ تمہاری ہم عمریں کیسی تندرست ہیں۔ ایک تم ہو کہ ابھی سے بڑھیا معلوم ہوتی ہو۔ یہ رنج کی خوبیاں ہیں۔ کیوں اپنے دل اور جان کو تباہ کرتی ہو جس کی رات دن تم تسبیح پڑھتی ہو اور جسکے پیچھے دنیا کو چھوڑکر گوشہ نشینی اختیار کی ہے کچھ اُسکو بھی تمہاری پرواہ ہے۔ دیکھو وہ کیسا خوش رہتا ہے۔ اُسکو تمہارے غم کا اتنا بھی خیال نہیں جتنا ایک ہمسایہ کا ہوتا ہے۔ تم ہو کہ اپنی زندگی سے بیزار ہو کہ کبھی کسی خوشی کے جلسے میں بھی تم کو خوش نہ پایا۔ یہ جانتے ہیں کہ تمہارا رنج بے وجہ نہیں ہے لیکن کیا کریں بیٹی مجبور ہیں۔ دنیا کے دستور اور مذہبی پابندی سے دم مارنے کی جگہہ نہیں ہے۔ بٹیا شریفوں کی بہو بیٹیوں کو سوا اسکے کہ صبر کریں اور کیا علاج ہے۔ یوں ہی ہوتی آئی ہے اور ہوگی۔ شوہر کی تابعداری ہر حال میں واجب ہے۔ خوش رہو اور خوش رکھو۔ اُسکے بھلے اور بُرے کسی فعل سے کچھ سروکار مت رکھو۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ اپنے دل کو سمجھاؤ اور ہرگز اپنا رنج اُسپر ظاہر مت ہونے دو اگر کہیں تمہارا یہ غم اُسکے خلاف گذرا تو اور بھی خرابی ہوگی پھر وہی مثل ہوگی کہ دونوں دین سے گئے پانڈے دنیا ہی نہ رام

اے اللہ وہ دل جو ٹوٹے ہوئے شیشہ کے ٹکڑوں کی طرح ایک تھیلی میں بھرا ہے اور پژمردہ ہو رہا ہے اُسکو تو ہی جوڑ اور شگفتہ کر۔ تجھے خوب روشن ہے کہ میرا دل میرے اختیار سے باہر ہوگیا ہے۔ میری ساری خوشیاں اس دل نے چھین لی ہیں۔ مجھے شادی اور خوشی کے موقعوں پر بھی وہ چٹکیاں لیکر بے چین کر دیتا ہے۔

اے دل تونے میری ساری مسرتیں تہِ خاک کر دیں ہائے کیونکر تجھے پہلو سے نکالکر پھینکوں۔ اے دل تیرے اس سلوک کا جو تونے میری آنکھوں اور تندرستی کے ساتھ کیا ہے عوض یہی ہے کہ غم کا گھن تجکو چاٹ جائے۔

یا اللہ میرے گناہ معاف کر اور بزرگوں کی نصیحت پر عمل کرنے کی

پوری توفیق عطا کر آمین۔

اس سے پیشتر ہم نے زہرا خانم صاحبہ اور مس عطیہ فیضی صاحبہ کی نانی صاحبہ کے انتقال کی خبر شایع کی تھی لیکن ہم اپنے ناظرات خاتون کو اُن کے مختصر حالات سے بھی آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ مرحومہ ایک ایسی بیوی تھیں کہ جنھوں نے اپنے شوہر اور عزیزوں کی مختلف اصلاحی کوششوں میں مدد کی اور جس کی وجہ سے طیب جی اور فیضی خاندان آجکل مسلمانوں میں بطور نمونہ و مثال کے پیش کیے جاتے ہیں۔ لباس کی اصلاح جو اُنکے خاندان میں ہوئی ہے اُس کی بڑی مدد و معاون یہی بیوی تھیں۔ اپنے نیک برتاؤ۔ اور فیاضی سے اُنھوں نے اپنے گروہ کے لوگوں پر ایسا اثر ڈالا تھا کہ سب لوگ اُنکے ساتھ ہر اصلاح میں شریک اور شامل ہو جاتے تھے اور بالخصوص اس گروہ کی تمام بیویاں اُن کی کسی بات سے باہر نہ تھیں۔ فطرتاً نہایت نیک اور ملنسار تھیں۔ گجراتی اُردو کے علاوہ فارسی بھی جانتی تھیں۔ آجکل ہماری علم دوست بہنیں عطیہ فیضی اور زہرا فیضی جس ہمدردی سے اپنی بہنوں کی تعلیم کے لیے کوشش کر رہی ہیں وہ زیادہ تر مرحومہ ہی کی مثال اور اثر کا نتیجہ ہے۔ موصوفہ کی زندگی ہمارے اس خیال کی پوری تائید کرتی ہے کہ جس قدر خاندان پر عمدہ اور اعلےٰ اثر ایک قابل اور تعلیم یافتہ روشن خیال بی بی کا پڑ سکتا ہے ویسا ایک مرد کا نہیں پڑ سکتا۔

حال میں ہمارے دوست مولوی حسن نظامی صاحب مہتمم توشہ خانہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیائے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں ایک لیکچر دیا جسکا عنوان یہ ہے " ایکو برہم دوتیا ناستی" جسکے معنی وہ کہتے ہیں کہ لاالہ الا اللہ وحدہ لاشریک کے ہیں۔ ہم کو سنسکرت کے ان الفاظ کے وہ معنی قرار دینے میں

قائل ہے جو ہمارے دوست نے قرار دیے ہیں۔ در اصل سنسکرت کے یہ الفاظ اُس وحدانیت سے متعلق نہیں ہیں جس کی تعلیم قرآن نے کی ہے۔ بلکہ وہ وحدانیت مراد ہے جسکو صوفی لوگ وحدت الوجود یا دوسرے لفظوں میں ہمہ اوست سے تعبیر کرتے ہیں ان الفاظ کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ایک خالق ہے اور سوا اُسکے کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک ویدانت کا مسئلہ ہے۔ اور اسلام میں بھی صوفیہ کرام کا ایک گروہ اس مسئلہ کو مانتا ہے ہمارے دوست نے رامچندر جی اور کرشن جی کو جو ہندوؤں میں اوتار مانے جاتے ہیں نبی اور پیغمبر ثابت کیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی قوم میں نبی اور پیغمبر رہے ہوں اور ہماری قرآنی تعلیم ہم کو ہدایت کرتی ہے کہ ہم نبیوں اور پیغمبروں کی عزت کریں اور انکو مانیں کرشن جی کی گیتا اخلاقی تعلیم کے لیے ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی کتاب ہے کہ مسلمان بچوں کو اُسکے بعض حصے پڑھنے چاہییں۔ انسان کی بُری خواہشات اور نفسانیت کے لیے یہ کتاب بطور تازیانہ کے ہے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ہم یہ بھی فخر کرتے ہیں کہ ہمارے قرآن کی تعلیم نے ہم کو کسی دوسری کتاب کا محتاج نہیں رکھا ہے لیکن دوسرے مذاہب کی اخلاقی کتابیں بھی ہمارے لیے مفید ہیں کیونکہ اچھی باتیں جہاں سے اور جس ذریعے سے ملیں ان کو لینا چاہیے۔ اپنے اس لکچر کو مولوی حسن نظامی صاحب نے رسالہ کی صورت میں چھپوا دیا ہے جو دفتر مخزن لاہور سے مل سکتا ہے۔

ہمیں اس بات کے سننے سے سخت رنج ہوا اور ہمارے ناظرین بھی اسکو سنکر اس رنج میں ہمارے ساتھ شریک ہونگے کہ مسٹر نیاز احمد صاحب میرٹھی نے بعارضۂ طاعون بمقام بنارس انتقال کیا۔ مرحوم ایک نہایت قابل و پرجوش نوجوان تھے۔ قومی کاموں میں صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ عملاً حصہ لیتے تھے۔ صیغہ اصلاح تمدن کے بڑے حامی و مددگار تھے اور ڈیڑھ سال سے زنانہ نارمل اسکول علیگڑھ کے لیے اپنی اہلیہ صاحبہ کی

معرفت وظائف فنڈ کے لیے ایک الگ چندہ جمع کر رہے تھے۔ جس میں سے قریب چونسٹھ روپیہ کے ہمارے پاس پہنچ چکے ہیں اور تقریباً آٹھ سو روپیہ کسی بنک میں منیجر کی معرفت جمع ہیں۔ ہم کو مرحوم کی اہلیہ صاحبہ اور دیگر عزیز و اقارب سے دلی ہمدردی ہے خدا اُن کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو بخشدے۔

سوسائٹی کی اصلاح صرف سوسائٹی کے سربرآوردہ اشخاص اور سرداروں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ ہماری قوم میں بھی جب تک اونچے درجے کے بزرگان قوم اصلاح کی طرف متوجہ ہونگے اسوقت تک ہماری تقریریں ہمارے رسالہ جات اور اخبارات کی اشاعت اور دیگر قسم کی ساری کوششیں رائیگاں جائینگی۔ شروع اپریل میں ہمارے صوبہ اور اودھ کے دو خاندانوں نے عملاً رسوم شادی کی اصلاح کر کے دکھلائی ہے۔ اور ہم کو امید ہے کہ یہ دو مثالیں آیندہ کم از کم تعلیم یافتہ گروہ کے لیے قابل تقلید نظیریں ہوں گی سید محمد علی صاحب جج مرزاپور جو سر سید مرحوم کے قریبی عزیزوں میں ہیں اُنھوں نے اپنی دو صاحبزادیوں کا نکاح ایک ہی تاریخ میں کیا۔ بڑی صاحبزادی فاطمہ محمدی صاحبہ کی شادی راجہ نوشاد علیخانصاحب رئیس اعظم جہانگیرآباد ملک اودھ کے ساتھ اور دوسری صاحبزادی ہاجرہ محمدی کی شادی مرزا محمد سعید صاحب ایم۔اے۔ کے ساتھ کردی۔ یہ شادیاں ایسے سادہ طریقہ سے ہوئی ہیں کہ آجتک ہم نے نہ سُنا اور نہ دیکھا۔ نہ برادری کی عورتیں جمع ہوئیں نہ کوئی بڑی بارات گئی۔ نہ کچھ دھوم دھام ہوئی۔ چند دوستوں کو بلاکر اسلامی طریقے سے نکاح پڑھا دیا گیا۔ پھر اُن سب دوستوں نے ملکر ایک جگہ کھانا کھایا اور ہنسی خوشی دُلہنوں کو رخصت کیا۔

اسی طور پر فیض آباد کے ایک معزز خاندان کی دو بہنوں کی شادیاں ایک ہی دن میں ہوئیں ایک مسٹر شاہد حسین صاحب بیرسٹرایٹ لا تعلقہ دار گدیہ کے ساتھ اور دوسری بہن کی شادی حبیب اللہ صاحب ڈپٹی کلکٹر منیجر ریاست محمود آباد کے ساتھ ہوئی۔ ان دونوں نکاحوں میں بھی وہی اسلامی مہذب

سادگی ملحوظ رکھی گئی جسکا ہم نے اوپر ذکر کیا۔ ان سب تقریبات میں فریقین کے خاندان اور اُنکی مالی حالت ایسی تھی کہ وہ تمام فضول رسمیات کو بڑے صرف سے ادا کر سکتے تھے۔ اور اس صرف سے غالباً اُن کی مالی حالت پر کوئی بڑا اثر نہیں پڑ سکتا تھا۔ لیکن ان روشن خیال بزرگوں نے دنیا کے رسمی نام و نمود کی کچھ پروا نہ کی۔ ہم انکے اخلاقی جرأت کی تعریف کرتے ہیں اور اُن کی اعلیٰ مثال کو قوم کے لیے نیک فال سمجھتے ہیں۔

ہم افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتے ہیں کہ شروع اپریل سے بوجہ شدت طاعون زنانہ نارمل اسکول بند ہے۔ کہار جو لڑکیوں کو لاتے تھے اُن میں ایک کو طاعون ہوا اور اُسکے بعد چند لڑکیوں کے گھروں میں طاعون پھیلا تو ہم مجبور ہو گئے اور آخر مدرسہ بند کر دیا۔ اسوقت تک طاعون کی وہی حالت ہے اور مدرسہ اُسوقت تک بدستور بند رہیگا جبتک کہ شہر اس آفت سے نجات نہ پا جائے۔

ہم نہایت خوشی کے ساتھ اپنے ناظرین کو اطلاع دیتے ہیں کہ ایم اے او کالج کی کل شورش رفع ہو گئی۔ سب لڑکے واپس آ گئے۔ اُستادوں اور شاگردوں میں قدیم تعلقات پھر قائم ہو گئے۔ اور ہمارے طلبار کی سعادتمندی سے ہمیں پوری توقع ہے کہ آیندہ اس قسم کے ناگوار واقعات نہ پیش آئینگے۔

اسوقت تک ہمکو کالج کے معاملات میں اُلجھن کیوجہ سے نصاب تعلیم نسواں کی طرف توجہ کرنیکا موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن اب ہم اس کام کو فوراً شروع کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ناظرین نصاب کے متعلق جو کچھ اپنے خیالات رکھتے ہوں اُس سے ہمیں مطلع فرمائینگے۔ آیندہ پرچے میں ہم نصاب کی ایک مفصل اسکیم چھاپینگے اور اُس سے پیشتر ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین میں سے جو صاحب نصاب کے بارے میں کوئی خاص رائے رکھتے ہوں اُس سے ہمکو مطلع کریں تاکہ اسکیم میں اُنکی رائے کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے اور اُسپر اچھی طرح غور کر لیا جائے۔

ہم نارمل اسکول کے لیے چندہ کی فراہمی کے لیے بہت جلد چند ڈپوٹیشن بھیجنے والے ہیں کیا ہمارے ناظرین میں سے کوئی صاحب یا کوئی خاتون ایسی ہیں جو امسال چندہ کی فراہمی میں ہمکو امداد دینے کیلئے پورے طور پر آمادہ و مستعد ہوں۔ ہم نہایت ممنون ہونگے اگر اس بارے میں وہ ہم سے خط و کتابت کریں۔

اعلان چندہ جو معزز خاتون ہم کو علاوہ یکمشت ہزار روپیے کے پندرہ روپیہ ماہوار دیتی رہی ہیں اُنھوں نے حال ہیں مبلغ پندرہ روپیے کی ایک رقم بھیجی ہے۔ بیگم صاحبہ کی فیاضی کا شکر کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا۔

اعلان نمبر۲۔ ہز ہائنس جناب نواب صاحب جنجرہ کی خالہ صاحبہ کا انتقال ہوگیا اُسپر جناب ہز ہائنس نے سو روپیہ اُن کی یادگار میں نارمل اسکول کو عطا فرمایا۔ مرحومہ کو خدا جنت عطا فرمائے۔ اور نواب صاحب موصوف کے ہم تہ دل سے ممنون ہیں۔

ہمارا ملک اسوقت بڑی مصیبت میں مبتلا ہے۔ ہر مہینے میں لاکھوں آدمی طاعون کی نذر ہو جاتے ہیں۔ خاندانوں کے خاندان اور گھرانوں کے گھرانے برباد ہو گئے۔ عورتیں بیوہ اور بچے یتیم اور مرد بے سر و ساماں ہو گئے۔ تعلیم۔ تجارت اور تمام کاروبار تقریباً بند پڑے ہیں۔ ادہر بیوقت کی بارش۔ اولے اور مینھ نے فصل کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ خدا آئندہ کوئی بہتری کی صورت کرے ورنہ قحط کے پورے آثار نظر آرہے ہیں۔ مشیّت ایزدی سے کسی کو مفر نہیں اور نہ کوئی چارہ ہے۔ بندوں کے لیے صرف صبر کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور ہمارے نزدیک صبر سے بہتر دل کو تسکین دینے والی اور کوئی چیز نہیں ہے۔ مصیبت زدہ خاندانوں سے ہم کو ہمدردی ہے۔ اور خدا سے امید کیجاتی ہے کہ وہ جلد اس مصیبت کو ہمارے ملک سے دُور کرے۔

ریویو

نصیحت کے کرن پھول

سعیدہ ایک شریف عقلمند ایرانی مرزا کی بیٹی ہے جسنے ہندوستان میں شادی کی تھی باپ تنہا چھوڑکے اُسکو چین کے سفر کے لیے جاتا ہی۔ سعیدہ کی ماں پریشان ہوتی ہی کہ میں اکیلے ہندوستان میں کیونکر زندگی بسر کروں گی۔ بیٹا بھی ہوتا تو تسکین ہوتی۔ مرزا سمجھاتا ہی کہ یہ تمھاری ہونہار بیٹی۔ بیٹے سے کم نہیں ہی۔ تم اسی کو تعلیم دو۔ یہ وہی کام کرسکتی ہی جو بیٹا کرتا ہی۔ بہزار مشکل پرانے خیال کی ماں تعلیم پر مستعد ہوتی ہی۔ مرزا ایک مغلانی کو اُسکی اُستانی مقرر کرتا ہی۔ اور چین کا رستہ لیتا ہی۔ سعیدہ پڑہتی ہی۔ پھر باپ سے اُسکی خط وکتابت ہوتی ہی جس میں باپ دریا۔ جہاز۔ ریل اور ملک چین کی دلچسپ اور مفید معلومات اپنی پیاری بیٹی کو لکھتا ہے۔ وہاں سے واپس آنے پر وہ دیکھتا ہے کہ اُسکی تعلیم یافتہ بیٹی ہر طبقہ کی عورتوں میں نہایت عزت سے دیکھی جاتی ہی۔ اور ایک بڑے بھاری جاگیردار اُسکے سلیقہ اور علمیت کی تعریف سُنکر اپنے بیٹے کے لیے اُسکی منگنی کرتے ہیں اور پھر سعیدہ کی شادی ہو جاتی ہی۔ اور وہ عزت وآرام کی زندگی بسر کرتی ہی۔

یہ دلچسپ قصہ اس کتاب میں نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہی جسکا نام ہم نے اوپر لکھا ہی۔ یہ کتاب ہندوستان کے سب سے بہتر اور اعلیٰ درجے کے اُردو نگار اور مصنف شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی تصنیف ہے۔ جو غالباً اُنھوں نے ۱۸۶۴ء میں لکھی تھی۔ اب اُنکے لائق بیٹے سید محمد ابراہیم صاحب نے پہلی بار اُسکو چھپوایا ہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہی کہ جو کام آج ہم کر رہے ہیں ہندوستان قوم کو اسکی ضرورت آج سے ۴۰۔۵۰ سال پہلے محسوس ہو چکی تھی۔ اس کتاب کی عبارت نہایت سادہ اور صاف ہے۔ اور قیمت ۲/ ہی۔ یہ کتاب اور نیز شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی تمام تصنیفات خلیفہ محمد سالم صاحب منیجر آزاد بک ڈپو۔ اکبری منڈی لاہور سے مل سکتی ہیں۔

لیجیے ابتو حد ہوگئی

اُردو علم اَدب کے بہترین و مشہور رسالہ

مخزن کی تیسری قسم

۱۵۔ دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء سے ہوبہو اسی تقطیع۔ ضخامت ۶۴ صفحہ۔ لکھائی چھپائی اور اُنھیں
مضامین کے ساتھ شائع ہوگی۔ اور باوجود ان خوبیوں کے چندہ صرف

ایک روپیہ سال بھر کے لیے

(۶؍ محصولڈاک)

اس سے زیادہ اب اور کیا ارزانی ہوسکتی ہے۔ اب تو گویا

موتی کوڑیوں کے مول ہیں

ہم یہ چاہتے ہیں کہ کسی بامذاق شخص کا ہاتھ اس بیبہا اور دلاویز گلدستے سے خالی نہ رہے
اگر اسوقت بھی شائقین اُردو نے اس رعایت سے فائدہ نہ اٹھایا تو افسوس ہوگا

درخواستیں بنام (مینیجر مخزن لاہور) ہوں۔

مخزن کے ہر نئے خریدار کو انتخاب مخزن بجائے ۱۲؍ کے صرف ۱۰؍ (مع محصول) میں دیا جاتا ہے۔
چندہ قسم اول ۳؍ قسم دوم ۱۲؍

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علیگڑہ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اسکی سالانہ قیمت (عہ/) اور ششماہی عہ/ ہے

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہے یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑہی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جبتک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی اُمید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہورہے ہیں اُس کی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہینگے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ و اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑہنے کی اُنکو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اس بڑے لطف کے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبانمیں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالے کی مدد کرنیکے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہے اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائیگا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علیگڑہ ہونی چاہیے۔

دروغ گوئی

ایک حکیم کا قول تھا کہ مجھ میں جو عیب چاہو نکالو میں کسی سے رنجیدہ نہ ہونگا لیکن مجھکو جھوٹا نہ کہو

جھوٹ اگر دنیا میں نہ ہوتا تو لاکھوں رنج و غم نہ ہوتے نہ حکومت ہوتی نہ جنگ ہوتی ۔ بنی نوع انسان کی تمام مصیبتوں کی جڑ جھوٹ پر ہے۔ جھوٹ کو گو غلطی سے انسان اپنے لیے بعض وقت مفید خیال کرے لیکن وہ ایسا ہی ہوگا جیسے ایک ناداں بچہ خوبصورت زہریلے سانپ سے کھیلنے لگے۔

اُس نازک اور لطیف تعلق کو جو زبان کو دل کے ساتھ اور دل کو زبان کے ساتھ ہے۔ اُس ربط معنوی کو جو روح کو خدا کے ساتھ اور خدا کو روح کے ساتھ ہے۔ اگر کوئی چیز دنیا میں منقطع کرنے والی ہے تو جھوٹ ہے۔

پیشانی پر غلامی کا داغ لگایا جانا بہتر ہے۔ کیونکہ وہ ایک جابر ہاتھ کی دی ہوئی ذلت ہے مگر وہ داغ جو دروغگوئی کا کسی پر لگتا ہے وہ ایک احمقانہ ذلت کا داغ ہے جسکو انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی پیشانی پر لگاتا ہے۔

اڈیٹر

ذکر ہے کہ فارس میں کوئی نواب رہتا تھا جو نہایت متقی پرہیزگار اور عقلمند شخص تھا لیکن بدقسمتی سے اُسکا غلام ایک نہایت درجے کا دروغ گو شخص تھا یہ شخص ہمیشہ اپنے کارناموں کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ اُسنے ایسے ایسے ملک دیکھے تھے جو سُننے والوں کے کبھی خواب میں بھی نہ آئے تھے ایک دن نواب نے اُس شخص کو گھوڑے پر اپنے ساتھ چلنے کو کہا یہ غلام ایک گھوڑے پر سوار ہو فوراً ساتھ ہو لیا۔ نواب اور اُسکا غلام ایک جنگل میں سے گذر رہے تھے کہ اُن کی نظر ایک بہت موٹی تازی لومڑی پر پڑی نواب بولا " ایسی بڑی لومڑی میں نے اپنی عمر میں کبھی نہیں دیکھی" غلام " او ہو آپ کو اس کی موٹائی دیکھکر تعجب ہوا۔ میں ایک ملک میں تھا جہاں کی لومڑیاں یہاں کی بھینسوں کی برابر تھیں" نواب کو اس جھوٹ پر غصہ تو بہت آیا مگر اُسوقت غلام سے کچھ نہ کہا۔ جاتے جاتے نواب نے ٹھنڈے ٹھنڈے سانس بھرنے شروع کیے اور بہت غمگین صورت بنالی۔ غلام نے رنج کی وجہ دریافت کی تو نواب نے ایک ٹھنڈا سانس بھر کر کہا " خدا کرے کہ ہم میں سے کسی نے آج جھوٹ نہ بولا ہو۔ آج ہم میں سے جسنے جھوٹ بولا ہوگا وہ زندہ نہ بچیگا" غلام نے جب یہ وحشتناک لفظ سُنے اور اپنے مالک کو غمگین صورت دیکھا تو بہت گھبرایا اور نواب سے اس کی تشریح پوچھی نواب نے کہا " اچھا سُن آج ہم لوگوں کو بہت دور جانا ہے اور ہمارے رستہ میں ایک بڑا خطرناک نالہ ہے جسکے اوپر ایک بہت تنگ پُل ہے اُس نالے میں قدرت الٰہی سے یہ قدرت ہے کہ جو شخص جھوٹ بولکر اسپر سے گذرتا ہے اسکو پار پہنچنا نصیب نہیں ہوتا وہ رستہ ہی میں غرق ہوجاتا ہے" غلام یہ سُنکر دریائے غم میں غوطے کھانے لگا اور اپنے مالک سے بھی زیادہ لمبے لمبے سانس بھرنے لگا۔ اتنے میں وہ ایک پایاب نالے پر پہنچے اُسکا پاٹ اتنا چھوٹا تھا کہ ایک ذرا سا لڑکا اُسے کود جاتا۔ تاہم در دغگو غلام کانپنے لگا اور ڈرتے ڈرتے پوچھا " کیا یہیں جھوٹے غرق ہوتے ہیں"

نواب نے جواب دیا " نہیں یہاں نہیں" مگر غلام کو کچھ تسلی نہ ہوئی اور بولا " میرے مہربان آقا مجھے خیال آتا ہے کہ تیرے غلام نے آج لومڑی کی بابت مبالغہ سے کام لیا تھا اُس ملک میں

لومڑیاں بہت موٹی ہوتی ہیں لیکن اچھی فربہ ہرن سے زیادہ نہیں ہوتیں۔ نواب نے تعجب کے لہجے میں کہا اُس لومڑی سے مجھے کیا مطلب چھوٹی ہوں یا بڑی مجھے کیا غرض تم اپنے گھوڑے کو تیز چلاؤ کہ آج ہمیں دور جانا ہے" اتنے میں ایک دوسرے نالے پر پہنچ گئے جو پہلے سے ذرا زوردار تھا۔ غلام بولا دوسرا دریا آیا آج سارے دن دریا ہی آتے رہیں گے۔ کیا یہی وہ نالہ ہے جس کی نسبت آپ نے کہا تھا۔ نواب نے جواب دیا" نہیں یہ نہیں"

غلام " بات یہ ہے کہ وہ لومڑیاں جنکا میں نے ذکر کیا تھا گائے کے بچھڑے سے بڑی تھیں" بڑی ہوں یا چھوٹی! اس فضول گفتگو سے مت دق کرو' تھوڑی دور نہ گئے تھے کہ ایک خاصہ بڑا دریا ملا جسپر ایک چھوٹا سا پُل بھی تھا۔ اور دریا بارش کی وجہ سے بہت زور شور سے بہ رہا تھا۔

" کیا یہی جھوٹوں کی جہنم ہے؟ لیکن اے میرے آقا آپ پر روشن رہے کہ وہ لومڑیاں ایک موٹی بھیڑ سے زیادہ بڑی نہ تھیں" نواب نے اسپر بہت ناراض ہوکر کہا کہ" یہ جھوٹوں کا قبرستان نہیں ہے تو کیوں اُن لومڑیوں کی فکر میں مرا جاتا ہے"۔

اب شام ہوگئی تھی اور بہت دور تک اُنھیں کوئی دریا وغیرہ نہ ملا۔ دروغگو غلام کی کچھ تسلی ہو چلی تھی کیونکہ اُن کا راستہ بہت پتھریلا ہوگیا تھوڑی دیر بعد غلام نے کچھ فاصلہ پر ایک کالا سیاہ نہایت زور شور سے بہتا ہوا دریا دیکھا جسپر ایک بہت تنگ سا پُل بھی تھا" ہائے شامتِ اعمال (غلام نہایت خوف زدہ ہوکر بولا)" یہ تو ضرور یہی وہ دریا ہوگا' بیشک یہی ہے" نواب نے جواب دیا۔

غلام بولا" میری جان مجھے عزیز ہے اور تو جانتا ہے کہ اگر یہ جاتی رہی تو میری بیوی نہایت غمگین ہوگی لہذا میں ایمانداری سے بیان کرتا ہوں کہ وہ لومڑیاں اُس لومڑی سے جو ہمنے وہاں دیکھی تھی زیادہ بڑی نہ تھیں" اسپر نواب نے قہقہہ لگایا اور اُس سے یوں مخاطب ہوا" اے بے ایمان شخص تجھے اپنی موت کا غم ہے اور کیا تیرے غم کا علاج نہیں کیا جھوٹ جو روح کو

فنا کرنا ہی موت سے بدتر نہیں جو صرف جسم کو ہی فنا کرتے ہی یہ دریا بھی ویسا ہی بے خطر ہے
جیسے پہلے تھے میں نے محض تجھے درست کرنے کے لیے یوں کہا تھا تو ہمیشہ اس دریا سے
شرم میں غرق رہے گا جب تک تو بہ کی تیری مدت نہ آے" نواب یہ لعنت و ملامت کر ہی رہا تھا
کہ وہ پل پر بخیریت گذر گئے تب اُس غلام نے پختہ قسم کھائی کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولونگا۔

مسنر حمید مرزا

ڈیرہ دون

اُستانی حمیدہ خاتون صاحبہ کی وفات

کل بتاریخ ۱۲۔ اپریل ۱۹۰۸ء کو میں بیٹھی ہوئی رسالہ "خاتون" دیکھ رہی تھی کہ یکایک ایک
دائی نے آکر یہ خبر دی کہ استانی اُٹھ گئیں۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ کہیں بیٹھی تھیں اُٹھ گئیں۔ مگر
مفصل پوچھنے سے معلوم ہوا کہ دنیا سے اُٹھ گئیں۔ مگر میرے دل کو یقین نہ آتا تھا۔ کیونکہ
چار روز قبل آکر ہمسے ملی تھیں بھلی چنگی تھیں ہمنے خاص دائی کو بھیجکر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ
وہ تو بیچ مچ دنیا سے سدھار گئیں۔ ہے ہے حمیدہ خاتون مرگییں۔ اے حمیدہ خاتون جو استانی
مقرر ہوئی تھیں۔ جو ایک بڑی لائقہ بیگم تھیں۔ افسوس صد افسوس پہلے تو طبیعت نے عجیب
عجیب پلٹا کھایا۔ ہزاروں شکوک پیدا ہوئے۔ کہ ایسی لائقہ بیگم۔ تندرست۔ نیک ارادہ۔
سلیم طبیعت دنیا سے اُٹھ جائے۔ مگر وہ کوئی ایسی خبر نہ تھی جو کسی طرح باور کیجاتی جب دل کو
پورے طور سے یقین دلا دیا گیا۔ تو نہ معلوم کیسے کیسے خیالات جمع ہوے۔ زندگی بُری معلوم
ہونے لگی۔ طبیعت اُداس ہوگئی۔ دل بیاکل ہوگیا اور یکایک زبان سے نکل گیا کہ ؎

انداز و دلفریبے وُہ دنیا ہزار ظرف ارمان عیش لذت فانی ہزار حیف

دنیا دنیا ہی ہے۔ موت کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ وقت پورا ہونے پر ایک لمحہ ٹھہرنا بھی محال ہے
سچ ہے۔ ؎

امید وار کان صدائے درا کے ہیں　　　دنیا کے رہنے والے مسافر سرا کے ہیں

یہ مرحومہ بیگم صاحبہ شیخ مولوی ابوالفضل صاحب حشر مرحوم مغفور (جو ارڈ ماڈن اسکول کے ہیڈ مولوی اور یہاں کے اچھے شاعروں میں تھے) کی نیک زوجہ اور مولوی فدا علیخانصاحب کی صاحبزادی تھیں۔ شادی ہوئی اُسکے دوسرے برس ایک لڑکی تولد ہوئی (جو ابتک بفضل خدا زندہ ہی) ابھی پورے برس روز کی بھی نہوئی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور مرحومہ بیوہ ہوگئیں۔

اب زندگی کیسی گذرنے لگی قابل بیان نہیں۔ دنیا اُنکے لیے اندھیری ہوگئی۔ لڑکی کے نانا، نانی (بیگم مرحومہ کے والدین بزرگوار) جس طرح سے ہوسکا ناز و نعم سے پالنے لگے۔ مگر وہ ناز و نعم کہاں وہ تو مفقود ہو چکا تھا۔ خیر۔ لڑکی نے تیسرے چوتھے سال میں قدم رکھا۔ فکر نے مرحومہ بیگم کو اُبھارا۔ ہمیشہ متفکر رہنے لگیں۔ کہ یکایک گورنمنٹ کی جانب سے تعلیم نسواں کے لیے اُستانی کی تلاش ہوئی۔ خدا بڑا مسبب الاسباب ہی۔ مرحوم بیگم صاحبہ کے والد نے ایک عرضی اپنی صاحبزادی کی طرف سے دیدی۔ بہت سی عرضیاں پڑیں مگر خدا کا کرنا کہ انھیں کی عرضی منظور ہوئی۔ وقت امتحان مقرر ہوا۔ سخت سخت سوال کیے گئے بفضلہ تعلیم یافتہ تو تھیں ہی کامیاب ہوگئیں اور اوائل مارچ ۱۸۹۵ء میں تیس (۳۰) روپیے ماہانہ مع سواری خرچ پر مقرر ہوگئیں۔ اور روز ڈولی میں سوار ہوکر گھر گھر تعلیم دینے جانے لگیں۔ ابھی پورا ایک ماہ بھی ختم نہ کرنے پائی تھیں۔ کہ ایک روز تعلیم دیکر مکان کو گئیں۔ جاکر اپنے لوگوں سے کہا کہ طبیعت کچھ کسلمند معلوم ہوتی ہی۔ تھوڑی دیر کے بعد بدن کچھ گرم ہو چلا۔ طبیعت میں تغیرات ہونے لگے۔ ڈاکٹر بلائے گئے۔ دیکھا۔ دوا تجویز کی۔ لائی گئی۔ استعمال کرایا گیا۔ مگر رفتہ رفتہ کچھ طبیعت اُداس ہونے لگی۔ ایک روز گذرا دو روز گذرے۔ تین روز گذرے چوتھے روز یعنی بتاریخ ۱۲- اپریل ۱۸۹۵ء بروز جمعہ کلمہ پڑھتی ہوئی اس دنیا سے گذر گئیں۔ اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ خداوند کریم اپنے

جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور اُنکے پس ماندگان خصوصاً ماں باپ و ننھی بچی کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

لڑکی نانا نانی کی گودِ شفقت میں پل رہی ہے۔ خدا اُس کو دنیا پروان چڑھائے۔ فقط

راقمہ خاکسار
ایم۔ ایف بیگم آروی

عورتوں کے فرائض

ایک مشرقی شخص اگر یورپ کے کسی بڑے مرکز میں کھڑے ہو کر وہاں کے تمام حالات کا غور سے معائنہ کرے تو سب سے پہلے جو حسرتناک نظارہ اُسکے پیش نظر ہوگا تو وہ عورتوں کی کاروباری زندگی کا نظارہ ہوگا۔ وہ اپنی قرار دادہ اصطلاح "خارجی اور داخلی زندگی" کو جو اُسکے اہل ملک نے اپنے خیال میں مردوں اور عورتوں کے فرائض میں حد فاصل پیدا کرنیکے لیے مقرر کر رکھی ہیں اور وہ عورتوں کو صرف داخلی یا خانگی زندگی کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں۔ وہاں تھوڑی دیر کے لیے ایک لخت بھول جائیگا۔ اور اس کی صحت میں اُسکو بہت کچھ شبہ ہونے لگے گا کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ وہاں تمام پیشوں میں مرد اور عورت ساتھ ساتھ اور دوش بدوش کام کر رہے ہیں۔

جب وہ یورپ سے اور آگے چلکر امریکہ میں پہنچیگا۔ اور اپنی غائر نگاہ سے وہ اس ملک کا نظارہ دیکھے گا تو مبہوت اور لایعقل ہو کر تصویر حیرت بنجائیگا۔ وہ اپنے اہل ملک کی اصطلاحی اور خیالی تقسیم زندگی" بیرونی اور خانگی" کو نہ صرف غلط بلکہ صد درجے کی حماقت خیال کریگا۔ کیونکہ وہ یہاں زندگی کی تمام شاہراہوں کو مرد اور عورت دونوں سے یکساں آباد دیکھے گا۔ اور عورتوں کو مردونکا کام اور مردوں کو عورتوں کا کام بلاکسی تفریق کے انجام دیتے ہوئے پائیگا۔ اسی پر بس نہیں۔ وہ اپنے کانوں میں یہ اجنبی آواز بھی گونجتی

ہوئی پائیگا کہ ”اہل یورپ عورتوں کے حق میں بڑے ظالم۔ بڑے بیدرد بڑے بےرحم ہیں“
یہ آوازالله‌اکبر۔ وہ یوروپ جسکو پہلے دیکھکر وہ اپنی مشرقی عورتوں کی حالت پر پچھتایا
تھا۔ رویا تھا اور اُسکو خلاف انسانیت خیال کیا تھا۔ اُسکے اوپر بھی یہ اعتراض۔
مگر یہ سب چونک۔ یہ سب حیرت اُسی وقت تک اُسکے غافل دماغ میں رہتی ہو جبتک
وہ ان ممالک کی سیاحت میں مصروف رہتا ہو۔ اور پھر مشرق میں آکر یہ سب باتیں اُسکو بھولا
ہوا خواب معلوم ہوتی ہیں وہ یوروپین قوموں کو اپنے ممالک میں بھی اپنے ساتھ دیکھتا ہے،
اخبارات میں بھی عورتوں کے حالات و کارنامے پڑھتا ہے۔ مگر اس طرح کہ جس طرح شیشے پر
سے سیلاب گذرجائے۔ کیونکہ اکثر اوقات وہ بھی سمجھتا ہے کہ ہمارے ملک اور قوم کی رسم و عادت
قابل قدر ہیں۔ اور غیر قوموں کی رسم و عادت کے اخذ کرنے سے ہم کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔
یہ تو اُن لوگوں کی حالت ہو کہ جو سادہ خیال۔ اور قوموں کے بننے اور بگڑنے کے اُصول
سے ناآشنا ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو قومیت کو دنیا کی اعلیٰ ترین حماقت سمجھتے ہیں۔ جو قومیت
کو جنّت سمجھتے ہیں۔ جو قومی ترقی کے خیالات میں اپنی زندگی صرف کرنے میں اُسکو جہادِ اکبر
سمجھتے ہیں وہ ان حالات اور واقعات پر سرسری نہیں نظر ڈالتے بلکہ اُس سے فلسفہ تمدن اور
قومیت کے اہم ترین مسائل کا سراغ لگانے میں اور قوم کے لیے قومیت اور تمدن کی بنیاد
ڈالتے ہیں۔
وہ ایک دن اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ آج مسز جارج نیویارک کے ہائی کورٹ میں
فلاں مجرم کی طرف سے وکیل تھیں۔ اور اُنھوں نے اپنے پرزور دلائل سے مجرم کو رہا کردیا۔
دوسرے دن پڑھتے ہیں کہ مسز کوپرنے واشنگٹن میں فلاں عنوان پر ایک زبردست
لکچر دیا جہاں ہزاروں تعلیم یافتہ مردوں اور عورتوں کا مجمع تھا۔ پھر وہ پڑھتے ہیں کہ مسز ولیم
فلاں کالج میں ہیئت کی تعلیم دیتی ہیں۔ اُسکے ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انھیں عورتوں پر
ختم نہیں ہو بلکہ ان کی ہم پیشہ ان کی ہم لیاقت ہزاروں لاکھوں عورتیں یوروپ میں موجود

ہیں۔ جو انہیں کی طرح لکچر دیتی ہیں تعلیم دیتی ہیں۔ وکالت کرتی ہیں ڈاکٹری کرتی ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ عمدگی اور خوبی کے لحاظ سے ان عورتوں کا کام اُنکے ہمقوم مردوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔

ان سب باتوں کو دیکھکر وہ ہمدردان قوم ایک دریائے تفکر میں غرق ہوجاتے ہیں۔ اور اپنی سادہ دل مشرقی اقوام کی حالت اور عورتوں کی طرف سے اُن کی بے اعتنائی دیکھکر بے چین ہوکے تڑپنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں آہ اے قوم۔ ہم تیری بیکسی پہ تیرے جہل مرکب پر روتے ہیں لیکن تو اپنے رونے والوں کو کوستی ہے۔ تو کیا جانے کہ دنیا ترقی کے کس زینے پر پہنچ چکی ہے۔ اور مغربی قومیں روشن زندگی کی کتنی منازل طے کر چکی ہیں لیکن تو ہے کہ تجھپر چاروں طرف سے اندھیرا چھایا ہوا ہے۔ تو اس قدر بے خبر ہے کہ تجھکو یہ بھی خبر نہیں کہ تو اندھیرے میں ہے یا روشنی میں تجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ تیرے بہی خواہ کون ہیں اور دشمن کون۔ تو یہ بھی نہیں دیکھتی کہ کون تجھکو ترقی کے زینے سے نیچے کھینچ رہا ہے۔ اور کون اوپر چڑھانا چاہتا ہے۔

اگر ہماری قوم منطقی اور فلسفی نہ ہوتی بلکہ حق بینی اور حق جوئی سے کام لیتی تو موجودہ ترقی یافتہ ملکوں کی مثالیں اُسکے توہمات کے توڑ دینے کے لیے کافی تھیں۔ وہ ان مثالوں سے اچھی طرح سمجھ سکتی ہے کہ عورتوں کے فرائض جسقدر اُسنے مقرر کیے ہیں اُس سے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن افسوس تو یہی ہے کہ وہ نہایت منطقی واقعات سے چشم پوشی کرنے والی قوم ہے۔ دنیا ایک میدان جنگ ہے۔ اور ادنی سے لیکر اعلی حیوان تک اور نیز انسان خود فرداً فرداً خواہ مادہ ہو یا نر سب کا فرض فطرتی ہے کہ وہ اُس کارزار حیات کے لیے تیار ہو مگر افسوس کہ مشرقی عورت کا یہ فرض ہے اُسکی قوم نے نہیں قرار دیا بلکہ وہ ایسی مٹی کی مورت ہے جو صرف چولہے اور چوکے پر نصب کرنے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ شعر کتب القتل والقتال علینا + وعلی الغانیات جر الذیول

جنگ اور لڑائی ہمارا حصہ ہے اور دامن کھینچکر ناچنا گانے والیوں کا

چنانچہ انسان کے کاموں کو بلا تخصص اُسکی اہمیت کے لحاظ سے دیکھو وہ تم کو تین قسم کے ملیں گے۔ ایک تو وہ کام جو خود اُس کی ذات سے متعلق ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو کہ اُسکے اہل وعیال سے وابستہ ہیں۔ تیسرے وہ کام جنکا تعلق وجود اجتماعی (سوسائٹی) کے ساتھ ہی۔

یہ امر تو بدیہی ہی۔ اور ہر شخص اسکو آسانی سے سمجھ سکتا ہی کہ ہر ایک صحیح تربیت کا پہلا مقتضا یہ ہونا چاہیے کہ انسان پہلے اس قابل ہوجاے کہ وہ اپنی ذاتی ضروریات کو پورا اور اپنی شخصی حیات کو قائم رکھ سکے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص اپنی ذات کو قائم رکھنے اور اپنی ضروریات کو خود پورا کرنے کے قابل نہیں ہی تو سوسائٹی کے اوپر اُسکا بار مفت ہے۔ وہ نہ خود اپنے کام آسکتا ہی نہ غیر کے۔ اسلیے وہ علوم جس کی بدولت انسان اپنی زندگی کو سالم رکھ سکے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرسکے اُسکا حاصل کرنا پہلا انسان کا فرض ہے۔ اسکے بعد وہ اس قابل بننے کی کوشش کرے کہ اپنے اہل اہل وعیال یا کنبہ کے کام آسکے اور پھر سوسائٹی کی خدمت کرنے کی قابلیت پیدا کرے۔

یہ تینوں باتیں اس ترتیب کے ساتھ جس طرح کہ ہم نے بیان کیا جیسا کہ ایک مرد کا فرض ہوسکتی ہیں۔ اُسی طرح ایک عورت کا بھی۔ اور اس امر میں دونوں میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔

بالفعل ہم تیسرے امر یعنی ملکی اور قومی خدمت کو چھوڑتے ہیں کیونکہ ہندوستان ایسا ملک ہے جہاں ہم ابھی اسی کے لیے روتے ہیں کہ یہاں کے مردوں میں ملکی اور قومی خدمت کرنے کا مادہ نہیں پیدا ہوا۔ اور جو لوگ اس کام کو کرتے ہیں وہ اچھی طرح اس کو انجام نہیں دے سکتے تو بھلا عورتوں کا کیا ذکر۔ ابھی ان کو دماغی اور عقلی تربیت کے لیے صدیاں چاہیں جب جاکر وہ کہیں اس قابل ہونگی۔ لیکن باقی رہے دو امر اُن کی نسبت ہم کو کچھ کہنا ہے۔

لوگ عورتوں کی فطرت اُن کی دماغی قوت کے متعلق جسقدر چاہیں اختلاف کریں لیکن اس بات سے کوئی شخص اختلاف نہیں کرسکتا کہ عورتوں کو ایسی تعلیم اور تربیت دی جائے جس سے کہ وہ اپنی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے قابل ہوں اور حیات نفس کو قائم رکھ سکیں اسی طرح کتنا ہی لوگ مخالف ہوں مگر اس سے وہ کبھی منکر نہیں ہوسکتے کہ گھر گرہستی کی عورتوں کو تعلیم نہ دی جائے۔ جو کہ انتظام خانہ داری اور تدبیر المنزل کے لیے نہایت ضروری ہے۔

اب جو تعلیم عورتوں کو ان دونوں قسموں سے دی جائیگی وہ نہ صرف مفید بلکہ ضروری ہوگی۔ اور یہی دونوں تعلیم ایسی ہیں جنکی وجہ سے عورت اپنی حیات شخصی اور انتظام خانہ داری کو قائم رکھ سکتی ہے۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ عورتوں کو تعلیم کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ دقیق المزاج اور نازک ہوتی ہیں۔ اور اُن کی لطیف لیکن کمزور ساخت تعلیم کی تکلیف اور کام کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتی۔

یہ فقرہ نہایت دلچسپ ہے اور ساتھ ہی اس میں بہت سے فریب پوشیدہ ہیں۔ جو اسکے الفاظ سے ظاہر نہیں ہوتے لیکن جب اس جملے کی تحلیل کرو اور اُسکے تمام اجزاء پر غائر نظر ڈالو تو معلوم ہوجائیگا کہ اس جملے کے کہنے والے کس قدر غلطی اور مکاری سے کام لیتے ہیں اچھا اس دعوے اور دلیل کے اجزا کو دیکھو۔

(۱) عورتیں دقیق المزاج اور نازک ہیں۔
(۲) اُنکی لطیف کمزور ساخت تعلیم اور عمل کو برداشت نہیں کرسکتی۔

کیا یہ دونوں باتیں تعلیم کے مخالف ہیں۔ کیا یوروپ اور نیز ہندوستان کی لاکھوں کروڑوں عورتوں کی مثالیں جنھوں نے اعلی سے اعلی تعلیم حاصل کی ہے۔ اس جملے کو بالکل جھوٹا۔ بالکل مہمل نہیں ثابت کرتیں۔

یہ تو موٹے لفظوں میں ہم نے اس جملے کی غلطی اور فریب سے آگاہ کیا۔ جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ایسے فصیح و بلیغ جملے گھڑنے والے لوگ نہ صرف قوم اور ترقی کے دشمن بلکہ خود عورتوں کے دشمن ہیں جنکی حمایت میں ایسے پوچ دلائل سے کام لیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معرکہ دنیا میں عورت اور مرد دونوں دو فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مردوں نے عورتوں کے لاکھوں حقوق ہضم کر ڈالے ہیں اور کر رہے ہیں اور کرنا چاہتے ہیں وہ اگر اس قسم کی ناصحانہ (خود غرضانہ) نصیحتیں عورتوں کو نہ کرینگے تو اور کیا کرینگے۔

ہم اس موقع پر اُن واقعات کو اگر لکھیں جن میں عورتوں کے حقوق پر مردوں نے بیجا تصرف کر لیے ہیں یا اُن مقدمات کی فہرست درج کریں جو عورتوں نے اُنکے ظالمانہ اور غاصبانہ دستبرد سے عاجز آکر عدالتوں میں دائر کی ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ہمارے دعوے کی کافی دلیل ہوگی لیکن اسکے لیے ایک طولانی دفتر درکار ہے۔

اسپر بھی عورتیں کسی مزید شئی کا دعویٰ کرنا تو درکنار بعض بعض صرف اپنے مہر کا دعوے کرتی ہیں اور اُس میں بھی فریق مخالف اس طرح لڑتا ہے کہ گویا مہر اُسکے باپ کا ہے نہ کہ بی بی کا۔ کیا کوئی صاحب ٹھنڈے دل سے غور کرکے اس بات کا اعتراف کر سکتے ہیں کہ ان عورتوں کے مدعیان حمایت میں پانچ فیصدی بھی ایسے ہیں جو اپنا فرض سمجھکر عورت کا مہر ادا کر دیتے ہیں

مصر جو کہ اسلامی تمدن کا اسوقت اعلیٰ نمونہ ہو سکتا ہے۔ اور جہاں کے مسلمان تمام دُنیا کے مسلمانوں سے زیادہ تر تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں وہاں کی رپورٹوں کے پڑھنے سے بھی ہم کو کمال افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ بھی عورتوں کے حقوق کے غاصب ہیں اور بہت کچھ اُن میں شان جہالت باقی ہے، جبتک وہاں محاکم اہلیہ نہیں قائم کیے گئے تھے اُسوقت تک عملاً عورتوں کا وراثت میں کوئی حق نہیں تھا۔ اور اب اُنکے قائم ہونے کے بعد بھی بیٹی دعوے کرکے بمشکل اپنے باپ کی وراثت کا حصہ حاصل کر سکتی ہے۔ ورنہ وہ بھی نہیں۔ جیسا کہ ہمارے ہندوستان میں ہے۔

عورتوں کے حقوق کا غصب کرلینا ان مردوں سے جو عالم خیال میں مدہوش رہتے ہیں اور دنیا کی رفتار اور عملی زندگی کو نہیں دیکھتے کچھ تعجب انگیز نہیں ہے۔ وہ قلم ہاتھ میں اُٹھاتے ہیں اور ایک ورق کاغذ لیکر لکھتے ہیں "عورتیں صرف اسلیے پیدا کی گئی ہیں کہ وہ گھروں میں بیفکر ہوکر بیٹھیں اور مرد اُن کی کفالت کریں" اسکا جواب ہم سوا اسکے اور کیا دیسکتے ہیں۔ ولیکن قلم درکف دشمن ہست۔

خیالی نظریات اور دلائل اس طرح پر قائم کرلینا کچھ مشکل نہیں۔ ہم خود ایسے ایسے ذی مدہ جملے لطیف سانچے میں ڈھالکر فصیح و بلیغ بنا سکتے ہیں جو معمولی دل و دماغ کے آدمی کو تو ذہن ذات واخلاق اور اصول فطرت پر حکمراں معلوم ہوسکیں۔

دشواری تو اُس شخص کے لیے ہے جو نظریات اور دلائل کے ایک ایک جزو کو حقیقت پر منطبق کرنا چاہتا ہے اور واقعات کی بنا پر غور کرتا ہے۔ وہ جب حقوق نسواں پر بحث کرنا چاہتا ہے تو قوت خیالیہ اُسکو زمین اور آسمان کے بیچ میں معلق لیجاکر بٹھاتی ہے۔ وہ وہاں سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے تمام دنیا کی قوموں کا نظارہ کرتا ہے۔ وہ عورتوں کے مختلف دور پر نظر ڈالتا ہے۔ اُسکو بچپن کی حالت میں دیکھتا ہے۔ نوجوانی کے زمانے میں دیکھتا ہے۔ گھر گرہستی کا روبار کرتے ہوے دیکھتا ہے۔ مطلقات کو دیکھتا ہے۔ بیوٗوں کو دیکھتا ہے۔ پھر ساتھ ہی ہر طبقہ پر وہ نگاہ ڈالتا ہے۔ دیہات کی عورتوں کو دیکھتا ہے۔ قصبہ کی نسوانی زندگی پر غور کرتا ہے شہر کی زنانہ ضروریات کو سمجھتا ہے۔ مدرسہ کی تعلیم پر سوچتا ہے۔ دوکانوں اور کارخانوں میں اُن کو کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ شوہروں۔ اقارب اور اہل معاملہ سے اُن کے سلوک کی کیفیت کو جانچتا ہے۔ ایشیا۔ یوروپ۔ افریقہ اور دیگر براعظم کی مختلف قسم کی ضروریات زندگی کو سمجھتا ہے۔ اور اُنکے اختلافات رسم و رواج کو مدنظر رکھتا ہے۔ پھر گذشتہ تواریخ سے عورتوں اور مردوں کے باہمی سلوک اور برتاؤ کا نقشہ کھینچتا ہے۔ ان سب کے بعد وہ ایک نتیجہ اخذ کرتا ہے۔

یہ سب کام کچھ سہل نہیں ہیں۔ اور ان میں بڑی معلومات کی ضرورت ہے۔ اسکے بعد بھی وہ جو رائے قائم کرتا ہے اُسکے اوپر یقین کامل نہیں رکھتا بلکہ اور بھی جد و جہد کرتا رہتا ہے۔ اور ان سب کوششوں کے بعد تب جاکر تقریباً یقین کی سرحد میں وہ پہنچتا ہے۔

بخلاف اسکے وہ لوگ جو خیال کے دریا میں غرق رہتے ہیں جو توہمات اور رسم و رواج کی پابندی میں جکڑے رہتے ہیں وہ اپنی بلیغ و فصیح خیالی دلیل کو جنکو دنیا کی عملی زندگی اور واقفیت سے مطلق سروکار نہیں ہے ایسا مضبوط اور صحیح سمجھتے ہیں کہ وہ گویا ایک حسابی عمل ہے جو کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ بڑے وثوق کے ساتھ یہ کہکر الگ ہو جاتے ہیں کہ عورت ضعیف ہے۔ مرد قوی ہے۔ اور زندگی کے دو حصے ہیں بیرونی اور خانگی۔ بیرونی زندگی مرد کا حصہ ہے اور خانگی عورت کا۔"

یہ فرمان ناطق اُسوقت ممکن ہے کہ آسانی سے تسلیم کر لیا گیا ہو جبکہ عورت بالکل مرد کی ایک ملک خیال کیجاتی تھی۔ اور جبکہ مرد نے پورا تسلط اور غلبہ اُسپر اور اُسکے حقوق پر کر رکھا تھا۔ لیکن اس زمانے میں دنیا نے دوسری کروٹ لی ہے اور پہلی حالت افسانۂ کہن ہو گئی۔

ہم اب ایک ایسے زمانے میں ہیں جس میں ایک ایک آدمی کے لیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت نہایت سخت مقابلہ حیات ہے۔ اور یہ مقابلہ مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ علم میں۔ دولت میں صنعت و حرفت میں۔ تجارت و زراعت میں۔ ایک ایک قوم دوسری قوم کو نگل جانے کے لیے تیار ہے۔ اگر اُسنے اس مقابلے میں ذرا بھی کمی کی۔

عورت بھی مرد کی طرح انسان ہے۔ فطرت نے اُسکو بھی عقل اور انھیں دماغی قوتوں سے زینت دی ہے جنسے کہ مرد کو۔ اُسکا بھی یہ حق ہے کہ وہ مرد کے دوش بدوش ترقی کی تمام شاہراہوں میں قدم مارے اور نہیں تو کم سے کم اُسکے نقش قدم پر چلی چلے۔

ضروریات زندگی اور انسانی حاجتیں اسقدر بڑھ گئی ہیں کہ اگر کوئی قوم بلا امداد عورتوں کے اُنکو پورا کرنے کی کوشش کرے تو اُسکا نتیجہ یہی ہوگا کہ دوسری قومیں اُسکو اس طرح چاٹ جائینگی

جس طرح تر کاغذ کو دیمک چاٹ جاتی ہے۔

یہ مقابلۂ حیات ایسا آسان اور سہل نہیں ہے کہ انسان آسانی کے ساتھ اُس سے عہدہ برا ہو سکے۔ بلکہ اُسکے لیے ایک ایک فرد کو اپنے قویٰ عقلیہ و دماغیہ کو ترقی دینا اور اَپ ٹو ڈیٹ ہونا لازمی ہے۔

کیا اس گردش کا اثر ہماری عورتوں پر نہ پڑیگا؟ کیا اُنکو اس کشاکشی اور مقابلہ کے لیے تیار ہونے کی ضرورت نہ پڑیگی؟ بیشک اگر دنیا میں ہم اپنا وجود نہیں رکھنا چاہتے۔ اگر ہم دوسری قوموں کے لقمۂ تر ہونا پسند کرتے ہیں تو اس مقابلہ کا احساس عورتوں کو نہیں ہونا چاہیے لیکن یہ ایک ایسا امر ہے کہ جسکو احمق ترین خلائق بھی ناپسند کرتا ہوگا۔

ہم اس امر میں مطلق بھی بحث کرنا نہیں چاہتے کہ فطرتاً عورتوں کو تدبیر المنزل (انتظام خانہ داری) اور تربیت اولاد کے لیے دنیا میں پیدا کیا ہے اور اُسکے لیے فطرتی طور پر عوارض طبعی مثلاً حمل۔ رضاع۔ ولادۃ وغیرہ لاحق ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ اُن کاموں کو کرنے کی کافی طاقت نہیں رکھتی ہے جو مرد کرتے ہیں۔ بلکہ ہم بالاعلان اور بہ تصریح کہتے ہیں کہ عورت کی بہترین خدمت سوسائٹی کی یہی ہے کہ وہ شادی کرے۔ اولاد پیدا کرے اور ان کو تربیت دے۔ یہ ایک ایسا بدیہی مسئلہ ہے کہ اسپر زیادہ بحث کی گنجایش نہیں ہے۔ لیکن اس میں خطایہ واقع ہوجاتی ہے کہ اسپر لوگ اس امر کو مبنی کرلیتے ہیں کہ پھر عورت کو تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔

عورتوں کی تعلیم کو غیر ضروری کہنا اور اُنکو اپنی حیات اور اپنی چھوٹی چھوٹی اولاد کی حیات قائم رکھنے اور معاش حاصل کرنیکے قابل نہونے دینا ایسا صریح ظلم ہے جو خودکشی کی ہدایت کے مساوی ہے۔

ہر ایک شہر میں بہت سی عورتیں ایسی ہیں جن کی شادیاں نہیں ہوئیں۔ بہت سی ایسی ہیں جو مطلقہ ہیں یا جنکے شوہر مرگئے ہیں۔ بہت سی ایسی ہیں جنکے شوہر ہیں لیکن محتاجگی

یا شوہر کی نالائقی سے گذر اوقات نہیں ہو سکتی ایسی صورت میں ماننین تعلیم اُنکے لیے کیا راستہ بتا سکتے ہیں۔ اور یہ مثالیں ہمارے ملک میں کثرت سے ہیں۔ ساتھ ہی جب عورت بیوہ ہو جائے اور اُسکے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں تو اُن کی پرورش کی کیا شکل ہو سکتی ہے۔ ان تمام عورتوں کو تعلیم سے روکنا۔ اور کاروباری زندگی کے قابل نہ بننے دینا درحقیقت اُن کو مصیبت میں ڈالنا اور سوسائٹی کو زیربار کرنا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ عورت نکاح کرنا چھوڑ دے۔ وہ مردوں کی طرح زندگی بسر کرے۔ کمائے اور تمام دنیاوی کاروبار میں حصہ لے بلکہ ہم پھر اس بات کو دہراتے ہیں کہ ہر عورت بیوی بنے اور ہر بیوی ماں ہو۔ مگر اسکے ساتھ ہی ہم صورتہائے متذکرہ بالا کو نہیں بھول سکتے۔ اور یہ صورتیں نہ صرف ممکن الوقوع بلکہ دن رات واقع ہوتی رہتی ہیں اور ادنےٰ سے ادنےٰ قوموں اور ملکوں سے لیکر اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ قوموں اور ملکوں میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

یوروپ جو آجکل تہذیب کا سرچشمہ ہے۔ اُس میں صرف ایک فرانس کی مردم شماری کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں (۳۶۲۲۱۷۰) چھتیس لاکھ سے زیادہ بے بیاہی اور (۲۰۶۰۷۷۸) بیس لاکھ سے زیادہ بیوائیں موجود ہیں۔ درآں حالیکہ وہاں کی آبادی تقریباً چار کرور ہے۔ اُسکے مقابلے میں ہمارے ملک میں بیوہ اور خاصکر ہندو بیواؤں کی تعداد اسکے بارہ گنا سے زیادہ ہے۔ اور یہ بھی اسپر مصیبت ہے کہ وہ آیندہ شادی کے قابل نہیں خیال کی جاتیں۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کی بدولت انکا بار غریب کنبہ والوں پر پڑتا ہے۔ اور اس طرح پر سوسائٹی مصیبت زدہ اور پریشان رہتی ہے۔ وہی عورتیں اگر تعلیم یافتہ ہوں تو خود اپنی اور نیز اپنی چھوٹی چھوٹی اولاد کی پرورش کرنیکے قابل ہو سکتی ہیں۔

اسکے ساتھ ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ایسی عورتوں کی تعداد دن بدن ہمارے یہاں بڑھتی جائیگی۔ کیونکہ ہم اُس لائن پر ترقی کر رہے ہے جس لائن پر یوروپ نے کی ہے۔ اور اس تہذیب اور ترقی نے غیر منکوحہ عورتوں کی تعداد اضافہ کرنے میں خاص شہرت حاصل کی ہے۔ جسکے

کیے وجوہات ہیں۔
سب سے بڑی تو یہ وجہ ہی کہ ہم جس آسانی سے نکاح کر لیتے ہیں اُس آسانی سے ایک یوروپین نکاح نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ عورت میری تمام زندگی میں رفیق اور شریک ہوگی۔ اسلیے وہ جب کسی عورت سے شادی کرنا چاہتا ہی تو اُس میں پہلے ایسے اوصاف کی جنکو وہ اپنے زندگی بھر کے شریک میں ضروری سمجھتا ہے دیکھ بھال کرتا ہے اور اُسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شادی دن بدن دشوار ہوتی جاتی ہے۔
اسکے ساتھ ہی ایک دوسرا سبب یہ ہے کہ ممالک متمدنہ کی اقتصادی حالت کی وجہ سے وہاں کے باشندے قبل تیس سال کی عمر کے روزی پیدا کرنے کے بہت کم قابل ہوتے ہیں کیونکہ اُنکے راستے میں بڑی مزاحمتیں ہوتی ہیں اور بہت سی رُکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ اور تاوقتیکہ وہ اپنے آپ کو اس قابل نہ بنائیں کہ ان صفوف کو چیر پھاڑ کر آگے نکل جائیں۔ اسوقت تک اُن کو معاش کا حاصل کرنا ایک امر دشوار ہوتا ہی۔ اور چونکہ وہ نکاح کے لیے اس امر کا خصوصیت کے ساتھ لحاظ رکھتے ہیں کہ ہماری اولاد کم سے کم ہماری طرح فارغ البال رہے اسلیے اُن کی معاش جبتک مستقل نہیں ہو جاتی۔ یا اُنکے پاس آیندہ کے لیے کافی سرمایہ نہیں جمع ہو جاتا وہ ہرگز نکاح نہیں کرتے۔ کیونکہ خود تو وہ بدبختی کی زندگی بسر کریں لیکن ایک کنبے کو ہمیں پھنسانا نہیں چاہتے۔ اور اسکو سب سے بڑی جہالت سمجھتے ہیں کہ انسان بلا انجام کو سوچے ہوے شادی کرے۔ اور بیوی اور اولاد کے حقوق نہ ادا کر سکے۔
ہم بھی اس لائن پر چلیں گے۔ اور دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں ہی جو اس شاہراہ سے ہمکو باز رکھے گی۔ بلکہ میں تو یہ خیال کرتا ہوں کہ ہم اس شاہراہ کی کچھ منزلیں طے بھی کر چکے ہیں صغر سنی کی شادی کا رواج ہم نے بہت کم کر دیا ہی۔ تعلیم یافتہ فرقہ خصوصیت کے ساتھ شادی میں نہایت دوراندیشی اور انجام بینی کو کام میں لانے لگا ہی۔ اور بہتوں نے مختلف وجوہات شادی ہی نہیں کی۔

اہل قلم اور قدیم خیالات کے لوگ کچھ لکھیں کچھ کہیں لیکن نہ اس رو پر چلنے سے ہم باز رہ سکتے ہیں نہ ہم کو یہ رو چھوڑیگی گو نکاح میں کمی ہوجانے اور عورتوں کے مردوں کا کام کرنے سے آبادی میں خلل آئے۔ ملک کی پرانی رسمیں ٹوٹ جائیں لیکن حوادث عالم کی رفتار یہی ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ صرف شکوے شکایت پر زمانے کی حالت متغیر ہوجائے اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ ملک اور قوم پر سب سے قوی حکمراں اُن کی اقتصادی حالت ہی اور یہ کسی کے ہات میں طاقت نہیں ہی کہ اُس کو محکوم بنائے اور جس طرح چاہے بدلدے۔

ہم ہر قوم میں ایسی عورتوں کی تعداد کثرت سے دیکھتے ہیں جنکو ضروریات نے اس بات پر مجبور کیا ہی کہ وہ ایسے کام کرتی ہیں جو ہمارے یہاں صرف مردوں کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اُنکے دل میں یقیناً یہ درد ہی کہ اُنکے شوہر نہیں۔ اُنکو یقیناً یہ رنج ہے کہ اُنکے اولاد نہیں۔ وہ بلاشبہ اپنی تنہائی پر روتی ہیں۔ لیکن ملک کی اقتصادی حالت سے مجبور ہیں۔ نہ کریں تو کھائیں کیا اور نہ کھائیں تو کیسے جئیں۔

مخالفین کہتے ہیں کہ ہم فقیر عورتوں کو کب منع کرتے ہیں کہ وہ مردوں کی طرح محنت مزدوری نہ کریں یا تعلیم حاصل کر کے کمانے کی قابلیت نہ پیدا کریں۔ کیوں کہ مجبوری میں سب کچھ جائز ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہی کہ ہمارے مخالف حضرات ہم سے اس امر میں بالکل موافق ہیں کہ تعلیم دیجائے لیکن اس کے لیے وہ ایک قسم کی (فقیر) عورتوں کو مخصوص کرتے ہیں اور ہم یہ کہتے ہیں کہ نہیں فقیر اور امیر سب کو یکساں تعلیم حاصل کرنی چاہیے۔ اور یہیں استثنا نہیں ہوسکتا مخالفین اگر اپنے اسی جملے پر اچھی طرح غور کریں کہ "ہم فقیر عورتوں کو یہ اجازت دیتے ہیں کہ وہ پڑھیں اور پردے سے باہر آکر کوئی ایسا پیشہ جو اُن کی حیات شخصی قائم رکھنے کے لیے ضروری ہو اختیار کریں" تو یقیناً وہ بھی وہی رائے دینگے جو ہم دیتے ہیں۔

کیونکہ ہر ایک نفس کے لیے ضروریات لازمی ہیں۔ اور اُن ضروریات کو پورا کرنا اور اچھی طرح اُن فرائض کا ادا کرنا اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ اُسکو پہلے سے تعلیم دیجاے اور مشق کرائی جاے اگر عورت کو اس قسم کی تربیت اور تعلیم نہ دی گئی تو اُسوقت جبکہ ضروریات اُسکو پیش آئیں گے وہ ہرگز انجام دینے کی قابلیت نہ رکھے گی۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ ہلاک اور برباد ہو جائیگی۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایک غیر تعلیم یافتہ مرد کو جسنے کسی خاص کام میں مشق حاصل نہیں کی ہو اور نہ کوئی علم یا پیشہ جانتا ہو ہم محرومی کا شکار سمجھتے ہیں اور عورت کو جانتے ہیں کہ وہ بلا تعلیم کے معاش حاصل کرنے کے قابل ہو جائیگی۔ میں کہتا ہوں کہ کون ایسا شخص ہے کہ جو اس بات کی پیشینگوئی کر سکتا ہو کہ کون عورت احتیاج اور فقر کے تیر کا نشانہ نہ بنے گی۔ اور کون دولتمند ہو گی۔ زمانے کے حوادثات اس طرح پر ہیں کہ کبھی کوئی شخص اس بات کی گارنٹی نہیں کر سکتا کہ میں ہمیشہ دولت مند ہی رہوں گا۔ اسلیے یہ لازم ہے کہ ہر شخص اسوقت کے لیے تیار رہو جو ممکن ہے کہ اچانک اُسکے اوپر آجائے۔ ہر زمانے میں ایسی لاتعداد مثالیں موجود رہتی ہیں کہ دولتمندوں کی لڑکیاں فاقے کرتی ہیں اور اونچے اونچے گھروں کی عورتیں نان شبینہ کو محتاج ہو جاتی ہیں۔ ہمارے مخالفین اُن کی فقیری اور احتیاج دیکھکر اب اُن کو اجازت دینگے کہ بیشک وہ کمائیں کھائیں۔ اور اپنی اور اپنی اولاد کی معاش حاصل کریں۔ لیکن افسوس کہ اب اُسکا وقت نہیں رہا اب وہ بیچاری کب تعلیم حاصل کرینگی اور کب کمائینگی ضروریات کو ایک لحظہ بھی ٹالنا ناممکن ہے۔

اسلیے ہم یہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلی بات جو لڑکیوں کے باپ پر لازم ہو وہ یہ ہے کہ اُن کو ایسی تعلیم دیجائے کہ وہ ضرورت کے وقت کسی کی محتاج نہ رہیں۔ تاکہ حوادث زمانہ کی مصیبتوں سے فی الجملہ اطمینان رہے۔ اور یہ تعلیم یقیناً ایسی ہی ہونی چاہیے جیسی کہ لڑکوں کو دیجاتی ہے۔ اسکے بعد اگر وہ اپنے شوہر کے گھر جا کر خوش حال رہی تو اُس علم سے کوئی نقصان سوائے نفع کے نہیں پہنچ سکتا۔ بخلاف اسکے جہالت کی صورت میں یہ خوف لگا رہتا ہو کہ خدانخواستہ

اگر زمانے نے کروٹ کھائی تو کیا ہوگا۔

اسکے ساتھ ہی جب اُن مادی فائدوں اور علم کی معنوی لذتوں پر ہم غور کرتے ہیں جو صاحب علم کو حاصل ہوتی ہیں تو اور بھی تعلیم کی ضرورت ذہن میں راسخ ہو جاتی ہے۔

اسوقت ہمارے سامنے میسو پولی کی کتاب رکھی ہوئی جو اُنھوں نے امریکن لڑکیوں کی لائف کے متعلق لکھی ہے۔ اُس میں سے ہم اُنکے خیال کا اقتباس درج ذیل کرتے ہیں۔

میں نے امریکہ میں دیکھا ہے کہ وہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی ساتھ مدرسے میں جاتے ہیں۔ ایک ہی جگہ اور ایک ہی ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھتے ہیں۔ ریاضت بدنی بھی ایک ہی ساتھ سیکھتے ہیں۔ تعلیم کے ختم کرنے کے بعد بھی یہ ساتھ نہیں چھوٹتا۔ کارخانوں۔ دفاتر اور تعلیم گاہوں میں بھی وہ ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹری۔ وکالت کے پیشے میں بھی دونوں دوش بدوش ہیں۔ مذہبی کاموں میں بھی وہ مردوں کا ساتھ دیتی ہیں۔ اور پبلک جلسوں۔ عام شاہراہوں میں برابر مردوں کی طرح لکچر دیتی ہیں۔ کلب اور دیگر سوسائٹی میں بھی اُنکی وہ شریک ہیں۔

اگر تم یہ پوچھو کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ تو اس سوال پر غور کرو جو ایک امریکن باپ اپنی لڑکی کی ابتدائی زندگی میں اپنے دل سے پوچھتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ خدانخواستہ اگر میری لڑکی کسی خاص وجہ سے ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے خود اپنی ہی محتاج ہو جو بہت ممکن ہے تو اُسوقت وہ کیا کر سکتی ہے یہی سوال اُسکو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی لڑکی کو لڑکوں کی طرح تعلیم دے۔ اگر اُسکو اچھا گھر اور اچھا بر ملا تو وہ عزت کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ اور اگر نہیں تب بھی اُسکو کوئی تکلیف نہیں۔ کیونکہ وہ اپنی حیات شخصی قائم رکھ سکتی ہے کیونکہ اُسنے تعلیم حاصل کی ہے وہ آسانی سے پہنے

میں دس پونڈ کمائے گی۔ اور امریکن باپ اس قسم کی تعلیم دیکر اپنی لڑکی سے
سبکدوش ہوجاتا ہی۔ اور اس خیال سے اسکو تسکین ہوجاتی ہے کہ میں نے
اپنا فرض ادا کر دیا۔ وہ اُس کی آیندہ حالت کو بالکل نامعلوم خیال کرتا ہے
اور اس لیے ایسی تعلیم دیتا ہی کہ گویا اُسنے فرض کرلیا ہی کہ اس لڑکی کو اپنی
ضروریات خود پوری کرنی پڑینگی۔

اسکے مقابل میں جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ ایک ہندوستانی عورت اگر محتاج ہوجائے
تو وہ کیا کرسکتی ہے۔ تو ہمکو سخت مایوسی ہوتی ہی۔ ہم اُس کے لیے کوئی ذریعہ نہیں دیکھتے
سوائے اس کے کہ دن بھر اگر بیل کی طرح جُتی ہے اور چکی پیسے تو شام کو چار پیسے ملیں۔
ہم اسی پست حالت کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ہندوستانی عورتیں ہر لائن میں ترقی
کرسکتی ہیں اور ان کے لیے بھی وہی میدان معاش کے کشادہ ہیں جو یورپ مین عورتوں کے
لیے ہیں۔ بلکہ اسوقت ان کے لیے زیادہ ہیں کیونکہ یہ کمیاب ہیں۔ لیڈی ڈاکٹروں کی بہت
ضرورت ہی۔ محکمہ تعلیم میں لاکھوں عورتوں کی مانگ ہی۔ ملک کی صنعت و حرفت میں بھی
یہ بہت کچھ حصہ لے سکتی ہیں۔ ایسی حالت میں عورتوں کو تعلیم نہ دینا۔ ملک اور قوم پر ظلم کرنا
ہے۔ یہ کہنا کہ لڑکیوں کو صرف ایسی تعلیم دینی چاہیے کہ وہ اچھی بیوی ہوسکیں بعینہ یہ
کہنا ہی کہ اپنے بیٹوں کو ایسی تعلیم دو کہ وہ شوہری کے قابل ہوجائیں۔ کیا اس سے دنیا کا
کام چل سکتا ہے۔ کیا اس سے دنیا ترقی کرسکتی ہی۔ فقط

ا - ج

عورتوں کی اعلےٰ تعلیم

عورتوں کی عزت و حرمت، و تعلیم و تربیت کا صور جدید تعلیم نے اس بلند آہنگی
کے ساتھ پھونکا ہے کہ درحقیقت اس زمانے میں اس کی مخالفت کرنا اپنے تئیں قوم کی نظر میں

ذلیل کرا دیتا ہی۔ میرا مقصد اس بیان سے یہ نہیں ہی کہ میں عورتوں کی تعلیم کو کوئی بُری شئی سمجھتا ہوں۔ اور اُن کے جاہل رہنے کو اچھا قرار دیتا ہوں۔ میں عورتوں کی ابتدائی تعلیم کا جسکو اسکول کی تعلیم کہتے ہیں نہایت فراخ دلی سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ مگر ہاں ان کی اعلیٰ تعلیم جس کو کالج کی تعلیم کہتے ہیں اسکو ضرور میں مخالفانہ نظر سے دیکھتا ہوں۔ اسی وجہ سے میں اسوقت اس موضوع پر کچھ خامہ فرسائی کرنا چاہتا ہوں۔

ہمکو یہ کھٹکا لگا ہوا ہے اور جو حق بجانب ہی کہ کہیں ہماری آزادخیالی کی رفتار ترقی کرتے کرتے اس مرتبے پر نہ پہنچ جائے جس پر پہنچکر یورپ کے اہل نظر نالاں ہیں۔ اب سے تیرہ برس کا واقعہ ہی کہ مصر کے ایک مشہور ومعروف عالم احمد زکی نے یورپ کا سفر کیا تھا پیرس پہنچکر وہاں کی عورتوں کی ترقی وشائستگی وتہذیب وخوش مذاقی نے اسپر اس درجہ اثر کیا تھا کہ وہ متعجبانہ لہجہ میں بول اُٹھا تھا کہ نوع انسانی کا وہ نصف حصّہ جو ہمارے ملک میں بالکل بیکار چیز ہی۔ یہاں وہی تمام ترقیوں کی روح رواں ہی اور اس کی اسقدر عزّت کیجاتی ہی کہ فرانسیسی زبان کا یہ مشہور مقولہ ہی کہ عورت کی مرضی عین خدا کی مرضی ہی۔ اسنے وہاں کی عورتوں کی حد درجہ تعریف کی ہی اور لکھا ہے کہ وہ شاعری، مصوری، طبابت، مضمون نگاری انشاپردازی، وکالت وصنائع واختراعات میں کمال رکھتی ہیں۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اس مشہور عالم نے انکے متعلق یہ نہایت محققانہ رائے قائم کی ہے کہ انکی وہ آزادی جو ان وجوہ سے زیادہ بڑھتی جاتی ہی ضرور قابل اعتراض ہی

انگلستان میں ابھی حال ہی میں مسئلہ انتخاب کے متعلق عورتوں نے کیا کچھ شورش نہیں برپا کی۔ اور اگر اعلیٰ تعلیم اور آزادی کی یہی رفتار جاری رہی تو یہی عزت وآزادی جو وہاں کے مردوں نے عورتوں کو دے رکھی ہی ایک دن ان کے لیے وبال جان ہوجائیگی خود یورپ میں عورتوں کے لٹریری مذاق کو ناپسند کیا جاتا ہی۔ اور جو عورتیں وہاں کی مہذب سوسائٹی کی لٹریری زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان کو وہاں کے لوگ طعناً ناٹسیکڈ کہتے ہیں اسکی وجہ

یہی ہے کہ لٹریری زندگی بسر کرنے کی وجہ سے وہ اپنے نیچرل فرائض کے انجام دہی سے عاری رہتی ہیں۔ جسکا نتیجہ یہ ہے کہ یورپین زبانوں میں بہت سی ایسی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن کی مصنفہ خود عورتیں ہیں اور جنکا موضوع یہ ہے کہ وہاں کے مرد اپنی ان بیویوں پر جو لٹریری زندگی بسر کرتی ہیں بہت زیادہ مظالم کرتے ہیں۔ ان کی کمائی سے فضول خرچیاں کرتے ہیں اور پھر بھی اُن کو دُکھ دیتی ہیں۔ ان مختلف واقعات کو پیش نظر رکھکر کوئی کچھ نتایج پیدا کرے مگر ہمارے ملک کے ناعاقبت اندیش نوجوان اپنے دل ہی دل میں تمام اعتراضات کا جواب دیکر یورپ کی کورانہ تقلید میں کہیں گے کہ "تعلیم ایک عمدہ شے ہے۔ خواہ وہ ادنیٰ ہو یا اعلیٰ لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم عورتوں کو ایسی نعمت سے محروم رکھیں۔ واقعی انکے خیال کے مطابق ہمارے نزدیک بھی ہندوستانی عورتوں کا اسدرجہ تعلیم یافتہ ہونا جیسی کہ یورپ کی عورتیں تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک نہایت دل خوش کن خواب ہے مگر اس خواب کی تعبیر بہت بُری ہے اور دانایانِ ہند یا اہل نجوم کا بیان ہے کہ "ہندوستان کی عورتوں کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا نقصانے نسلِ ہند کی دلیل ہے۔

ہمنے مانا کہ ہمارے ملک کی سرسبزی و بہبودی و تمام آیندہ کی خوشحالی عورتوں کی اعلیٰ تعلیم پر منحصر ہے۔ لیکن یہ تمام خوش آیند امیدیں اُسی وقت پوری ہونگی جب وہ کامیابی حاصل کرنے والے ہی اس پردۂ دنیا پر نہ رہیں گے۔ ؎ پس از انکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد۔

امریکہ جہاں عورتوں کی تعلیم اُفق اعلیٰ پر پہنچی ہوئی ہے اور جہاں کی عورتیں مردوں سے زائد قابل ہیں وہیں کے ایک میگزین میں تقریباً ایک سال کا عرصہ ہوا ایک ڈاکٹر کے قلم سے ایک مضمون مندرجۂ بالاعنوان پر شائع ہوا تھا۔ جسکا اقتباس اس موقع پر ہم درج کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ۔

وہ لوگ جنکا علمی مرتبہ بلند ہے اس مسئلے سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اس سطح عالم پر جتنے مخلوقات ہیں اُنکے افراد و نسل دونوں کے بقا میں بہت جھگڑے ہیں۔ لیکن نسلی

تنازعات کا مرتبہ فردی تنازعات سے کہیں زیادہ اہم اور بلند ہے۔ اگر ایک فرد اس صفحۂ ہستی سے مٹ جائے تو اُسکے زوال سے خزانۂ حیات میں صرف ایک ہی فرد کی کمی ہوگی۔ بخلاف اسکے کہ اگر نسل کی نسل فنا ہوجائے تو اُسکے خاتمے سے ہزاروں جانوں کا فنا ہونا لازم آتا ہی۔ اور ان آیندہ پیدا ہونے والوں کا شمار نہیں جو اس خاندان کے نام لیوا ہوتے۔ دلائل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عورتوں کی اعلی تعلیم نسل انسانی کے انقراض کا باعث ہی۔ اور اسکے دو سبب ہیں پہلا بلا واسطہ اور یہ وہ اثر ہی جو اعلی التعلیم عورتوں کی صحت اور جسم پر ڈالتی ہی۔ اور دوسرا سبب بواسطہ ہی اور وہ یہ ہی کہ چونکہ کالج میں تعلیم پانے کی وجہ سے عورت کا اچھا سِن نکل جاتا ہے۔ لہذا اسکی شادی اس سن میں نہیں ہوسکتی ہے۔

پہلا سوال کہ وہ علوم عالی جنکی تعلیم عورتوں کو دیجاتی ہے انکے جسم و صحت کو نقصان پہنچاتے ہیں؟ ایک اہم سوال ہے۔ کیونکہ اس وقفیت سے تو کسی کو انکار ہی نہیں ہوسکتا کہ بہ نسبت عقلی خدمات کی انجام دہی کے فرائض امومتہ کے برتنے کے لیے جسمانی تندرستی و توانائی زیادہ ضروری ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ ہم کو یہ بھی معلوم ہی کہ جسقدر عورت کے قوی عقلی کی ترقی کی طرف زیادہ توجہ کیجائیگی اسیقدر وہ اپنے ان فرائض کی ادائگی سے جنکا پورا کرنا اسکا فطری مقصد ہی مجبور رہے گی۔

جس ڈاکٹر سے چاہو تم پوچھ لو وہ تم کو بہت سے ایسے واقعات گنادیگا جنمیں شادی کا نتیجہ محض اسوجہ سے خراب رہا کہ عورتوں کی حد درجہ پرداخت عقل نے جو شادی سے قبل کی گئی تھی اُنکو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ ان تمام طبی اعمال طبیعت کو برداشت نہیں کرسکتیں جنکو کم تعلیم یافتہ عورتیں بآسانی برداشت کر لیتی ہیں۔ پھر دیکھنے کی بات یہ ہی کہ فرائض اموۃ اور علمی مشاغل میں باہمی رقابت ہے جسکا سبب یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں میں وہ مرکبات فاسفوری جو غذا سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کو

جسم بچے کی پرداخت کے لیے اور دماغ علمی مشاغل کے لیے کھینچتے ہیں برابر تقسیم نہیں ہوسکتے اور انکا خرچ پیدائش سے بہت زیادہ ہوجاتا ہی۔ خصوصاً جب بچہ پیٹ میں ہوتا ہے تو اور زیادہ مصرف انکا ہوتا۔ اور یہ بھی ہمکو معلوم ہی کہ وہ شورہ کیمیائی جو بچے کی ساخت جسمی اور پٹھوں کے لیے ضروری ہوتا ہی بچہ عورت کے خون سے کھینچتا ہی۔ غرض کہ اس کشمکش کا نتیجہ عورت کے حق میں بُرا ہوتا ہی اور وہ مجنون ہو جاتی ہی۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب اس خرچ شدہ مادّے کی تلافی ہو جاتی ہی تو وہ اپنی اصلی حالت پرآجاتی ہے۔ مگر ایسا شاذونادر ہی۔ اور کبھی بچے کا نقصان ہوتا ہی۔ جو ہمیشہ کا بیمار روگی پیدا ہوتا ہی۔ اور چونکہ ماں کے دودہ میں تغذیہ کی قوت کم ہوتی ہی لہذا اُسکو اوپر کا دودہ دیا جاتا ہی۔ یا بعض اور مصنوعی غذائیں جو ماں کے دودہ کے صحیح قائمقام نہیں ہوسکتیں۔

جب عورت تعلیم علوم عالیہ سے فراغت کرچکتی ہی تو اُسکو اس بات کا احساس ہوتا ہی کہ وہ اموتہ کی صلاحیت نہیں رکھتی ہی۔ یا تو اس وجہ سے کہ ایسی عورتیں شادی ہی کرنا کم پسند کرتی ہیں۔ یا اس لیے کہ اگر شادی ہوئی بھی تو اسقدر سن جاکر ہوتی ہے کہ اولاد کی کمی لازمی طور پر اسکا نتیجہ ہوتا ہی۔ ہم نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوے سُنا ہے کہ ایک ہی اولاد ہو اور اُسی کی تربیت میں ماں باپ اپنی تمام توجہ صرف کردیں اچھا ہے بجاے اسکے کہ چار پانچ لڑکے ہوں۔ کیونکہ آخری صورت میں ماں باپ کو چار لڑکوں کی پرورش و پرداخت میں سخت تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور اسپر بھی کافی تربیت نہیں ہوسکتی لیکن یہ خیال اس موقع پر غلط ہی کیونکہ ان دونوں ماں باپ کا ایک لڑکا جنکی تعلیم و تربیت اعلیٰ درجے کی ہوئی ہو روگی و بیمار ہوتا ہی اور ان ماں باپ کے چار لڑکے جنھوں نے کم تربیت و تعلیم پائی ہی اور جو صحیح و تندرست ہیں پہلے کی اولاد سے کہیں بہتر ہیں اور اگر فرض بھی کرلو کہ وہ عورت جس نے اعلےٰ درجے کی تعلیم حاصل کی ہو اور اُس میں اولاد ہونے کی بھی قابلیت ہی اور وہ اس بچے کی تربیت بھی کرسکتی ہے تو بھی ان سب باتوں کے قطع نظر ایک اور

مانع ایسا ہی کہ جس کی وجہ سے اولاد زیادہ نہیں ہو سکتی اور وہ شادی کا زمانہ نکل جانے سے بہت بعد کو شادی کرنا کیونکہ عموماً چھبیس برس سے لیکر تیس برس کی عمر عورت کی شادی کے وقت ہوتی ہے۔ اور چونکہ مرد کو عورت سے دس سے لیکر پندرہ برس تک بڑا ہونا چاہیے اس لحاظ سے مرد کی عمر شادی کے وقت پینتالیس برس کی ہوتی ہی۔ اس سن پر پہنچکر دونوں کو زیادہ اولاد سے نا امیدی ہو جاتی ہی۔ طلاق کے نقشوں کے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہی کہ میاں بیوی میں اسوقت تک جھگڑا نہیں ہوتا جب تک کہ عورت فرائض اموختہ کی انجام دہی میں کوتاہی نہیں کرتی۔ بس مناقشات کی جڑ ان فرائض سے غفلت ہی۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ کیا اس زمانے میں عورتوں کی صحت ویسی نہیں ہی جیسی گزشتہ صدی کی عورتوں کی تھی؟ اور کیا فرائض مادری کی انجام دہی اس زمانے میں اگلے زمانے سے زیادہ اہم و مشکل ہی؟ ان سوالوں کا جواب ہم اثبات میں دینگے جس کی وجہ یہ ہی کہ وہ میل ہمجنسی جو عام طبائع میں پایا جاتا ہی اور اولاد کی خواہش سال بسال کم ہوتی جاتی ہی۔ اور سب سے بڑی شہادت ہمارے اس بیان کی روز بروز شادیوں کی کمی اور اولاد کی قلت ہی۔

اعلی و ادنی دونوں درجے کی عورتوں کو شادی سے قبل اکثر شکایات پیدا ہو جاتی ہیں اور انکے فزیالوجیکل اعمال اپنی رفتار طبیعی پر نہیں چلتے ہیں۔ ابھی سال ہی بھر کا عرصہ ہوا ہی کہ امریکا میں امراض نسواں کے سپشلسٹ ڈاکٹروں کی ایک کمیٹی اسی تحقیقات کی غرض سے بیٹھی ان میں سے ایک حاذق طبیب نے یہ بیان کیا کہ اکثر وہ عورتیں جنکے علاج کرنے کا اسکو اتفاق ہوا ہی ان میں یہ بات خاص طور پر دیکھی گئی ہی کہ وہ کسی عمل طبیعی کی برداشت کی قابلیت نہیں رکھتیں۔ جسکا بڑا سبب یہ ہی کہ درد و تکلیف کے متعلق انکا احساس نہایت درجہ بڑھا ہوتا ہی اور انکے پٹھے کمزور ہوتے ہیں۔ اس ڈاکٹر کے بیان کی اور دوسرے ڈاکٹروں نے بھی تائید کی۔ لیکن اس کمزوری کے سبب میں اختلاف ہا۔ بعضوں نے تو یہ بیان کیا۔ اس دس برس کی مدت میں جو کالج سے نکلنے اور شادی کے درمیان میں گذرتی ہی بے اعتدالیوں کا زیادہ موقع ملتا ہی۔ یہ زمانہ چونکہ لہو و لعب میں کٹتا ہی اسلیے شب بیداری کا

اکثر اتفاق ہوتا ہے۔ پوری طرح ریاضت جسمانی کا موقع نہیں ملتا اور نہ کھانے ہی میں اعتدال اور وقت کی پابندی ہو سکتی ہے۔

لیکن میری رائے میں سب سے بڑا سبب ان کمزوریوں کا پڑھنے کا زیادہ مشغلہ رہنا ہے کیونکہ دن رات کی محنت دماغی انکو اول تو کافی دہوپ کھانے نہیں دیتی اور نہ صاف ہوا ہی انکو نصیب ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ خون جو بلوغ کے وقت اعصاب کے بڑہاؤ کے لیے ضروری ہوتا ہے وہ دماغ کی طرف چلا جاتا ہے تیسرے انکے دماغی دوگنی کے سبب سے قوت ہاضمہ اور پٹھوں سے زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ چوتھے یہ کہ اپنی طبیعت پر وہ تاری کرنے کے متعلق زور ڈالتی ہیں اور چھبیس و ستائیس برس تک تجرد کی زندگی بسر کرتی ہیں جس کی تنہا مدت عورتوں کے لیے اٹھارہ سال ہے۔ پانچویں انکے لوازمات زندگی اس درجہ وسیع ہو جاتے ہیں کہ وہ کسی نوجوان سے جو کیسا ہی قوی اور توانا ہو اگر خوش حال نہیں ہے شادی کرنا نہیں گوارا کرتی ہیں۔

اس بحث کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جس کی طرف بہت کم التفات کیا جاتا ہے اور جسکو اس مسالہ سے بڑا اہم تعلق ہے اور وہ یہ کہ جب کسی شخص کی ترقی عقلی انتہائی درجے پر پہنچ جاتی ہے تو اسکی حاجات و ضروریات و مطالب بھی بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ہمکو معلوم ہے کہ قناعت کامیابی کا جزو اعظم ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اعلیٰ درجے کی تربیت کیا انسان کو اس کی موجودہ حالت پر قناعت کرنا سکھلاتی ہے یا اُس کی خواہشات کو اور زیادہ بڑہا دیتی ہے ؟

کیا وہ عورت جسنے علوم و فنون حاصل کیے ہیں قناعت کر سکتی ہے نہیں کبھی نہیں بلکہ روزمرہ کتابوں کا جمع کرنا اور اس کے ساتھ ہی اور فیشن کی بہت سی چیزیں جنکو وہ لازمہ زندگی سمجھتی ہے انکا مہیا کرنا وہ بہت زیادہ ضروری جانتی ہے۔ کیا وہ ایسے شخص کے ساتھ شادی کرنا پسند کرے گی جو اسکے حوائج زندگی کو تو اچھی طرح مہیا کر دیگا لیکن ان بہت سی چیزوں کے مہیا کرنے پر وہ قادر نہیں ہے جنکو خود وہ عورت یوں تو فضول سمجھتی ہے لیکن بلحاظ فیشن انکا رکھنا نہایت درجہ ضروری جانتی ہے۔ ایسے شخص سے شادی کرنا وہ ضرور ناپسند کریگی۔ کیا ایسی عورت سے اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ اولاد

تربیت اچھی طرح کرسکے گی جو اپنا وقت فیشن کی فکر میں کاٹتی ہی

لوگوں کو عموماً اپنی اور اپنی اولاد کی نیک نامی کا بے حد خیال ہوتا ہی۔ وہ لوگ جو مردوں کی عصمت و عفت سے تھوڑا بہت بھی واقف ہیں انکا یہ خیال ہی کہ سب سے عمدہ طریقہ لڑکے کے چلن بد نہونیکا یہ ہی کہ لڑکے کی شادی پچیس برس کے سن میں کردی جائے اور جس لڑکی سے کیجائے اُسکا سن اٹھارہ کے اندر ہو۔ لیکن افسوس ہی کہ لوگ نتائج سے بے خبر ہیں اور انکو اس کی مطلق پروا نہیں ہوتی کہ سن کتنا بڑھا جاتا ہی کیا انکے سامنے اپنی اولاد کی اس ہونے والی ابتر حالت کا نقشہ نہیں کھنچ جاتا ہی۔ لوگوں کو یہ نہیں معلوم ہی کہ عورت کو چھبیس و ستائیس برس کے سن تک بٹھا رکھنے سے اُسکو شوہر ایسا ملتا ہی جو اپنی عصمت کو پہلی جوانی پر قربان کرچکا ہوتا ہی۔ اسی لیے عورتوں کو طرح طرح کے امراض پیدا ہوتے ہیں

سب سے بڑا اعتراض اعلی تعلیم پر یہ تھا کہ عورتوں کو کالج میں ریاضت جسمانی کا موقع نہیں ملتا لیکن جب سے کالجوں میں مختلف طریقے ریاضت جسمانی کے جاری ہوگئے ہیں اُسوقت سے یہ اعتراض دور ہو گیا ہی مگر ایک اعتراض عورتوں کی اعلی تعلیم پر ایسا ہی جسکا کوئی جواب ہی نہیں ہی اور وہ یہ ہی کہ اعلی تعلیم حاصل کرنیکے بعد ان میں تکبر و غرور حد درجے کا بڑھجاتا ہی۔ وہ تعلیم [illegible] تمام ہر کام جو مرد کرسکتے ہیں کرتی ہیں اور بھی [illegible] زیادہ بھی کرسکتی ہیں مگر یہی احساس انکو خود مختار [illegible] لاپروا۔ یہی خود مختاری اور لاپروائی اسکا باعث ہوتی ہی کہ ان میں الفت و عزت و اطاعت ان نوجوانوں کی نہیں پیدا ہوتی ہی۔ جو علم میں تو انکے ہم پلہ ہیں مگر کاروبار کی ابتدائی حالت میں ہونیکی وجہ سے صرف بقدر کفاف تو انکے لیے روپیہ مہیا کرسکتے ہیں ہاں البتہ انکی فرمائشات کو نہیں پورا کرسکتے۔ اس تکبر کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ اکثر مردوں کی عمر یوں ہی گزرجاتی ہی اور وہ کنوارے رہ جاتے ہیں یا کسی کمتر درجے کی عورت سے انکو شادی کرنا پڑتی ہی۔ جو انکے ہم پلہ نہیں ہوتی لیکن چونکہ اس قناعت و اطاعت کا مادہ بہ نسبت اعلی تعلیم یافتہ عورت کے زیادہ ہوتا ہی۔ اسلیئے شوہر کو زیادہ تکلیف نہیں اُٹھانا پڑتی اور ادھر تعلیم یافتہ عورت کا یہ حال ہوتا ہی کہ اُس کی نکتہ چین نظر اسکے لیے

کوئی شوہر تلاش ہی نہیں کر سکتی۔ گو کبھی ایسا ہوتا ہو کہ عورت جب کالج سے تعلیم پاکر نکلتی ہو تو اس کی صحت بھی اچھی ہوتی ہو اور خواہشات بھی اعتدال پر ہوتی ہیں مگر ایسی صورتیں شاذ و نادر ہوتی ہیں۔ جنپر کوئی کلی حکم نہیں قائم کیا جا سکتا۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت عموماً مومنہ و زوجیت کی تکالیف نہیں برداشت کر سکتیں جب تک انکو کوئی ایسا شوہر نہ ملجائے جو بے حد ناز و نعم میں رکھ سکے اور جتنی اُن کی خواہشات عقلی ہوں وہ پوری کر سکے۔ تھیٹروں و موسیقی گھروں کی انکو خوب سیر کرلے۔ غرض اس عیش و عشرت کا نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ مرد کے آرام میں تو خلل پڑتا ہی ہو خود عورت کی صحت خراب ہو جاتی ہو۔ یہ ہیں خیالات ہمارے لیڈروں کے جنکی ہم تقلید کرتے ہیں۔ امریکا و یورپ کی عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کے متعلق اگر خدانخواستہ ہم میں یہ مرض پھیل گیا تو ہماری حالت نہایت درجہ قابل افسوس ہوگی۔

(ضیاء الحسن علوی)

خدیجہ بنت القیم

یہ فن حدیث کی امام اور ادب میں یکتائے روزگار خاتون جنکا نام نامی زیب عنوان ہو، حکام قیم ناطوری کی صاحبزادی تھیں جنکا وطن بغداد تھا۔ یہ علمی دنیا میں امۃ العزیز کے معزز لقب سے معروف ہیں سنہ ۔۔۔ھ میں پیدا ہوئیں۔ اُس زمانہ کے مسلمان اب کی طرح عورتوں کو تعلیم و تربیت سے محروم نہ رکھتے تھے بلکہ وہ برگزیدہ لوگ خدا اور رسول کے احکام کی پوری پابندی کرتے اور ذیل کے نہایت دانشمندانہ مقولوں پر عمل کرتے تھے

(۱) کسی مرد کو تعلیم دینا دنیا میں ایک ایسے فرد کو تعلیم دینا ہو جسکا کوئی اثر اُسکے مرنے کے بعد باقی نہیں رہتا۔ لیکن ایک عورت کو تعلیم دینا گویا آیندہ نسلوں کو تعلیم دینا اور انکو سدھارنا ہو۔

(لیبولے)

(۲) عورتوں کی تعلیم و تربیت سے مردوں کے چال چلن پر ایک شریفانہ اور مہذبانہ اثر پڑتا ہی اسلیے اگر کوئی قوم اپنی عورتوں کی تعلیم و تربیت سے غافل رہیگی تو گویا وہ جرم خودکشی یا قتل نفس

کی مرتکب ہوگی اور اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتوں سے ہلاک۔ تباہ و برباد کریگی۔ جن ممالک میں عورتیں جاہل اور ناتعلیم یافتہ رکھی جاتی ہیں وہاں مردوں کی تعلیم بھی ایک غیر فطری یا مصنوعی چیز ہوتی ہے۔ جسکو کسی قسم کی کوئی پایداری نہیں۔ ایک دفعہ عورتوں کے دلوں میں تعلیم و تربیت کا بیج بودو اور پھر تم یہ دیکھوگے کہ تعلیم کا درخت خود بخود بڑہیگا اور ساری قوم کو فائدہ پہنچائیگا۔ عورتوں کی تعلیم سے صرف قوم کے وہ افراد ہی تعلیم یافتہ نہیں ہوتی ہیں بلکہ تمام خاندان اور ساری قوم کی قوم تعلیم یافتہ ہوجاتی ہے۔"

(آنریبل مسٹر بڈوڈ)

(۳) مرد ویسے ہی بنجاتے ہیں جیسا کہ عورتیں انکو بنانا چاہتی ہیں۔ پس اگر تم ایسے مردوں کو پیدا کرنا چاہتے ہو جن کی ہمتیں بلند ہوں اور جنکے اخلاق عمدہ ہوں تو عالی ہمتی اور حسن اخلاق کی تعلیم پہلے عورتوں کو دو۔"

(روسو)

(۴) جب کوئی عورت کسی کتاب کو پڑہ لیتی ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس کتاب کو اُسکے شوہر و اُس کی اولاد نے بھی پڑہ لیا

(لامارٹین)

(۵) ہر ملک۔ ہر قوم اور ہر مذہب میں انسان ایسا بنتا ہے جیسا اُس کی ماں بناتی ہے۔

(سر ایڈمنڈ ورتی)

غرض اس مقدس خاتون کی تعلیم اس زمانہ کے دستور کے موافق نہایت عمدگی سے بہت اعلیٰ ہوئی اور اپنے وطن کے مشہور اساتذہ سے فیضیاب ہونے کے بعد امۃ العزیز نے سیر و سیاحت کا تہیہ کیا اور ارض شام میں پہنچکر مختلف علماء سے درس لیے۔ مصر میں ابن میری اور علی بن مختار عامری کے درس و تدریس میں مدت تک شریک رہیں۔ انکے علم و فضل کا شہرہ دُور دُور تک پہنچا۔ فن حدیث میں یہ امام مانی اور ادب میں یگانہ آفاق سمجھی جانے لگیں۔ ابتک تاریخ کے صفحات

اس فخر روزگار خاتون کے علم و فضل کے ذکر سے مرصع اور مزین ہیں۔ بالمختصر اپنی زندگی کو نہایت گزیدہ طریقہ سے گزار کر امۃ العزیز نے ۱۲۹۹ھ میں انتقال کیا۔ اور اب یہ ستودہ صفات مقدس خاتون اپنی لحد میں لیٹی ہوئی اپنی ہندوستان کی مسلمان بہنوں کی حالت زار کو چشم عبرت سے دیکھ رہی ہے کہ اسکے بعد دنیا میں کیا انقلاب آیا اور اسی قوم میں جس کی عورتیں پہلے تعلیم میں شہرۂ آفاق تھیں آجکل پڑھی لکھی عورتوں کا کال ہے اور عورتوں کو پڑھانا گناہ عظیم سمجھا جاتا ہے۔ افسوس ہزار افسوس!!

اس معزز خاتون کی قبر سے گوش دل سے سننے والوں کو یہ صدا آ رہی ہے کہ

نہ دینگے ہند میں گر در اب تعلیم نسواں پر
رہیگی مرکز بقل جہالت یہ زمیں برسوں

(سید خورشید علی حیدرآباد)

علم و اوہام

ایک دشمن خیال انشا پرداز لکھتا ہے کہ اوہام کی کالی گھٹا، جو نوع انسان کی عقلوں پر چھائی رہتی ہے، نہیں پھٹتی اور نہیں مٹتی؛ جب تک کہ اُسپر علم کی تیز کرنیں جلوہ افگن نہ ہوں اور شرمناک عادتوں اور بیہودہ رسموں کی فوجیں شکست کھا کر نہیں بھاگتیں؛ جب تک کہ علم اپنی چمکتی تلوار میان سے نکالکر علم نہ کرے۔

علم اگر مجسم ہو جائے، تو سراپا نور کی تصویر نظر آئے گی۔ اور اگر جہالت مجسم ہو جائے. تو تاریکی کی خوفناک شکل دکھائی دیگی۔

جہل انسان کی زندگی میں ایسا ہی ہے جیسے کوئی اندھیرے میں ٹاکٹوئیاں مارتا پھرتا ہو۔ کبھی سیدھے راستے پر پڑ لیتا اور کبھی اُس سے بھٹک جاتا ہو۔ انسان اُسیقدر راہ راست پر چلتا ہے، جسقدر کہ علم کی روشنی اُسکے ساتھ ہوتی ہے۔ اگر خدا کسی انسان کو علم کی روشنی بہت زیادہ عطا کرتا ہے تو وہ اور انسانوں سے زیادہ راہ راست پر چلتا ہے اور کبھی نہیں بھٹکتا اور اگر کسی انسان نے علم کی تھوڑی سی روشنی پائی ہے اور دھیمی سی چمک اُس کے ہاتھ آئی ہے، تو وہ کبھی راہ راست پر چلنے لگتا ہے اور کبھی

حیران ہوکر کھڑا ہو جاتا ہی، مگر وہ بدنصیب انسان، جسکو خدا نے روشنی بالکل عطا نہیں کی اور جس کے سامنے تاریکی کے سوا کچھ نہیں ہی، وہ کبھی ہدایت نہیں پاتا اور کبھی منزل مقصود پر نہیں پہنچتا۔

جو قوم سست و کاہل ہو، مفلس و محتاج ہو، بُری عادتوں کے پنجے میں گرفتار ہو، بیہودہ اوہام کی زنجیروں میں مسلسل ہو، اُس میں اتفاق و اتحاد پیدا نہیں ہوتا؛ جب تک کہ علم کا نور اُسکے افراد میں نہ پھیلے اور جب تک کہ اس قوم کے نوجوان صحیح تعلیم اور سچی تربیت کے زیور سے آراستہ نہ ہوں۔ تعلیم و تربیت پانے کے بعد ہر قوم کی آنکھیں کھلتی ہیں اور اُنکو گرد و پیش کا منظر صاف صاف نظر آنے لگتا ہی۔ اگر کوئی جاہل قوم، جو بُری رسموں اور بیہودہ وہموں میں چاروں طرف سے گھری ہوئی ہو، اُن رسموں اور وہموں سے نجات چاہتی ہی، تو اُسکے لیے علم سے بڑھ کر کوئی علاج نہیں ہے۔

جب کسی قوم میں سچے علم کے اُصول پھیل جاتے ہیں، تو وہ قوم یکایک خواب غفلت سے بیدار ہو جاتی ہی اور اپنی بُری رسموں کی درستی میں سرگرمی دکھانے لگتی ہی۔ پھر تمام قوم کو تندرستی کی، وقت کی اور علم و عمل کی قیمت معلوم ہو جاتی ہی اور وہ کوشش کرتی ہی کہ ان فوائد کو آسان طریقے سے حاصل کرے اور کامیابی کی بلندی پر پہنچ جاے۔

روشن خیال مضمون نگاروں نے سالہا سال تک اس امر پر بحث کی ہی کہ مشرقی قوموں کی اور خاص کر مسلمانوں کی تنزل یافتہ قوم کی اصلاح کا طریقہ کیا ہو سکتا ہی اور وہ آخر کار اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس غرض کے لیے علم کی اشاعت سے بڑھ کر کوئی مفید طریقہ نہیں ہو سکتا۔ اُن کی رائے میں علم کی اشاعت لڑکوں اور لڑکیوں میں یکساں ہونا چاہیئے۔ لڑکیوں کے لیے علم کی ضرورت لڑکوں سے کسی طرح کم نہیں ہی۔ ہاں تم کو یہ کہنے کا بھی حق حاصل ہی کہ عورت کی درستی اور اصلاح پر تمام قوم کی درستی اور اصلاح موقوف ہی؛ اس لیے لڑکیوں کو تعلیم دینا لڑکوں کو تعلیم دینے سے زیادہ ضروری اور مقدم ہی۔

عورتیں ہی قوم کو بناتی ہیں اور وہی زمانہ آیندہ کے لیے مردوں کو طیار کرتی ہیں۔

گھر بھر کی تندرستی، خانہ داری کا انتظام، خانگی مصارف میں کفایت شعاری، بچوں کی پرورش

اور اُنکے دلوں میں قومی فیلنگ کا پھونکنا؛ یہ سب فرائض عورت کے ذمّے ہیں۔ وہی گھر کی مالک ہی۔ اُسی پر گھر کے تمام معاملات کا مدار ہی۔

خانگی زندگی میں چہل پہل اور شگفتگی اسی ایک بات پر موقوف ہی کہ عورت تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہو۔ اگر عورت جاہل ہوگی تو گھر والوں کی تندرستی خراب ہوگی۔ بچوں کی تربیت نکمّی ہوگی، خانگی اخراجات زیادہ ہونگے، عیش مکدّر ہوگا، اور گھر کا سارا انتظام درہم و برہم ہوگا۔ اگر گھر والے تندرست ہوں، بچے تربیت یافتہ ہوں، گھر کا خرچ اعتدال سے ہوتا ہو اور گھر صاف و پاکیزہ اور صحت بخش ہو تو اس سے بڑھ کر اور کونسی نعمت ہوسکتی، جس کی انسان آرزو کرے۔ خراب عادتیں اور فاسد عقیدے اکثر عورتوں ہی کے ہوتے ہیں۔ اُنھیں کا وجود بیہودہ رسموں کا سرچشمہ ہی اور اُنھیں کی ذات خوفناک وہموں کا منبع ہی۔ بدیوں اور جرائم اور خرابیوں کے جرائم متعدی بیماریوں کے جرائم کی طرح اُنکے وجود میں پیدا ہوتے ہیں اور اُنسے منتقل ہوکر بچوں تک پہنچتے، پھر تمام قوم میں پھیل جاتے ہیں۔

نظرِبد سے گھبرانا، جنّات سے خوف کرنا، فرشتوں سے دہشت کھانا۔ رجال غیب سے مدد مانگنا، جادو، طلسم، جھاڑپھونک، نجوم و رمل، جنتر منتر، فال و تعبیرِ خواب وغیرہ وہموں میں مبتلا رہنا، یہ سب عورتوں کا کام ہی اور اُنکے کمزور جاہلانہ دلوں پر جسقدر ان وہموں کا اثر ہوتا ہی اُسقدر تعلیم یافتہ عورتوں کے دلوں پر نہیں ہوتا۔

جب اس طرح کے اوہام عورتوں کے دل و دماغ کو گھیر لیتے ہیں، تو گھر کے آرام و راحت میں خلل آجاتا ہی اور مردوں کی زندگی ایسی عورتوں کی رفاقت میں تلخ و مکدّر ہوجاتی ہی۔

اکثر دیکھنے میں آتا ہی کہ عورتوں کی رضامندی اور خوشنودی کے لیے یا اُنکے غصے اور چیخ و پکار سے بچنے کے لیے مردان بیہودہ باتوں میں اپنا روپیہ بیدریغ صرف کرڈالتے ہیں۔

جاہل عورت اپنے شوہر کے ساتھ کبھی راضی نہیں رہتی، گو کہ وہ کیسا ہی عقلمند اور ذی شعور ہو، اور اگر کسی وقت اتفاقاً راضی ہوتی ہی تو دوسرا وقت ایسا آتا ہی کہ وہ اُس سے بحث و تکرار پر کمربستہ ہوجاتی ہی اور اُسکو اپنی اطاعت پر مجبور کرنا چاہتی ہی۔

مرد جو عورتوں کے اوہام و خرافات کے ساتھ موافقت کرتے اور ایسے موقعوں پر اُنکے ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، اسکا سبب یہ ہوتا ہی کہ اُنکے دل کمزور ہوتے ہیں اور اُن کی ہمتیں پست ہوتی ہیں، ہم یقین کرتے ہیں کہ یہ دلوں کی کمزوری اور ہمتوں کی پستی اُن کو اپنی ماؤں سے وراثت میں ملی ہی اور عورتوں نے بچپن میں جو تربیت اُنکو کی ہی اُسکا اثر بھی غالب ہی۔

بعض دفعہ مرد کے مغلوب ہونے کا سبب یہ ہوتا ہی کہ اُس کی عورت زبان دراز ہوتی ہی یا اپنے حسن و جمال پر مغرور ہوتی ہی، مرد کبھی خیال کرتا ہی کہ اگر وہ اپنی عورت کا مقابلہ کرے گا تو اسکا نتیجہ نقصان اور تکلیف کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ کبھی سوچتا ہی کہ اگر میں نے عورت کی بات کو رد کیا اور اُسکے وہم کی تردید کی اور اُسکے ساتھ سختی سے پیش آیا، تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اُسپر کوئی اثر نہیں پڑیگا، بلکہ وہ بہت غضبناک ہوگی اور کینہ توزی کے ساتھ پیش آئیگی۔ ممکن ہی کہ اُس کی مخالفت سے کوئی ایسی تکلیف پیدا ہو، جو اس تکلیف سے کہیں زیادہ ہو۔ گویا وہ عورت سے مغلوب ہونے اور اُس کی اطاعت قبول کرنے میں اس حدیث پر عمل کرتا ہی کہ "جب تم دو بلاؤں میں مبتلا ہو، تو وہ بلا اپنے لیے پسند کرو، جسکا برداشت کرنا زیادہ آسان ہو۔

غرضکہ یہ تمام خرابیاں، جو ہمارے گھروں میں ہیں اور یہ تمام اوہام، جو ہمارے گھروں کی چار دیواری کے گرد چھائے رہتے ہیں، اس سبب سے ہیں کہ ہم نے عورتوں کو جاہل رکھا ہی اور اُنکے دل و دماغ کو علم کی روشنی سے منور نہیں کیا اور اُن کی طبیعتوں میں شرافت اور تہذیب کا بیج نہیں بویا۔ اگر ہم عورتوں کو تعلیم دیں اور اُنکو سچی تربیت کے زیور سے آراستہ کریں اور اُنکو اُن کے فرائض سے آگاہ کریں اور اُنکو انسانیت اور شائستگی کی بلندی پر پہنچائیں، تو پھر کوئی خرابی ہماری قوم میں باقی نہیں رہ سکتی۔ اس صورت میں ہمارے بچے تندرست پیدا ہوں گے اور تندرست رہینگے اُنکے اخلاق نہایت پاکیزہ اور لطیف ہونگے۔ اُنکے جذبات نہایت شائستہ اور درست ہونگے۔ وہ نہایت آسانی سے علم کی کٹھن منزلیں طے کرینگے۔ وہ نہایت سہولت سے عمل کے فراخ میدان میں قدم بڑہائینگے۔ اُنکو اپنے مذہب کے ساتھ محبت ہوگی۔ اپنی قوم کے ساتھ ہمدردی کا رشتہ ہوگا

اس بیان سے صاف ظاہر ہی کہ لڑکوں کی تعلیم بھی ضروری ہی! مگر اس سے بہت زیادہ ضروری لڑکیوں کی تعلیم ہی! کیونکہ بغیر لڑکیوں کی تعلیم کے لڑکوں کی تعلیم مکمل نہیں ہو سکتی اور وہ ہماری قوم کے لیے زمانہ آیندہ میں مفید اور کارآمد افراد نہیں ہو سکتے۔

(انسٹیٹوٹ گزٹ)

سمندر کے کنارے ایک شام

وہ نور کا ٹکڑا جسے لوگ آفتاب کہتے ہیں دن بھر ہمارے دنیوی جھگڑوں کو دیکھ دیکھ کر تھک گیا۔ اب وہ بھی ہم سے بیزار ہو کر مغرب کیطرف آہستہ آہستہ جا رہا ہی۔ اسکا رنگ کیسا زرد پڑ گیا ہی معلوم ہوتا ہی کہ یہ بھی ہماری وحشیانہ حالت دیکھکر سہم گیا مگر جاتے جاتے اپنی محبت اور ہمدردی کا ثبوت دیے ہی جا رہا ہی وہ پیاری پیاری زرد زرد شعاعیں کسقدر بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ سیدھی کنارے پر جہاں میں بیٹھا ہوا ہوں کس تیزی سے پڑ رہی ہیں۔ کالے کالے پتھر بھی اسوقت سنہرے ہو گئے ہیں اطراف میں دیکھا بھی مگر کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ نہ کوئی انسان ہی نہ حیوان۔ صرف میں ہی میں ہوں کالے کالے پتھروں پر بیٹھا ہوا ہوں۔ مگر نہیں میرے ساتھ ایک اور بھی ساتھی ہی۔ یہ مجھ سے کبھی جدا نہیں رہتا۔ ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ہی۔ خواہ میں کیسی حالت میں ہوں یا کسی جگہ پر اسکے ساتھ رہنے سے تنہائی میں میرا جی بہلتا ہی۔ سستی اور کاہلی کبھی پاس پھٹکنے تک نہیں۔ کچھ نہ کچھ سوچا کرتا ہی۔ اسی سے باتیں کرتا ہوں۔ یہ مجھے اچھی اچھی تصویریں دکھلاتا ہی۔ دل بہلاتا ہی۔ غرض میرا بڑا وفادار دوست اور ساتھی ہی۔ مگر اسوقت نہ تو میں اسکا ساتھ دیرہا ہوں نہ اُس سے باتیں کرتا ہوں۔ صرف نیچر کے کرشمے اور انداز سے جی بہلا رہا ہوں۔ ہوا بھی کیا آہستہ آہستہ چل رہی ہی گویا ہے ہی نہیں۔ سمندر بھی کیا دھیمے دھیمے موجیں لے رہا ہی۔ نہ پرندہیں جو شور وغل مچائیں۔ نہ درخت قریب ہیں جنکے پتوں سے آواز آئے اور مخل ہو۔ کیا سکوت کا عالم ہی۔ ہر چیز پر خموشی برس رہی ہی۔ جدھر نظر ڈالو سناٹا ہی سناٹا ہی اس خاموشی کو دیکھکر زبان سے یہی نکل آتا ہی کہ کاش ساری دنیا پر ایسی خموشی چھا جاتی۔ تو

پھر کہیں رونے پیٹنے کی صدا آتی نہ کہیں جھگڑے فساد کا غل مچتا نہ کہیں ہنسنے اور قہقہوں
کا شور ہوتا۔ ہر چیز پر گویا رحمت برسنے لگتی۔ ہر جنس بشر کو اپنے پیدا کرنے والے کی قدرت پر غور
کرنے اور سوچنے سمجھنے کا موقع ملتا۔ مگر یہ کہاں۔ دنیا اور اس میں ایسی باتیں۔ توبہ توبہ۔ یہیں
تو وہی دھینگا مشتی وہی مارپیٹ اور وہی رونا دھونا رکھا ہی۔ تھوڑی دیر میں اسی اپنے زین
نے زور سے میرے ایک چٹکی بھری اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ مینے بھی شوق سے کچھ اُسکی
سُنی کچھ اپنی سُنائی۔ پھر جو دیکھتا ہوں تو آفتاب غروب ہو گیا۔ آسمان پر شفق پھوٹ آئی اور اُسکی
کچھ ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی ہی۔ سمندر میں موجیں بھی برابر اسی طرح سے خراماں خراماں یکے بعد
دیگرے چلی آ رہی ہیں۔ میرے پیروں کے پاس آ آ کر ٹکراتی ہیں اور پھر نیست و نابود ہو جاتی ہیں
ان بیچاریوں کو یہ کیا سوجھتی ہی۔ کیوں اتنی تکلیفیں اُٹھاتی ہیں۔ یہاں تک کیوں اُبھر اُبھر کر آتی ہیں۔
کیا زحمت اور پھر کسقدر فضول۔ یہ دیکھنا وہ سامنے ایک موج کسقدر شوق سے بڑھی چلی
آ رہی ہی۔ کیا تیز آ رہی ہی۔ سطح سے اوپر کو کسقدر اُبھر آتی ہی اور پھر کس خوبصورتی سے پلٹا کھاتی
ہی۔ ساحل پر جلد پہنچنے کی کوشش کر رہی ہی۔ آہا یہ بڑھی۔ یہ لپکی۔ آ آ او موج۔ بس اب تھوڑا ہی
فاصلہ رہ گیا۔ جیسا تجھے میرے پاس آنے کا شوق ہی ویسا ہی مجھے بھی تیری اس زحمت کا
نتیجہ دیکھنے کا شوق ہی۔ ہاں بڑھی آ۔ چلی آ۔ ہاں ابکے تو پہنچ ہی گئی۔ ہیں مگر یہ کیا۔ یہ تو پریشان
کیوں ہو گئی۔ تیری ہستی مٹ کیوں گئی۔ ساحل پر پہنچتے ہی تو ٹکرا گئی۔ پھیل گئی اور برباد ہو گئی
یہ کیوں۔ یہ تجھے کیا ہوا۔ میں تو سمجھا تھا کہ تو بہت کچھ کر گزریگی مگر تو تو جتنے زور سے آئی تھی اُتنے
ہی زور سے ٹکرا کر غائب ہو گئی جتنے شوق سے بڑھی تھی اُتنی ہی مایوسی سے نابود ہو گئی۔ کیوں
یہ کیا ہوا۔ ہاں اب میں سمجھا۔ تو نے دھوکا کھایا تو اس ساحل پر پہنچتے ہی نا امید ہو گئی۔ تجھے
اس دنیا سے بہت کچھ توقع ہو گی تو سمجھی ہو گی کہ یہاں نیکی ہی نیکی ہی۔ یہاں کے رہنے والوں کی
زندگی خوشی اور مسرت میں گزرتی ہو گی۔ یہاں کے باشندے مصیبت اور رنج کے نام سے واقف بھی
نہ ہونگے۔ یہی وجہ تھی کہ تو مایوس ہو گئی۔ میری طرح تو نے بھی دھوکا کھایا۔ تجھے یہ کیا معلوم کہ یہاں

برائی بھی بُرائی ہے۔ تو یہ کیا جانے کہ اس دنیا میں نیکی۔ وفاداری۔ محبّت اخلاص وغیرہ نام کو بھی نہیں۔ مگر تو مجھ سے زیادہ خوش قسمت ہی۔ ساحل پر پہنچتے ہی اس بیوفا دنیا کی بدبوں نے تیری دماغ پر اثر کیا۔ تو یہاں کی ناگفتہ بہ حالت کو تاڑ گئی۔ ناامید ہوگئی۔ سر پٹیا۔ پچھاڑیں کھائیں اور اپنی ہستی کو مٹا دیا۔ ایک میں ہوں کہ جب سے آیا ہوں پریشان ہوں۔ ہزاروں فکروں میں مبتلا ہوں ہر چیز سے تنگ آگیا ہوں، یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں مگر نکل نہیں سکتا۔ بچنا چاہتا ہوں مگر بچ نہیں سکتا۔ مٹ رہا ہوں برباد ہو رہا ہوں مگر چپ ہوں کاش کہ میں تجھسا خوش قسمت ہوتا کاش کہ میں تجھسا بلند شناس ہوتا کہ اس دنیا میں داخل ہوتے ہی تیری طرح مایوس ہوکر پچھتاتا۔ سر پٹیتا ٹکریں کھاتا اور مرجاتا۔ مگر وہ دیکھنا۔ وہ اور موجیں برابر چلی آرہی ہیں۔ اے پیاری پیاری موجو اے سمندر میں گزرنے والی موجو — اے ننھی ننھی کھیلتی کودتی موجو۔ تم یہ زحمت کیوں اُٹھاتی ہو۔ اس طرف کیوں بڑھی چلی آتی ہو۔ بجز ناامیدی کے یہاں کیا رکھا ہی۔ برائی۔ بدنوائی دشمنی یہاں کے باشندوں کا پیشہ ہی۔ بغض۔ حسد کینے نے یہاں کے لوگوں کے دلوں میں گھر کرلیا ہی۔ اپنے ہم جنس ہی کو ستانا۔ ایذا پہنچانا۔ تکلیف دینا یہاں کے بسنے والوں کا شیوہ ہے۔ کیا تم یہ نہیں دیکھتیں کہ یہاں پرند پرند کو مارتا ہی، جانور جانور کو پھاڑ کھاتا ہی اور انسان جسے اللہ تعالےٰ نے اشرف المخلوقات بنایا ہی۔ جسے عقل و فہم دی ہی جسے سوچنے سمجھنے کا مادہ عطا کیا ہی۔ وہی انسان اپنے بھائی کی برائی کرتا ہی، اُسے ضرر پہنچاتا ہی اور رات دن اسی فکر میں مبتلا رہتا ہی کہ اپنے ہمجنس کو نقصان پہنچائے۔ اپنے ہمسایے کا بُرا کرے۔ اپنے بھائی کو مار آستین بنکر ڈسا کرے اے پیاری پیاری موجو کیا تم ایسی دنیا میں آنا گوارا کروگی۔ نہیں۔ تو پھر یہ اشتیاق کیسا۔ یہ شور، زور کیوں۔ ہاں۔ دھوکا دھوکا۔ تم دھوکے میں آرہی ہو۔ دھوکا، فریب، دغابازی تو یہاں کے ذرّے ذرّے میں ہی۔ کوئی چیز اصلی نہیں ہی۔ کسی شے میں سچائی نہیں، ہر چیز یہاں کی دیکھنے والونکو فریب میں لاتی ہی۔ غرض یہ بُری جگہ ہی۔ تم یہاں نہ آو۔ اس دھوکے سے بچو۔ جاؤ، موجو واپس جاؤ، میرا کہا مانو۔ مجھے خود دیکھو۔ میں اس سے بیزار آگیا ہوں۔ کہیں اور ٹھکانا کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں سے

الگ رہنا چاہتا ہوں۔ کاش کہ میری یہ آرزوئیں پوری ہوتیں۔ کاش کہ میں یہاں لایا بھی جاتا۔
اے تیزی سے آنے والی موجو۔ اے سمندر میں پیدا ہونیوالی، اور زمین پر ٹکرا کر خاک میں ملجانے والی موجو۔ تم ذرا اپنی اس خوش و خرم حالت کو تو دیکھو۔ اپنی اس آزادی کا تو خیال کرو، کس مزے میں تم کھیلتی کودتی ہو۔ کیسی بشاش ہو۔ تمہاری ہر ادا سے مسرت ٹپکتی ہے تمہاری ہر بات سے خوشی کا اظہار ہوتا ہے۔ تمہاری ہر لہر پر فرحت اور زندہ دلی لہرا رہی ہے۔ تم اپنی ہمجولیوں سے کیسے اتفاق سے رہتی ہو۔ ایک دوسری سے کیسی چمٹی ہوئی ہو۔ رنج و راحت میں ایک دوسری کا کیسے ساتھ دے رہی ہو۔ ایک ہم ہیں کہ عزیزوں سے الگ ہیں، دوستوں سے جدا ہیں۔ کسی کو اجل نے چھڑا دیا تو کسی کو دنیوی کاروبار نے الگ کیا۔ اور کسی کو فضول رسم و رواج نے پرے رکھا۔ ساتھ دینا تو درکنار صورت دیکھنے کو جی ترستا ہے۔ آزادی کہاں؛ آزادی کا صرف خیال کرنا بھی گناہ ہو جاتا ہے۔ تمھیں دیکھکر مجھے رشک ہوتا ہے۔ تمہاری حالت دیکھکر میرا جی تڑپتا ہے۔ کاش کہیں بھی تم میں سے ایک ہوتا۔ اے اچھلتی کودتی موجو۔ اے خوشنما موجو۔ اے بے فکر و خوش و خرم موجو۔ میرے پاس نہ آؤ۔ یہاں آنیکا خیال دل سے دور کرو۔ جاؤ۔ جاؤ۔ یہاں سے دور جاؤ۔ اتنے میں میرے مونس۔ میرے تنہائی کے ساتھی تصوّر نے میرے پہلو میں پھر ایک زور سے چٹکی بھری۔ میں چونک پڑا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ واقعی میرے اس کہنے کا اثر ان پیاری موجوں پر خوب ہوا۔ اور وہ آہستہ آہستہ مجھ سے پرے کو ہٹنے لگیں۔ ہٹتے ہٹتے اب بڑی دور چلی گئیں۔ میں خوش ہو گیا۔ دل کو اطمینان ہوا۔ اسوقت چونکہ اندھیرا زیادہ ہو چلا تھا میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھا اور اپنے دوست تصوّر سے باتیں کرتا ہوا چلا گیا۔"

راقم محمد احمد خدنگ

نصاب تعلیم نسواں کی اسکیم

ہمارے معزز و محترم دوست ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب ایل۔ ایل۔ ڈی اسکیم مندرجہ ذیل لکھکر

پیش کرتے ہیں۔ ہم اسکو خاتون میں اس غرض سے درج کرتے ہیں کہ ناظرین خاتون اسپر اپنے مفید
مشورے اور صلاحیں دیں تاکہ اسکے بعد جو کمیٹی نصاب کے آخری فیصلے کے لیے بیٹھے وہ انکی
رایوں پر اچھی طرح غور کر سکے۔

اڈیٹر

تمہید

تعلیم نسواں میں اسوقت ملک کو سب سے زیادہ ضرورت استانیوں کی ہی۔ اور اسی ضرورت کو
محسوس کرکے علیگڑھ میں صیغہ تعلیم نسواں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی زیر نگرانی استانیوں کی تعلیم
کے لیے ایک مدرسہ کھولنے کی تجویز ہی۔ اسلیے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسوقت ایسے لوگ موجود ہیں
جو اپنی لڑکیوں کو تعلیم کے لیے باہر بھیجنے پر بشرطیکہ تعلیم و تربیت اور پردے کا عمدہ انتظام ہو طیار ہیں
ایسے والدین کی تعداد گو اسوقت کم ہی مگر یقیناً مردوں کی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ بڑھتی جاتی ہی۔
اسکے علاوہ ہمکو استانیوں کی کلاس میں کافی تعداد کا بہم پہنچانا مشکل ہوگا اور اس تعداد کو بہم پہنچانے
کے لیے چھوٹی لڑکیوں کو تعلیم دینے کی ضرورت ہی جو کہ آیندہ چلکر استانیاں بنجاویں۔ ایک ہی مدرسے
میں لڑکیوں اور استانیوں کی تعلیم کا سامان مہیا کرنا کوئی نئی چیز نہیں ہی۔ برلن کے مشہور مدرسے میں جسکو
ملکہ لوئیزا نے قائم کیا تھا یہی انتظام ہی۔ اس مدرسے میں صرف شرفا کی اولاد شامل کیجاتی ہی اور اسکی
شہرت اسقدر ہی کہ فرانس اور انگلستان سے لڑکیاں اس مدرسے میں آتی ہیں۔ استانیوں اور لڑکیوں
کی جماعتوں کا ایک ہی مدرسے میں ہونا لازم و ملزوم ہی۔ استانیوں کو عملی تعلیم کا موقع ملتا ہی لڑکیوں
کی نگرانی اور عام تعلیم میں استانی طلبا سے بہت مدد ملتی ہی۔ اسکول میں کنڈر گارٹن کلاسوں کے
کھولنے کی بھی دو وجوہات سے ضرورت ہی۔ اول یہ کہ اس طریقے کو قوم میں رواج دینے کے لیے
عملی طور پر اسکو چلا کر دکھانا چاہیئے دوسرے یہ کہ استانیوں کو بچوں کی فطرت سے واقفیت اور انکی
تربیت کا عملی طریقہ سکھلانے کے لیے چھوٹے بچوں کی کلاس کی ضرورت ہی۔ کنڈر گارٹن کے طریقے کی
محض کتابی تعلیم استانیوں کو کتنی اچھی کیوں نہ دیجائے۔ اس سے استانیوں کو نہ دلچسپی ہوگی اور نہ
انکی سمجھ میں آئیگا۔ بہت سے کھیل ایسے ہیں جنکے ذریعہ سے بچوں کے مختلف قویٰ کی تربیت کیجاتی ہی

کیا کوئی توقع رکھ سکتا ہی کہ اُستانیاں ان بچوں کے کھیلوں کو کھیلیں گی اور اگر انھوں نے سیکھ بھی لیے تو کیا ضمانت ہی کہ وہ بچوں کو اس میں دلچسپی پیدا کرا سکیں گی۔۱۱

ان تینوں صیغوں کے علاوہ ہمکو ایک اور چوتھا صیغہ خط و کتابت کے ذریعہ سے بھی تعلیم دینے کا جاری کرنا پڑیگا۔ کیونکہ بہت سی لڑکیاں خاندانی وجوہات سے کم عمر میں خواندگی پورا کیے بغیر چلی جائینگی اور بہت سی لڑکیاں ایسی ہونگی جو خانگی وجوہات سے ہرستے ہیں بالکل نہیں آسکیں گی

چاروں مختلف صیغوں کی مختصر تشریح

۱۔ **صیغہ کنڈرگارٹن**۔ اس صیغہ میں لڑکے اور لڑکیاں تین اور چار برس کی عمر کے درمیان شامل ہوں گی اور چھ سات برس کی عمر تک رہینگی۔ ان بچوں کے مکان سے لانے اور مکان پر پہنچانے کے لیے سواری کا خاص انتظام کیا جائیگا۔ ان بچوں کو مفصلہ ذیل چیزوں کی تعلیم دیجائیگی۔

(۱) **گفتگو**۔ الفاظ کی درستی۔ جملہ مکمل بولنے اور روزمرہ کی چیزوں سے واقفیت بڑھانے کیلیے گفتگو کیلیے علٰحدہ وقت کنڈرگارٹن کلاسوں میں ضروری ہی۔ بچے فطرۃً ایک لفظ میں جواب دیتے ہیں اور پورا جملہ نہیں بولتے۔ پورا جملہ بولنے کی مہارت کی خاص ضرورت ہی اور اسکے لیے اُستادوں کو خاص کوشش کرنی پڑتی ہی۔ اسی گفتگو کے گھنٹے میں بچوں سے دریافت کیا جائیگا کہ انھوں نے کل کیا کیا۔ اسکول جاتے یا آتے میں کوئی نئی چیز دیکھی۔ گھر پر اُنکے کوئی خاص بات ہوئی۔ موسم کے متعلق بھی گفتگو اسی میں شامل ہی۔

(۲) **باغ کی سیر**۔ کنڈرگارٹن کے لفظی معنی ہیں "بچوں کا باغ" اسکول کے ملحق چھوٹا سا چمن ہوگا۔ جس میں علاوہ درختوں کے مختلف اقسام کے پودے گملوں میں ہونگے۔ مختلف اقسام کے پلاؤ جانور بھی یہاں موجود ہونگے۔ آدھ گھنٹہ روز بچوں کو دکھایا جائیگا کہ پودوں میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ سائنٹیفک طریقے پر علم نباتات وحیوانات کی تعلیم دینا مقصد نہیں ہی۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہی کہ بچوں کو پودوں اور پھولوں سے دلچسپی ہو۔ اُنکے نام جہانتک ممکن ہو یاد کریں۔ اور کلی کے نکلنے کے وقت سے پھول کے مرجھانے تک جو جو تبدیلیاں ہوتی ہیں اُس طرف بچوں کو توجہ دلائی جاسے۔ جانوروں میں اُنکی معمولی

عادت۔ آواز دینے سے واقفیت کرائی جائے۔

(۳) **بچوں کو مشغول رکھنے کے کھیل** ان میں دو قسم کے کھیل شامل ہیں اول وہ جو کہ میدان میں متعدد بچے ملکر کھیلتے ہیں اور جس میں بچوں کو چلنے پھرنے اور مختلف اعضا کو حرکت دینے کی ضرورت ہو دوم وہ کھیل جو کہ کمرے کے اندر کھیلے جاتے ہیں جیسے تصویروں کے ٹکڑوں سے تصویریں بنانا۔ مکان بنانا۔ چھوٹی تیلیوں کو جوڑ کر کسی خاص شکل کو بنانا وغیرہ۔ ان کھیلوں سے اول تو بچے کو اپنی طبیعت کا خود بہلانا آتا ہے اور اس سے بچے کی ایجاد کی قوت بڑھتی ہے

(۴) **کنڈر گارٹن کھیل**۔ ان کھیلوں سے مراد ایسے کھیلوں سے ہے جن سے باقاعدہ تعلیم دیجا سکے رنگ اور فاصلہ پہچاننے کی قوتوں کی تربیت کرنا۔ مشابہت اور خوبصورتی کی عادت ڈلوانا۔ مربعوں مثلثوں اور مختلف شکلوں کی تمیز ہو جانا۔ ایسے کھیلوں کا بہت اچھا ذخیرہ اسکول میں موجود رہیگا اور تجربے سے جو کھیل زیادہ مفید ثابت ہونگے وہ رفتہ رفتہ اسکیم میں شامل کر لیئے جاوینگے۔

(۵) **دستی کام** جس سے ڈرائنگ اور نیز ایسی دستکاری مراد ہے جس سے ہاتھ کی صفائی حاصل ہو۔ اس میں لڑکوں کے لیے علاوہ ڈرائنگ کے کاغذ مختلف شکلوں میں کاٹنا کاغذ موڑ کر خاص چیزیں بنانا چٹائی بننا۔ تنکوں سے خوبصورت چھوٹے ٹوکرے بنانا شامل ہوگا۔ لڑکیوں کے لیے سوئی کا کام۔ گلوبند بننا وغیرہ ہوگا

(۶) **اُردو کا لکھنا اور پڑھنا**۔ شروع میں لڑکوں کو کسی خاص کتاب کے دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ حروف تہجی لکڑی پر یا موٹے ملٹ پر لکھکر لڑکوں کو دیجاویں اور وہ انھیں اپنی تختی پر یا کاپیوں پر نقل کر لیا کریں۔ بعد میں دو حرفی بامعنی الفاظ لڑکوں کو بتلائے جاویں اسکے بعد سہ حرفی وغیرہ

(۷) **حساب**۔ اس مدت میں جو کنڈرگارٹن صیغہ کے لیے تجویز کی گئی ہے۔ بچے کو گنتی۔ آسان۔ جمع تفریق۔ اور معمولی تحویل روپیہ آنہ پائی۔ من۔ سیر۔ چھٹانک کی پڑھائی جائیگی۔

(۸) **مذہب**۔ شروع میں بچے کو مذہبی کتاب بھی نہیں پڑھائی جائیگی۔ بلکہ قرآن شریف کے قصوں کو بطور کہانی لڑکوں کو سنایا جائیگا جن سے بچوں کو ہمیشہ دلچسپی ہوتی ہے۔

یہ مضامین گو گنتی میں آٹھ ہیں مگر اُن میں سب ایسے ہیں جس میں بچے بہت دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔

(۲) صیغۂ تعلیم

اس صیغہ کی اسوقت تشریح کی ضرورت نہیں ہی۔ اسکے متعلق ایک عام اسکیم شیخ عبداللہ صاحب نے خاتون..... میں چھاپی ہی چند فروعی باتوں میں لوگوں کو اُس سے اختلاف ہوگا۔ مگر عام اُصول اُس اسکیم کی نہایت عمدہ ہیں۔

صیغہ نمبر ۳

اُستانیوں کی کلاس کا صیغہ

اُستانیوں کی تعلیم کے بالفعل دو کورس ہونگے۔ ایک اُن اُستانیوں کے لیے جو ایک سال میں تعلیم ختم کرنا چاہیں اور ایک اُنکے لیے جو دو سال تک تعلیم حاصل کرنا چاہیں۔ اس صیغہ میں شامل ہونے کے لیے اُردو کا لکھنا پڑھنا۔ قرآن شریف اور تھوڑی سی حساب سے واقفیت ضروری ہی اور یہ بھی ضروری ہوگا کہ شامل ہونے سے پیشتر وہ کچھ حد تک سوئی کے کام سے بھی واقفیت رکھتی ہوں۔ بہت ممکن ہی کہ شروع میں ایسی عورتیں یا لڑکیاں اُستانیوں کی کلاس میں شامل ہونیوالی ہونگی۔ جو کہ کُل مضامین سے واقفیت نرکھتی ہونگی۔ انکے لیے ایک ابتدائی جماعت کمی کو پورا کرنے کیلیے کھولی جاویگی۔ اس طرح اس صیغہ میں تین جماعتیں ہونگی۔ جماعت ابتدائی۔ دوم سنہ اولی۔ سوم سنہ ثانیہ

جماعت ابتدائی۔ اس کی کوئی خاص خواندگی نہیں ہوگی بلکہ اس میں صرف وہی چیزیں پڑھائی جائینگی جنکی اُستانیوں کی کلاس میں داخل ہونے کی ضرورت ہی۔

سنہ اولی (۱) اُردو لٹریچر۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ اُستانیوں کو عمدہ کتابوں سے واقفیت ہو اور وہ تمیز کرسکیں کہ عمدہ کتابیں کون ہیں اور خراب کون ہیں۔ زیادہ توجہ اسپر کیجائیگی کہ وہ ہر کتاب کے متعلق اپنی ذاتی رائے قائم کرسکیں۔

(۲) حساب۔ آسان سوال جمع۔ تفریق۔ ضرب۔ تقسیم۔ سادہ و مرکب۔

علم ہندسہ۔ مربع۔ مستطیل۔ مثلث۔ وغیرہ کے اضلاع کو ناپ کر رقبہ نکالنے کے طریقے۔

(۳) **جغرافیہ**۔ نقشے اور کُرّے سے عام واقفیت

(۴) **مذہب اور مذہبی تاریخ**۔ پیغمبر اور اُنکے خلفا کے زمانے کی فتوحات۔ پیغمبروں کے قصے جو کہ قرآن شریف میں بیان کیے گئے ہیں ان سوال وجواب۔ قرآن شریف کے کچھ حصے کا ترجمہ اور فقہ۔

(۵) **اُمور خانہ داری اور حفظانِ صحت**۔ ان پر بیبیا اور راور مضامین پر شیخ عبداللہ صاحب کے نے سکشن تعلیم نسواں سے لکھاہی خاص رسالے لکھوانے پڑینگے۔

(۶) **اُصول تعلیم اور کنڈرگارٹن** ان کی کتابی اور عملی تعلیم بھی استانیوں کے لیے ضرور ہی ان چیزوں کو انکو آیندہ پڑہانا ہوگا۔

(۷) **کھانا پکانا اور سوئی کا کام اور اور دستکاری**۔ یہ توقع تو کوئی نہیں کرسکتا کہ ہر اُستانی پکانے میں اور ہر ایک قسم کی دستکاری میں بے مثل ہوگی۔ گو ہماری خواہش ہی کہ ایسا مگر یہ بہت ممکن ہی کہ ایک کسی چیز میں اچھی ہو اور ایک دوسری چیز میں۔

صیغہ نمبر ۴

خط وکتابت کے ذریعے سے تعلیم۔ یورپ اور امریکہ میں متعدد درسگاہیں موجود ہیں جن میں خط کے ذریعے سے تعلیم ہوتی ہی ظاہر معلوم ہوتا ہی کہ استاد اور شاگرد کا روبرو ہونا تعلیم کے لیے ضروری ہی۔ مگر خط وکتابت کی درسگاہوں نے حیرت انگیز نتیجے دکھلائے ہیں۔ ہر ایک فن کی خاص کتابیں تصنیف کی ہیں۔ ہدایتیں نہایت مفصل ایک خاص فارم پر لکھکر دیجاتی ہیں جنسے شاگرد خود پڑھ لیتے ہیں۔ خط وکتابت کے ذریعے سے ایک غیر زبان کی تعلیم بھی حروف تہجی سے لیکر اخیر تک دیجاتی ہی۔ اس طریقے کو جاری کرنے کے لیے شاید ضرورت ہوگی کہ ہمارے زنانہ مدرسے یا چند آدمیوں کو کسی مشہور خط وکتابت کی درسگاہ سے طریقہ سیکھنے کے لیے سبق لینے پڑیں۔ اگر لڑکی خط وکتابت کے ذریعے سے تعلیم حاصل کرنا چاہے تو تمام خط وکتابت سبق کے متعلق کے والد یا کسی اور شخص سے جنکو والدین پسند کریں کیجائیگی۔ پتے کے لفافے پر خط کے اندر

کاپی میں شاگرد یا اُسکے رشتے دار کا نام نہیں لکھا جائیگا۔ بلکہ صرف ایک نمبر لکھا جائیگا جسکی فہرست اسکول کی افسر اعلےٰ کے پاس رہیگی۔ اسکول کی افسر اعلےٰ ان خط وکتابت کو اپنے ہات سے کھولینگی اور مشق کی کاپیاں صحیح کرنے کے لیے دیدینگی۔ صحیح کرنے والے کو صرف نمبر معلوم ہوگا اور اُسکو یہ پتہ نہیں چلیگا کہ یہ کس کی کاپی ہے اور کس شہر سے آئی ہے۔ کاپی صحیح ہوجانے کے بعد افسر اعلیٰ اپنے ہات سے تمام خطوں کو بند کرکے پتہ لکھکر بھیجیں گی۔ اس طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہم آیندہ مرد اُستادوں سے بھی اس تعلیم میں مدد لیں۔

یہ تعلیم کا طریقہ کوئی نیا طریقہ نہیں ہے۔ اسپر یورپ میں تجربہ ہوچکا ہے۔ بہت سے لوگ اسطرح تعلیم پاتے ہیں۔ مینے خود ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جنھوں نے صرف خط وکتابت کے ذریعے سے پڑھا ہے۔ یہ طریقہ معمولی طریقے کے مثل جبکہ اُستاد و شاگرد برابر بیٹھے ہوں اچھا نہیں ہے۔ مگر طریقہ ایسی حالت کے لیے ایجاد ہوا ہے جبکہ اُستاد اور شاگرد آپس میں نہ مل سکتے ہوں۔ ہماری قوم میں بہت سے لوگ ایسے ہونگے جو پردے کی وجہ سے اور نیز اور امور خاندانی کی وجہ سے لڑکیوں کو مدرسے نہیں بھیجیں گے اُن کے لیے یہ طریقہ بہت مفید ہوگا۔ اس طریقے کو جاری کرنے کے لیے جیسا کہ مینے اوپر بیان کیا ہے سکرٹری سکشن تعلیم نسواں کو ایسی درسگاہوں کی درسی کتابیں خرید نا چاہیئے اور خود اُنکو اور نیز مہتمم مدرسہ نسواں کو چند درسگاہوں سے خط وکتابت کے ذریعے سے مختلف مضامین میں سبق لینا چاہیے۔ اس سے اُنکو طریقہ معلوم ہوجائیگا کہ کاپیاں کیونکر بھیجی جاتی ہیں۔ اُستاد ہدایتیں کس قسم کی دیتا ہے۔ کتابیں کس قسم کی پڑھائی جاتی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ طریقہ ہندوستان میں بھی بہت مفید ثابت ہوگا۔

اڈیٹوریل

ہندوستان میں بے چینی۔ پنجاب میں اور نیز مشرقی بنگال میں امسال جو شورش اور بے چینی پیدا ہوئی ہے اُسکے مختلف سبب ہیں جنسے ہمکو بحث نہیں ہے۔ گورنمنٹ کیطرف سے اس شورش کو روکنے

کے لیے چند تدابیر عمل میں لائی گئی ہیں۔ دو تین اخبارات کے اڈیٹروں پر مقدمے قائم ہوئے ہیں منجملہ انکے پنجابی اور ایک گجراتی اخبار کے اڈیٹر کو سزائیں بھی مل چکی ہیں۔ راولپنڈی میں بلوہ کرنے والوں اور انکے سرغناؤں کو حوالات میں لے لیا گیا ہے۔ اور باقاعدہ مقدمے قائم کرکے بعد تحقیقات کے انکے جرم کے موافق اُن کو سزائیں ملیں گی۔ لالہ لاجپت راے کو گورنمنٹ نے بلاجبیاً خود بلا تحقیقات گرفتار کرکے جلاوطن کر دیا ہے۔ علاوہ اس پکڑ دھکڑ کے گورنمنٹ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ پنجاب اور مشرقی بنگال میں کوئی شخص بلا تحریری منظوری صاحب سپرنٹنڈنٹ ضلع کے عام جلسے نہ کرنے پاے اور نیز یہ بھی حکم دیا ہے کہ طلبا کسی ایسے شورشی اور باغیانہ جلسے میں شریک نہ ہوں اور اگر وہ شریک ہوے تو انکے اُستاد اور پروفیسر ذمے دار ہونگے۔

ان تدابیر سے یقین ہے کہ شورش رفع ہوجائیگی اور لوگ جو اپنی حالت کو بھول کر ہوا میں محل بنانے میں مصروف تھے۔ وہ پھر زمین پر اتر آئینگے۔ اور آیندہ اس غیر ضروری اور قبل از وقت کاموں کی طرف منہمک نہ ہونگے۔ عام طور پر طالب علموں کی زیادہ شکایت کی جاتی ہے کہ وہ اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے شورش افزا جلسوں میں زیادہ حصہ لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ہر شخص کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ طالب علموں کو ایسے جلسوں میں شریک ہونے سے روکے اور سب سے بڑا فرض طالبعلموں کی ماؤں کا ہے کہ وہ اُنکو اس قسم کے خیالات سے باز رکھیں تاکہ انکے خیالات پریشان نہ ہوں۔ اور تعلیم میں ہرج نہ واقع ہو

اعلان چندہ۔ مسز نیاز احمد صاحبہ نے جس قومی ہمدردی اور اپنی بہنوں کی خالص محبت سے نارمل اسکول کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا تھا اُس سے ہمارے ناظرین پورے طور پر واقف ہیں حال میں انکے معزز شوہر کا انتقال ہوگیا۔ اور وہ بالکل بے بس اور بے کس ہوگئیں اُنکے والد آغا سلیمان شاہ صاحب جو ایک عرصے تک علیگڑھ میں تحصیلدار رہے انکے انتقال کے بعد مسز نیاز احمد صاحبہ کا صرف ایک بھائی ہے جسکے ہوش و حواس بھی ٹھیک نہیں ہیں یہ خاتون ایک بڑے معزز خاندان کی ہیں اور اب اُنکو بہت سخت صدمے پہنچے ہیں۔ جو روپیہ اُنھوں نے جمع کیا تھا منجملہ اُسکے

مبلغ چھ سو روپئے کی بنک کی رسیدیں اُنھوں نے ہمارے پاس بھیجدی ہیں - اور کچھ جزوی رپیہ سونگ بنک میں ہنوز باقی ہے - ہماری ناظرات بہنوں کو مسز نیاز احمد صاحبہ سے پوری ہمدردی کرنی چاہیے اور اُنکے کام میں جس میں وہ پھر کوشش کرنے والی ہیں اُنکی ہمت افزائی کرنی چاہیے

اعلان چندہ - سیٹھ موسیٰ جمال برادر علی گڑھ میں اپنے بچوں اور بھتیجوں کو داخل کرانے کے لیے رنگون سے تشریف لائے تھے - وہ ایک نہایت با اخلاق اور شریف طبع نوجوان ہیں - اور اُنسے ہمکو آیندہ بہت کچھ توقعات ہیں - اسوقت اُنھوں نے کالج کے مختلف فنڈوں میں چندے دیے اور تعلیم نسواں پر بھی احسان فرمایا اور مبلغ تیس روپئے نارمل اسکول کے لیے عطا فرمایا -

عورتوں کی محبت اور وفاداری - مرض طاعون بھی اخلاقی جرأت استقلال اور محبت کی ایک بہت بڑی کسوٹی ہے - اس مرض کے دوران میں ہمارے ہموطن ہندو صاحبان نے عام طور پر ہر ایک جگہ پورے استقلال اور جرأت سے کام نہیں لیا - بلکہ خوف زدہ ہو کر اپنے بیماروں اور مُردوں کو گھروں میں چھوڑ کر قفل لگا لگا کر بھاگ گئے لیکن شوہروں نے بہ نسبت بی بیوں کے بہت زیادہ بے مروتی اور بزدلی کا اظہار کیا ہے - اکثر بی بیوں کو جب طاعون ہوا تو شوہر اور بیٹے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے - لیکن اکثر ہی بی بیوں کی ہمت پر کہ وہ اپنے بیمار شوہر یا بیٹیوں یا باپ کو چھوڑ کر اپنی جگہ سے نہیں ٹلیں - بہت سی مر گئیں لیکن اپنی قدیمی عادت وفاداری کا ثبوت دے گئیں - ہمیں اس موقع پر مسلمان مردوں اور عورتوں کی نسبت اظہار طمانیت کرنا چاہیے کہ اُنھوں نے بڑے استقلال اور جرأت سے کام لیا - اپنے مردوں کو باقاعدہ شرعی طریقے سے دفن کیا - بیماروں کی کماحقہ تیمارداری کی - اور اپنے مولا کی تسلیم و رضا پر متوکل اور شاکر رہے - الحمدللہ - الحمدللہ - مذکورہ بالا دعوی کی دلیل میں ہم مشیر دکن سے نقل کرکے ایک مثال پیش کرتے ہیں -

ہندی عورتوں کی شوہر پرستی اور وفاداری کی تازہ مثال - قدرتی طور پر عورت کو اپنی اولاد سے بہت محبت ہوتی ہے - اپنی محبت کہ جسکا اندازہ مردوں سے نہیں ہو سکتا - اگر اولاد کے مقابلے میں عورت اپنے خاوند کے ساتھ زیادہ اخلاص و محبت کا اظہار کرے تو سوچنا اور سمجھنا

چاہیئے کہ وہ کیسی کچھ نہ محبت ہوگی۔ ہند کی خاک کو ہمیشہ سے اس بات کا فخر حاصل رہا ہے کہ یہاں کی عورتیں اپنے شوہر یا خاوند کی حد سے زیادہ شیدا و فریفتہ اور اطاعت گزار و فادار ہوتی ہیں۔ گو ہندوستان کی بہت سی قدیم باتیں زمانے کے اثر سے بدل کر کچھ کی کچھ ہوگئی ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہند کی عورتوں کی وفاداری اور شوہر پرستی کے جوش میں کچھ فرق نہیں۔ پاکباز اور شریف خیال کی عورتیں خواہ وہ کسی ذات اور کسی قوم سے کیوں نہ تعلق رکھتی ہوں اب بھی اسیطرح اپنے شوہر اور خاوند کی شیدا اور وفادار و اطاعت گزار دیکھی جاتی ہیں جس طرح زمانہ قدیم کی ہندی عورتیں اس خاص وصف میں مشہور تھیں شریف اور مہذب و شائستہ گھرانوں کو چھوڑکر ہم ذیل میں ایک نیچ قوم کے گھرانے کی عورت کی شوہر پرستی اور وفاداری کا قصہ مثال کے طور پر بیان کرتے ہیں جسکو ہمعصر مہیہ اخبار کے ایک موقع نامہ نگار نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "پٹنہ میں ایک گوالہ گھوسن نامی مرض طاعون میں مبتلا ہوا اثنائے علالت میں اس کی ایک چھوٹی شیرخوار بچی بیٹھی کھیل رہی تھی اور اس کی ماں اسکے پاس بیٹھی تھی کہ کھیلتے کھیلتے دفعتاً وہ چپ ہوئی اور مرگئی میں اُسی وقت اُسکے شوہر نے پانی پینے کو مانگا۔ گوالن مصیبت زدہ نہایت بشاشت سے اپنے شوہر کے سامنے پانی لیکر گئی اور پلایا۔ اسنے اپنی اس پیاری مرنے والی بیٹی کو پوچھا، کہا گیا کہ اسکا بڑا بھائی گلی میں بہلا رہا ہے۔ یہ کہکر واپس آئی اور محلے والوں کو اطلاع کر کے خفیہ طور پر اسے روانہ کردیا اور خود برابر شوہر کی خدمت کرتی رہی۔ چنانچہ کمال یہ ہے کہ شوہر پر ظاہر نہیں ہونے دیا اور اسکی خدمت نہایت بشاشت سے کی، تاکہ خوف زدہ پر اور خوف طاری نہ ہوجائے"۔

زنانہ ایسوسی ایشن کا جلسہ حیدرآباد دکن میں۔ مسز خدیو جنگ کے مکان پر ۲۲۔ اپریل کو زنانہ ایسوسی ایشن کا جلسہ تھا۔ اس ایسوسی ایشن کی تمام ممبر عورتیں موجود تھیں اور چند بی بیاں اور بھی مدعو تھیں۔ جلسہ خیریت آباد میں مسٹر ہنٹ کے بنگلے میں جہاں وہ بغرض تبدیل آب و ہوا گئی ہوئی ہیں ہوا تھا۔ مکان کے مشرق کی جانب شامیانہ لگایا گیا تھا اور سب بی بیاں باغ میں بیٹھی تھیں اور چائے کی میز بھی باہر لگائی گئی تھی، جسپر نہایت خوشنما چاندی کے گلاسوں میں پھولوں کے گلدستے

نہایت خوش اسلوبی سے جمائے گئے تھے اور میز طرح طرح کے میوہ جات و لذیذ کیک وغیرہ سے آراستہ تھی۔ بعد چاے پینے کے نواب بیگم صاحبہ ممتاز یار الدولہ بہادر نے ایک دلچسپ اسپیچ دی۔ پھر مسز نائڈو صاحبہ نے انگریزی میں تقریر کی۔ مسز گاف صاحبہ نے جو بوجہ عدم موجودگی مسز واکر صاحبہ کے کرسی صدارت پر متمکن تھیں، بہت پرجوش الفاظ میں حاضرات محفل کا شکریہ ادا کیا

مصر میں زنانہ تعلیم کی ترقی اور اسکے مقابلے میں یہاں کی زنانہ تعلیم کی حالت

یہاں تو ابھی مردوں ہی کی تعلیم کا کوئی ٹھوڑھکانا نہیں ہے۔ دوسرے خوش قسمت اور بلند حوصلہ ممالک میں عورتوں کی تعلیم بھی قابل رشک ترقی کرتی دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ سال گرشتہ ۱۹۱۰ء کی بابت جو رپورٹ لارڈ کرومر نے مرتب کی ہے اس میں وہ ملک مصر کے تعلیمی حالات لکھتے ہوئے وہاں کی زنانہ تعلیم کی نسبت یہ لکھتے ہیں کہ "اسوقت زنانہ تعلیم کے لحاظ سے ملک مصر ترقی کی منزل پر پہنچنے والی تدریجی چال چل رہا ہے۔ باپوں کو اپنی لڑکیوں کی تعلیم دلانے سے جس قسم کی سخت نفرت تھی وہ اب دور ہو گئی ہے اور بعض لوگ اس خیال کے پیدا ہو گئے ہیں۔ جو موجودہ زنانہ مدارس کی تعلیم ہی اپنی لڑکیوں کے واسطے کافی تصور نہیں کرتے بلکہ خاص مدارس زنانہ تعلیم کے لیے تلاش کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی ایک جماعت سال زیر بیان میں وقتاً فوقتاً سرکاری زنانہ مدارس میں آکر وہاں کے پروگرام دیکھنے اور اُن کی کمی پوری کرنے پر زور دینے میں مصروف رہی۔ سررشتہ تعلیم کو آخر ان لوگوں کی خواہشات پر توجہ کرنی پڑی اور اسنے مدارس سرکاری میں معلمہ عورتوں کی تعداد بڑھا کر پروگرام میں بھی اصلاح و ترقی کر دی۔ تاہم اہل مصر کی تشنگی شوق فرو نہ ہوئی۔ اور وہ مزید اصلاح و درستی کے طالب رہے۔ سررشتہ تعلیم اب بکوشش بلیغ ایسی ابتدائی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو بہم پہنچا رہا ہے جو عمدہ طور پر استانیوں کے اسکول (زنانہ نارمل اسکول) میں داخل کیجا سکیں اور ان کو لائق معلمہ بنایا جا سکے۔ مگر اسپر بھی بعض والدین نے اپنی لڑکیوں کو سرکاری زنانہ مدارس سے اسواسطے اٹھا لیا کہ وہاں بعض علوم ان کے حسب مرضی پڑھائے نہیں جاتے تھے اور اسوجہ سے اب محکمہ تعلیمات بار دیگر زنانہ تعلیم

کے پروگرام کی درستی پر غور کرنے میں مصروف ہونا چاہتا ہے۔ تاکہ گو ایسے والدین کے حسب مرضی زنانہ تعلیم کا انتظام نہ کر سکے جو اپنی لڑکیوں کو اعلےٰ تعلیم دلانے کے خواہاں ہیں۔ تاہم عام زنانہ تعلیم کے ایک موزوں معیار نصاب تیار کرے۔ ماہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں تمام ملک مصر میں ۲۰۹۰ زنانہ مدارس موجود تھے جن میں ۱۳۷۰۵ یعنی ۱۹۰۵ء کی مجموعی تعداد سے ۱۴ فیصدی زائد لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں، اس مابین میں اسکول جانے والی لڑکیوں کی تعلیم بہت سرعت کے ساتھ بڑھ گئی۔ ۱۹۰۰ء میں مدارس میں جانے والی لڑکیاں ۱۶۷۴ تھیں اور زنانہ مدارس ۲۲۵ جس میں پرائیوٹ اور سرکاری دونوں قسم کے مدارس شامل تھے اور ۱۹۰۶ء میں خاص سرکاری مدارس ہی کی وظیفے اسکالر لڑکیوں کی تعداد ۲۱۳۵ اور دیگر ایڈیڈ یا گرانٹیڈ زنانہ اسکولوں کی تعلیم پانے والی لڑکیوں کی تعداد ۱۰۷۰۴ تک ترقی کر گئی۔ معلمہ عورتوں کی کمیابی کی وجہ سے مجبوراً چند نیک اطوار اور سن رسیدہ استادوں کو گرل اسکولوں میں مقرر کرنا پڑا مگر سال گزشتہ میں سرکاری سررشتہ تعلیم نے ایک مدرسے میں شیخ کی جگہ لائق اُستانی مقرر کرنے میں کامیابی حاصل کی جو اس میدان ترقی میں پہلا قدم ہے کہ ابتدائی مدارس میں شیوخ کی جگہ لائق استانیاں تعلیم پر مامور ہو سکیں اور آیندہ یہ کمی بالکل پوری ہو جائیگی۔

ہمارے ہاں ابھی مردوں کی تعلیم ہی میں اس ترقی کے آثار نہیں نظر آتے جس کا ذکر مصر کی زنانہ تعلیم کے متعلق اوپر کیا گیا ہے۔ زنانہ تعلیم میں اس درجہ ترقی نمودار ہونے کے لیے ہمارے ہاں ابھی سالہا سال چاہئیں"

ایک غمناک حادثہ۔ ۱۰ مئی سنہ رواں کو قوم کے معزز اور بے مثل عالم شمس العلما مولانا شبلی صاحب کے بائیں پاؤں میں اتفاقیہ گولی لگ گئی۔ واقعہ یہ ہوا کہ مولانا ممدوح کے صاحبزادے شکار کھیلکر آئے اور غلطی سے بھری ہوئی بندوق کمرے میں چھوڑ کر کچہری چلے گئے۔ مولانا نے اُسکو اُٹھا کر کسی مناسب جگہ رکھنا چاہا۔ اتفاقاً وہ گر گئی اور چل گئی جس سے پاؤں کی ہڈی پاش پاش ہو گئی سول سرجن کے مشورے سے پاؤں ٹخنوں کے اوپر سے کاٹ ڈالا گیا۔ یہ حادثہ قوم کے لیے ایک دردناک

ید بیضا

یعنی اُردو کا ایک دلچسپ اور مفید ماہواری رسالہ

ہندوستان انقلاب کی حالت میں ہے اور مختلف گروہ مختلف میلان رکھتے ہیں اسلیے ہمنے اپنے رسالے کی وہ پالیسی رکھی ہے اور وہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہمارا رسالہ میانہ روی کے لحاظ سے مقبولیت کی صلاحیت اور تمدنی امور پر اعتدال کے ساتھ بحث کرنیکی وجہ سے پسندیدگی کی قابلیت رکھتا ہے جسطرح خالص مغربی طرزونکی پیروی ملک اور قوم کے مناسب حال نہیں ہے۔ اسی طرح خالص مشرقی خیالات کی اتباع بھی ترقی کے میدان میں کوتاہی پیدا کرنیوالی ہے۔ ہمنے ان دونوںکے درمیان مناسب اعتدال کرنیکی کوشش کی ہے جس سے ہمکو امید ہے کہ ہم ملک اور قوم کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوسکیں گے مگر اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوے ہمنے ملک کی بڑہتی ہوئی ضروریات کو نظرانداز نہیں ہونے دیا ہے اور ہمارے رسالے کے وہ مضامین جو تبدیل شدہ سوشل حالات اور مابہ النزاع تمدنی مسائل کے متعلق ہیں ہمارے لیے مایۂ فخر ہیں تمام تمدنی اور سوشل و فلسفیانہ اور تاریخی اور اخلاقی اور ادبی اور تنقیدی مضامین جو ہمارے رسالے میں شائع ہوتے ہیں انمیں اُس صفائی زبان اور پاکیزگی خیالات کا پورا خیال رکھا جاتا ہے جو اس ترقی زمانے کے شایان ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مضامین ہمارے اہل ملک کی وسعت معلومات اور ترقی مذاق میں امداد کرسکینگے اور اُردو دان پبلک کے سامنے یوروپین تہذیب اور ایشیائی تعلیم کے باہمی میل جول سے جو گرانبہا جواہرات علمی پیدا ہوئے ہیں انھیں کوڑیوں کے مول پیشکش کرینگے۔ اُردو دان پبلک کی تعداد ملک میں اسقدر زیادہ ہے کہ اُردو کی بلندپایہ رسائل کا بہت بڑے پیمانے پر ملک اور قوم کے لیے مفید ہونا صرف ملک کی ادنی توجہ پر منحصر ہے۔ خصوصاً اُس صورت میں جبکہ رسالے کے مقاصد میں ذاتی منفعت کا خیال شامل نہو بلکہ یہ کوشش ہو کہ جسقدر رسالے کی مالی حالت میں ترقی ہوتی جائے اُسیقدر اُس کو ملک کے لیے زیادہ مفید بنانے میں سعی موفور سے کام لیا جائے اور چونکہ ہمارا بالکل یہی اصول ہے لہذا ہم امید کرتے ہیں کہ ہم بہت جلد اس رسالے کے ذریعے سے ملک کی اہم خدمت انجام دے سکیں گے۔

شرح قیمت سالانہ۔ قسم اول عمدہ دبیز کاغذ پر [illegible] قسم دوم معمولی کاغذ پر [illegible]

مشتہر حکیم سید محمد سعید خنجر اڈیٹر و منیجر مقام سکندرآباد ضلع بلندشہر

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۷۱

خاتون

جلد ۴ | ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۵ھ مطابق جون ۱۹۰۷ء | نمبر ۶

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی۔اے۔ ایل۔ایل۔بی سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

علی محمد خاں کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علیگڑہ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اُسکی سالانہ قیمت (عہ/) اور ششماہی ۱۲/ ہے

۲۔ اس رسالے کا صرف ایک مقصد ہے یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جبتک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہو رہے ہیں اُس کی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہینگے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جاوے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی اُنکو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالے کی مدد کرنیکے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہے اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائیگا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علیگڑہ ہونی چاہیے۔

بچوں کی نیند

حال کے پیدا ہوے بچے سوائے دودھ پلائے جانے نہلائے جانے اور کپڑے بدلے جانے کے وقتوں کے دن رات کے بڑے حصّے میں سوتے رہتے ہیں جسکا اوسط اٹھارہ اُنیس گھنٹہ ہی۔ جتنی عمر بڑہتی جاتی ہی اُتنی ہی نیند گھٹتی جاتی ہی۔ چنانچہ سال بھر کا بچہ ۱۵-۱۶ گھنٹے سوتا ہی۔ دو تین سال کا بارہ تیرہ گھنٹہ۔ چار پانچ سال کا دس گیارہ گھنٹہ اور بارہ تیرہ سال کا نو دس گھنٹہ۔ اگر بچہ اس سے کم سوئے تو سمجھنا چاہیے کہ اُس کی تندرستی میں فرق ہی۔ یا اُسے وقت پر سلایا نہیں جاتا۔ دوسرے مہینے سے بچے کو رات میں سونے کے اصل وقت سے ایک گھنٹہ بعد سُلایا جاوے تاکہ رات بھر گہری نیند سوتا ہے۔

ماں کو چاہیے کہ بچے کو ٹھیک وقت معینہ پر سُلادے۔ لیکن اگر بچے کو نیند کم آتی ہو تو اُسکا علاج افیون یا اور کوئی مسکر چیز کھلا کر نہ کریں) کیونکہ اس سے بچوں کے کمزور جسموں کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اکثر مائیں یہ بھی کرتی ہیں کہ بچے کو گود میں لیکر اُچھالتی یا دائیں بائیں

جھلاتی یا ٹا کر تھپکتی یا چارپائی ہلاتی ہیں۔ غرضکہ سُلانے کے لیے طرح طرح کے ذریعے کام میں
لاتی ہیں۔ لیکن یہ سب نقصان پہنچانے والے ہیں۔ کیونکہ اس سے نہ صرف ماں کو جسکا بچہ
دودھ پیتا ہو بلکہ بچے کو بھی تھکان پیدا ہوتی ہے بہتر یہ ہو کہ انکے علاوہ اور کسی طرح بچے کو سلائیں
اور اپنے اوپر تھوڑی سی تکلیف گوارا کرکے اُسکے سونے کا صبر کے ساتھ انتظار کریں۔

پہلے مہینے میں بچے کو ہمیشہ چت لٹانا چاہیے۔ اور اسکے بعد اگر کچھ وقت سیدھی
کروٹ سے یا پیٹ کے بل بھی لٹا دیا جائے تو کچھ ہرج نہیں ہے بلکہ بہت مفید ہو۔ لیکن اگر
بچے کو ہڈیوں کی نرمی کا مرض ہو تو ہر وقت کسی ایک پہلو سے لٹانے میں ڈر ہو کہ اُسکی پیٹھ ٹیڑھی
نہو جائے اور ہمیشہ ایسی ہی رہے۔

کھانے کی طرح سونے کے وقت بھی مقرر ہونے چاہییں۔ رات کے وقت بچے کو دودھ
پلانے کے لیے ایک بار یا دو بار سے زیادہ نہ جگانا چاہیے۔ بلکہ بغیر مانگے رات کیوقت دودھ دینا
بھی نہیں چاہیے۔

بچے کا اوڑھنا بچھونا صاف ستھرا نرم اور کشادہ ہونا چاہیے تاکہ ہوا آسانی سے پہنچ سکے
کیونکہ بچوں کو ہوا کی ایسی ہی ضرورت ہو جیسی بڑوں کو۔ بچوں کو ہوا سے بچانے کے لیے بھاری بھاری
اوڑھنوں سے ڈھکنا سخت غلطی ہے۔

بچے کا پلنگ پٹیوں کی طرف سے اونچا ہونا چاہیے تاکہ بچے کے گرنے کا ڈر نہ رہے۔
ماں کا بچے کے ساتھ ایک پلنگ پر سونا سخت خطرناک ہے۔ کیونکہ ممکن ہو کہ ماں نیند میں
بچے پر لوٹ پڑے اور بچہ کچل جائے۔ یا ماں کا اوڑھنا بچے پر جا پڑے اور اُسکا دم گھٹ جائے
علاوہ بریں یہ اصول حفظانِ صحت کے لحاظ سے بھی مُضر ہو۔ اس میں ایک اور خرابی یہ ہے
کہ ماں کے ساتھ سونے کی حالت میں بچہ جب چونکے گا تو ماں ضرور دودھ پلائیگی۔ اور اس سے
بچے کے ہضم میں فتور آئیگا۔

بچوں کے کپڑے ہمیشہ صاف ستھرے رکھنے چاہییں اور اوڑھنے بچھونے سوائے

گرمیوں کے ہر روز دہوپ میں ڈالنے یا آگ سے سیکنے چاہییں - دن کو بچہ جو کپڑے پہنے رہا ہو وہ رات کو اُتار دینے چاہییں - بچے ذرا سمجھدار ہو کر کپڑے بدلنے میں ضد کرنے لگتے ہیں - لیکن ماؤں کو چاہیے کہ بہلا پھُسلا کر یا ضرورت ہو تو جبراً کپڑے بدلوائیں -

سونے کے مکان کے متعلق یہ ہی کہ وہ ماں کی سونے کی جگہہ سے علیحدہ ہونا چاہیے اور بچہ اور اُس کی کھلائی ایک کمرے میں رہیں - اور جسوقت بچے کو دودہ پلانا چاہیں اُسے ماں کے پاس لیجائیں - اور اگر بچہ ماں کا دودہ نہیں پیتا بلکہ دائی کا یا جسکی اور بتی سے پیتا ہے تو ماں کی موجودگی کی ضرورت نہیں ہے - لیکن پھر بھی بہتر یہ ہے کہ بچے کے تمام کام ماں کی نگرانی میں ہوں -

(ترجمہ تدبیر الاطفال)

محمد مقتدیٰ خاں شروانی ہونوی

مراسم شادی مسلمانانِ آگرہ

کچھ عرصہ ہوا کہ بنت نذر الباقر صاحبہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ تمام بہنیں خاتون میں اپنے اپنے یہاں کی شادی و غمی اور دیگر تقریبات کی رسمیں شایع کریں - کیونکہ خاتون اُنکی کانفرنس ہی اور اُسکے ذریعے سے ان مراسم میں اصلاح کی امید ہوسکتی ہے - لیکن بہنوں نے خاموشی اختیار کی - اور کسی نے بھی اپنے یہاں کے رسم و رواج لکھنے کی تکلیف گوارا نہ فرمائی - اس موقع پر ہم کو معلم نسواں کے چند نمبر ملگئے جو ہمارے دوست سید خورشید علی صاحب نے حیدرآباد سے ہمارے پاس بھیجے ہیں - اُس میں مندرجہ بالا عنوان سے ہمارے مطلب کا ایک نہایت بسیط مضمون ملا - جسکو ہم خاتون میں اسلیے درج کرتے ہیں کہ اور کوئی اگر اپنے یہاں کے رسم و رواج کو لکھے تو اُسکے لیے یہ نمونہ ہو حقیقت میں اس قسم کے مضامین کی بیحد ضرورت ہے - یہ بیہودہ اور غیر ضروری رسمیں

اسی وقت مٹ سکیں گی جب اچھی طرح ان پر بحث ہوگی۔ اور تحریر و تقریر کے ذریعے سے لوگوں کو بتایا جائیگا کہ وہ غلطی میں پڑے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ یہ مضمون ہماری بہنیں دلچسپی سے پڑہیں گی۔

اڈیٹر

جو بہادر اور دلاور مسلمان۔ ہندوستان میں لڑ کر فتحمندی حاصل کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہونے کے بعد اکثر یہیں قیام گزین ہوگئے چونکہ عورات کو اپنے ہمراہ نہیں لائے تھے۔ اسوجہ سے ہندوستان ہی کی عورتوں سے تعلقات قائم کرکے زندگی بسر کرنے لگے۔ مگر اس نئے میل کا اثر اُن کی سوسائٹی پر بہت کچھ ہوا۔ جو مراسم کہ یہ عورتیں اپنے ہندو والدین کے یہاں ادا کرتی تھیں۔ وہ انکو بچپن ہی میں بخوبی ذہن نشین ہوچکی تھیں اور اُن کا اس نئے تعلق ہوجانے کے بعد بالکل چھوڑ دینا غیر ممکن تھا۔

مسلمان شوہر بھی عورات کی پاس خاطر سے ان رسموں کی طرف سے بالکل چشم پوشی کرگئے۔ اور انتظام خانہ داری میں زیادہ تنبیہ اور تہدید سے بے لطفی نہ آنے دی۔ کل رسومات قبیحہ اُنکے گھروں میں نہایت آزادی سے جاری رہیں۔ چنانچہ اُنکا اثر ابتک دیکھا جاتا ہی۔ اہل ہنود کسی خاص روز اپنے بزرگوں کا شرادہ کرتے ہیں۔ اور کبھی اُن کو پنڈ دیتے ہیں۔ ان عورتوں نے بھی شب برات کو غنیمت سمجھکر حلوا روٹی پکا کر اپنے بزرگوں کی فاتحہ کے نام سے خاندان کے مردوں کو پنڈ دینے شروع کردیے۔ باہر اگر روزہ نماز کا تذکرہ تھا۔ تو گھر میں کفر و شرک کا چرچا۔ باہر اگر مذہبی امور پر بحث تھی۔ تو گھر میں مراسم ممنوعہ کی طرف رجحان۔ شادی بیاہ اور لڑکا پیدا ہونے کے وقت اُن کل مراسم پر نہایت سختی کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ جو کہ قریب قریب اُسی حیثیت سے کسی ہندو خاندان میں رائج تھیں۔ فی الحال اگرچہ مذہبی واقفیت اور شائستگی کے پھیلنے سے اکثر عورتونکے عقائد

بوجہ اپنے لائق شوہروں کے درست ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ مگر پھر بھی بیشمار رسمیں معلوم ہوتی ہیں۔ جو کہ اہل ہنود کی رُسوم سے بالکل ملی جُلی ہیں۔

بعض عجیب و غریب رُسوم اور بیجا و آزاردہ تکلفات حضرات لکھنؤ کی ایجاد کا ایسا تتبع ہوتا ہے کہ جسنے اکثر خاندان کو تباہ و برباد کر دیا۔ چنانچہ ذیل میں ہم صرف اُن رسموں کا ذکر کرتے ہیں۔ جن پر آگرہ میں ابتک بعض شریف خاندان کی عورتیں عمل کرتی رہتی ہیں۔ اور میرے خیال میں عورتوں کے قانون وسیع اور ناقابل ترمیم و تنسیخ ہونے کی وجہ سے شاید کل ہندوستان کی عورتیں انھیں رسوم پر عمل کرتی ہوں گی۔

لڑکیوں کی شادی ہونے سے قبل کی حالت

گیارہ برس کی عمر سے شادی ہونے تک بیچاری لڑکیاں عجیب نامناسب قید میں گرفتار رہتی ہیں۔ اُن کی حرکات و سکنات گفتار و رفتار پر ہمیشہ اعتراض ہوتے رہتے ہیں شادیوں اور دیگر جلسوں میں جانے۔ غیر عورتوں کے سامنے آنے۔ منکوحہ عورات سے گفتگو کرنے کی اجازت اُن کو نہیں ہوتی۔ عمدہ لباس اور چند خاص زیور وہ ہرگز نہیں پہن سکتیں۔ کیا مقدور جو سرمہ یا مسی استعمال کر سکیں۔ ممکن نہیں کہ اُن کی بزرگ عورتیں اُن کو عطر لگائے ہوئے یا آزادانہ حالت میں دیکھ سکیں۔ جہاں گھر میں کوئی غیر عورت آئی۔ خواہ وہ مشاطہ ہو یا نہو۔ اس بیچاری کو اُس سے چھپنا ضرور ہے۔ جب خدا کو اُس کی حالت پر رحم آتا ہے۔ تو لڑکے والوں کی طرف سے شادی کے پیغام آنے شروع ہوتے ہیں۔ لڑکے کے حسب و نسب اور اُسکے چال و چلن کی کیفیت ایک سرخ کاغذ پر لکھکر کسی مشاطہ کے ہاتھ لڑکی والوں کے پاس بھیجتے ہیں۔ جسکا جواب شروع میں بالکل بے غرضانہ طریقہ سے دیا جاتا ہے۔ اگرچہ دل میں یہی ہوتا ہے کہ ہماری لڑکی کی شادی اسی جگہ ہو جائے۔ چنانچہ ایک مثل مشہور ہے "کہ جب تک مشاطہ کے پاؤں کا جوتا نہ ٹوٹے اور اُس کے

سر کی چادر نہ پھٹے۔ اُسوقت تک لڑکی کی شادی نہیں ہو سکتی" ان جاہلانہ خیالات کا
نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ لڑکے والے اپنا خیال کسی دوسری جانب رجوع کر دیتے ہیں
اور یہ بیوقوف دست افسوس ملتے رہ جاتے ہیں۔

رسوم متعلق منگنی یعنی نسبت

جب رفتہ رفتہ لڑکی والوں کی طرف سے رضامندی کی علامات شروع ہو جاتی ہیں
تو سخن ہارنے کی رسم کے لیے دو تین عورتیں لڑکے والوں کی طرف سے جاتی ہیں اور
کسی قدر تجاہل عارفانہ گفتگو ہونے کے بعد سخن ہار دیا جاتا ہے۔ اور منگنی یعنی نسبت
کی تاریخ مقرر ہو جاتی ہے کنبے کے مرد اور عورتوں سے اس رسم میں شامل ہونیکے لیے
درخواست کی جاتی ہے۔ منگنی سے ایک ہفتہ قبل دولھا دلہن والوں کے یہاں گانا ہوتا ہے
لڑکے والوں کی طرف کے گانے کو گھوڑیاں اور دلہن والوں کے یہاں گانے کو سُہاگ
کہتے ہیں منگنی والے روز کُل اعزا و اقربا مرد اور عورت جن کو بلایا جاتا ہے۔ جمع ہو کر
دلہن کے گھر جاتے ہیں۔ اس قسم کی منگنی میں نوشہ بھی ہمراہ ہوتا ہے۔ کُل عورتیں گھر میں
عروس کو چڑھاوا چڑھانے جاتی ہیں۔ چڑھاوے میں دلہن کے واسطے اکثر سونے چاندی
کا زیور بقدر حیثیت اور گوٹے پٹھے اور پھولوں کا زیور بھی ہوتا ہے۔ دو انگوٹھیوں اور قند کے
کوزوں کے علاوہ پان کی بیڑیاں سونے چاندی کے ورقوں سے منڈھی ہوئی ایک سنگاردان
میں رکھی ہوتی ہیں۔ روپیے اور اشرفیاں علیٰ قدر مراتب دلہن کے ہاتھ پر رکھنے اور
ناریل کھیلیں بتاشے اور لڈو گود میں ڈالنے کے لیے چار پانچ من شیرینی دولھا والے
اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ جس خوان میں دلہن کے چڑھاوے کا سامان ہوتا ہے وہ بہت آراستہ
کیا جاتا ہے۔ اور اُسکے اُٹھانے والے کو اور خوانوں کے اُٹھانیوالوں سے زیادہ مزدوری ملتی ہے۔ اور
نوشہ کی طرف کے مرد اور عورت جن سواریوں میں جاتے ہیں۔ انکا کرایہ اُنھیں کے ذمہ ہوتا ہے

دلہن والے نہیں دیتے۔ ان مہمانوں کے آنے سے قبل دُلہن کو اُس کُل زیور سے جو کہ جہیز میں نکاح کے بعد دیا جائے گا۔ آراستہ کرکے نہایت عمدہ لباس پہنایا جاتا ہے۔ اُسوقت سُرخ رنگ کا لباس نہایت عمدہ گوٹے پٹھے کا دُلہن کے واسطے بہت موزوں ہوتا ہے۔ اور اُسی کو استعمال کیا جاتا ہے۔ توشہ کے لیے کسی خاص رنگ کی خصوصیت نہیں ہے۔

جب کُل سمدھنیں یعنی دولھا کی طرف کی عورتیں آجاتی ہیں تو دلہن کو اُسکے خاص کمرے میں سے گودی میں اُٹھاکر اس مجلس عورات میں دُلہن والیاں لاتی ہیں۔ اور ایک خاص فرش پر اُسکو بٹھادیتی ہیں۔ اُسوقت شادی مبارک کا راگ بلند ہوتا ہے۔ اور چڑہاوے کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ سواسنیں۔ یعنی دولہا کی بہنیں سب سے اول اُسکو وہ کُل زیور جو اپنے ہمراہ لاتی ہیں۔ پہناتی ہیں۔ بعدازاں مصری اور بیڑہ کھلایا جاتا ہے۔ اور گود بھری جاتی ہے گود بھرنے کے بعد کل عورتیں دلہن کا مُنہ دیکھتی ہیں۔ بعض مُنہ دیکھنے کے بعد دُلہن کے دستِ راست میں اپنی طرف سے بطور مُنہ دکھائی انگوٹھیاں وغیرہ بھی پہناتی ہیں۔ پھر ایک عجیب طریقے سے عورتیں دلہن کے سر پر ہاتھ رکھکر اُنگلیاں چٹخاتی ہیں۔ اور ہاتھونکو ادہر اُدہر پھیر کر جسکو کہ وارن پھیرن کہتے ہیں۔ کچھ نقدی علیٰ قدر حیثیت بطور خیرات مراسنوں کو دیتی ہیں۔ جب سب عورتیں مُنہ دیکھ چکتی ہیں اسوقت دلہن کے دونوں ہاتھوں میں روپیے اور اشرفیاں رکھی جاتی ہیں۔ پس اسکے بعد دلہن کے چڑہاوے کی رسم ختم ہوجاتی ہے۔ اور دلہن کو اُسی طرح گودی میں اُٹھاکر اُسکے خاص کمرے میں لیجاتی ہیں اور کُل عورتوں کو عطر لگایا جاتا ہے اور پھولوں کے ہار پہنائے جاتے ہیں۔ پان۔ چھالیا الائچی وغیرہ یک جا نوشہ کی طرف کی عورتوں کو دیدیتی ہیں۔ وہ اُسکو آپس میں تقسیم کرلیتی ہیں۔ بعد اسکے شربت پلایا جاتا ہے۔ شربت پینے کے بعد ہر عورت بقدر حیثیت شربت کی پیالیوں کے طشت میں کچھ نقدی ڈالتی ہے۔ جسکا بار دولھا والوں پر ہوتا ہے۔

اگرچہ کل مجتمع رقم چلتے وقت دلہن والوں کے حوالے کردیجاتی ہے۔ شربت پلانے کے بعد اندر گھر کی کل رسمیں ختم ہوچکتی ہیں۔

اُسکے بعد نوشہ کا جوڑا و ادلہن والوں کی طرف سے باہر مردوں میں بھیجا جاتا ہے جس میں گوٹے اور پھولوں کے زیور دوشالہ چھاپ انگشتری اور رومال ہمیشہ طاق شمار میں ہوتے ہیں۔ دولہا کو یہ زیور پہنانے کے بعد دوشالہ اوڑھایا جاتا ہے اور چھاپ انگشتانہ دست راست کے انگشت زریں پہنایا جاتا ہے۔ اور انگوٹھی چھوٹی اُنگلی میں۔ رومال ہاتھ میں دیکر اُس اتری سے جو کہ مردوں نے ہاتھ پر رکھی گئی ہے کسیقدر زیادہ نوشہ کے ہاتھ پر رکھی جاتی ہے اور نوشہ کل حاضرین جلسہ کو سلام کرتا ہے۔ عطر و پان کی رسم ادا ہونے کے بعد اندر گھر کی طرح باہر بھی شربت پلایا جاتا ہے اور اُس کی رقم کا بار بھی دلہا والوں پر ہوتا ہے اگرچہ وہ رقم دلہن والوں کو چلتے وقت دیدیجاتی ہے۔ اس طرح سے یہ جلسہ برخاست ہوتا ہے۔

دوسرے روز اسی طرح دلہن کے یہاں سے چوبے لیکر صرف عورتیں نوشہ کے گھر آتی ہیں جو سامان کہ اُنکے ہمراہ ہوتا ہے۔ اُس میں کچھ چوبے۔ پھولوں کا زیور۔ رومال چاندی سونے کے ورقوں سے لپٹی ہوئی بیڑیاں ایک چاندی کا کٹورا مع کسی قدر شکر کے اور مونگ اور چانول کا بھوڑا ہوتا ہے۔ دولہا کو گھر میں بلا کر دلہن والیاں کل زیور پہنانے کے بعد چوبے میں سے چھ نوالے کھلاتی ہیں۔ مگر ساتواں نوالہ خوش نصیب نوشہ صاحب کو صرف بھکانے کے لیے دیا جاتا ہے۔ اُسکے بعد اُسی شکر کا اُسی چاندی کے کٹورے میں شربت بناکر جو کہ ٹونوں کا شربت کہا جاتا ہے پلاتی ہیں۔ اور پانوں کے بیڑے اور رومال اُسکے ہاتھ پر رکھ دیتی ہیں۔ اُن میں سے ایک بیڑا نوشہ کے مُنہ میں اپنے ہاتھ سے سواسنیں کھلاتی ہیں۔ وہ سب کو سلام کرتا ہے۔ اور نوچھاور کیجاتی ہے۔ جو کچھ کہ اس نوچھاور میں جمع ہوتا ہے۔ وہ مراسنوں اور کمینوں کو دیا جاتا ہے۔ اسکے بعد سب رخصت

ہوجاتی ہیں۔ اور منگنی کی رسم بالکل ختم ہوجاتی ہے۔

منگنی کی یہ رسم نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اس سے دوسرے درجہ کی وہ منگنی ہوتی ہے۔ جس میں کہ مرد اور نوشہ دُلہن کے گھر نہیں جاتے اور اسوجہ سے نوشہ دوشالہ اور چھاپ انگشتانہ سے محروم رہجاتا ہے۔ جوکہ اُسکو ساچق کے روز ملجاتا ہے۔ باقی اور رسوم میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ وہ لوگ جنکے دل کی اُمنگوں اور حوصلوں کو مفلسی نے پست کردیا ہے۔ وہ صرف اسی پر قناعت کرتے ہیں کہ تین چار روپیہ کی شیرینی کے ہمراہ دلہن کے لیے مختصر جوڑا وہ بذریعہ دو تین عورتوں کے بھیجدیتے ہیں اور اسی طرح سے کسی قدر مختصر سامان اپنی قسمت سے مجبور ہوکر دلہن والے بھی دوسرے روز نوشہ کے گھر بھیجدیتے ہیں۔

جن غریبوں کو اتنا بھی مقدور نہیں ہے۔ اُنکے یہاں ایک نہایت ہی عجیب وغریب رسم اس منگنی کے سرانجام دینے کے لیے رائج ہے۔ وہ یہ ہے کہ نوشہ کی طرف سے صرف دو تین عورتیں لڑکی والوں کے یہاں پان لیکر جاتی ہیں وہاں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد دُلہن کے مکان کے کسی کونے میں پان کی پیک تھوک دیتی ہیں۔ جس سے کہ منگنی کی رسم پوری ہوجاتی ہے۔

بعض جگہ یہ بھی دستور ہے کہ نوشہ والی عورتیں دو تین روپیے کی شیرینی اپنے ہمراہ لیجا کر دُلہن کے داہنے بازو میں ایک روپیہ امام ضامن کے نام کا باندھ آتی ہیں۔ اسی طرح دوسرے روز دلہن والی عورتیں آنکر نوشہ کے بازو پر ایک روپیہ باندھ دیتی ہیں۔ پس اس طرح سے اُنکی منگنی کی رسم بھی سرانجام پاجاتی ہے۔

جو لوگ کہ منگنی دہوم دہام سے کرتے ہیں اُن کو مناسب ہے کہ وہ ہر عید بر عیدی خربزوں اور ساون کی فصل میں دلہن کے لیے خربزے اور ساون کا سامان بھیجیں۔ عیدی میں دلہن اور اُس کی بہنوں کے لیے کانچ کی چوڑیوں کے جوڑے۔ خاص دلہن کے لیے ایک سرخ رنگ کا بہت نفیس جوڑا۔ مہندی۔ کلاوہ۔ پیالیاں۔ کنگھیاں۔ تانبے پیتل لکڑی اور چینی کے کھلونے

شیرینی اور کچھ نقدی بطور تیوہاری کے بھیجی جاتی ہے۔ اس سامان کے ساتھ اکثر عورتیں بھی جایا کرتی ہیں۔ ایک روز رہنے کے بعد دوسرے روز واپس آجاتی ہیں۔ شربت چوبہ مہمانداری وغیرہ سب ہوتی ہے۔ اس عیدی کے بدلے میں لڑکی والوں کی طرف سے رومال اور سوئیوں کے چوبے یعنی چاندی یا تانبے کا ایک بادیہ تیوہاری نوشہ کے لیے۔ اور کچی سوئیاں کنبے میں تقسیم کرنے کے لیے آتی ہیں

ساون کے دنوں میں علاوہ عیدی کے مانند سامان کے ریشم کی رسی کا جھولا۔ پٹریاں جھولنے کے لیے چاندی اور لکڑی کے کھلونے۔ پاؤں کی کھڑاؤں۔ اندرسے[۱] اور اندرسے کی گولیاں وغیرہ ہوتی ہیں۔ نوشہ کی طرف کی عورتیں اس سامان کو عروس کے گھر لیکر جاتی ہیں۔ جہاں کہ جھولا نصب کیا جاتا ہے۔ اور کل عورتیں خصوصاً دولہا دلہن کی بہنیں جھولتی ہیں۔ اور اگر دلہن بھی کم سن ہوتی ہے۔ تو اسکو بھی اپنے ہمراہ جھلاتی ہیں۔ اسوقت مرہٹوں کا گانا عجیب لطف پیدا کرتا ہے۔ اگر بادل ہو تو لطف دوبالا ہو جاتا ہے دوسرے روز یہ عورتیں کھانا کھانے کے بعد واپس چلی آتی ہیں۔ اسکے عوض میں نوشہ کے لیے رومال کچھ نقدی چوبے اور اُس کی ماں کے لیے جوڑا عروس کے گھر سے بھیجا جاتا ہے۔

آگرہ میں خربزوں کی فصل گرمیوں میں واقع ہوتی ہے۔ چنانچہ دلہن کے کھانے کے لیے خربزے تربوز اور دیگر فصلی میوہ جات دلہن کے گھر بھجوا دیے جاتے ہیں۔ خربزے اور تربوز بیلوں پر لاد کر اور دیگر خورد میوہ جات خوانوں میں رکھکر بھیجے جاتے ہیں۔ اس رسم کو یہاں پر ساکا کرنا کہتے ہیں۔ اسکے عوض میں دلہن والوں کے یہاں سے نوشہ کی ماں کے لیے ایک جوڑا اور مٹھائی وغیرہ کے چوبے اندازاً اُس قیمت سے کسی قدر زیادہ مالیت کے جتنے کا کر ساکا بھیجا گیا تھا۔ بھیجے جاتے ہیں۔ اس شہر میں یہ بھی دستور ہے کہ مہینے یا

[۱] ترس اندر گولی کی صورت کی ایک قسم کی شیرینی جو کہ آرد برنج سے صرف موسم برسات میں تیار کی جاتی ہے۔

ڈیڑھ مہینے بعد دلہن کی خیریت منگوائی جاتی ہے۔ اور جو شخص کہ خیریت مزاج دریافت کرنے کو جاتا ہے۔ اُسکے ہمراہ روپیہ دو روپیے کی شیرینی بھی بھیجی جاتی ہے۔

بامن پُوچھنا اور ڈھول رکھا جانا

غرضکہ جب دونوں طرف سے شادی کا سامان مہیّا اور طیار ہوجاتا ہی اُسوقت عقد کی تاریخ کے تعین کے لیے باہم گفتگو ہوجاتی ہی۔ اگرچہ عورتیں بذات خود کل تاریخیں طے کرلیتی ہیں مگر پھر بھی ان تاریخوں کے مقرر کرنے کے لیے مردوں کے ایک مجمع کا ہونا رسم میں داخل ہوگیا ہے۔ اس رسم کو ساعت رکھنا اور عوام جاہل بامن پچھنا کہتے ہیں۔ دولہ والے اپنے کُل احبا و اقربا کو فراہم کرکے من دو من گڑ بقدر حیثیت۔ پانوں کے بڑے ڈھاک کے پتوں کے اندر لپٹے ہوئے اور کسی قدر چاول اپنے ہمراہ لیکر دُلہن کے مکان پر جاتے ہیں جہاں کہ اُنکو کسی مکان یا محلہ کی مسجد میں بٹھایا جاتا ہی۔ برکت کے لیے قرآن مجید بھی چاولوں کے طشت کے آگے رکھکر کھولا جاتا ہی اور اُسکے بند کرنیکے بعد ہی اُن تاریخوں کا جنکو کہ عورتیں پہلے ہی سے مقرر کرچکی ہیں اعلان کردیا جاتا ہی۔ گویا کہ کلام شریف ہی میں یہ تاریخیں لکھی ہوئی تھیں۔ چاولوں کا طشت جس میں کہ کچھ نقدی اور تھوڑا گُڑ ہوتا ہی مسجد یا محلّے کے مُلّا کے حصے میں آجاتا ہی۔ اور کُل حاضرین کو ایک ایک بیڑا پان کا اور ایک ایک ڈلی گُڑ کی حوالے کرکے رخصت کردیا جاتا ہی۔ فی الحال جو لوگ اس قسم کی تقسیم کو پسند کرتے ہیں اُنھوں نے معمولی گڑ کے ہمراہ صرف تقسیم کے لیے بتاسوں کا دلہن کے گھر بھیجنا مناسب خیال کیا ہی۔ چنانچہ اکثر جگہ وہی تقسیم ہوتے ہیں۔ جس روز کہ ساعت رکھی جاتی ہے اُس کی شام کو دونوں طرف میٹھے چاول پکوائے جاتے ہیں اور قریب کے اعزّا کو تقسیم کیے جاتے ہیں۔

اسی روز سے گانا بجانا شروع ہوجاتا ہی جسکو کہ عورتیں ڈھول رکھنا کہتی ہیں۔ ڈھول رکھائی کُل قریب کے رشتہ دار عورتوں پر ضرور ہے اور ہر عورت علیٰ قدر حیثیت کچھ

شیرینی یا میوہ وغیرہ اپنے ہمراہ لیکر دولھا یا دُلھن جس طرف کا رشتہ ہو اُسکے یہاں آکر گانے کی محفل میں شریک ہوتی ہے گیت جو گائے جاتے ہیں وہ ایسے مہمل اور بے معنی اور بُری زبان کے ہوتے ہیں کہ اُن کا ایک حرف صحیح اور درست نہیں معلوم ہوتا۔ اُن کی عجیب زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاید زبان اُردو کی ابتدائی عمر میں تصنیف کیے گئے تھے۔ مگر ایک تعجب اور ہے کہ زمانے کی [illegible] ہر چیز میں ایک انقلاب پیدا کرتی ہے مگر اس جگہ اپنا اثر ظاہر کرنے سے وہ بھی عاجز ہوگئی۔ غرضکہ گانا ختم ہونے کے بعد کل شہر کا عورات اپنے اپنے مکان کو رخصت ہوجاتی ہیں اور ساچق کے روز تک ہر رات کو ایسا ہی مجمع انھیں قواعد کے رُو سے قائم رہتا ہے ساعت رکھنے کے ایک دو روز بعد اکثر اُس لڑکے جو ساعت میں آتا ہے۔ دُلھن والوں کے یہاں گلگلے پکتے ہیں۔ اور کُل کنبے میں تقسیم کیے جاتے ہیں اسی طرح دولہ والے بھی جنکو کہ خدا نے کچھ مقدور دیا ہے تو رے بندی کرتے ہیں یا کسی اور قسم کا حصہ رشتہ داروں کو تقسیم کرتے ہیں۔

نکاح سے کوئی ایک ہفتہ پہلے دولہ اور دُلھن مایوں بیٹھتے ہیں دونوں طرف میوے کی پنڈیاں بنتی ہیں۔ اور ایک بسنتی رنگ کا جوڑا اُس زمانے میں پہننے کے لیے دلھن والوں کی طرف سے مع اوبٹنا۔ میوہ۔ پنڈیاں۔ اور دودھ پینے کے لیے کچھ نقدی نوشہ کے لیے جاتا ہے دلھن کا زرد جوڑا خاص اُسی کے گھر کا ہوتا ہے اور دولہ والوں کی طرف سے کچھ نہیں بھیجا جاتا ہے دلھن کی بہنیں یعنی سوا سنیں بسنتی رنگ کا جوڑا پہنا کر اوبٹنا ملکر دُلھن کو چوکی پر بٹھاتی ہیں پھر پنڈیاں کھلاتی جاتی ہیں۔ اور دودھ پلایا جاتا ہے۔ ہر روز حجام اور نائن دولھا دلھن کے بدن پر اوبٹنا ملتے رہتے ہیں۔ اور صبح کے وقت دونوں میوہ اور پنڈیاں کھاتے اور شام کے وقت دودھ پیتے ہیں۔ دلھن کے ساتھ اُسکی بہنوں اور سہیلیوں کو بھی حصہ ملتا ہے۔

رسم ساچق

ساچق کی رسم نکاح سے تین روز قبل عمل میں آتی ہے اُسکو یہاں پر علی العموم بری

کہتے ہیں یہ شادی کا پہلا دن شمار کیا جاتا ہے۔ کل اعزا و اقربا شام سے نوشہ کے مکان پر
آجاتے ہیں۔ بعد نماز مغرب کُل مہمان مع نوشہ کے عروس کے مکان کی طرف روانہ ہوتے
ہیں آرائش و پیرائش اور جلوس کے کُل سامان موجود ہوتے ہیں آگے آگے کوتل گھوڑے
اپنی شبک چال دکھاتے ہوئے چلتے ہیں اور تخت رواں پر طوائفیں ناچتی جاتی ہیں۔ نوشہ
کے گھوڑے کے آگے آگے روشن چوکی بجتی اور آتشبازی چھوٹتی جاتی ہے۔ نہایت عمدہ
کاریگری سے کاغذ کے پھولوں کے گلدستے اور تختے بنائے جاتے ہیں۔ جنسے کہ تمام بازار
مثل باغ کے معلوم ہونے لگتا ہے۔ اُنکے بعد عمدہ نقش و نگار کی ہوئی مٹی کی مٹکیاں ایک ایک
ہر فرد کے سر پر ہوتی ہیں ان مٹکیوں کے ڈھکنوں کے اوپر ابرک کا ایک پیالہ نما پھول بنایا جاتا ہے
اور اُسکے اندر ایک شمع روشن کیجاتی ہے جسکی روشنی نہایت عمدہ و خوشگوار معلوم ہوتی ہے
تاشے باجے کا زور اسدرجہ ہوتا ہے کہ کان دہری آواز تک نہیں سُنائی دیتی۔ دُلہن کے
لیے چڑہاوے اور دیگر قسم کا سامان بھی اسی جلوس کے ہمراہ جاتا ہے۔ اس چڑہاوے میں
ایک بہت ہی بیش قیمت جوڑا کہ جسکے مقابل کا کوئی اور نہیں ہوتا۔ جاتا ہے اور ایک جوڑے
کی صرف سرخ ٹول گیارہ گز جسکو سُوا کہتے ہیں رکھدی جاتی ہے اس اخیر جوڑے کے ساتھ
پائجامے کے لیے سوا دو گز گلابی رنگ کی لینگ کلاتھ یا سرخ سبز گلبدن بغیر سلا ہوا ہوتا ہے
اسی جوڑے کے خوان میں ایک کاغذ کا پُڑا بھی رکھا ہوتا ہے جسکو کہ سہاگ پُڑا کہتے ہیں۔
اسکے اندر خوشبودار مسالہ مثل جاوتری۔ جائفل۔ زعفران۔ چھوٹی بڑی الائچی۔ ناگرموتھا
بالچھڑ چھیل چھبیلا وغیرہ کے ہوتا ہے۔ اسکے اندر دلہن کی ناک میں پہننے کے لیے ایک سونے
کی نتھ جس میں کہ تین عمدہ موتی بھی پڑے ہوتے ہیں رکھدیتے ہیں البتہ جو لوگ کم مقدور ہیں
وہ بجائے نتھ کے ایک دو روپیے اُسکے اندر رکھدیتے ہیں اور چھوٹے موتی سوے کے
کسی ایک کونے میں باندہ دیتے ہیں۔ اس سہاگ پُڑے کی بہت کچھ آرستگی ہوتی ہے۔
گوٹے پٹھے کلابتون اور زردوزی کا کام اُسپر کیا جاتا ہے۔ اکثر لوگ اسکے بیچ میں ایک نہایت

موزوں آئینہ بھی لگا دیتے ہیں۔ بعض سُنہری و روپہلی پنّی یا ابرک آراستگی کے لیے استعمال کرتے ہیں اکثر مفلس اُسکے کاغذ پر کتّے کے سرخ ٹیکے ہی لگا دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اسکے بعد اُسپر کلاوہ یا گوٹہ ٹھپا لپیٹ دیا جاتا ہے چڑہاوے میں علاوہ جوڑے کے چار شیشے جن پر نقاشی کا کام عمدہ کیا جاتا ہے۔ اور انکے اندر ڈنڈیوں یا شہاب کا سرخ رنگ بھر دیا جاتا ہے ہوتے ہیں۔ اُن کو مع تیل عطر وغیرہ کی شیشیوں کے ایک خوان میں آٹے سے چپکا کر رکھدیتے ہیں۔ اور اُنکے مُنہ پر گوٹے کے سرخ کپڑے باندھے جاتے ہیں علاوہ انکے سر پر باندھنے کے لیے کلاوے۔ مہندی سُرمہ۔ مسی۔ پیالیاں۔ تیل ڈالنے کی کنگھیاں اور دہماؤلے[1] کی دو انگوٹھیاں ہوتی ہیں اس سامان کے ساتھ ہی گود بھرنے اور دُلہن کی آراستگی وغیرہ کے لیے وہ کُل سامان بھی ہوتا ہے جو کہ ہم منگنی قسم اول میں بیان کر چکے ہیں جوڑے کے ہمراہ ایک نہایت بیش قیمت اور خوبصورت جوتا جس میں کہ چاندی کے گھنگرو لگے ہوتے ہیں دُلہن کے پہننے کے لیے بھیجا جاتا ہے ساچق کے جلوس میں علاوہ نقش و نگار کی ہوئی مٹکیوں کے دو سادی مٹکیاں اور ہوتی ہیں جنکو کہ چونے سے لیپ دیتے ہیں ایک میں ڈہائی سیر گڑ کا شربت اور دوسری میں صرف دہی ہوتا ہے۔ اُنکے مُنہ کلاوے سے باندھتے ہیں جسپر کہ کچے آٹے کی مچھلیاں بنا کر چپکا دیجاتی ہیں۔ ایک ٹوکرے میں سے پالک کا ساگ بھی بھیجا جاتا ہے۔ ساچق سے ایک دو روز قبل دلہن والوں کے گھر چار پانچ من یا کم و بیش جیسی مقدرت ہوئی شکر میوہ اور نُقل وغیرہ بھیجے جاتے ہیں۔

جب رات کو دُلہن کے گھر کُل سمدہنیں اور سمدہی (یعنی دولہ کی طرف کے عورت مرد) مع اپنے ہمراہیوں کے آجاتے ہیں۔ تو گھر میں چڑہاوے وغیرہ کی کُل وہی رسوم عمل میں آتی ہیں جو کہ ہم منگنی کے بیان میں لکھ چکے ہیں۔ صرف فرق اتنا ہے کہ منگنی میں نقدی ہاتھ پر رکھی جاتی ہے اور اسوقت دو روپیے یا اٹھنی یا چوّنی یا دوّنی۔ مگر دو روپیے سے زیادہ نہیں۔

[1] ایک خاص وضع کی خالص چاندی کی انگوٹھی جسکے نگینے کی جگہ پر سوائے ایک گول اُٹھے ہوئے دانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

دلہن کی گود میں ڈال دیتے ہیں۔ باہر مردوں میں محفل رقص و سرود گرم رہتی ہے طوائفوں
اور نقالوں کو دولہا والے اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ قریب بارہ بجے رات کے جبکہ رخصت کا
وقت قریب ہوتا ہی تو محفل میں نوشہ کے لیے چڑہاوا آتا ہی۔ اور وہ اُسکو چڑہا دیا جاتا ہے پھر
شربت وغیرہ ہونے کے بعد سب رخصت ہو جاتے ہیں۔

بیان رتجگے کا

مرد تو باقی ماندہ شب میں سو رہتے ہیں مگر دولھا دلہن دونوں طرف کی بیچاری عورتونکو
اب بھی سونے کا حکم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اسوقت دونوں جگھہ رتجگا ہوتا ہی۔ جسوقت گلگلے پکانے
کے لیے کڑہاؤ چڑہایا جاتا ہے اُسوقت دولھا اور دُلہن کی بہنیں یعنی سواسنیں دونوں جگھہ
ایک گُلگُلا سب سے اول اپنے اپنے ہاتھ سے کڑہاؤ میں چھوڑتی ہیں۔ پھر اپنا حق طلب
کرتی ہیں۔ جو کہ پہلے ہی سے چولھے کے پیچھے مع گُڑ اور آٹے کے رکھدیا جاتا ہے۔ ساتھ
کے ساتھ ہی مراسنیں اللہ میاں کی سلامتی اور اللہ میاں کے گیت گاتی ہیں۔ رتجگے میں
علاوہ کڑہائی چڑہانے کے ایک کوری مٹکی میں شربت بھی بھرا جاتا ہی جس کے اوپر صندل کا
چھاپہ لگانے کے بعد ایک بدہنی جس پر کلاوہ باندہا اور سہرا لٹکایا جاتا ہے۔ مٹکی کے مُنہ پر
رکھتے ہیں۔ اس بدہنی کی ٹونٹی میں پان کا ایک بیڑا ٹھونس دیا جاتا ہے یہ مٹکی اور بدہنی بحیثیت
مجموعی اللہ میاں کی سنجری کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ رتجگے کا سب کام سواسنیں
کرتی ہیں اور اُن کو اُسکا نیگ بھی ملتا ہے۔ جس جگھ سنجری اور نیاز کی اور چیزیں رکھی جاتی
ہیں اُس جگھہ کو مٹی یا کھریا سے لیپ دیتے ہیں۔ گلگلوں کے ساتھ پسے ہوے چاولوں
یا ماوے کے لڈو بنائے جاتے ہیں۔ اور اُن کو عورتوں کے لغت میں اللہ میاں کے
رحم کہتے ہیں۔

ایک طباق اور طیار کیا جاتا ہے جسکو اللہ میاں کی چومک کہتے ہیں۔ اس میں

خشک آٹا رکھنے کے بعد آٹے کا چوکھا چراغ بناکر رکھتی ہیں۔ اور بجاے تیل کے گھی اور بجاے روئی کی بتی کے کلاوے کی بتی بناکر ڈالی جاتی ہی۔ اسی طباق کے ایک کونے میں مُلا یعنی نیاز دینے والے کے لیے کچھ نقدی رکھدی جاتی ہی۔ الغرض نماز صبح کے وقت اُسی پاک جگہہ میں اللہ میاں کی چوکی۔ اللہ میاں کی سنجیری۔ گلگلے اور رحم نہایت خوش اعتقادی سے رکھے جاتے ہیں۔ اور کسی ملا کو بلوا کر اُس سب پر اللہ میاں کی سلامتی یا نیاز دلوائی جاتی ہی۔ جب ملا صاحب نیاز دیکر چراغی گلگلے اور رحم لیکر چلتے ہیں اسوقت اُن حضرت پر گالیوں کی خوب بوچھار ہوتی ہے پس اس طرح پر رتجگے کی رسم ختم ہو جاتی ہے۔

بیان بیوی کے کھانے کا

اس روز دوپہر کو دونوں جگہ حضرت بیوی کا کھانا ہوتا ہی جس میں شامل ہونیکے لیے جن عورتوں سے کہا جاتا ہے وہ صبح سے اُسوقت تک کچھ کھاتی پیتی نہیں ہیں۔ یہ آدھے دن کا فاقہ حضرت بیوی کا روزہ کہا جاتا ہے جو عورتیں کہ اس کھانے میں شامل ہوتی ہیں اُنکے لیے ضرور ہی کہ وہ پارسا۔ عمدہ چال چلن کی اور پاک صاف ہوں جس بیوہ نے کہ عقد ثانی کیا جسکے حسب و نسب میں فرق ہو یا جسنے کسی بازاری عورت کے ساتھ کھایا پیا ہو۔ یا جسکا خاوند شرابی نشہ باز ہو۔ اُسکو اس پاک کھانے میں ہرگز شریک نہیں کیا جاتا ہے اگر کوئی ایسی عورت فریب سے شامل ہو بھی جاے تو عورت کے اوہام کے مطابق اس کھانے کے چاول اُسکے منہ میں نہیں چل سکتے ہیں۔ بلکہ سوڑوں میں سے خون نکلنے لگتا ہی۔ اور اُس کی سزا اُسکو اسی سال میں ملجاتی ہے۔ جو عورتیں کہ اس میں شامل ہوتی ہیں اُن کو بیوی زنین کہتے ہیں۔ اور اُن کی تعداد کھانے کے وقت ۸ سے کم اور ۱۲ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ایک معینہ وزن میں خشکہ یا زردہ بیوی زنین خاص اپنے ہاتھ سے پاک صاف برتنوں اور اچھوتے پانی سے پکاتی ہیں۔ کسی غیر عورت یا خادمہ کو اسمیں دخل دینے کا

مجاز نہیں ہوتا۔ گیارہ بجے دن کے قریب مٹی کے چودہ طباقوں میں یہ کھانا نکالا جاتا ہے
جنپر کہ میوہ دہی اور شکر ڈالی جاتی ہے۔ ان میں سے چار طباق علحدہ نکالکر رکھدیے جاتے
ہیں۔ جوکہ پیغمبر صاحب اور پیروں کی نیاز کے طباق کہے جاتے ہیں۔ جو طباق کہ عورتوں کے
آگے رکھے جاتے ہیں۔ انکو بیوی کی سینک کہتے ہیں۔ جنکی طرف کھانا تو درکنار مرد نظر تک
نہیں ڈال سکتے مگر ہاں پیغمبر صاحب کی نیاز کے طباقوں میں سے انکو بھی کھانے کی اجازت
ملسکتی ہے جس جگہ کہ بیوی کی سینکیں رکھی جاتی ہیں اور یہ بیوی زنیں کھاتی ہیں۔ اسکو
پہلے لیپ لیتی ہیں۔ ادھے روزکار روزہ اسی اللہ میاں کی منجری کے شربت سے جوکہ رتجگے
کے وقت بھری گئی تھی کھولا جاتا ہے۔ جب کل پاک بیوی زنیں کھانے سے فارغ ہو جاتی ہیں
اسوقت علاوہ بہت زیادہ محتاط منکوحہ عورات کے سب عورتیں مسی سرمہ۔ مہندی عطر
وغیرہ لگاتی ہیں۔ نوشہ والوں کے یہاں یہ سنگار کی چیزیں بازار سے آجاتی ہیں۔ مگر دلہن والوں
کے یہاں اسی میں سے جوکہ ساچق میں عروس کے لیے سامان گیا تھا۔ تھوڑا تھوڑا نکالکر استعمال
کیا جاتا ہے۔ اگر رجب کا مہینہ ہوتا ہے تو یہ اللہ میاں کی بھولی بندیاں تھوڑی گھلی ہوئی مہندی حق
کے اندر بھی ڈال لیتی ہیں وہ اس خیال سے کہ اسکی وجہ سے قسمت سبز ہو جائیگا۔ ایک عجیب
رسم یہ بھی ہے کہ پاک کھانا کھاتے وقت کوئی سوہاگن ان بیوی زنوں کے پاس آکر
کھڑی ہوتی ہے اور اپنے سرخ دوپٹے کا ایک کونا قصداً لٹکا دیتی ہے۔ جسکو کہ کل بیوی زنیں
اسی کھانے بھرے ہوے ہاتھوں سے چھوکر مبارکباد دیتی ہیں جسکے جواب میں وہ سوہاگن
سب کو سلام کرتی ہے۔ دلہن کے گھر کی بیوی زنوں کو ایک ایک ٹکڑا اسی سرخ کپڑے
میں سے آدہ گز پھاڑکر جسکو سوا کہتے ہیں اور جو دلہن کے جوڑے میں ساچق کے روز
آتا ہے تقسیم کیا جاتا ہے۔ جوکہ زیادہ تر بیویوں اور غیر منکوحہ عورات کے موباف کے کام
آتا ہے اور جسکو کہ میلا ہو جانے کے بعد دریا یا کنوئیں میں پھکوا دیتی ہیں سرمہ۔ مسی عطر
وغیرہ اس قسم کے کپڑے کے موباف سے بعض بعض منکوحہ عورات کو صرف اسلیے پرہیز ہے

کہ اُنکے خیال میں ایسی پاک جگہ کی چیزوں سے اپنے تئیں مزین اور آراستہ کر کے شوہر کے پاس جانا حضرت بیوی صاحبہ کے حضور میں سخت سوء ادبی ہے۔ جب ان کُل باتوں سے یہ نادان عورتیں فارغ ہو چکتی ہیں اُسوقت کل بچا ہوا کھانا عطر وغیرہ کی خالی شیشیاں مسّی۔ سرمہ کی پڑیوں کے کاغذ اور جو کچھ کہ وہاں گرا پڑا ہوتا ہے وہ سب اُس ظرف میں جس میں کہ چاولوں پر ڈالنے کے لیے دہی آیا تھا۔ بھر کر مع کھانے کے طباقوں کے دریا یا کسی کنوئیں میں پھکوا دیا جاتا ہے۔ اسکے بعد اُسی جگہ کو جہاں کہ بیٹھکر حضرت بیوی کی سینک کھائی گئی تھی۔ پھر دوبارہ لیپ دیا جاتا ہے اور بیوی کے گیت گائے جاتے ہیں دلہن والوں کے یہاں وہی سوے کا سادا جوڑا جو کہ ساچق میں آیا تھا۔ بیونت کر وہی بیوی زنیں اُسی وقت اُسکو سیتی ہیں پس اس طرح سے بیوی کے پاک کھانے کی رسم ادا ہوتی ہے اور تھوڑے عرصہ کے بعد اُنھیں منقش شیشوں کے زرد رنگ سے جو کہ ساچق میں آتی ہیں۔ دلہن کا زرد جوڑا رنگا جاتا ہے جو رنگ کہ بچ جاتا ہے اُس کی خوب ہولی کھیلی جاتی ہے۔ اُسکے بعد اُٹھنا ہوتا ہے پس ساچق رتجگے اور بیوی کے کھانے کے متعلق جسقدر حالات تھے وہ سب ہم لکھ چکے۔ اب ذیل میں کچھ حال رسم حنا بندی کا لکھا جاتا ہے۔

بیان رسم حنابندی

اسی روز یعنی ساچق کے دوسرے دن شام کے وقت سے دولھا والوں کے یہاں مہمانوں کی خاطر و تواضع کے سامان نہایت سرگرمی سے ہوتے ہیں اور رقص و سرود کی مجلس کے لیے مکان آراستہ کیا جاتا ہے اور ادہر دلہن والے مہندی لانے کی تیاری میں مصروف ہوتے ہیں۔ سات آٹھ بجے شب کو کل اعزا و اقربا جمع ہو کر اُسی جلوس اور دھوم دہام سے جس طرح کہ دولھا والے ساچق یا بری لاتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اپنی مہندی لیجاتے ہیں۔ پھلواری آتشبازی وغیرہ زیادہ تر وہی ہوتی ہے۔ جو نوشہ والے اپنے ہمراہ ساچق میں لاتے ہیں

البتہ کسی قدر اپنی طرف سے بھی بنوا کر شامل کر دیجاتی ہے۔ جو سامان کہ اُسکے ہمراہ بھیجا جاتا ہی اُسکے ایک خوان میں تو نہایت عمدہ جوڑا نوشہ کے لیے جسکے ساتھ رومال پھولوں کے ہار وغیرہ ہوتے ہیں اور ایک سنگار دان میں ورقوں سے لپٹے ہوے بیڑے ہوتے ہیں ایک چوکی چاندی کے پترے جڑی ہوئی یا صرف لکڑی ہی کی مگر رنگی ہوئی ہوتی ہی جسپر کہ عمدہ زردوزی کام کا گردا بچھا کر ایک طباق گندہی ہوئی مہندی کا جس میں کہ پتی ابرک وغیرہ کے نقش و نگار بنائے جاتے ہیں اور چار شمعیں چاروں کونوں پر روشن ہوتی ہیں۔ رکھا جاتا ہی دوسرا طباق نوشہ کے کھلانے کے لیے مالیدہ کا ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں مع ایک لوٹے کے خوانوں پر رکھی ہوتی ہیں۔ دومن کے قریب مالیدہ علٰحدہ دوسرے خوانوں میں رکھ کر بھیجا جاتا ہے جو نقش و نگار کی ہوئی مٹکیاں نوشہ والوں کے ہمراہ ساچق کے روز جاتی ہیں۔ اُن میں سے چار مٹکیاں لیکر ایک میں میوہ دوسری میں نوشہ کے یہاں کے آئے ہوئے نقل تیسری میں پینڈیاں اور چوتھی میں اُبٹنا ہوتا ہے۔ ان مٹکیوں کے مُنھ بند کرکے اُنکے اوپر شمعیں لگائی جاتی ہیں اور ایک تخت پر جسکو چوگھڑا کہتے ہیں۔ رکھدی جاتی ہیں۔ انکے علاوہ زردے یا مٹھائی کے چوبے بھی نہایت ہی آراستگی کے ہوتے ہیں جن پر کہ کھوپرے اور چھوارے وغیرہ کے پھول پتے بنائے جاتے ہیں۔ جس چوبے میں سے خود دولہا کھاتا ہے اُس میں اکثر پان کو کتر کر اُسکے نام کے حروف بھی لگا دیے جاتے ہیں اُن کے ڈھانکنے کے واسطے جھلملیوں کی یا قبہ دار کھانچیاں بنائی جاتی ہیں۔ ایک بانس کی بنی ہوئی مہندی بھی جیسی کہ تعزیوں پر چڑہائی جاتی ہے۔ ہوتی ہے یہ سب سامان ہمراہیوں کے ساتھ نہایت جلوس سے نوشہ کے گھر تک آتا ہے۔ مرد باہر جلسے میں مشغول محفل رقص و سرود سے حظ حاصل کرتے ہیں۔ ناچ رنگ دلہن والے اپنے ہمراہ اپنے خرچ سے لاتے ہیں۔ سمدھنوں کے آنے کے وقت مراثنیں اُنکو اپنے گیتوں میں ذرا نرمی لیے ہوے گالیاں دیتی ہیں جنکو سُنکر وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ بلکہ بعض ارمان

والی عورتوں کی تو مدت کی آرزو انکو پوری سُنکر پوری ہوتی ہے۔ جب سب سمدھنیں نوشہ کے گھر جمع ہوجاتی ہیں اُسوقت نوشہ کو گھر میں بلایا جاتا ہے نوشہ کی کوئی بہن اُسکے سر پر اپنا سرخ دوپٹہ ڈال کر گھر میں لاکر اُسی چوکی مذکورہ بالا پر بٹھاتی ہے جو عورتیں دلہن والونکی طرف سے آتی ہیں وہ نوشہ کو اُسی جگہ کپڑے پہناتی ہیں۔ پھر پھولوں کے ہار وغیرہ پہنائے جاتے ہیں جسوقت دُلہن کی بہن اُسکو پھولوں کی بدھی پہناتی ہے تو نوشہ اُسکو ایک روپیہ نذر کرتا ہے اسکے بعد چوبے کے سات نوالے کھلائے جاتے ہیں۔ ساتویں نوالے پر عجیب دل لگی ہوتی ہے یعنی جب نوشہ نوالہ لینے کے لیے اپنا مُنہ لاتا ہے اُسی وقت وہ کھانے والی سواسن اپنا ہاتھ پیچھے کی طرف کھینچ لیتی ہے اُسوقت حضرت نوشہ کو بڑی خفت ہوتی ہے بعض چالاک نوشہ نہایت تیزی و چالاکی سے نوالہ مُنہ میں لے لینے میں کامیاب بھی ہوتے ہیں بعدہ مالیدہ بھی بالکل اسی طریقہ سے کھلایا جاتا ہے ساتواں نوالہ دونوں چیزوں کا پورا نوشہ کو نہیں کھلایا جاتا۔ بلکہ عورتوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے اسکے بعد بیڑا کھلایا جاتا ہے پھر مہندی اس طریق سے لگائی جاتی ہے کہ نوشہ کے سیدھے ہاتھ پر ایک پان رکھکر اُس پر ایک روپیہ دھرا جاتا ہے اور پان پر سب سواسنیں اپنی طباق میں سے تھوڑی تھوڑی مہندی لیکر رکھ دیتی۔ اور ہاتھ پر یا انگلی پر یا کسی ناخن پر مہندی لگادیتی ہیں۔ پھر مبارکباد ی اور سلامتی گائی جاتی ہے اور وارن پھیرن کی جاتی ہیں۔ چوکی سے اُٹھتے وقت نوشہ سب کو سلام کرتا ہے جسکے صلے میں دلہن کی بہن وہی روپیہ جوکہ نوشہ نے ابھی اُسکو دیا تھا۔ بطور سلام کرائی اُسکو دیتی ہے اسکے بعد نوشہ باہر چلا جاتا ہے اور سمدھنوں میں پان الائچی اور میوے کے ہار وغیرہ تقسیم کیے جاتے ہیں، شربت گھر میں اور باہر مردوں میں دونوں جگہ پلایا جاتا ہے آدھی رات کے وقت مجلس برخاست ہوجاتی ہے مرد اپنے اپنے گھر واپس جاتے اور عورتیں دُلہن کے گھر واپس جاتی ہیں۔ (باقی آیندہ)

از معلم نسواں

ماں کی فضیلت

اس مضمون میں ہم عورتوں کو مخاطب نہیں کرتے ؛ بلکہ ہمارا خطاب مردوں اور جوانوں سے ہے۔ ہمارا خطاب اُن لاکھوں آدمیوں سے ہے ، جو ماں کی محنت اور کام کی داجبی قدر نہیں کرتے ہمارا خطاب اُن لاکھوں انسانوں سے ہے ، جو ماں کی محبت اور اخلاص کا جان بوجھکر انکار کرتے ہیں ، جو نہیں جانتے کہ وہ کس طرح اپنی جانیں قربان کرتی ہیں اور کس طرح راحت و آرام کو اپنے نفسوں پر حرام کرلیتی ہیں ، جو نہیں پہچانتے کہ قومی زندگی کی شاندار عمارت اسی محبت اور اسی قربانی کی بنیاد پر اُٹھائی گئی ہے

رات کیوقت جب ہوا بند ہوتی ہے اور گرمی کی شدت ہوتی ہے اور لوگوں کا دم گھٹا جاتا ہے، اور گرد و غبار اور دُھواں ہوا میں پھیلا ہوا ہوتا ہے ، تم دیکھوگے کہ سینکڑوں عورتیں اپنے بچوں کو گود میں لیے گھروں میں ٹہلتی پھرتی ہیں ۔

تم دیکھوگے کہ اُن گھروں میں جو شہروں کے نشیب و فراز میں ہر طرف پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ، سارے دن کی تکلیف اور محنت سے چور ہوکر بھی عورتیں آرام سے نہیں بیٹھتیں اُنکے تیور اب بھی میلے نہیں ہوتے ۔ وہ بدستور خوش دکھائی دیتی ہیں اور بچوں کے رکھ رکھاؤ میں مشغول ہیں۔

آدھی رات کا وقت ہو ، یا صبح کا ہو جبکہ تمام دنیا کے مرد گھری نیند میں غافل ہوتے ہیں ، اُن مقامات میں جو قطب شمالی کے قریب ہیں اور جہاں مکانات برف سے ڈھکے رہتے ہیں اُن آبادیوں میں ، جو خط استوا کے نیچے ہیں اور جہاں گرمی نہایت شدت سے ہوتی ہے ، اُن عالیشان محلوں میں جہاں عیش پرستی کے تمام سامان مہیا ہیں اور اُن جھونپڑیوں میں جہاں افلاس اور بدبختی نمایاں ہے ، تمام عورتوں کو بیدار پاؤگے اور دیکھوگے کہ وہ اپنے فرض سے غافل نہیں ہیں اور بچوں کے پالنے کی دُھن میں

لگی ہوئی ہیں۔

جب ہم کسی مرد کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی ذات کے فائدہ کے لیے کام کرتا اور اُس کام کو محنت اور جفاکشی سے انجام دیتا ہے، تو اُس کی تعریف کرتے ہیں۔

جب ہم کسی مرد کو دیکھتے ہیں کہ اُسنے تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور رفتہ رفتہ دولتمند ہوگیا اور اُس نے دولت کے خزانے سمیٹ لیے تو ہم اُس کی تعریف کرتے ہیں۔

مگر سوچو اور غور کرو کہ مردوں کی جفاکشی اور دلیری اُس محنت اور تکلیف کا کیونکر مقابلہ کر سکتی ہیں، جو عورتوں کو بچوں کے پالنے میں جھیلنی پڑتی ہیں۔

بلاشبہ ماں کی محبت خالص ہے۔ اس میں کوئی ذاتی غرض نہیں ہے اور اُس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

ہزار مردوں میں سے صرف ایک مرد ہوگا، جو کسی خاص منصوبہ کے پورا کرنے میں اپنی زندگی کو قربان کرتا ہے؛ مگر ہزار میں سے ہزار عورتیں ہیں، جو اپنے بچوں کی خاطر اپنی جانیں قربان کرڈالتی ہیں۔

ہرایک مرد اپنی ماں کا احسانمند اور مقروض ہے۔ وہ ذہانت اور تندرستی، اخلاق اور چستی، سب کچھ ماں سے حاصل کرتا ہے۔ اور کامیابی اور ترقی کی اُمنگیں بھی جو ہر وقت اُسکے دل میں موجزن رہتی ہیں، اُسکو ماں ہی کی طرف سے ملی ہیں۔

تو اب غور کرو کہ مرد اپنی ماں کے احسان کا بدلہ کیا دے سکتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قوم بھی اُن خوبیوں کا معاوضہ نہیں دیسکتی، جو ماؤں نے بچوں کو بیدریغ عطا کی ہیں۔

مغرور مرد اگر تھوڑا سا روپیہ اپنی ماں کو دیتا ہے، یا کچھ سلوک اُسکے ساتھ کرتا ہے، تو خیال کرتا ہے کہ اُسنے بہت بڑا احسان کیا؛ حالانکہ ماں وہ ہے، جو اُسکو عدم سے ہستی میں لائی اور جسنے اُس کی خاطر اپنی میٹھی نیند، اپنی بھرپور جوانی اور اپنی پوری طاقت صرف کرڈالی

اگر قوم کی طرف سے بیوہ ماؤں کے لیے کوئی شفاخانہ قائم کیاجاتا ہے، یا سرسری طور سے بچوں کو کچھ دوائیں مفت دی جاتی ہیں، یا جاہل ماؤں کے لیے کوئی چھوٹا سا مدرسہ کھولا جاتا ہے، یا نادان بچوں کو کچھ کتابیں اور لکھنے پڑھنے کی چیزیں دی جاتی ہیں، تو خیال کیا جاسے کہ قوم نے اپنا فرض ادا کردیا، جو اُسکے ذمے واجب تھا، حالانکہ یہ نہایت شرم کی بات ہے۔

دنیا کی تاریخیں کھولو اور اُنکے ورق اُلٹ ڈالو۔ تم کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں جو بڑے آدمی ہو گزرے ہیں، وہ اپنی ماؤں کی کیسی قدر کرتے تھے۔

نپولین باوجود اسکے کہ وہ ایک مغرور اور جنگجو شخص تھا، اپنی ماں کی دل سے عزت کرتا تھا، اور ہمیشہ کہا کرتا تھا۔ " میں اپنی تمام ترقیات اور فتوحات میں اپنی مہربان ماں اور اُسکے شریفانہ اُصول کا احسانمند ہوں اور یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا کہ ہر بچے کی آیندہ حالت اُسکی ماں پر موقوف ہے "

اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ ہر بچے کی آیندہ حالت اُس کی ماں پر موقوف ہے اور نوعِ انسان کی آیندہ حالت کا انحصار ماؤں ہی کے وجود پر ہے۔ اُن بیشمار نیکیوں اور خوبیوں پر غور کرو، جو کروڑوں ماؤں کی محبت اور جانفشانی سے انسانوں کو مل سکتی ہیں۔

ہر ماں پوری امید بلکہ پورا یقین رکھتی ہے کہ اُسکا بچہ زمانہ آیندہ میں شاندار کامیابی اور خوش نصیبی کا حقدار ہے۔

کسی بچے کو دیکھو، اُسکا چھوٹا سا سر ماں کے کندھے پر ادہر اُدہر کیونکر حرکت کرتا ہے اُسکا منہ دانتوں سے خالی ہے؛ اسلیے دودھ کے سوا وہ کوئی اور غذا نہیں کھا سکتا۔ اُسکی آنکھوں میں پُتلیاں ادہر اُدہر گھوم جاتی ہیں؛ مگر ابھی وہ نہیں جانتا کہ دنیا کی کن چیزوں پر اُسکی نظر پڑتی ہے۔ یہ چھوٹا سا بچہ جو ذرا آگے چلکر مرد ہو جائیگا، دیکھنے والوں کی نظر میں گوشت کا لوتھڑا ہے، جو انسانوں سے بھرپور دنیا میں اوپر سے پھینکدیا گیا ہے۔

مگر ماں اُسکو حیرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اُسکے رونے اور بسورنے میں کیسے گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔ وہ اُسکے مسکرانے میں زمانہ آیندہ کی عظمت و ناموری کا مطالعہ کرتی ہے۔ اسکو اس چھوٹے سے سر میں آنے والی کامیابیوں اور ترقیوں کی تصویر نظر آتی ہے اُسکو پورا یقین ہے کہ میرا پیارا بچہ جوان ہوکر شہرت اور عزت حاصل کریگا۔
یہ کامل یقین کی روشنی جو اُسکے دل میں جلوہ گر ہے، اُسکو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی زندگی اُسپر قربان کرے اور ہمیشہ اُسکو پیار اور محبت کی نظر سے دیکھے اور اُسکے پالنے اور تربیت کرنے میں نہ اپنی نیند کی پروا کرے، نہ بھوک کی۔
ہر بچہ پیدائش کے دن سے جوانی کی عمر تک اپنی ماں کی مہربانیوں اور شیریں زبانیوں میں چاروں طرف سے گھرا رہتا ہے؛ اسلیے اگر سنگدلی و وحشت رفتہ رفتہ دنیا سے کافور ہوجائے اور اُس کی جگہ بُردباری اور نرمی انسانوں میں پھیل جائے، تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے۔
ماؤں کی شفقت اور مہربانی ہی وہ چیز ہے، جو نوع انسان میں نیکیاں پیدا کرتی ہے
ماؤں کی چستی اور جاں نثاری ہی وہ چیز ہے، جو انسانوں میں دلیری اور جرأت کی روح پھونکتی ہے۔
اگر ہم کسی انسان کے اخلاق پر رائے دینا چاہتے ہیں، تو ہم کو دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے اور لوگوں کی ماؤں یعنی عام عورتوں سے وہ کیونکر پیش آتا ہے۔
معزز ناظرین! میں آخر میں التجا کرتا ہوں کہ تم میں سے ہر ایک کو اپنی ماں کے ساتھ، اور ہر ماں یعنی ہر عورت کے ساتھ نیکی اور مہربانی سے پیش آنا چاہیے۔ تم پر فرض ہے کہ اُنکی تکلیفوں اور مصیبتوں کو ہلکا کرنے میں مدد دو۔ اُنکے دل و دماغ کو روشن کرنے اور اُنکے اخلاق کو زندہ و تر و تازہ کرنیکا بندوبست کرو۔ اُنکے لیے شفاخانے کھولو؛ تاکہ اُن کو اپنے اور اپنے بچوں کے تندرست رکھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔ اُن کے لیے مدرسے جاری کرو؛ تاکہ وہ تعلیم پاکر اپنے بچوں کو علم و اخلاق کے سانچے میں ڈھالنے کے لائق ہوسکیں اور یاد رکھو کہ قوم کی

جسمانی اور عقلی ترقیوں کی بنیاد عورتوں کی جسمانی اور عقلی ترقی پر ہے۔ کسی اور چیز پر نہیں۔

از انسٹیٹیوٹ گزٹ

کرشن کماری بائی

معزز ناظرین۔ آپ نے وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مختلف بہادر اور شریف و پاکدامن خواتین کے حالات پڑھے اور سُنے ہونگے۔

لیکن آج ہم ایسی خاتون کے حالات قلمبند کرنا چاہتے ہیں جسکو پڑھکر اپنے دل پر آپ ایک گہرا اثر پائینگے۔

یہ وہ واقعہ ہے جس کی نظیر آج ہندوستان کی تاریخ میں نہیں اور خود اہل یورپ اسکے مدّاح اور اسکی عفت اور پاکدامنی کے معترف ہیں۔

اللہ اللہ وہ بھی یدِ قدرت کی بنائی ہوئی کیا کیا سورتیں تھیں جو اب خاموش ہیں۔ اور ایک مدت سے مادرگیتی کی آغوش میں نہایت آرام گہری نیند سو رہی ہیں۔ اُنکے کارنامے ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اُن کی بہادری۔ پاکدامنی۔ اور عصمت کے تعریفوں سے تواریخ کے صفحوں کے صفحے بھرے پڑے ہیں۔

وہ مُنہ سے نہیں بولتی ہیں لیکن اُن کی خاموشی اُنکے حالات پر ایک تازہ روشنی ڈالتی ہے۔ آج ہمارا مقصد کرشن کماری کے حالات قلمبند کرنیکا ہے۔ وہ کونسا دل ہے جو اسکو پڑھکر نہ کڑھیگا اور وہ کونسی آنکھ ہے جو حسرت اور عبرت کے آنسوؤں سے نہ روئیگی۔ پندرہ سولہ سال کی جوان جہان ہندو خاتون کا تذکرہ لکھتے ہیں۔ دل پر عجب غم و اندوہ کا سیاہ سیاہ بادل چھایا ہوا ہے۔

اس معزز خاتون اور پاکدامن دپاک عصمت رانی کی زندگی بھی عجب زندگی تھی۔

جب تک زندہ رہی والدین کو ہر طرح کے مشورے اور صلاح دیتی رہی اور جب مری تو ناموس کی خاطر۔ کہنے کو سولہ سال کی عمر پائی۔ مگر وہ کام کر گئی جو قیامت تک تاریخ کے صفحوں سے نہ مٹے گا۔

یہ رانی راجہ اودے پور کی بیٹی تھیں۔ سنہ تاریخ بہت جستجو کے بعد ۱۷۹۲ء معلوم ہوا۔ بیحد حسینہ و جمیلہ تھی۔ نیچر نے اسکو حُسن و ملاحت کی دولت سے پورے طور پر مالامال کیا تھا اُسکے ہر ایک حرکات و سکنات نہایت دلکش تھے۔ زبان نہایت شیریں اور پُر درد تھی۔ رائے ہمیشہ صائب۔ اور طرز گفتگو بغایت پسندیدہ تھا۔ ملکم صاحب اپنی مشہور کتاب میں تحریر فرماتے ہیں گو کہ میں نے اُسکو نہیں دیکھا لیکن اُسکے بڑے بھائی راجہ جیون سنگھ ولیعہد بہادر کو بخوبی دیکھا ہے۔ مینے سُنا ہے کہ ولیعہد کی صورت اپنی بہن سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ یہ شہزادہ نہایت حسین و شکیل ہے اسکا رنگ سانولا اور قد میانہ ہے چہرہ سے متانت سنجیدگی اور نزاکت کے آثار نمایاں ہیں۔ اخلاق نہایت وسیع ہے۔ فراخ حوصلہ اور نہایت طباع ہے'' غرضکہ ہم اس تحریر سے کرشن کماری کا بھی ایک نقشہ اپنے دل میں قائم کر سکتے ہیں۔

جب رانی کی عمر ۱۵ سال کی ہوئی تو قدیم زمانے کے موافق راجہ (پدر) کو اسکے رشتہ ناتے کی فکر دامنگیر ہوئی۔ بالاخر اُسکا بیاہ راجہ بھیم سنگھ والی جودھپور سے قرار پایا۔ لیکن تقدیر کی باتوں کو کون جانے۔ اس اثنا میں منسوب شدہ راجہ راہی ملک بقا ہوا بعدہ راجہ جیپور نے پیغام شادی کا بھیجا۔ تلک چڑھنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ جودھپور کے نئے راجہ نے اس بنا پر پیغام شادی بھیجا کہ کرشن کماری اس سے قبل جودھپور کی گدی والے سے منسوب ہو چکی تھی۔ بہرکیف ان دونوں راجاؤں نے اس سے شادی کرنے کے لیے بڑے بڑے داؤ پیچ کھیلے آخر کار تنگ آکر وہ دونوں اپنے نتیجہ کے منتظر ہو بیٹھے اور بصورت ناکامیابی فوج کشی کا بھی پورے پورے طور سے بندوبست کر چکے تھے

راجہ اودے پور کی حالت اسوقت قابل رحم تھی۔ دو جھگڑالو راجاؤں کے درمیان بچارے کی جان آفت میں تھی۔ ہر چند تدبیریں سوچتا اور درباریوں سے مشورہ طلب کرتا تھا لیکن کسی کی عقل نے یاوری نہ کی۔ ہر شخص انگشت بدنداں نتیجہ کا منتظر تھا۔ بدقسمتی سے ایک فوجی افسر نے راجہ کو صلاح دی کہ جس کی وجہ سے اس قدر تکالیف۔ زیر باریاں اور پریشانیاں لاحق ہیں اُسی کا کیوں نہ خاتمہ کر دیا جائے۔ سینے تو ٹھ ہے اور ضعیف باپ کا دل بھر آیا۔ لیکن سوائے اسکے اور کوئی دوسری ترکیب رہائی کی نہ پاکر مجبور ہو گیا۔

لیکن اب فکر اس بات کی تھی کہ اس اہم کام کو کون انجام دے۔ جو شخص سُنتا تھا کانپ اُٹھتا تھا اور ہر طرح پر راجہ کو لعنت و ملامت کرتا تھا لیکن قسمت میں تو کچھ اور ہی لکھا تھا۔ اس طرح کی لعنت و ملامت پر قضا خود اشکبار تھی۔ کوئی ایسی صورت نظر نہ پڑتی تھی کہ راجہ کو اس اخیری اور ظالمانہ حکم کی تعمیل سے بچائے۔

لوگوں نے (یہ اشارہ خود راجہ اودے پور کی طرف سے ہوا تھا) اسکے ایک قریبی رشتہ دار راجہ دولت سنگھ کو مستعد کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ اب تمہارے ہاتھ میں اودے پور کی عزت ہے اس بے زبان اور مظلوم کے قتل کا اتنا بڑا جرم بھلا ایسے شریف طینت اور بہادر شخص سے کیونکر ممکن تھا فوراً جواب دیدیا کہ لعنت ہے تمہارے اوپر اور پھٹکار ہے تمہاری ایسی ہمت پر۔ اگر بہادر ہو اور بہادری و شجاعت کا خون تم میں موجزن ہے تو تلوار کا جواب تلوار سے دو۔ خدا مجھے وہ دن نہ دکھائے کہ میں ایسی معصوم صفت اور ہر دلعزیز رانی کے قتل کا مرتکب ہوں" اس جوابنے درباریوں میں بڑی پریشانی اور کھلبلی ڈالدی۔

پھر خود راجہ کا بھائی اس کام کے لیے تجویز ہوا۔ اُسنے بھی اولاً صاف انکار کر دیا۔ لیکن جب اُسے اشد ضرورت محسوس کرائی گی تو وہ بدبخت فوراً راضی ہو گیا۔ اور برچھی پوشیدہ طور پر اس جرم کے انجام دینے کو لے گیا۔ جسوقت داخل ہوا تو دیکھا کہ رانی کرشنا کماری

اپنی ماں سے باتوں میں مشغول ہے اور مسکراہٹ کے ساتھ اُس کی باتوں کا جواب دے رہی ہے قسی القلب چچا اس سین سے نہایت درجہ متاثر ہوا۔ برچھی چھوٹ کر گر پڑی۔ بدن میں رعشہ پڑ گیا۔ عرق ندامت سے تر بتر قریب تھا کہ بیہوش ہو کر گر پڑے لیکن سنبھلا اور نہایت پُر درد لہجے میں خواستگار معافی ہوا۔ ماں اپنی اکلوتی بیٹی کے ؛ اور پھر وہ بھی ایسی بائہنر اور سلیقہ شعار ، ہلاکت کا حال سُنکر زار و قطار رو تی تھی۔ کبھی تو اپنی نور دیدہ اور جگر گوشہ کو سینہ سے لگاتی اور کبھی اُسکی نورانی پیشانی پر بوسہ دیتی تھی۔ اُس کی بلورین کلائیوں کو پکڑ کر کبھی لپٹا لیتی تھی۔ اور اس وحشت انگیز اور عبرت خیز واقعہ نے وہ تلاطم پیدا کیا کہ سارا محل سکتے کی حالت میں پڑ گیا تھا۔

راجہ اس حالت کو دیکھکر نہایت شرمندہ ہوا لیکن قسام ازل نے تو اول ہی دن ایسی ہونہار دختر کی موت باپ کے ہاتھ لکھی تھی۔ ابھی کیونکر اسکا خاتمہ ہو جاتا۔ الغرض اسکی خدمت ایک نوکر کے سپرد کی گئی۔ اور بجائے برچھی یا تلوار کے اب کی مرتبہ زہر تجویز ہوا۔ خادمہ کانپتی اور روتی ہوئی زہر کا پیالہ لیکر اسکے پاس آئی۔ ماں کا کلیجہ درد کے مارے پھٹا جاتا تھا۔ درد اُٹھتا تھا اور کلیجہ میں رہجاتا تھا۔ طرح طرح کی کوششیں کیں کہ کسی صورت سے اس عقیل دختر کی جان بچے۔ لیکن نادر شاہی حکم نافذ ہو چکا تھا۔ سب کے دل ہل رہے تھے اور کلیجہ کی بُری حالت ہو رہی تھی۔ جسنے سُنا کہ آج ایسی تدابیر عمل میں لائی جائینگی۔ اُسکا دل دھڑکنے لگا اور راجہ کے حق میں گالیوں۔ اور لعن وطعن کے فقرے بلند ہونے لگے۔

مگر شاباش ہے اور ہزار آفریں ہے اُس بے زبان اور شریف دختر پر کہ صرف اس بات کی خاطر کہ اُس کی موت سے راجہ اودیپور کی عزت قائم رہے گی فوراً جان دینے پر راضی ہو گئی۔

اپنی ماں کو خوب سمجھاتی رہی اور طرح طرح کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتی رہی۔ اُسنے ایک آنسو بھی نہ نکلنے دیا۔

پہلے اپنے باپ کے حق میں دعا، خیر و برکت کے لیے ہاتھ اُٹھایا اور پھر اپنی ماں کے صبر و سکون کے لیے دعا کی۔ اور نہایت اطمینان سے زہر کے پیالے کو نوشجان کر گئی۔ لیکن اُسکا کچھ اثر نہ ہوا۔ اُس کی ماں نہایت بلند آواز میں گریہ کناں تھی۔ کرشن کماری اُسے سمجھاتی تھی اور کہتی تھی "اے مادر مہربان آپ کیوں اسقدر رو تی ہیں۔ کیا آپ نہیں جانتی ہیں کہ میں اپنی جان اپنے بزرگ والد کی عزت و حرمت کے بچانے کی غرض سے دے رہی ہوں۔ کیا اس سے بڑھکر عمدہ اور قابل فخر۔ کوئی اور زندگانی ہو سکتی ہے۔ اے پاک پروردگار اور اے مالک دو عالم تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں آج اپنے والد بزرگوار کی عزت و حرمت کے بچانے کے قابل ہوئی۔ تو ان میرے والدین کو ہمیشہ خوش رکھ۔ اور میری بیکس اور بے صبر و رنجیدہ والدہ محترمہ کو صبر عطا فرما" اسی عرصہ میں دوسرا تیز تر زہر کا پیالہ لایا گیا اور اُسنے نہایت متانت اور صبر کے ساتھ اسکو بھی نوش کر لیا۔ اور فوراً سو رہی۔ مگر آہ ایسی گہری نیند سوئی کہ پھر نہ جاگی۔ ایک باپ نے اپنی بیٹی و رجبنیہ کی جان اس غرض سے لی کہ اُس کی عزت و حرمت بچا سکے اور اُسکو اس غرض چھُری گھونپ کر حلال کیا تھا کہ ملک میں امن رہے لیکن افسوس! صد افسوس!! کہ یہ قدرت کا اعلیٰ نمونہ ایک جھوٹے خیال اور بیہودہ وہم کی وجہ سے ضائع ہوا۔

رفتہ رفتہ اس قتل کا حال رعایا پر بھی روشن ہو گیا۔ ہر کہ و مہ اس بوقت موت پر آنسو بہاتا تھا اور رانا پر طرح طرح کے الزامات عائد کرتا تھا۔

ہر طرف سے گریہ و بکا کی آوازیں بلند تھیں۔ محل نمونۂ محشر بنا ہوا تھا۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک بچشم گریاں رانا کو نفریں کر رہا تھا۔ افسوس!

پھُول تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھِلے مرجھا گئے

پیارے ناظرین۔ آپ نے اس عبرت انگیز اور درد آمیز سچے تاریخی واقعہ کو ضرور

بالضرور بڑا ہوگا۔

واقعی کارسازِ دو عالم نے بھی اس اُجڑے نخلستان یعنی باغ جہان میں کیسے کیسے گُل بوٹے کھلائے۔ کوئی اپنی عمرِ طبعی کو پہنچا اور کوئی بیچ ہی میں سے ٹوٹ گیا۔ لیکن سب کا نتیجہ یہی ہوا کہ کچھ عرصے کے بعد اس زمین میں مل گئے۔ اور ایسے مٹے کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

اس قدرت کے مصورّ نے صفحۂ دنیا پر کیا کیا گلکاریاں نہ کیں ہونگی اور کیا کیا تصاویر مختلف رنگوں کی آمیزش سے نہ بنائی ہونگیں۔ لیکن نتیجہ کسی کا بخیر نہ ہوا زمانہ بدلتا گیا اور منقش و رنگین البم بھی جسکو قدرت کی اعلیٰ دستکاریوں کا نمونہ کہنا چاہیے۔ اپنے صفحے پلٹتا گیا۔ ہائے۔

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

بہرحال ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ زندگی بالکل ناپائدار شئے ہے اور آئے دن ہزاروں موتیں ہوتی ہیں اور واقعی اتنی لمبی چوڑی دنیا کے رہنے والوں کا نام کوئی کب تک اور کیونکر یاد رکھ سکیگا لیکن صرف انسان کے عمدہ اطوار اور نیک کام ہی وہ شئے ہیں جو ایک قابلِ تعظیم اور نیک نام کو قیامت تک قائم رکھ سکیں گے۔

کیا ابتک خدا نے رانی کرشن کماری بائی سے (بلحاظ صورت، خواتین نہ پیدا کی ہونگی ضرور اُس سے اعلیٰ اور افضل بھی پیدا ہوئی ہونگی

لیکن وہ کیا چیز ہے جسنے ابتک اسکے نام کو قائم رکھا او مٹنے نہ دیا۔ ایک صلاحیت پسند دماغ اور اچھی طبیعت کا اعلیٰ تربیت یافتہ طبیعت سے مراد ہے، تو یہی جواب ہے کہ وہ چیز نیک نام ہے۔

راقم
سید محمد حسن عابد جعفری۔ پسر مولوی زین العابدین صاحب
سب جج پنشنر شاہ گنج آگرہ

بسلسلۂ سابق

مسز ہالیبرٹن کی مصیبتیں

دن کو آتے جاتے دیر کیا لگتی ہے۔ صبح نمودار ہوئی دن آیا۔ شام ہوئی دن رخصت شب بھر پڑے رہے۔ پھر دوسرے دن کی آمد آمد۔ کٹنے کی جو کہیے تو سب ہی کے دن کٹتے جاتے ہیں خواہ عیش وآرام کے دن ہوں خواہ رنج وسختی کے سہ شب تنور گزشت شب سمور گزشت۔

مسز ہالیبرٹن کے کئی مہینے اسی طرح گزر گئے۔ بہار کا موسم شروع ہوا مگر جین کو جب دیکھو مسز ریس کے ہاں ننھی سی چارپائی میں آنکھیں بند پڑی ہوئی ہے۔ اُسکی چمکتی ہوئی آنکھیں دھندلی پڑ گئی تھیں۔ خوبصورت گھونگریالے بال بکھرے ہوئے تھے۔ رخسارے زرد۔ غرضکہ اُس کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جاتی تھی۔ لڑکی کی یہ کیفیت دیکھ دیکھ کر مسز ہالیبرٹن کے دل کی جو حالت تھی سوائے خدا کے کسکو معلوم تھا۔ مگر اس افلاس اور غربت کے وقت اُنسے کیا ہو سکتا تھا۔ مسز ریس اور اُن کی خادمہ کو خدا نے جین پر مہربان کیا تھا یہی بڑی خیریت تھی ورنہ علاج معالجہ تو درکنار بیمار کو مناسب غذا تک ملنا دشوار تھی۔ اتفاقاً مسز ریس کی طبیعت اُن دنوں ناساز ہوگئی ڈاکٹر بلوایا گیا۔ جین کی طرف بھی اُسکو رجوع کیا ڈاکٹر نے مرض کا نام تو نہ لیا مگر اچھی اچھی غذا کھلانے کی تاکید کی اور ایک قیمتی سا نسخہ لکھدیا۔ مسز ریس کی خادمہ ہمیشہ جین کی ضرورت کی چیزیں اپنی مالکہ کے ہاں سے لادیا کرتی۔ مسز ہالیبرٹن گو بار بار روکتیں مگر وہ لوگ دینے پر مصر رہے بلکہ یہ کہا کرتے کہ تم کو کیا ہے ہم تو اس لڑکی کو دل سے پیار کرتے ہیں۔ تم کو کچھ ضرور نہیں کہ ہماری ممنوں ہو اور شکریہ ادا کرو۔

جین کو خادمہ ڈاکٹر کے حسب فرمائش اچھی اچھی غذائیں لادیا کرتی مگر چونکہ بالطبع

وہ بڑی شریر تھی۔ جین سے کہا کرتی دیکھو تم ہی اسکو کھانا تمہارے بھائی اسکو نہ چکھ بیٹھیں۔

مسز ہالیبرٹن کو یہ جملہ بُرا ناگوار گزرتا مگر چپ رہتیں ایک دن اتنا کہا کہ تمہیں کیا معلوم ہوگا کہ میرے لڑکے کس قماش کے ہیں وہ ایسے ندیدے ہرگز نہونگے کہ اپنی بیمار بہن کے کھانے کی چیزوں کو کھالیں۔

کُل ظاہری تدبیریں تو جین کی صحت کے لیے کی جاتی تھیں مگر مریضہ کی حالت دن بدن ابتر ہوتی جاتی تھی۔

ایک دن ڈاکٹر سے نہایت حسرت سے پوچھنے لگی کہ میں کب چنگی ہونگی ایک حالت میں پڑے پڑے طبیعت اُکتا گئی۔ جی چاہتا ہی کہ سبز میدان میں دوڑی پھروں۔ ڈاکٹر نے بہت کچھ دلاسا دیا۔ مسز ہالیبرٹن ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے دروازے تک گئیں ڈاکٹر نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مسز ہالیبرٹن کچھ پوچھنے کو تھیں مگر زبان یاری ندیتی تھی آخر اُنھوں نے بڑی کوششوں سے پوچھا کیوں ڈاکٹر صاحب کیا میری لڑکی جی اُٹھے گی۔

ڈاکٹر۔ آپ اس امر میں زیادہ متفکر نہو جیسے اس قسم کی بیماریوں میں کچھ دنوں صبر کرنا پڑتا ہی۔ خواہ کچھ ہی نتیجہ ہو۔

مسز ہالیبرٹن۔ نہیں یہ جواب کافی نہیں آپ میرے رنج کا مطلق خیال نہ کیجیے مجھے تو رنج ہی سہنے کے لیے قضا و قدر نے بھیجا ہی۔ میرے لیے یہی بہتر ہی کہ آپ مجھ سے صاف صاف کہدیں کہ آیا اُس کی زندگی کا کوئی بھروسا ہی یا نہیں؟

ڈاکٹر۔ ہاں اُس کی زندگی خطرے ہی میں ہے۔

مسز ہالیبرٹن۔ کیا کوئی امید نہیں۔

ڈاکٹر۔ یوں تو جب تک سانس تب تک آس ہی۔

مسز ہالیبرٹن کے لب خشک ہوگئے لمبی سانس لینے لگیں۔

ڈاکٹر۔ اے نیک بخت بی بی رنج نہ کیجیے دنیا کا یہی کارخانہ ہی اور آنا جانا ہی یہاں کا کام ہی

سبھی کو ہی ختم ہے یہی رہگذر   کوئی دیر جاوے کوئی زود تر

بلکہ اکثر میرے دل میں تو یہ آتا ہی کہ میرے عزیز پیارے سب میرے ہی سامنے چل بسیں تا کہ اُن کو میرے پیچھے دنیا کی ذلت اور مصیبت نہ اُٹھانی پڑے ۔ یہ کہکر ڈاکٹر رخصت ہوا مسز ہالیبرٹن اپنے کمرے میں جاکر رونے لگیں ۔ کچھ دیر کے بعد آنسو پونچھے بیچاری کو اتنی مہلت کہاں تھی کہ جی کھولکر غم کھاتیں ۔ ہر وقت کام کی فکر رہتی تھی کہ جس سے کچھ آمدنی کی صورت ہو ۔ اب اُن کو اور ایک کام ملا کہ اپنی بیٹی کو دوسری دنیا کے لیے تیار کریں ۔ یوں تو سب ہی دنیا سے جاتے ہیں خواہ خوش خواہ رنجیدہ وہ وقت جب آن پڑا تو ٹلنے کا نہیں مگر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ہنسی خوشی سے اُس ابدی قیام گاہ میں جائیں ۔

ایک دن شام کو بی ہمسائی آئیں پہلے تو جین کو پوچھا ۔ پھر ولیم کی بابت دریافت کیا کہ آیا وہ مکان پر ہے ۔ کیونکہ اینا اُسدن میری اینسلی کے پاس گئی ہوئی تھی ۔ ٹین صاحب بھی کسی وجہ سے گھر میں نہ تھے ۔ گھر کی خادمہ بھی کام پر گئی ہوئی تھی کوئی ایسا نہ تھا کہ اینسلی صاحب کے ہاں سے اینا کو لوا لاے ۔ ولیم اپنا سبق تیار کر رہا تھا ۔ یہ سُنکر اُٹھا اور اینسلی صاحب کے مکان کی راہ لی ۔ ولیم کو ایک کمرے میں نوکروں نے بٹھلایا اور اندر اینا کو خبر بھیجی ۔ ولیم کی نگاہ اُس کمرے میں ایک الماری پر پڑی جس میں بچوں کی کہانیوں کی کتابیں بھری پڑی تھیں ولیم حسرت سے دیکھنے لگا کہ کاش ان میں سے دو ایک کتاب غریب جین کو پڑھنے کو ملتیں اور اسی دہیان میں ایسا بیخود ہوا کہ بے خیالی سے ایک کتاب ہاتھ میں لیکر دیکھنے لگا ۔

اتنے میں اینا لین ولیم کے ساتھ جانے کو تیار ہوکر اندر سے نکل آئی ۔ اُسکے پیچھے پیچھے اینسلی مع میری اور ہنری کے آئیں ۔ اُن لوگوں کو دیکھکر ولیم چونک اُٹھا اور بے خیالی سے دوسرے کی چیز کو ہاتھ لگانے پر شرم سے پانی پانی ہوگیا ۔ ہنری نے اُسکو دیکھتے ہی پہچانا اور ہنس کر کہ کیوں صاحب آپ ہم لوگوں کی کتابیں دیکھ رہے تھے ۔

ولیم ۔ مجھے نہایت افسوس ہوا کہ میں نے آپ کی کتابوں میں ہاتھ لگایا مگر میں کچھ اور

ہی خیال میں مستغرق تھا۔

اینا۔ میں سمجھ گئی تم اپنی بہن کی بابت سوچ رہے تھے۔

ولیم۔ ہاں میں وہی سوچ رہا تھا کہ ایسی کتابوں کے پڑہنے کا اُسکو بہت شوق ہی۔

اینا۔ میں نے ان کتابوں کا تذکرہ تمہاری بہن سے بھی کیا تھا۔ افسوس وہ غریب ایسی بیمار ہے۔

مسز ایشلی۔ کیا ولیم کی بہن بہت بیمار ہے۔

اینا۔ بیمار کیا معنی وہ تو مر رہی ہی۔ یہ پہلی مرتبہ ولیم نے اپنی بہن کے بارے میں مرنیکی بات سُنی۔ اُسکا دل دھڑکنے لگا چہرہ فق ہوگیا۔ گھبراکر پوچھا "کہو بہن تم کو کسنے کہا کہ وہ مر رہی ہی" مسز ایشلی کو ولیم کی حالت دیکھکر بڑا ترس آیا اور اُسکو نگاہ ترحم سے دیکھنے لگیں۔ اینا نے ولیم کی پریشانی دیکھکر بات بنائی کہ میں نے یوں ہی ایک بے سروپا بات کہدی تھی مجھے معاف کرنا۔

میری ایشلی نہایت نیک اور ملنسار لڑکی تھی۔ اُسنے آگے بڑہکر ولیم سے کہا کہ مینے تمہاری بہن کی باتیں اینا لین سے سُنی ہیں۔ میری یہ کتابیں حاضر ہیں تم لیجا کر اُسکو پڑہنے کو دو۔ یہ کہکر چار کتابیں اچھی اچھی چُنکر ولیم کے حوالے کیں اور کہا کہ جب تمہاری بہن پڑہ چکے ان کو بدل کر اور لیجایا کرنا۔ ولیم نے نہایت شکرگزاری سے اُن کتابوں کو لے لیا۔

ہنری۔ کیوں صاحب آجکل لاطینی زبان میں کیسی ترقی کی ہی۔

ولیم۔ ہاں بغیر مدد کے جہانتک ممکن ہی میں برابر کوششوں سے آگے بڑہتا ہی جاتا ہوں اور اقلیدس اور یونانی بھی پڑہتا ہوں۔

ولیم۔ چھ بجے شام سے لیکر نو بجے شب تک۔ اس بیچ میں اپنے دونوں بھائیوں کو بھی پڑہانا ہوتا ہی۔

مسز ایشلی نے بیٹے کی طرف دیکھکر کہا "دیکھو جفاکشی اور استقلال اسکو کہتے ہیں

خدا اس یتیم بچے کو اپنے کل ارادوں میں کامیاب کرے"۔

ولیم اور اینا مسز اشلی سے رخصت ہوکر روانہ ہوئے۔ اینا کو اُسکے دروازے پر پہنچاکر ولیم سیدھے اپنی ماں کے پاس آیا۔ اماں سچ کہیے کیا جین کی زندگی کی اُمید نہیں ہے۔ ماں کا دل زور سے دھڑک اُٹھا۔ اپنے اندرونی جوش کو دباکر پوچھا۔ کسنے تمہیں بتایا۔

ولیم۔ اینا لین نے۔ مگر کیا یہ سچ ہے۔

ماں۔ ہاں شاید ایسا ہی ہو۔

ولیم۔ میز پر سر رکھکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اتنا رویا اتنا رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں اُس کی ماں بھی اپنا سر جھکاکر رونے لگی۔ پھر سنبھلکر کہا "ولیم میرے پیارے بچے رنج نہ کرو۔ اس دکھیاری ماں کی خاطر سے اپنے کو شکستہ نہ کرو۔ صرف خدا ہی کو معلوم ہے کہ ہمارے لیے کیا بہتری ہے۔ وہ کبھی اُسکو نہ لیگا جب تک اُس کی کوئی مصلحت پنہاں نہ ہو۔ اُس کی مرضی پر راضی رہو۔

دو مہینے اسی طرح اور گزر گئے۔ جین گھنٹے بھر کی مہمان معلوم ہونے لگی۔ ایک دن مسز رئیس کی خادمہ پاس آنکر بیٹھی اور حسب معمول جین کا استفسار حال کرنے لگی۔ اُسپر جین نے کہا "اے مہربان میں کبھی چنگی ہوں گی تم ناحق میرے لیے اتنی پریشانی اُٹھاتی ہو"

خادمہ۔ ایسا نہ کہو خدا نے چاہا تو تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گی۔ کسنے تمہیں ایسی یاس کی باتیں سکھائیں۔

جین۔ اسکے جاننے میں ہرج ہی کیا ہے۔ کیوں اماں جان نے تو مجھے کہا ہے کہ میں بہت جلد اس دنیا کو چھوڑنے والی ہوں۔

خادمہ۔ اے ہے غضب۔ مسز ہالیبرٹن کے یہ ڈھنگ۔ اُن کو میں اتنی عاقلہ سمجھتی تھی اور وہ تو بیچاری ننھی سی جان کو موت کی بھیانک صورت دکھاتی ہیں۔

جین۔ یہ نہیں۔ میں موت سے بھلا کیونکر ڈرنے لگی۔

خادمہ۔ کیا تمہیں بند صندوق میں اندھیری گور کے اندر تنہا پڑے رہنے کا خوف نہیں ہے۔

جین۔ ہرگز نہیں۔ میرا جسم تو صندوق کے اندر رہیگا مگر اصلی شے تو عالم بالا پر ہوگی۔ میری اماں نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا ہے۔ ماؤں کی تعلیم کی غلطی ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں موت سے اتنا ڈرتے ہیں جتنا خدا کے غضب سے ڈرنا چاہیے۔

خادمہ (دل میں کہکر) اس لڑکی میں کسی تارک الدنیا راہب کی روح تو کہیں حلول نہ کر گئی ہو۔ موت کی باتوں کو اس خندہ پیشانی سے بیان کرتی ہے گویا میلے یا تماشے کی بات ہے۔

جین۔ واقعی موت کوئی خوف کی چیز نہیں ہے۔ جیسے ریشم کے کیڑے اپنے خول کو چھوڑ کر اڑ جاتے ہیں اُسی طرح میرا جسم بیجان یہاں پڑا رہیگا اور میری روح اصلی مکان کی راہ لیگی۔ وہ مکان جہاں نہ دنیا کی سختی ہے نہ رنج نہ مصیبت ہے نہ فکر نہ تردد ہے نہ تشویش فقط سلاماً سلاما۔

خادمہ اور جین میں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مسز ہالیبرٹن اوپر آئیں اُنکے پیچھے میری ایشلی اور اینا لین تھیں۔ میری اینا کے ساتھ جین کی عیادت کو آئی تھی۔ یہ ایسی حسین لڑکی تھی کہ اسکو دیکھکر انسان کا جی چاہتا تھا کہ گھنٹوں دیکھا ہی کرے گو اینا بھی خوبصورت تھی مگر میری کے لباس کی سج دھج سے بڑا فرق ہو گیا تھا۔ جین سے اور اُس سے ہر طرح کی گفتگو ہوئی۔ جب سنا کہ جین کو اپنے مرنے کا کچھ بھی رنج نہیں ہے۔ بلکہ اُسکو اس دنیا کی یہاں سے زیادہ تمنا ہے تو نہایت متعجب ہوئی۔

جین۔ میری اماں جان نے نہایت مشقت اُٹھاکر ان باتوں کو میرے ذہن نشین کیا ہے۔

میری۔ میری اماں بھی ہم لوگوں کی تربیت کے پیچھے بہتیرا سر مارتی ہیں مگر ہم تو ایسے

نہوئے۔ آخر مس جین سے اور مجھ سے سن میں بھی کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔

مسز ہالیبرٹن - نہیں پیاری یہ نہ کہو خدا کی حکمت بالغہ کون سمجھ سکتا ہے۔ چونکہ میری لڑکی اتنے دنوں سے علیل رہی اسلیے اُس کی سمجھ ایسی ہوئی کہ دنیا کی محبت سے دست بردار ہوگئی۔ اور تم کو خداوند کریم صد و سی سال کی حیات دے ماشاء اللہ تندرست ہو تم کو دنیا میں رہنا ہے اسلیے تمہارے اور خیال ہیں۔

اس طرح کی باتیں ہو ہوا کر میری اور انیا رخصت ہوئیں۔ انیا تو ہر روز عیادت کو آتی اور میری بھی گاہ گاہ خبر لیتی۔ آخر ایک دن ایسا آیا جین کی طاقت بالکل سلب ہوگئی کہ اپنے بستر سے بھی اُٹھ نہ سکی۔ دو ایک دن اور یوں کٹے۔ ایک دن صبح کو جین اپنے بستر پر بیٹھی ہوئی تھی کہ اُسکے دونوں بھائی اسکول جانے کو تیار ہو آئے

مسز ہالیبرٹن نے چاہا کہ حسب معمول کوئی اخلاقی کتاب پڑھکر بچوں کو سُنائیں۔ جین نے کہا اماں جان آسمانی کتاب پڑھکر سُنائیے۔ مسز ہالیبرٹن کتاب لیکر پڑھنے لگیں جب اس مقام پر پہنچیں "کہ وہ مقام جہاں نہ سورج کی ضرورت ہے نہ چاند کی کیونکہ خدا کے جلال کی روشنی سے وہ ہر دم معمور ہے" اتنا پڑھا تھا کہ جین بیتاب ہونے لگی۔ ماں نے کتاب ہاتھ سے رکھدی اور آگے بڑھکر پوچھا کہو پیاری کیا حالت ہے۔

جین - اماں جان مجھے یہاں نہ رکھیے نہ رکھیے۔ میں نہیں رہونگی نہیں رہونگی۔ میں نے خدائی روشنی دیکھ لی ایلو ابّا کو بھی دیکھ رہی ہوں۔ یہ کہا تھا کہ اُسکا منکا ڈہلک گیا اور مُسکراتے ہوئے آہستہ سے تکیے پر سر رکھدیا اور مس جین ہالیبرٹن کی روح اپنے ٹھکانے پر پہُنچ گئی۔

اُدگار کے چیخ کی آواز سُنکر خادمہ دوڑی آئی بہت روئی پیٹی چلائی مسز ہالیبرٹن کو الزام دیتی رہی کہ کیوں اخیر وقت میں مجھکو نہ بلایا۔ اُنھوں نے عذر کیا کہ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح دفعتہً یہ دفعتہً ہو جائیگا اللہ کی یہی مرضی ہے اس میں انسان ناچار ہے

اتنا کہکر مسز ہالیبرٹن الگ ہوگئیں اُنکے رنج کا پیالہ لبریز ہوکر چھلکا چاہتا تھا۔ گو کہ پہلے سے اُن کو جین کی موت کا یقین تھا مگر وہ سمجھتی تھی کہ اسکے لیے کوئی وقت آئیگا یہ نہ معلوم تھا کہ موت کے لیے بھی کوئی وقت مقرر ہے۔ اس غیر متوقع حادثے سے اُنکا دل تہ و بالا ہو رہا تھا۔ برآمدے میں سر جھکائے کھڑی تھیں کہ زینے کے پاس آینا لین کو دیکھا کہ اسکول جانے کے لباس میں کھڑی ہوئی ہے۔ مسز ہالیبرٹن کو سلام کرکے پوچھا کہ آپ کی ہمسائی نے پوچھا ہے کہ آج مس جین کی طبیعت ایا کل سے کچھ اچھی ہے۔

مسز ہالیبرٹن۔ آینا جین تو چل بسی۔ مسز ہالیبرٹن نے اس استقلال سے یہ جملہ کہا کہ آینا ہول کھاکر اُلٹے پاؤں دوڑی اور ہمسائی کو خبر دی۔ جسوقت بی ہمسائی پہنچی ہیں مسز ہالیبرٹن کی حالت غیر تھی۔ ہزار کوئی صبر و استقلال دکھلائے اولاد کا داغ ہی وہ بلا ہے کہ دل قابو سے نکلجاتا ہے۔ یہ دن دشمن کو بھی نصیب نہ ہو۔ مامتا وہ چیز ہے کہ سوائے ماں کے کوئی کیا جانے۔ اپنے لخت جگر جسم کے ایک ٹکڑے کی ابدی جدائی نے جین کی ماں کا جگر پاش پاش کرڈالا تھا۔ کلیجہ تھامے ہوئے پڑی تھی اور دنیا آنکھوں تلے اندھیری تھی

بی ہمسائی۔ ارے ہے مسز ہالیبرٹن یہ کیا کررہی ہو سنبھلو سنبھلو تمہاری طرح سمجھدار صابرہ مستقل مزاج کو ایسا نہ ہونا چاہیے۔ اپنے اور بچوں پر رحم کرو اور اُنکا منہ دیکھو۔ تم اگر یوں اپنے کو تباہ کرڈالو گی۔ اُن کا کون پرسان حال ہوگا۔

مسز ہالیبرٹن۔ ہائے بی ہمسائی ؎

من چوں زیم کہ سینۂ من چاک کردہ اند
لخت جگر کشیدہ بہ خاک کردہ اند

سب کے بچے صحت اور خوشی میں ہیں اور میری ہی غریب بچی کو مجھ سے جدا کر لینے میں خدا کی مصلحت رکھی ہوئی تھی۔ الٰہی میرے ساتھ تیرا یہ انصاف ہے۔

ہمسائی۔ توبہ کرو ایسا نہ کہو افسوس اولاد کے درد نے آپ کو آپے سے باہر کردیا ہے

ابھی کل کی بات ہی کہ آپ اپنی لڑکی کے ذہن نشین کر رہی تھیں کہ خدا کی مصلحت عجب چیز ہی
اور اس میں کسی کو مجال دم زدن نہیں اور ابھی یہ ناشکری کا کلمہ۔ مسز ہالیبرٹن چپکی ہوئیں
اور سر جھکا کر زار زار رونے لگیں۔ (باقی آیندہ)

سہر وردیہ

اڈیٹوریل

گزشتہ اشاعت میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب پروفیسر ایم۔ اے۔ او کالج کی نصاب تعلیم نسواں کی اسکیم شائع ہوئی ہے۔ اُس میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اشارہ کیا ہی کہ اسکے متعلق ایک عام اسکیم شیخ عبداللہ صاحب نے خاتون میں چھاپی ہے چند فروعی باتوں میں لوگوں کو اُس سے اختلاف ہوگا مگر عام اُصول اُس اسکیم کے نہایت عمدہ ہیں۔

ایک اسکیم ہم نے شائع ضرور کی تھی۔ لیکن خاتون میں کبھی نہیں چھپی۔ خاتون کے جاری ہونے سے بہت پہلے چھپ چکی تھی۔ چونکہ اب ڈاکٹر صاحب نے اُسکا حوالہ دیکر اُسکی ضرورت کو محسوس کرایا ہی اسلیے ہم ذیل میں اس اسکیم کا ایک ضروری حصہ شائع کرتے ہیں۔

لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ مسلمان مردوں کو اس طرف بہت کم توجہ ہی اور جن حضرات کو کسی قدر توجہ بھی ہی وہ بھی زبانی جمع خرچ پر اکتفا فرماتے ہیں۔ اور عملی طور پر ابتک کوئی کام شروع نہیں ہوا۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ اسوقت بڑے بڑے شہروں اور قصبات میں عموماً مسلمان لڑکیاں اُردو پڑھ لکھ لیتی ہیں اور ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی لڑکیوں کو شوق پیدا ہوتا جاتا ہی لیکن افسوس سے دیکھا جاتا ہی کہ بجز اُردو کے چند قصص وغیرہ کے لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل اسوقت تک ایک کتاب

بھی اُردو زبان میں نہیں پائی جاتی۔ جو چند کتابیں اس وقت لڑکیوں کے لیے تعلیمی کورس خیال کیجاتی ہیں۔ اُنسے کوئی خاص تعلیمی مقصد حاصل ہو نہیں سکتا اور نہ اُن میں کسی قسم کی عمدہ معلومات کا ذخیرہ ہے جن ممالک اور اقوام نے اسوقت تعلیم میں سب سے زیادہ ترقی حاصل کی ہے اور جہاں پر بڑے بڑے فاضل فن تعلیم کے ماہر موجود ہیں اُن اقوام اور ماہرین کا خیال ہے کہ تعلیم کا مقصد وہی ہونا چاہیے جو مقصد انسان کا جسمانی ورزش سے ہوتا ہے۔

جسمانی ورزش سے مقصد جسم کی توانائی اور ہر رگ و پٹھہ کی یکساں مضبوطی و تندرستی ہے اسی طرح دماغی قویٰ کو بذریعہ تعلیم کے یکساں توانائی اور قوت اور ترقی دینا چاہیے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھکر یورپ و امریکہ والے بچوں کے لیے تعلیمی کورس تیار کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں سرکاری مدارس میں بھی ایک حد تک یہی اصول مدنظر رکھنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ گو اُن میں سے ایک بڑا جزو یعنی مذہبی تعلیم کے کم ہونے کی وجہ سے ہمارے یہانکے مدارس کی تعلیم ناقص خیال کیجاتی ہے اور اُسکو خود تعلیمی سررشتہ کے افسر محسوس کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً بعض نے اسکا اعتراف بھی کیا ہے۔

ا۔ اب ہر پہلو پر نظر غائر ڈالنے سے ہمکو سب سے اول جو کام ضروری معلوم ہوتا ہے وہ ایک عمدہ اور اعلیٰ تعلیمی نصاب کا تیار کرانا ہے۔ اس نصاب میں اس امر کی پوری رعایت رکھی جائیگی کہ اگر انگریزی تعلیم کے خیال کو ترک کر دیا جاوے تو بھی اُس سے ہماری لڑکیونکی تعلیم میں بجز انگریزی زبان کے اور کسی بات کی کمی واقع نہو یعنی کل اُن عمدہ اور مفید خیالات کو جو لڑکیوں کی سمجھ سے بالاتر نہوں سلیس اور صاف اُردو زبان میں انگریزی سے ماخوذ کرکے لکھدیا جاوے اسی طرح عربی ادب اور زبان میں جو عمدہ باتیں تعلیمی کورس کے لیے ضروری خیال کیجاویں اُن کو اُردو کی ریڈروں میں ترجمہ کرکے لکھا جاوے۔ ان ریڈروں کے مختلف مدارج ہونگے۔ قاعدہ یا حروف تہجی سے شروع کرکے چھ مختلف کتابوں کا

سلسلہ علم ادب میں ہوگا اور درجہ بدرجہ اُن میں معمولی روزمرہ کے واقعات سے لیکر علمی خیالات مندرج کیے جاوینگے۔ اعلےٰ درجہ کی ریڈروں میں ہندوستان کی موجودہ اور گزشتہ اہل قلم کی تصانیف یا تالیف سے عمدہ اور چیدہ انتخابات درج ہونگے اور اسکے ساتھ ساتھ عربی اور ترکی اور انگریزی اور اگر ممکن ہوا تو فرینچ مضمون اور نیز ہندی اور سنسکرت سے مفید انتخابات درج کیے جاوینگے۔ یہ حصہ علم ادب کے متعلق ہوگا۔

۲۔ پھر دینیات میں چند رسالے تیار کرائے جاوینگے جن میں ایک رسالہ فقہ کا ہوگا جس میں زیادہ تر مسائل کا وہ حصہ ہوگا جو عورتوں سے متعلق ہو۔ دوسرے رسالے میں کل اخلاقی احادیث مع ترجمہ درج کیجاوینگی اور اس انتخاب میں زیادہ تر وہ احادیث ہونگے جو عورتوں سے متعلق ہوں۔ تیسرا رسالہ دینیات کا تفسیر کا ہوگا جس میں کُل قرآن شریف کی تفسیر یا صرف ایسی سورۃ قرآنی کی تفسیر جو عورتوں کے متعلق ہوگی۔ یہ امر ابھی تک تصفیہ طلب ہے۔

۳۔ تیسرا حصہ کورس کا تاریخ کے متعلق ہوگا اسکے دو حصے ہونگے تاریخ اور سوانح مشاہیر اور بزرگان اسلام اور بالخصوص مشاہیر خواتین اسلام۔ اول حصے میں مختصر تاریخ اسلام از ابتدا تا زمان حال جو ایک قصہ یا کہانی کے پیرایے میں لکھا جائیگا اور جس میں کل مشہور واقعات کو ایک دلچسپ اور مختصر مضمون کی شکل میں لانیکی کوشش کی جاویگی۔ اس حصے میں ہندوستان کے حالات اور واقعات کو کسی قدر وسعت دیکر دیگر اقوام اور بالخصوص عہد حکومت انگریزوں کے واقعات کو ضرور شامل کیا جاوے ایک باب غیر اقوام پر لکھا جاویگا جن میں نہایت اختصار کے ساتھ یوروپین ور امریکن اور ایشیاٹک اقوام کے حالات اور ترقی اور تنزل کی حالت درج کیجائیگی جو حصہ سوانح پر لکھا جاویگا اُس میں سب سے اول آنحضرت کی مختصر سوانح عمری اور صحابہ کرام کے

حالات درج کیے جاوینگے۔ خلفاء اسلام اور شاہان اسلام کی مختصر سوانح عمری درج کیجائیگی اور اسلام کی برگزیدہ اور مشہور خواتین زمانہ سلف یا زمانہ حال کی سوانح عمری جہانتک دستیاب ہوسکیگی لکھی جاوینگی اور اسکے بعد ایک باب غیر اقوام اور غیر مذاہب کی بڑی بڑی مشہور مستورات کی حالت کے متعلق ہوگا جس میں چند رومن اور گریک۔ ہندو اور عیسائی شہزادیوں اور مصنفات کے حالات اور بالخصوص ملکہ معظمہ مرحوم اور لیڈی ڈفرن اور مس نائٹنگل وغیرہ کے حالات ہونگے اس حصے کو اس طور پر مرتب کیا جاویگا کہ جس میں حتی الوسع کوئی مشہور واقعہ کسی خاتون کی لائف میں جو انسانی قلب پر عمدہ اثر ڈال سکے باقی نہ رہجاوے۔

۴۔ چوتھا حصہ کورس کا جغرافیہ کا ہوگا اس میں ہندوستان کے نقشے اور جغرافیہ کو کسی قدر صراحت سے لکھا جاویگا اور بعد اُسکے کل قدیم ممالک اسلامی کا ایک جداگانہ جغرافیہ مع مختصر حالات ہر مشہور شہر ممالک اسلامی مثل مکہ شریف مدینہ منورہ دمشق یا قرطبہ یا بغداد وغیرہ کے لکھا جاویگا۔ اور قدیم اور موجودہ اسلامی دنیا کا ایک نقشہ بھی مرتب کیا جائیگا۔ آخر میں ایک مختصر باب کل دنیا کے جغرافیہ پر لکھا جائیگا۔

۵۔ پانچواں حصہ حفظان صحت پر ہوگا اور اُس میں علاوہ ضروری قواعد حفظان صحت کے ایک مختصر باب طب کا بھی ہوگا۔ جس میں مستورات اور بچوں کی معمولی بیماریوں کی شناخت اور اُنکا یونانی اور ڈاکٹری علاج درج کیا جاویگا۔

۶۔ چھٹے حصے کورس میں سائنس کی ایک ریڈر مرتب کیجائیگی اس میں عام فہم مسائل طبیعیات اور ہیئت کے درج کیے جاوینگے۔

۷۔ ایک رسالہ مختصر انتظام امور خانہ داری پر ہوگا۔

۸۔ ایک رسالے میں ہندوستانی اور انگریزی کھانا پکانے کی ترکیبیں درج کیجاوینگی۔

۹۔ حساب کا کوئی رسالہ جداگانہ تصنیف نہیں کیا جاویگا۔ بلکہ موجودہ رسالوں میں سے

کوئی رسالہ پسند کرکے اسی کورس میں شامل کردیا جاویگا

اب میرے نزدیک یہ کورس اگر تیار ہوگیا تو بہت سی دقتیں جو تعلیم نسواں کے باب میں اسوقت درپیش ہیں منجملہ اُنکے ایک دقت ضرور رفع ہوجائے گی۔ اس کورس میں تعلیم کے ہر پہلو پر پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ گو مذکورہ کورس کے پڑہنے سے کوئی بی اے یا ایم اے یا فاضل نہیں ہوسکتی لیکن معمولی قسم کی لیاقت اور عمدہ مذاق پیدا کرسکتی ہیں یہ کورس پوری مدد دیگا اور موجودہ حالت کے لحاظ سے اور کوئی اس سے بہتر کورس ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہاں اس اسکیم کے شائع ہونے پر اگر ہمارے احباب یا قوم کے معززین میں سے کوئی صاحب اس کورس میں کمی و بیشی یا تغیر و تبدل کی ضرورت ظاہر فرمائینگے تو ہم بڑی شکرگزاری کے ساتھ اُسپر پورا لحاظ رکھا جاویگا۔

اس کورس کے مرتب کرنے میں ہم اپنی قوم سے دوگونہ مدد کے خواستگار ہیں اور قوی امید ہے کہ ہماری درخواست اور امید میں کامیابی ہوگی۔ اول اور سب سے اہم مدد جسکے بغیر اس کورس کا مرتب ہونا ناممکن ہے وہ مدد قوم کے اہل قلم کی مدد ہے کورس کا پورا خاکہ مینے اپنی قوم کے روبرو پیش کردیا ہے جسکو حضرات اہل قلم خود تجویز کرسکتے ہیں کہ اس خاکہ کے کس حصے میں وہ اپنی تحریر اور قلم کا رنگ بھرسکتے ہیں آیا وہ علم ادب کے متعلق کوئی جدید مضمون لکھ سکتے ہیں یا کوئی عمدہ انتخاب کرسکتے ہیں یا کسی اور مضمون پر کچھ تحریر یا تالیف فرماسکتے ہیں یا کسی غیر زبان سے کوئی مفید مضمون ترجمہ کرکے ہمکو دیسکتے ہیں۔ اور اگر کوئی صاحب خود تحریر نہ فرمانا چاہیں تو بھی ہم اُنکے بہت ممنون ہونگے اگر وہ ہمکو کوئی ایسی بات بتائیں جو کورس کے متعلق ہو اور اُن کو معلوم ہو جو جو صاحب اس کورس کے متعلق تحریر فرماوینگے یا کسی قسم کی ہم کو مدد دینگے اُنکے اسمار گرامی بڑی شکرگزاری سے البشیر میں وقتاً فوقتاً شائع کیے جاوینگے دوسری وہ مدد ہے جسکے بغیر آجکل کوئی مفید اور قومی کام انجام پانا ناممکن ہے وہ مالی مدد ہے۔ کانفرنس کے پاس ایسا کوئی سرمایہ نہیں ہے

جس سے یہ کام انجام پا سکے۔ اس کام کے لیے قوم سے چندہ مانگنے کو بھی دل نہیں چاہتا اسلیے کہ ہر کام کے لیے کہانتک جدا گانہ چندہ کی فہرستیں ہم کھول سکتے ہیں۔ قوم کے فیاض دل حضرات سے یہ تو پوری امید ہے کہ اگر اُنسے چندہ مانگا جاے تو اُن کو دریغ نہو گا لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہم مانگنے والے ہی اب اس گداگری سے بیزار ہیں۔ اس کام کے لیے سب سے عمدہ ترکیب یہ سوچی گئی ہے کہ اُسکو تجارتی اُصول پر انجام دیا جاے یعنی ایک کمپنی قائم کی جائے۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ اس کورس کے مرتب کرنے اور شائع کرنے میں زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار روپیہ صرف ہوگا۔ لہذا اگر ایک سو حصہ دار فی حصہ پچاس پچاس کے خرید لیں تو پانچہزار روپیہ فراہم ہوجائے گا۔ جب کورس کانفرنس سے منظور ہوکر شائع ہوجائے تو اسکو رجسٹری کرادیا جاویگا اور وہ کمپنی کی ملکیت ہوجاویگا اُس کی آمدنی سے تین چوتھائی منافع حصہ داران میں تقسیم ہوگا اور ایک چوتھائی کانفرنس کے تعلیم نسواں سکشن کے اغراض کے لیے صرف کیا جائیگا۔ ہمیں پوری امید ہے کہ بہت جلد سو حصے دار ملجاوینگے۔ منجملہ ۱۰۰ کے مفصلۂ ذیل پانچ حصہ داران نے ایک ایک حصہ پہلے ہی سے خرید لیا ہے۔

مولوی بشیرالدین صاحب اڈیٹر البشیر۔ مولوی بہادر علی صاحب ایم۔ اے وکیل علیگڈھ مولوی یوسف علی صاحب سررشتہ دار نہر گنگ اٹاوہ مولوی رشید احمد صاحب سالم اور یہ احقر۔ اب مجھے امید ہے کہ وہ صاحبان جو واقعی تعلیم نسواں کی حمایت کرنا چاہتے ہیں وہ اس کام کے انجام دینے کو اپنا فرض سمجھیں گے جو صاحب حصہ خریدیں گے اُن کو میں پورا اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ اُن کو کسی قسم کا نقصان نہوگا بلکہ یہ ایک معقول فائدہ کی صورت ہوگی جو روپیہ حصہ داروں سے آویگا وہ الہ آباد بنک میں جمع ہوگا اور آمدنی و خرچ کا پورا حساب مرتب کرکے ہر ماہ میں شائع کیا جاوے گا اور ایک ایک کاپی مطبوعہ حساب کی حصہ داروں کے پاس بھیجی جاویگی۔ میں نے کورس کی نسبت مصنفہ

جمع کرنا شروع کر دیا ہی اور عنقریب اپنے یہاں ایک دفتر قائم کر دنگا اور ایک قابل عربی اور فارسی داں مولوی صاحب جن کی اُردو کی تحریر بہت مقبول اور اعلیٰ درجے کی ہو اور ایک انگریزی خواں نوجوان کو اسی کام کے انجام دینے کے لیے مقرر کیا جاویگا۔

زنانہ نارمل اسکول۔ اس سے پیشتر ناظرین کو اطلاع دی گئی تھی کہ زنانہ مدرسہ طاعون کی وجہ سے بند کر دیا گیا ہی۔ ہم نے نہایت مجبوری سے اس مدرسے کو بند کیا تھا۔ بہت عرصہ تک ٹالتے رہے۔ لیکن آخر جب لڑکیاں اور اسکول کے ملازم تک بیمار ہونے لگے تو بجز بند کرنے کے اور کچھ چارہ نہ دیکھا۔ جب تک طاعون کی شدت رہی اُسوقت تک برابر مدرسہ بند رہا۔ لیکن جب ذرا تخفیف ہوئی تو فوراً مدرسہ کھولا گیا۔ تقریباً پونے دو مہینے تک مدرسہ بند رہا۔ اور چونکہ مدرسہ کی ابتدائی حالت تھی اسلیے بہت ہرج ہوا۔ مگر اب خدا کا فضل ہی کہ طاعون سے نجات ملی ہی اور مدرسہ کھولنے پر سب لڑکیاں پھر مدرسے میں آگئیں۔ اور پھر باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہمیں ایک اور اُستانی کی نہایت سخت ضرورت ہی کیونکہ اب دو اُستانیوں سے کام نہیں چلتا اسلیے ناظرین میں سے کوئی صاحب اگر ہمارے اس کام میں مدد کریں اور ایک عمدہ اُستانی بہم پہنچا دیں تو ہم ممنون ہونگے۔

اُستانی کی قابلیت مڈل کی خواندگی تک ہونی چاہیے۔ اور اگر کسی مدرسے میں معلمہ کا کام بھی کیا ہو تو اُسکو اوروں پر ترجیح دی جائے گی۔ تنخواہ حسب حیثیت تیس روپیہ سے پچاس روپیے تک ملیگی۔ رہنے کو مکان بھی دیا جائیگا۔

غیر اقوام اور غیر مذاہب سے نفرت۔ ریلوے اسٹیشن پر ہم نے ایک مرتبہ ایک ہندو عورت کو دیکھا کہ وہ ایک انٹرمیڈیٹ کے زنانے درجے میں سوار ہوئی اور سوار

ہوتے ہی "مسلمانی مسلمانی" کرتی ہوئی باہر چلی آئی۔ اسکے پاس یقیناً انٹر کلاس کا ٹکٹ تھا لیکن وہ جاکر تیسرے درجے میں بیٹھ گئی۔ دریافت کرنے سے مجھے معلوم ہوا کہ انٹرمیڈیٹ کے درجے میں کچھ مسلمان مستورات بیٹھی تھیں اسلیے اس ہندو عورت نے اُن عورتوں کے ساتھ سفر کرنا گوارا نہ کیا۔ ہم نے اپنے ذہن میں اُس کی دلی خیالات کی تصویر کھینچنی شروع کردی کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اُسکو مجبور کیا کہ وہ مسلمان عورتوں کے درجے میں سفر نہ کرے۔ اسکو مسلمان عورتوں سے کسی جسمانی نقصان یا صدمے کا اندیشہ نہ تھا نہ اُسکو یہ خیال تھا کہ مسلمان عورتیں اُسکو کوئی مالی نقصان پہنچائیں گی۔ اسکا مذہب اور ایمان اُسکے دل کی بات تھی۔ مسلمان عورتیں اُسکو چھین نہیں سکتی تھیں پھر اُسنے جو اپنے اوپر تکلیف اُٹھائی اُس کی کیا وجہ تھی اسکا جواب ہم کو بجز اسکے اور کچھ نہیں سوجھا کہ وہ زبردست خیال جو انسانوں میں بطور طبیعت ثانی کے ہوگیا ہے یعنی غیر اقوام اور غیر مذاہب سے نفرت کرنا اُسی خیال نے اُسکو انٹرمیڈیٹ کا درجہ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ یہ خیال ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ یوروپ کے لوگ جو آزادی کا دم بھرتے ہیں اور انسانی برادرانہ مساوات پر اپنی تحریر تقریر سے بہت کچھ زور دیتے ہیں وہ بھی اس خیال سے خالی نہیں ہیں۔ غالباً غیر اقوام سے اُن کو اتنی ہی نفرت ہے جتنی اُس ہندو عورت کو مسلمان عورتوں سے تھی۔ صاحب لوگ بھی حتی الوسع کالے آدمیوں کے ساتھ سفر کرنا پسند نہیں کرتے۔ لیکن یوروپ والوں میں اتنی بات ضرور ہے کہ اُن کے یہاں کسی بات کی چھوت نہیں ہے۔ اگر کوئی صاف ستھرے کپڑے پہنکر شریفانہ طریقہ سے اُنسے ملے جلے تو اُس سے اخلاق سے پیش آتے ہیں اور کسی قسم کی نفرت ظاہر نہیں کرتے برخلاف اسکے ایشیا کے بعض تنگ خیال فرقے غیر اقوام اور غیر مذاہب کو ناپاک سمجھکر اُنسے نفرت کرتے ہیں۔ ہندوستان میں برہمن خصوصاً اور دیگر ہندو عموماً اس مرض میں مبتلا ہیں۔ مسلمانوں کو ہندوستان میں آئے ہوئے قریب ہزار برس کے

ہوئے اور بڑے بڑے عالموں نے تحقیقات سے یہ بھی ثابت کیا ہو کہ ہندوستان کے اکثر مسلمان اور ہندو ایک ہی نسل میں سے ہیں۔ اگر فرق ہے تو صرف مذہب کا ہی اس پر بھی ہندوؤں کی نفرت ابتک کم نہیں ہوئی۔ مسلمان کے ہاتھ کا کھانا پینا تو درکنار اکثر برہمن لوگ مسلمان کا سایہ بھی اپنے اوپر نہیں پڑنے دیتے۔ مسلمانوں میں اس قسم کا کوئی خیال نہیں پایا جاتا۔

ہم اس بات میں نفرت کرنے والے لوگوں کی تائید ضرور کرینگے کہ گندے اور ناپاک لوگوں کی چیزیں نہ کھانی چاہییں اور وہ حفظان صحت کے خیال سے نہ کہ اعتقادی نفرت کے خیال سے۔ علم کی روشنی کے ساتھ غیروں سے نفرت کی تاریکی بھی کم ہوتی جاتی ہی۔ سوسائٹی میں میل جول اور ارتباط زیادہ بڑہتا جاتا ہی۔ اور امید ہی کہ رفتہ رفتہ وہ نفرت کے خیالات جو بعض وقت سخت دوسروں کی دلشکنی کا باعث ہوتے ہیں دور ہوجاوینگے اور ایک زمانہ آویگا کہ عیسیٰ بدین خود موسیٰ بدین خود قائم رہیں گے۔ لیکن سوسائٹی میں لوگ بلا لحاظ مذہب وملت قوم ورنگ آزادی سے میں جلیں گے۔ اور وہ زمانہ بنی آدم کے لیے ایک بڑا مبارک زمانہ ہوگا۔

ایک عورت کی دلیری۔ بھوپال میں ایک عورت چکّی پیس رہی تھی کہ اُسکے کپڑوں میں سانپ گھس گیا۔ جب اُسکے جسم پر سانپ رینگ رہا تھا تو اُسنے اپنے ہاتھ سے سانپ کا منہ پکڑ لیا اور اُسے زور سے دبالیا۔

بیوی نے اپنے میاں کو بلایا جو نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں گیا تھا۔ میاں آئے لیکن اُنسے کچھ نہ ہو سکا اور اپنی بیوی کی کچھ مدد نہ کرسکے۔ سانپ کو ہاتھ میں پکڑنے سے ڈرتے تھے۔ محلے کے اور لوگ بھی جمع ہوئے لیکن کسی کی ہمت نہ پڑی کہ وہ سانپ کو پکڑ کر کھینچلے اور مار ڈالے۔ آخر عورت نے مجبور ہوکر سب سے کہا کہ باہر جاؤ۔ جب لوگ

باہر چلے گئے تو اُنہوں نے کپڑے اُتار کر سانپ کو دیوار پردے مارا اور وہ مرگیا۔ اسکے بعد پھر اُسنے پہننا شروع کیا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ایک دوسرا سانپ نمودار ہوا جو جلدی جلدی اُس عورت کی طرف بڑھا لیکن اُسنے اُسکو جوتی سے مار ڈالا۔ آفریں۔

چندہ نارمل اسکول۔ بہت عرصہ کے بعد ہمکو رسالہ خاتون کو اعلان چندہ کی مد سے خالی رکھنے کا موقع ہوا ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے ناظرین اور دیگر حامیان تعلیم نسواں کو غور فرمانا چاہیے کہ تعلیم نسواں کی کوشش میں اگر ایسے ابتدائی زمانے میں غفلت اور بے توجہی ہوگی تو پھر منزل مقصود تک کیونکر پہنچ سکینگے۔ ہم حامیان تعلیم نسواں کی خدمت میں ملتجی ہیں کہ وہ نارمل اسکول کی کامیابی کے لیے پوری کوشش فرمائیں۔ ہم نے چندے کی رسید بہیاں چھپوائی ہیں۔ ایک ایک رسید بہی پچاس پچاس روپیے کی ہے۔ ناظرین خاتون میں سے اکثر معزز اصحاب اور شریف بیویاں باثر اور متمول ہیں خود بھی دے سکتے ہیں اور اپنے دوست احباب اقارب سے بھی دلوا سکتے ہیں۔ پچاس پچاس روپیے کا جمع کرنا کچھ بھی دشوار نہیں ہے۔ رسید بہیاں دفتر سکرٹری تعلیم نسواں سکشن سے مل سکتی ہیں۔ ہم بڑے انتظار سے دیکھینگے کہ کون کون صاحب رسید بہیاں منگوا کر چندہ جمع کرتے ہیں۔

رجسٹرڈ نمبر ا ے ۲۷

خاتون

جلد ۴ | ماہ جمادی الاول ۱۳۲۵ھ مطابق جولائی ۱۹۰۷ء | نمبر ۷

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

علی محمد خاں کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علیگڑھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اسکی سالانہ قیمت (عہ/۱) اور ششماہی ۱۲/

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہے یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جبتک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی اُمید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہو رہے ہیں اُس کی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہینگے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی اُنکو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالے کی مدد کرنیکے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہے اگر اسکی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائیگا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علیگڑھ ہونی چاہیے۔

ہندوستان کی خانگی تہذیب کی تازہ مثال

آہا۔ آج قاضی جمال الدین صاحب کے مکان میں تو کچھ غیر معمولی رونق معلوم ہوتی ہے ہر شخص کام کاج میں مشغول ہے۔ کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو بیکار ہو۔ بڑی بیگم صاحبہ ادہر ماماؤں سے کام لے رہی ہیں۔ چھوٹی بیگم ادہر سے اُدہر اور اُدہر سے ادہر دوڑتی نظر آتی ہیں۔ منجھلی بیگم جلدی جلدی کچھ سی رہی ہیں۔ لڑکیاں ادہر چھالیاں کتر رہی ہیں۔ غرض ہر شخص کام کاج میں غرق ہے۔

ان بیبیوں کو ایسی محنت کرتے ہوئے دیکھکر کچھ تعجب سا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیچاریاں دن بھر اور رات بھر اینڈا اینڈ کر سونے والیاں یا نوکروں سے کام لینے والیاں آج اسقدر سختی سے کام کر رہی ہیں۔ باہر مردانے میں بھی خوب گرمجوشی پھیل رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے اچھے اچھے کپڑے پہنے ہوے کھیلتے کودتے نظر آتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ایک بند گاڑی بھی آ پہنچی۔ معلوم ہوا کہ سید باڑے سے کچھ سواریاں آئی ہیں۔ غرض عجب

پھل پھل ہے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ دو تین دن میں انکے ہاں قاضی صاحب
کے بھتیجے میاں علی محمد کی شادی ہونے والی ہے۔ آہا جبھی یہ تیاریاں ہوری ہیں۔ ادہر تو
یہ گڑبڑ تھی اور ادہر سامنے والے مکان میں جس میں قاضی صاحب کے کچھ عزیز رہتے تھے
انکے ہاں بھی اسی طرح کی دہوم دہام معلوم ہوتی ہے۔ ہاں ہاں ٹھیک ہے یہ میاں علی محمد
کی دُلہن کا مکان ہے۔ علی محمد بیچارے بڑی مدت سے اس گھر کے خواہاں تھے۔ چلو بیچارے
کی اُمید برآئی دوچار دن میں شادی بھی ہوجائیگی۔ اور اُن کی خواہش بھی پوری ہوجائے گی
دُلہن کے بھائی بھی کچھ بہت مشغول معلوم ہوتے ہیں۔
اور دُلہن کے چچا نیچے والے کمرے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ اُدہر دلہن کی ممانی
والدہ وغیرہ سینے سلانے میں مصروف ہیں۔ غرض یہاں بھی اسی خوشی کے سامان
مہیا ہورہے ہیں۔ دونوں گھروالوں کو اسقدر کام کاج میں مصروف دیکھکر ہمیں بڑی
خوشی حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ ان دونوں گھروں میں آپس میں سخت نااتفاقی تھی۔ ایک دوسرے
سے اکثر جھگڑے ہوا کرتے تھے اور اسی وجہ سے یہ شادی بھی کئی دن سے اُٹھار کھی تھی
مگر اس نئے رشتے سے ہمیں امید ہے کہ پھر یہ لوگ باہم شیر وشکر ہوجائینگے اور اپنی پُرانی اور
نئی رشتہ داری کو قائم کرینگے۔ مگر دیکھنا یہ قاضی صاحب کے ہاں شور کیسا ہورہا ہے۔ معلوم
ہوتا ہے کہ کوئی لڑرہا ہے۔ یا کوئی فتنہ وفساد برپا ہوگیا۔ ابھی تو خوشیاں منائی جارہی تھیں
اور ابھی چیخنے چلانے کی آواز آرہی ہے۔ ہاں مگر یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ قاضی صاحب کے
ہاں کی عورتیں نہ صرف بات چیت ہی چیخ چیخ کر کرتی ہیں بلکہ اکثر آپس میں لڑتی جھگڑتی بھی ہیں
انکا خاندان یوں تو بڑا مہذب شمار کیا جاتا ہے مگر انکے ہاں کے اندرونی حالات کو دیکھنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تہذیب کی بو تک نہیں۔ مگر چلیے ہم بھی سنیں یہ اسوقت شور
کیسا مچ رہا ہے۔
آہا یہ تو دولہا کی ممانی منجھلی بیگم چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہی ہیں یہ کس کم بخت نے بھی

چولھا توڑ ڈالا۔ ہے ہے کل ہی تو منگایا تھا۔ یہ کون موا اندھا تھا۔ ٹھوکر مار کر موئے نے اُکا کونا ہی توڑ ڈالا۔ نگوڑے بچے ذرا نہیں مانتے۔ اب اسے سانڈ بنا پڑیگا۔ اور کہیں گوبر بھی نہیں ملیگا۔ توبہ موئے نے کیا سخت تکلیف دی۔ دیکھیں سامنے اگر بیل آ گئے ہونگے تو گوبر ملجائیگا۔ ارے بلال۔ او بلال۔ ارے او بلال۔ موئے کے کان پھوٹ گئے"

بلال۔ (لڑکا) دور سے چلاّکر "جی آیا صاحب"

دولھا کی ممانی۔ ارے او کم بخت کیا تیرے کان پھوٹ گئے۔ جواب کیوں نہیں دیتا۔ جا تو سامنے سے تھوڑا سا گوبر لا اُنکے بیل آ گئے ہونگے۔

بلال بہت اچھا کہکر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں روتا ہوا واپس آیا اور ہچکیاں لیکر کہنے لگا۔ اوں اوں بیگم صاحب مجھے میاں نے اوں اوں مارا۔ میرا ہاتھ مرو اوں اوں مرو اوں مروڑا اور لاتیں ماریں اوں اوں اوں اوں۔

منجھلی بیگم کا مزاج یہ سُنکر بالکل جاتا ہی رہا۔ اور بجائے اسکے کہ وہ بیچارے بلال کی کچھ سُنتی اُنھوں نے اُس غریب کے ایک زور سے چپت رسید کی اور کہنے لگیں۔

ہٹ موئے جھوٹے تو گیا کب۔ مار کب کھائی اور آیا کب ابھی تو تو یہاں تھا موئے کم بخت تو گیا ہی نہیں۔ حرامخور ٹھہر تیری میں کیسی گت بناتی ہوں آنے دے سید میاں کو۔ تو تو اُن کی ہی مار سے ٹھیک ہوتا ہے۔ اری سیمہ (لڑکی) جا تو تو ذرا سامنے سے تھوڑا سا گوبر اُٹھا لا۔

سیلمہ یہ سُنکر ٹُھنک ٹُھنک کرتی ہوئی سامنے گئی اور جوں ہی گوبر اُٹھاکر لیجا رہی تھی کہ سامنے سے نوشاہ میاں (دُلہن کے چچا) مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے لپک کر آئے اور کہنے لگے۔

کیوں بے حرامخور ایک مار کھا کر گیا اب تو آئی۔ معلوم ہوتا ہے تیری بھی شامت

آئی ہے۔ یہ گوبر کیا تیرے باپ دادا کا ہی جو لیچلی۔ ہمارے گھر کا م نہیں ہے گوبر
ہمارے کام میں نہیں آئیگا۔ رکھ گوبر ورنہ تجھے ٹھیک کر ہی کے بھیجونگا۔ حرامخور
آئی گوبر لینے۔ جیسے اسکے باپ دادا کا مال۔ رکھتی ہے یا نہیں۔ ٹھہر تیرا سر ہی
مونڈ کر بھیجتا ہوں۔ یہ کہا نوشاہ میاں سلیمہ کی طرف بڑھے ہی تھے کہ سلیمہ گوبر پھینک کر
کھسکنے لگی۔

اجی مہربان مجھے منجھلی بیگم نے گوبر لینے بھیجا ہے آپ مجھپر کیوں خفا ہوتے ہیں
میں نے آپ کا کیا کیا۔ لیجیے اپنا گوبر۔

نوشاہ میاں۔ یہ سُنکر آگ بگولا ہوگئے اور بگڑ کر کہا کہ ”سور بچی مجھسے یہ
زبان درازی۔ تیری زبان چیر کر نہ پھینکدوں تو میرا نام نہیں۔ تو بھی کیا ہے اور تیرے
بھیجنے والے کیا تجھے ہوئے ہیں۔ بڑی آئی منجھلی بیگم۔ بیگم ہوں تو اپنے گھر کی۔
ہمیں کیا لینا دینا۔ بیل ہمارے گوبر ہمارا اور منگائیں منجھلی بیگم۔ جا اُن سے کہدے
کہ اگر ایسے ہی گوبر کی ضرورت ہے تو بیل گاؤں کو اپنے گھر لائیں اور پھر گوبر لیں۔

سلیمہ یہ سُنکر ہاتھ پیر جھاڑتی ہوئی واپس گھر آئی اور اپنی بیگم صاحبہ سے بہت
کچھ بڑھا چڑھا کر سب واقعہ کہہ سُنایا۔

یہ سننا ہی تھا کہ منجھلی بیگم آپے سے باہر ہوگئیں۔ غصے کے مارے بُرا حال تھا
چہرہ سرخ ہوگیا۔ آنکھوں سے پانی نکل آیا اور زمین پر بیٹھکر دونوں ہاتھ زمین پر مار مار
کر کوسنے لگیں کہ ”ارے تیرا ستیاناس ہو۔ ارے تیرا خانہ خراب ہو تو نے مجھے
سر راہ ایسا کہا۔ خدا کرے تیری زبان جھڑ جائے۔ مونڈی کٹے کو ذرا شرم بھی نہ آئی
کہ کسی شریف عورت کا نام بازار میں کھڑا ہو کرے۔ ارے موئے رشتہ دار کہلاتے
ہیں موے جل جائیں فنا ہو جائیں۔ الٰہی کیسے لوگوں سے پالا پڑا ہے۔ آگے چلکر
کیا حشر ہونے والا ہے۔ میں علی محمد سے کہتی ہی تھی کہ دیکھ بیٹا یہ لوگ بہت پیچ

اور بُرے ہیں اسنے نہ مانا آخر دیکھا۔ ایک گوبر کے لیے یہ باتیں سُنیں۔ خدا کرے
موئے کو گوبر نصیب نہ ہو۔ غرض اسی طرح سے کوئی گھنٹہ بھر تک یہ کوساکیں۔ ادہر
تو یہ کوس رہی تھیں اور سامنے نوشاہ میاں یہ سُن سُنکر تلملا رہے تھے
اور زبان سے یہ فقرہ نکلتا تھا کہ "کیا رذیل عورتیں ہیں"۔ اور پھر دُلہن کی ماں نے
جب منجھلی بیگم کی آواز سُنی اور یہ گالیاں سُنیں تو اُدہر وہ بگڑیں اور لگیں کوسنے۔
دونوں طرف سے برابر کی چوٹ تھی۔ کبھی کوسنے میں منجھلی بیگم کا پلہ بڑھجاتا تھا
تو کبھی دُلہن کی ماں کا۔ غرض اس طرح دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ اسی
طرح سے یہ دونوں بہت دیر تک ایک دوسری کو کوستی رہیں۔ جب تھک گئیں
تو اُدہر وہ خاموش ہوگئیں اور ادہر یہ۔

دوسرے دن ایک اور واقعہ پیش آیا۔ دلہن کے والد اپنی نوکری سے شادی
کے لیے چھٹی لیکر گھر آئے اور کوئی قریباً دو ڈہائی بجے گھر پہنچ گئے۔ جوں ہی یہ
اوپر اپنی بیوی بچوں کے پاس گئے کہ بیوی نے یعنی دلہن کی ماں نے انسے پوچھا
تم نے کھانا تو نہیں کھایا ہوگا۔ جسکے جواب میں مہماں نے کہا نہیں تو۔ لاؤ کچھ
کھانے کو ہو تو ذرا جلدی سے لاؤ۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ یہ سُنکر بیچاری دُلہن
کی ماں خاموش ہوگئی کیونکہ گھر میں کھانا تو کچھ تھا ہی نہیں۔ اور یہ اسی فکر میں
تھیں کہ دلہن کی ممانی نے کہا کہ نگوڑی یہ کونسی گاڑی ہے جو اسوقت آتی ہے بیچارے
مسافروں کو بھوکا پیاسا مارا۔ موؤں نے کیسے کیسے وقت گاڑی کے رکھے۔ خانہ خراب
ہو ان نگوڑے فرنگیوں کا۔ موؤں نے ہر طرح دق کر رکھا ہے۔ خیر بہن دیکھو تو اگر ہمارے
ہاں کچھ نہ ہو تو سامنے والی کے ہاں سے ایک دو انڈے منگوا کر تل ڈالو"۔ یہ کہکر
خود ہی گلاب (نوکر) کے ہاتھ انڈے منگوائے۔ گلاب دوڑتا قاضی صاحب کے
ہاں آیا اور کہا کہ بی بی نے ایک دو انڈے منگائے ہیں۔ یہ خبر اندر پہنچی اور وہاں سے

منجھلی بیگم اور بڑی بیگم اور چھوٹی بیگم غرض سب چیخ اٹھیں کہ جاؤ ہم نہیں دیتے۔ ذرا سے گوبر کے لیے تو اتنا بڑا فساد برپا کیا اب آئے انڈے مانگنے۔ جا کہدے اپنی بی بی سے کہ نہیں ہیں انڈے۔ یہ سنتے ہی دولھا کی چھوٹی بہن سردار بیگم دوڑی آئیں۔ سردار بیگم چونکہ نہایت ہی تعلیم یافتہ اور اچھے خیالات کی لڑکی تھی اسنے آتے ہی ان لوگوں سے کہا کہ اگر انھوں نے اپنا کمینہ پن بتلایا تو آپ کو چاہیے کہ آپ ان سے شریفانہ برتاؤ کرکے انھیں شرمائیں نہ کہ آپ بھی ویسا ہی برتاؤ کریں۔ یہ کہکر زبردستی انڈے دلوائے۔ مگر یہاں یہ باتیں ہوتی تھیں اور وہاں دلہن کے والد اپنے گھر میں بیٹھے بیٹھے یہ سب سُن رہے تھے کیونکہ گھر بالکل ہی سامنے تھا۔ جتنا جتنا یہ سُنتے تھے یہ اور زیادہ غصے میں آتے تھے آخرش اپنی بیوی سے کہا کہ یہ بات کیا ہے۔ تم نے انڈے منگوائے کیوں اور یہ جھگڑا کیسا۔ بیوی نے سب قصہ کہہ سُنایا۔ یہ سُنکر میاں اور جھنجلائے۔ اتنے گلاب انڈے لیکر آ بھی گیا۔ میاں نے غصے میں آکر گلاب سے انڈے لیے اور اُسی کی طرف پھینک مارے۔ خیر گذری کہ بیچارا گلاب بچ گیا اور وہ انڈے دیوار پر جا ٹوٹے دیوار بھی خراب ہوئی اور دری بھی ادہر تو یہ پھینک دیے اور اُدہر جوش میں آکے خوب کہہ سُنایا۔ کہتے کہتے یہ بھی کہدیا کہ بیاہ ویاہ گیا چولھے میں۔ نہ مجھے لڑکی دینی ہے نہ ایسے لوگوں سے کوئی رشتہ رکھنا ہے۔ بس ہو چکا۔ یہ کہنا ہی تھا کہ گھر میں ایک عجیب حسرت برسنے لگ گئی۔ ادہر قاضی صاحب والے بھی چپ چاپ ہو گئے۔ ادہر بیچاری دلہن یہ جھگڑے سُن سُنکر سکتے کی حالت میں ہو گئی۔ میاں علی محمد کے چہرے پر عجیب اُداسی چھا گئی۔ سب آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ یہانتک تو یہ حالت تھی اب آگے خدا جانے کیا حشر ہونیوالا ہے۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دُلہن کے والد کا غصہ کچھ تھم گیا یا نہیں۔ اور یہ بھی نہیں

کہہ سکتے کہ شادی ہوگی یا نہیں۔ ابتک تو یہ حالت ہے۔

راقم
خدنگ

ایک ہے اور کچھ نہیں

اچھی اتاّ! سختی کے دن کب جائینگے۔ بے فکری کی نیند بھی کبھی میسر آئیگی یا یونہیں ڈر اور خوف سے راتیں آنکھوں میں کٹیں گی۔ چچا عالمگیر ہم کو کیوں ستاتے ہیں۔ خدا بھی ہماری مدد نہیں کرتا۔ اُسنے بھی حق کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دنیا گواہی دیتی ہے کہ تخت دارا کا۔ تاج دارا کا۔ اور دین کے قاعدے کے موافق بھی آپ ہی تاج و تخت کے اصلی وارث ہیں۔ مگر میں دیکھتی ہوں کہ کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ زمین آسمان دشمن ہیں۔ گھر سے بے گھر جنگلوں میں بسیرا لیتے پھرتے ہیں۔ جب بھی لوگوں کو چین نہیں اور ہم کو جڑ بنیاد سے فنا کرنے کی ترکیبیں سوچی جاتی ہیں۔ جواب دیا گیا۔

دارا کی جان دل آرا۔ جو باتیں کل شام کو ہم نے بیان کی تھیں شاید تم نے اُنکو ذہن سے اُتار دیا۔ بیٹی! اسی زبردستی و زبردستی کا نام دنیا ہے۔ یہی ناکامی اور کامیابی ہی جسکے چکر میں تمام عالم گرفتار ہی۔ یہ نہو تو ساری دنیا بے مزہ ہو جائے۔ اسی الٹ پھیر سے یہ کارخانہ چل رہا ہی۔ بھائی اورنگ زیب کا کوئی قصور نہیں۔ نہ خدا اور زمانے کی کوئی شکایت۔ قدرت کا دستور ہی کہ ایک بادشاہی کا تاج پہنتا ہی دوسرا سولی دیا جاتا ہے۔ ایک پاؤں پھیلا کر بیفکری سے سوتا ہی دوسرا پلک جھپکنے کو ترستا رہجاتا ہی۔ لیکن پیاری اس کی خوشی اور اسکا غم دونوں فانی ہیں۔ قرار ایک کو نہیں بلکہ ذرا اور غور کرو تو معلوم ہوگا کہ خوشی و رنج فقط وہم و خیال ہی۔ خیال قابو میں ہو تو کیسی ہی سخت مصیبت پیش آئے انسان اُسکو ہیچ سمجھتا ہے اور اُسکو کسی قسم کی تکلیف

نہیں ہوتی۔ جو باتیں آجکل ہم کو پیش آرہی ہیں وہ بھی ایک طرح کی خدمت ہے جو خدا کی طرف سے انسان کو دیجاتی ہے۔ جس طرح ایک آدمی بادشاہ بنایا جاتا ہے اور اُسکے ذمے حکومت کے ذائقض لگائے جاتے ہیں اسی طرح ایک غریب کو بھی غربت کی خدمت سپرد کی جاتی ہے۔ بادشاہ کو دولت کی شان سے اپنے کام عمدگی سے پورے کرنے چاہییں اور غریب کو غریبی کی حیثیت سے اس خدائی نوکری کو بجا لانا چاہیے۔ بھائی اورنگ زیب سے میں اتنا بھی مقابلہ نہ کرتا جتنا کیا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ آیا واقعی قدرت نے اس کی بادشاہت قبول کرلی ہے یا نہیں۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ بیشک خدا اُس کی حکومت اور میری غربت چاہتا ہے۔ میں تو ہر طرح راضی ہوں۔ اورنگ زیب جس طرح چاہے ستائے۔ ہماری سرکوبی اور بیخ کنی کی جیسی چاہے تدبیریں کرے اسکے لیے یہی شایاں ہے کیونکہ اُسکو شاہی طرز کی نوکری پوری کرنی ہے۔ ہم کو سب سختیاں برداشت کرنی چاہییں کیونکہ ہمارے ذمے غربت بے کسی لاچاری اور ہر طرح کی مصیبت لگائی گئی ہے ہمارا فرض ہے کہ سہیں۔

دارا شکوہ کی یہ تقریر سُنکر اُس کی بیٹی دل آرا بولی۔ یا اللہ دل میں اور خلجان پیدا ہوا۔ آپ روز سمجھاتے ہیں مگر مجھ بے وقوف کی عقل میں نہیں آتا۔ پرسوں آپ نے فرمایا تھا کہ ایک ہے اور کچھ نہیں، یعنی جو چیز آنکھوں کو نظر آتی ہے اور جن چیزوں کی صورت خیال کرنے سے ذہن میں جمتی ہے سب کی حقیقت ایک ہے شکلیں الگ الگ ہیں۔ جیسے مٹی کے برتن۔ ایک مٹکا ہے تو ایک آبخورہ ایک کونڈا ہے اور ایک چلنی۔ نام الگ الگ۔ کام الگ الگ۔ صورت و شکل الگ الگ۔ مگر مٹی سب کی ایک۔ یا مثلاً ایک ڈورا ہے جس میں کئی گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ گرہ ایک اُبھری ہوئی صورت کا نام ہے مگر اصل اُسکا ڈورا ہے جو لپٹ کر گرہ بن گیا ہے۔ پہلی چیز جو مسلمان بچے کو سکھلائی جاتی ہے وہ کلمہ لاالٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ہے جسکے معنی عام طور پر یہ بتائے

جانتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا دوسرا نہیں اور محمد اُسکے رسول ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ کلمہ ہی تمام دین و دنیا کی بنیاد بتا دیتا ہے۔ اگر اسکے معنی یوں سمجھائے جائیں کہ ایک خدا کے سوا کچھ نہیں۔ یا لفظی معنی کہ نہیں ہے کچھ مگر خدا اور محمدؐ اُسکے رسول ہیں۔ ابّا جان یہ تعلیم مینے اپنے اُستاد مولوی صاحب سے بیان کی تھی۔ وہ یہ سُنکر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ یہ شرک کی باتیں ہیں۔ ان میں پڑکر آدمی کافر ہوجاتا ہے۔ داراشکوہ نے ہندوؤں کی صحبت اور ان کی کتابوں کے پڑہنے سے یہ باتیں سیکھی ہیں۔ دین اسلام کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام تو یہ سکھاتا ہے کہ خدا ایک ہی اور سب مخلوقات اُسنے بنائی ہے۔ مگر ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سب کچھ خدا ہے۔ درخت بھی خدا اور جانور و آسمان زمین بھی خدا۔ توبہ توبہ بالکل کفر کے کلمے ہیں۔ سو حضرت اول تو میں پرسوں کی باتوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ آج آپ نے یہ اور نئی باتیں سُنائیں کہ مصیبت بھی ایک نوکری ہے جسکو خوشی خوشی بجالانا چاہیے۔ پرسوں کی باتوں کی نسبت مولوی صاحب کہتے تھے کہ قرآن میں اسکا کہیں ذکر نہیں۔ یہ ہندوؤں کے ویدانت کا مسئلہ ہی جسکو مسلمانوں میں صوفیوں کا گروہ بھی ان کی دیکھا دیکھی ماننے لگا۔ اور آج کی تقریر سُنکر تو میں پیشگی حکم لگاتی ہوں کہ مولوی صاحب اسکو بالکل مسلمانی کے خلاف بیان کرینگے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ میرے جی کو بھی مولوی صاحب کی باتیں لگتی معلوم ہوتی ہیں۔ بھلا جسکا ذکر قرآن شریف میں نہو وہ ہم کس طرح مان لیں۔ اور بات بھی ایسی کہ سب چیز خدا ہے۔

الٰہی تیری پناہ دل آرا کی شکیہ باتیں سُنکر داراشکوہ کو جوش آگیا مگر وہ جوش خفگی و ناراضی کا نہ تھا۔ بلکہ جس طرح کوئی آدمی جانی پہچانی چیز کا انکار کسی نادان کی زبانی سُنکر افسوس کا جوش آجاتا ہی ایسے ہی دارا کے چہرے پر جوش کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور نہایت بے پروائی سے بولا دیوانی اس چیز کے وجود پر شبہ کرتی ہی جو سورج کی طرح ظاہر ہے۔ مولوی صاحب کی ناسمجھی ہے جو قرآن کو اس تعلیم سے خالی بتاتے ہیں

اری نادان قرآن کے دل میں اُنھیں باتوں کا خزانہ ہے۔ ظاہری الفاظ پر عمل کرنا بیکار ہے
اصلی معانی پر غور کرنا چاہیے۔ قرآن میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ وہ سب پر محیط ہے۔
وہ اول ہی آخر ہی ظاہر ہے باطن ہی۔ نیچے ہے اوپر ہے۔ اسکے بہت سے نام ہیں
مگر جس طرح قرآن میں ارشاد ہی کہ ہدایت اُنھیں کو ہے جو غور کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں
کہ لوگ غور نہیں کرتے۔ بیشک ویدانت کے بھی یہی اُصول ہیں۔ لیکن اسلام کی تعلیم
اگر اُسکے موافق ہی تو کوئی مضائقہ نہیں۔ میں نے کب کہا تھا کہ ہر چیز کو خدا کہنا چاہیے
وہ تو میری مثال سے خیال میں آسکتا ہے کہ جب تک آبخورہ اپنی صورت پر اور مٹکا اپنی
شکل پر قائم ہے اُسکو مٹی نہیں کہہ سکتے۔ یا جبتک ڈورے میں گرہ ہے گرہ نام رہیگا۔
ڈورا نہیں کہہ جائے گا۔ لیکن سمجھنا یوں نہیں چاہیے کہ حقیقت سب کی ایک ہے۔

رہی دوسری بات کہ رنج و راحت آدمی کے فرائض ہیں۔ یہ بھی تعجب کی بات نہیں ہے،
جب ہم نے یہ مان لیا کہ ایک ہے اور کچھ نہیں۔ یعنی جو کچھ ہے سب خدا کا ظہور ہی
تو کہیں اُس کی شان کرم ظاہر ہے اور کہیں شانِ غضب۔ ایک کانٹے دار درخت
جس میں پھول پھل نہیں آتے شکایت کرے کہ دوسرے درخت میں پھول بھی خوبصورت
ہیں اور پھل بھی مزیدار ہیں مجھے اس سے کیوں محروم کیا گیا تو ہم یہی جواب دینگے
کہ تجھکو وہ میسر ہے جو پھولدار پھلدار درخت کو نصیب نہیں جو شان تجھ میں ہے وہ
اُس میں نہیں جو اُس میں ہی وہ تجھ میں نہیں۔ پھر شکوہ کرنا لاحاصل ہی۔ دل آرا یہ ایسی
اچھی تعلیم ہے کہ اگر انسان اسکو خوب سمجھ کر ذہن نشین کرلے تو دنیا کے عیش و راحت
اور رنج و غم کے جھگڑوں سے آزاد ہوجاے۔ دنیا کا ترک اسی کا نام ہے کہ اُسکے اُتار
چڑھاؤ کی تکلیف جاتی رہے۔ یہ نہیں کہ انسان مال و دولت جورو بچے چھوڑ بیٹھے۔ سو
پیاری جب میں اپنے بھائی کے برتاوہ کا شاکی نہیں تو تو کیوں شکایت کرتی ہے۔
بس ہر وقت اس خیال میں غرق رہ کہ

ایک ہے اور کچھ نہیں"۔

از خواجہ حسن نظامی
خانقاہ مبارک حضرت محبوب الٰہی دہلی

ملکہ کیتھرین دوم شہنشاہ بیگم روس

یوروپ میں جن عورتوں کے ہاتھوں میں زمام حکومت رہی اُن میں سے یہ ملکہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہی کیونکہ اسی کے زمانے میں روس میں علم پھیلا۔ اور وہی تخم اب برگ و بار لایا ہی۔

اس ملکہ کی ولادت ۱۷۲۹ء میں ہوئی۔ اسکے باپ کا نام کرسچین اوگسٹ تھا۔ جو جرمن کے شاہی خاندان میں سے تھا۔

اسکا نکاح ۱۷۴۵ء میں پیٹر سوم کے ساتھ ہوا۔ کیونکہ پیٹر اعظم نے اپنی وصیت میں ایک بات یہ بھی لکھوائی تھی کہ "روس کے شاہی خاندان کے لیے یہ امر لازمی ہے کہ وہ ہمیشہ جرمن کے شاہی خاندان کی لڑکیوں سے شادی کریں۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ہمارے اور اُنکے درمیان اتحاد بڑھ جائیگا۔ اور بہت سے پولٹیکل فوائد ہم کو حاصل ہونگے"۔

اسی وصیت کی بنیاد پر یہ شادی ہوئی۔ اور ملکہ کیتھرین نے اپنے آبائی مذہب رومن کیتھلک کو چھوڑ کر آرتھوڈکس مذہب اختیار کر لیا کیونکہ روس کے شاہی خاندان کا یہی مذہب تھا۔ اسکے بعد اسکے دو لڑکے پیدا ہوئے ایک پولس جو اسکے بعد بادشاہ ہوا اور ایک لڑکی جو بچپن میں مر گئی۔

اس زمانے میں روس کی سلطنت پیٹر اعظم کی بیٹی کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۷۶۱ء میں جب وہ مر گئی تو اُسکے بجائے پیٹر سوم مالک تاج و تخت ہوا۔ لیکن وہ کچھ مدبر نہ تھا

اور سلطنت کے لیے بالکل ناقابل ثابت ہوا۔ اسکے ساتھ ہی یہ بھی اُسنے قصد کیا کہ اپنے
بیٹے پولس کو ولیعہدی سے محروم کر دے اور کیتھرین کو طلاق دیدے۔ کیتھرین کو بھی اسکے
اس ارادے سے اطلاع ہو گئی اور اُسنے رفتہ رفتہ یہ کوشش کی کہ ملک کی لگام اُسکے
ہاتھ سے چھین لے۔ آخر اُسنے تمام اعیان سلطنت اور فوج کے افسروں کو ملالیا۔ اور
جبراً پیٹر سوم سے خود اُسی کے ہاتھوں سے استعفا لکھوا دیا۔ اور ۱۷۶۲ء ۲۷۔ جون کو
اُسکو روبشا کے محل میں نظر بند کر دیا۔ جہاں دو مہینے بعد لوگوں نے کیس اور لوف ملکہ
کیتھرین کے ایک مقرب بارگاہ کے مشورے سے قتل کر ڈالا۔ اور یہ مشہور کر دیا کہ وہ درد
قولنج میں مرگیا۔ بعض مورخ یہ کہتے ہیں کہ خود ملکہ نے اسکو قتل کرایا تھا۔ بہرصورت جو کچھ
بھی ہو ملکہ کے سر سے یہ الزام نہیں دور ہو سکتا۔ اگر نہیں تو کم سے کم یہی کیا کم جرم ہے کہ اُسنے
اپنے شوہر کی نجات کی کوشش نہیں کی اور اُسکو قتل ہو جانے دیا۔ اور پھر قاتلوں کو بھی
قتل نہیں کیا۔

غرض پیٹر سوم کی وفات کے بعد اُسی سال ستمبر کے مہینے میں زمام حکومت خود اُسنے
اپنے ہاتھ میں لی۔ اور ماسکو اُسکے قدیم دارالخلافہ میں اُس کی معمولی تاجپوشی کی رسم
ادا کی گئی۔ اسوقت روس کی حکومت اُنھیں اُصول اور قوانین پر چل رہی تھی جو پیٹر اعظم
نے مقرر کر دیے تھے۔ ملکہ نے نہایت سنجیدگی اور نرمی سے حکومت شروع کی۔ تاکہ
رعایا کا دل وہ اپنی مٹھی میں لیلے۔ اور مدتوں تک اُسنے کسی جنگ کا ارادہ نہیں کیا۔
بہت سے ایسے موقع پیش بھی آئے لیکن وہ ٹالتی گئی۔ اور اپنی تمام توجہ ملک کی اندرونی
حالت کی اصلاح کی طرف متوجہ رکھی۔ چونکہ نہایت ذہین۔ متین اور عاقلہ عورت تھی اسلیے
اُن وسائل کو صحیح طور پر سمجھتی تھی جو اصل میں ملکی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُسنے علم
کی اشاعت پر توجہ کی۔ تمام یورپ سے چھان چھان کر لائق لائق لوگ بلوائے تاکہ وہ تعلیم کی
اشاعت کریں۔ اور اُسکے ذرائع مہیا کریں۔ چنانچہ اسکے زمانے میں علمی ترقی بہت ہوئی۔

اور ڈاکٹری کی تو اُسنے خاص طور پر سرپرستی کی۔ اسی کے زمانے میں چیچک کا ٹیکہ مملکت روس میں عام کر دیا گیا۔ ورنہ اس سے پہلے لوگ اس سے بہت ڈرتے تھے۔ الغرض روسی بدماغوں اور وحشی جاہلوں کو اُسنے علم آشنا کر دیا۔ اور اُس سطح پر اُن کو پہنچا دیا جس سطح پر یورپ کی اور قومیں اُسوقت تھیں۔

اسنے حکومت کے نئے قوانین بھی تیار کرائے جو زیادہ آزادی اور عدل و انصاف پر مبنی تھے۔ اور بہت سے جابرانہ قوانین کو منسوخ کرا دیا۔

۱۷۶۹ء میں روس اور دولت علیہ میں سلطان مصطفےٰ ثالث کے زمانے میں جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ میں ملکہ کیتھرین نے یورپ کی بعض اور سلطنتوں مثلاً پروشیا آسٹریا وغیرہ کو شریک کر لیا تھا۔ اس جنگ کی انتہا اس امر پر ہوئی کہ پولینڈ جو روس کا ایک حصہ تھا اُسکے حصے بخرے ہوگئے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی ملکہ نے قریم وغیرہ کی طرف اپنی سلطنت کا دائرہ بڑھا لیا۔ اور ایک جنگی بیڑہ بحر متوسط کی طرف روانہ کیا۔ غالباً یہ پہلا روسی بیڑہ تھا جو اس طرف گیا۔ اس نے ایک نہایت گہری چال یہ چلی کہ دولت علیہ کے بعض افسروں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسوجہ سے اُن کی قوت کمزور ہوگئی۔ چنانچہ اسوقت علی بک جو مصر کا گورنر تھا اور شیخ طاہر جو عکا کا گورنر تھا۔ دونوں اسی کے ساتھ مل گئے اور دولت علیہ کی نمک حرامی کی۔

یہ دونوں مع اُس بیڑے کی فوج کے شام کے ملک کو فتح کرنے کے ارادے سے روانہ ہوئے اور اُنھوں نے اپنی تلواریں اپنے ہمقوموں کے خلاف کھینچیں۔ علی بک و شیخ طاہر کے ساتھ جو فوج تھی اُسکا افسر ایک شخص محمد بک نامی تھا۔ جاتے کے ساتھ ہی اُسکی فوج نے دمشق کو فتح کر لیا۔ لیکن محمد بک جو فوج کا افسر تھا دمشق فتح کرنیکے بعد اپنی نمک حرامی سے باز آیا۔ اور پھر سلطنت عثمانیہ کا خیرخواہ ہوگیا اور ایسا پرجوش خیرخواہ ہوا کہ تمام فوج کو لیکر مصر چلا آیا۔ اور تمام مصر کو اپنے قبضے میں کیا۔ پھر علی بک اور شیخ طاہر پر حملہ کر کے

صالحیہ میں اُن دونوں کو گرفتار کیا۔ اور تمام فوج کو جمع کرکے اُنکے سامنے اُن دونوںکے سر اُڑا دیے۔ اور کہا کہ نمک حراموں اور مغروروں کی یہی سزا ہے۔

پھر روس اور دولت علیہ میں صلح ہوگئی۔ جس میں ان کریاں۔ کلی۔ اسماعیل اور اُسکے ملحقات قلعے اور بندرگاہیں وغیرہ دولت علیہ کو ملیں۔ اور جزیرہ قریم اور کرش وغیرہ روس کو۔

اس صلح کے بعد ملکہ پھر اپنے اندرونی انتظام کی طرف متوجہ ہوئی۔ اور جنگ کی وجہ سے ملک میں جو ابتری پھیلی تھی اُس کی تلافی کرنی شروع کی۔

مجر بالٹک میں اسنے شمالی سلطنتوں سے معاہدے کر لیے اور تجارت کو وسعت دینی شروع کی۔

یہ عجیب بات ہے کہ شادی کے لیے اس نے جس مذہب کو اختیار کر لیا تھا اسکو پھر ترک کر دیا۔ اور اب وہ رومن کیتھلک چرچ کی پیرو ہوگئی۔

۱۷۸۷ء میں پھر روس اور دولت علیہ میں جنگ ہوئی۔ کیونکہ روسیوں نے کچھ سلطانی ممالک پر دست درازی شروع کی تھی۔ اس لڑائی میں جرمنی نے بھی روس کا ساتھ دیا۔ پھر آخر کو ۱۷۹۲ء میں صلح ہوگئی۔ جس میں باب عالی کو قلعہ روکزاف چھوڑ دینا پڑا اور روس کی سرحد تک بڑھ آئی۔ اسکے بعد پولینڈ میں بغاوت کا سلسلہ شروع ہوا۔ کیونکہ وہاں کے لوگ بعض حکام کے مظالم سے تنگ آگئے تھے۔ ملکہ نے ایک جنگی فوج بھیجکر وہ بغاوت فرو کرائی۔ اس فوج نے وارسا میں اسقدر باغی قتل کیے کہ خون کے نالے بہنے لگے۔ اسکا انجام یہ ہوا کہ پولینڈ تین حصوں میں منقسم ہوگیا۔ اور اس میں ایک تہائی کا شریک جرمنی ہوگیا۔

یہ علم کی قدردان ملکہ ۱۷۹۶ء میں ۶۷ برس کی عمر میں مرگئی۔

راقم ا۔ ج۔

بسلسلۂ سابق

مراسم شادی مسلمانان آگرہ

مہندی کی صبح یعنی ساچق کے تیسرے روز کو برات کہتے ہیں اس تاریخ میں کوئی خاص رسم ادا نہیں کیجاتی۔ سوائے اسکے کہ گیارہ بجے کے قریب نوشہ کے گھر سے بطور ہوڑا دلہن کے گھر کے کل مہمانوں کے لیے ایک دو دیگ کھانے کی آتی ہیں۔ ان مہمانوں سے جو کچھ کھانا بچ رہتا ہے وہ کنبے میں تقسیم کر دیا جاتا ہے بعض ناواقف اور جاہل یا مطلب کے جاہل دعوت ولیمہ بھی اُسی روز کر دیتے ہیں حالانکہ اُسکے کرنے کا حکم بعد نکاح ہو جانے کے ہے۔ قبل نکاح دعوت کرنے سے انکا یہ فائدہ ہے کہ اس دن کی مہمانداری سے بچ رہتے ہیں۔ اور ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ دعوت کے انتظار کی وجہ سے مہمان عقد کے بعد نہیں ٹھیرتے جن کی مہماں نوازی کے بار سے یہ بچ جاتے ہیں۔

اس روز شام سے نوشہ کے مکان پر رقص و سرود کی محفل ترتیب دیجاتی ہے جس میں شرکت کے لیے کل احباب کو بلایا جاتا ہے۔ شہر کے عمدہ عمدہ طائفوں کا ناچ ہوتا ہے۔ نقال محفل کی زینت کو دو بالا کر دیتے ہیں۔ یہ بزم نشاط شام سے صبح تک برابر اسی حالت سے قائم رہتی ہے۔ آدھی رات کے قریب دلہن والوں کی طرف سے نوشہ کے لیے ایک لباس جسکو برات کا جوڑا کہتے ہیں۔ آتا ہے۔ جسوقت یہ جوڑا دلہن والوں کے گھر کشتی میں رکھا جاتا ہے اُسوقت اس کشتی کو کھولکر مستورات کے آگے رکھکر ٹونے گوائے جاتے ہیں۔ جب وہ گا چکتی ہیں۔ تو پھر کشتی کو ڈھانک دیا جاتا ہے اور اُٹھاکر حجام کو دیدیجاتی ہے تاکہ وہ اُسکو نوشہ کے گھر لیجاوے جوڑے کی ہمراہی میں دلہن کے بھائی بہنوئی وغیرہ رشتہ دار بھی جاتے ہیں۔ اس جوڑے میں ایک نہایت تکلف آراستہ زرق برق جوڑا ایک سفید جالی یا کسی اور اچھے کپڑے کا کرتا۔ ایک سرخ رنگ کی پگڑی یا منڈیل ٹپکا

کمر سے باندھنے کا جس میں کہ سرخ پٹھے کی گوٹ لگی ہوتی ہے۔ نہانے کے لیے ایک لنگی اور کھیس۔ ایک جوڑا زر دوزی کام کے ہندوستانی وضع کے جوتے کا۔ ایک تاش کا رومال۔ پھولوں کا زیور جس میں طرہ اور بدھی بھی ہوتی ہے۔ اور ایک بہت نیچا سہرا سر سے قریب قریب پاؤں تک پھولوں کا جسکو بہاری سہرا کہتے ہیں۔ سر سے باندھنے کا شامل ہوتا ہے ان سب چیزوں پر کھیلیں اور بتاسے پڑے ہوتے ہیں۔ اس جوڑے کی کشتی کو محفل میں لاکر رکھا جاتا ہے۔ اور کل حاضرین مجلس اُسکا ملاحظہ کرتے ہیں۔ بعدہ وہاں سے اٹھاکر گھر میں بھجوا دیجاتی ہے۔ دلہن کے جو رشتہ دار جوڑے کے ہمراہ آتے ہیں۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر پھر واپس چلے جاتے ہیں۔ ایک رسم اس موقع پر اور قابل ذکر ہے کہ جب برات کا جوڑا دلہن کے گھر سے روانہ ہو چکتا ہے تو دلہن کا باپ اپنی لڑکی کے ہاتھ میں چانولوں کی بنی ہوئی پنڈیاں اور کچھ روپیے رکھتا ہے۔ اور یہ الفاظ کہتا ہے کہ ”اے لڑکی آج میں تیرے قرض سے ادا ہوا“ اسی طرح اور رشتہ دار بھی اُسکے دودھ پینے کے لیے کچھ نقدی حسب مقدور حیثیت دیتے ہیں۔ اس رسم کے وقت اُسکو اُس کوٹھری کی دہلیز پر کہ جس میں وہ ایک عرصہ سے بیٹھی ہے۔ بٹھایا جاتا ہے۔ پھر دلہن کو رات ہی میں سوا سنیں نہلاتی ہیں۔ جب نہلا چکتی ہیں تو گھونگھٹ کاڑھکر بغیر کسی کا منہ دکھائے ہوئے اسی کوٹھری میں اسکو لیجاکر بٹھادیتی ہیں۔ نوشہ کے گھر میں آجانے کے وقت تک اُسکو کسی کی صورت دیکھنے کا حکم نہیں ہوتا۔

ادہر نوشہ کے گھر برات کا جوڑا پہنچنے کے بعد نوشہ کو نہلانے کے لیے مع حجام اور چند قریب کے رشتہ داروں کے بلایا جاتا ہے۔ جب حجام نہلا چکتا ہے تو دلہن کے گھر کی آئی ہوئی لنگی اڑھاکر اُسکو ایک پلنگ پر سفید چادر بچھاکر بٹھاتے ہیں۔ سوا سنیں اُسی جگہ اُسکو جوڑا پہناتے ہیں۔ بہنوئی یا پھوپھا کے ذمے سہرابندی کی خدمت ہوتی ہے۔ جسکا صلہ نوشہ کا باپ بقدر اپنی حیثیت کے اُسکو دیتا ہے۔ جب نوشہ کی آراستگی ہو چکتی ہے تو اُسکو باہر محفل میں لاکر

بٹھا دیتے ہیں اگر دولھا کم سن ہوتا ہے تو اُسکو فرط محبت سے گود میں اٹھا کر گھر سے باہر لیجاتے ہیں۔ اُسوقت محفل میں جسقدر طوائفیں موجود ہوتی ہیں۔ وہ سب باہم ملکر نوشہ کا سہرا گاتی ہیں۔

قریب چار بجے صبح کے دلہن کے گھر برات جانے کی تیاری ہوتی ہے۔ نوشہ کے مُنہ پر محفل میں جانے سے پہلے ایک بہت نیچی مقیشؔ ڈالی جاتی ہے۔ جو نکاح کے وقت تک اُسکے مُنہ پر پڑی رہتی ہے۔ نوشہ کو گھوڑے پر سوار کیا جاتا ہے اور کل حاضرین مجلس معیت میں ہوتے ہیں۔ تاشے باجے اور آتشبازی بھی ہوتی ہے۔ طوائفوں کو ڈولی پالکی اور سواری میں علٰحدہ روانہ کردیا جاتا ہے۔ ایک خوان چھواروں کا جو عقد ہونے کے بعد تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ہوتا ہے۔ ایک خوان میں دلہن کے لیے پھولوں کا زیور اور بیڑے ہار وغیرہ جو شربت پلانے کے بعد مردوں اور عورتوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں ہوتے ہیں۔ مردوں کو محفل میں لیجا کر بٹھایا جاتا ہے۔ مگر نوشہ کے گھوڑے کو دلہن کے مکان کے دروازے پر کھڑا کرتے ہیں۔ اور دلہن کے نہانے کا پانی جو کہ ابتک محفوظ رکھا گیا تھا۔ گھوڑے کے نیچے ڈالا جاتا ہے اور اُبلے ہوئے چاولوں کی بنی ہوئی گیند سواسنیں آکر نوشہ اور اُسکے گھوڑے کو مارتی ہیں۔ بعض خاندانوں میں خاص دُلہن کے ہاتھ سے اس گیند کو پھکوایا جاتا ہے۔

اسکے بعد نوشہ کو اُتار کر مکان کے اندر لایا جاتا ہے اُسوقت اُسکے سر پر اُس کی بہن جو پہلے سے آجاتی ہے۔ اپنے سرخ دوپٹے کا آنچل ڈالے رہتی ہے جس چوکی پر دلہن کو نہلایا گیا تھا۔ اُسی پر نوشہ کو لاکر کھڑا کیا جاتا ہے۔ مراسن اسوقت حضرت کے گلے مبارک میں ایک کلاوہ ڈال کر ڈواتی ہے۔ یعنی ٹوٹنے گاتی ہے کہ دیکھیں کون اب آکر دولھا کو چھڑاتا ہے اسی حالت میں دلہن کی طرف کی عورتیں نوشہ کے کان کی لو میں سوہاگ لگاتی

ؔ عوام الناس کے محاورے میں مقیش مشہور ہے۔

ہیں۔ اور پس پشت ہینگ سلگا کر سنگھاتی ہیں۔ نوشہ کی سواسن مراسن کو کچھ دیکر کلاوہ علحدہ کراتی ہے۔ جب یہانسے اس طرح رہائی ہوئی تو نوشہ کو دلہن کی کوٹھری کے دروازے پر لایا جاتا ہی اور وہیں دلہن کو بھی لاکر بٹھایا جاتا ہی درمیان میں ایک سرخ رنگ کا دوپٹہ بطور پردہ روک کر دیتی ہیں۔ دلہن کے ہاتھوں پر شکر رکھی جاتی ہے۔ جس میں کہ تلی کے بیج بھی ملا دیے جاتے ہیں۔ ہاتھوں کو دوپٹہ سے باہر نکالکر نوشہ سے اس شکر کو چٹوایا جاتا ہے اور جو سہرا کہ نوشہ باندھے ہوتا ہی اُس کی ایک لڑی دلہن کو دکھاتی ہیں۔ وہ دیکھتی ہے۔ اور اُسی وقت سے وہ قید مرقومہ بالا دور ہو جاتی ہی اور اُسکو ہر چیز کی طرف نظر ڈالنے کا اختیار ہوتا ہی ان رسموں کے ختم ہونیکے بعد نوشہ محفل میں جاتا ہی یہاں کہ ناچ رنگ ہونے لگتا ہی۔

تھوڑی دیر کے بعد قاضی کو نکاح کے لیے بلاتے ہیں اور رقص و سرود بند کرا دیے جاتے ہیں۔ نوشہ کے مُنہ پر سے معجر اور سہرے اُٹھا دیتے ہیں۔ ہاتھ میں اگر کنگنا ہوتا ہی تو اُسکو علحدہ کر لیتے ہیں۔ اور جو پاجامہ خلاف شریعت کعبین سے نیچے تک ہوتا ہی تو اُسکو اوپر چڑہا دیتے ہیں۔ احکام شریعت مبین کے مطابق گواہ شاہد مقرر کرنے کے بعد خطبۂ نکاح قاضی پڑہتا ہی اور حسب دستور نکاح عمل میں آتا ہی۔ اسوقت نوشہ کے آگے ایک کٹورے میں شربت جس میں کہ دلہن کے پہننے کی نتھ پڑی ہوتی ہی رکھا ہوتا ہی یہ شربت انھیں تاسوں کا ہوتا ہی جو کھیلوں کے ساتھ نوشہ کے گھر سے آتے ہیں۔ آدہا شربت نوشہ پی لیتا ہی اور آدہا گھر میں دلہن کے پلانے کے لیے لایا جاتا ہی۔ نکاح کا دلہن سے اقبال کراتے ہیں مگر وہ اسکا کچھ جواب بوجہ شرم و حیا نہیں دیتی مگر الخاموشی نیم رضا پر عمل کر کے اُسکو شربت پلا دیا جاتا ہی اور نتھ اُس کی ناک میں پہنا دیجاتی ہی کیونکہ بغیر اسکے پہنائے ہوئے کوئی نکاح عورتوں کے قانون میں جایز تصور نہیں کیا جاتا ہی۔ نکاح ہو چکنے کے بعد مجلس میں چھوہارے یا شیرنی تقسیم کر دیجاتی ہے اور اعلان کے لیے تاشے بجوا دیے جاتے ہیں۔

تھوڑے عرصے کے بعد شربت پلانا شروع کیا جاتا ہی۔ مہمانوں کے گلے میں ہار ڈالے جاتے ہیں۔ اور عطر و پان سے اُن کی خاطر کی جاتی ہی۔ شربت پینے کے بعد ہر شخص بطور شربت پلائی طشت میں کچھ نقدی ڈالتا ہی۔ جسکا بار نوشہ والوں پر ہوتا ہی مگر وہ سب رقم جمع کرکے دلہن والوں کو دیدیتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں میں شربت ہو چکنے کے بعد کھانا کھلادیا جاتا ہی۔ سب سے پہلے ایک بہت آراستہ چوبہ نوشہ کے آگے رکھا جاتا ہے۔ علاوہ اقربا و اعزا کے مدعو کے شہر کے تمام فاقہ مست بیفکر جو ایسی دعوتوں کی فکر ہی میں لگے رہتے ہیں آکر جمع ہوجاتے ہیں۔ اور بیچارے غریب دلہن کے باپ یا وارث کی طبلی اُڑا دیتے ہیں۔ چندیں شکل برائے اکل کی ضرب المثل پوری پوری صحیح ہوتی ہی جب کھایا جا چکتا ہی تو ناچ رنگ کے شوقین مجلس میں بیٹھکر گانا سنتے ہیں۔ اور ادہر عورتوں میں مراسنیں اپنا راگ بلند کرتی ہیں

بیان جلوے اور آرسی مصحف کی رسم کا

قریب چار بجے شام کے نوشہ کو جلوے کے لیے گھر میں طلب کیا جاتا ہے۔ یہ اُسی طرح اپنی بہن کے دوپٹے کا آنچل سر پر ڈالے ہوے گھر میں جاتا ہی۔ دہاں زمین پر ایک سفید چادر بچھا کر اور پس پشت گاؤتکیہ لگا کر بٹھایا جاتا ہی اُس جگہ حضرت کے آگے ایک پتھر کا چکلہ اور بٹّا رکھدیا جاتا ہی۔ نوشہ کے سات سواسنیں اُسی سہاگ پوڑہ کو جو کہ ساچق میں نوشہ کی طرف سے گیا تھا کھولتی ہیں اور اسکے اندر کی چیزیں نکالکر چکلے پر رکھکر پسواتی ہیں وہ تبرکاً اپنے ہاتھ سے بٹّے کو ہلادیتا ہے اور وہی سواسنیں اُسکو پیس دیتی ہیں۔ اس لفظ کو عورتوں کی اصطلاح میں سروس پیسنا کہتے ہیں۔ ایک کٹورے میں شربت گھول کر اور سرخ نگینے کی انگوٹھی اُس میں ڈالکر مراسنیں اپنے سامنے رکھلیتی ہیں اور سروس پیسنے کے وقت نوشہ کی سالیاں اُس کی آنکھوں میں سرمہ لگاتی ہیں۔ اور جو اُبٹنا کہ دلہن کے ملا جا چکا ہی اُسکو یکجا جمع کرکے آٹھ چراغ اور شیر کی صورت جس میں کوڑیاں لگی ہوتی ہیں۔ بناتی ہیں چراغوں

کو روشن کرکے اور اس مورت کو چھاج میں رکھکر نوشہ کے سامنے لاتی ہیں۔ اور اُس سے
اُس تمثال کی طرف اشارہ کرکے کہواتی ہیں "کہ میں بھیڑ اور یہ شیر" نوشہ کی ماں اس چھاج
میں کچھ نقدی ڈالکر واپس کر دیتی ہی۔ اسکے بعد اُسی چوکی پر جسپر دلہن نہاتی ہی۔ نوشہ کو
بٹھاتی ہیں۔ اور اُس چوکی کے پاس وہی پلنگ جو جہیز میں دیا جاویگا۔ دلہن کے سواسی آکر سرہانہ
شمال کی جانب کرکے بچھاتے ہیں۔ اس پلنگ کو آراستہ کرنیکی خدمت دلہن کی بہن یا بھاوج
کے ذمے ہوتی ہی۔ بعض جگہ پلنگ بچھوائی بھی کچھ دیجاتی ہی۔ اس پلنگ پر لاکر دلہن کو بٹھاتی ہیں
اور نوشہ اور عروس کے بیچ میں ایک سرخ دوپٹہ بطور پردے کے حائل کر دیا جاتا ہی۔ نوشہ کو کھیلیں
اور بتاسے دیے جاتے ہیں۔ اور مراسن اُس سے ڈہائی لپیں طلب کرتی ہی وہ دیدیتا ہے۔ وہ
یہ لیکر پلنگ پر بیٹھنے کی اجازت نوشہ سے طلب کرتی ہی۔ اور بیٹھکر پھولوں کا زیور دُلہن کو
پہناتی ہی۔ اسکے بعد یہی مراسن سورۂ اخلاص پڑھ پڑھکر دولہ کی طرف کھیلیں تباسے پھینکتی ہی
اور نوشہ دلہن کی طرف پھینکتا ہے۔ اور بیچ کا پردہ اب الگ کر دیا جاتا ہی اور دولہ کو بھی پلنگ
پر بٹھایا جاتا ہے مگر اس طریقے سے کہ سرہانے کی طرف دلہن ہوتی ہی اور پائینتی کی طرف
نوشہ۔ دلہن کا رخ مشرق کی طرف اور دولہ کا منہ شمال کی جانب ہوتا ہی۔ مراسن دُلہن کے
دونوں شانوں پر اور دونوں کہنیوں پر بتاسے رکھتی ہے۔ اُنکو نوشہ اپنے منہ سے اُٹھاتا ہے
پھر مراسن دو بتاسے دلہن کے سر پر رکھتی ہے اور نوشہ سے کہواتی ہی کہ "ہاہا بیوی تباسا"
اگرچہ وہ بشرطیکہ نیا پھنس کر گھبرا نہ جائے یہ الفاظ نہیں کہتا ہی۔ مگر اُسکا اشارہ کرنا ہی کافی سمجھا جاتا ہے
اور بتاسے اُسکو دیدیے جاتے ہیں۔ دو بتاسے دلہن کی پاؤں کی اُنگلیوں پر نوشہ کے ہاتھ
کی اُنگلیوں سے تڑوائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ان تباسوں کو دلہن کے مختلف عضو ہاے
جسم پر رکھنے کو نو باتیں جتا عورتیں اپنے محاورے میں کہتی ہیں۔ اس رسم کے بعد نوشہ کی
کمر کا پٹکا کھولکر دلہن کے سر پر بطور پگڑی کے مراسن باندہ دیتی ہی۔ اور دلہن کے سر کو ہلاتی ہے
پھر اُتار کر دولہ کو دیدیتی ہے بعد ایک دو منٹ تک دُلہن کی پشت پر نوشہ کا ہاتھ رکھوائے رکھتی ہی

پھر آرسی مصحف کی رسم ہوتی ہے جو رضائی یا غلاف جہیز میں دیا جاتا ہے اُسکو نوشہ اور دلہن کے اوپر ڈال دیتی ہیں دونوں کے درمیان میں آئینہ اور قرآن مجید رکھدیا جاتا ہے اُسوقت نوشہ دلہن کے ہاتھ کی اُنگلی میں ایک سرخ رنگ کی انگوٹھی پہناتا اور مُنہ میں بیڑا دیتا ہے۔ تبرکاً سورۂ اخلاص بھی پڑھ لی جاتی ہے۔ پھر جو سب سے زیادہ آسودہ اور خوش قسمت سواسن ہوتی ہے وہ رضائی کے اندر نوشہ کو سب سے اول اپنا مُنہ دکھاتی ہے۔ اور رضائی الگ کرلیجاتی ہے نوشہ باہر چلا جاتا ہے اور دلہن کو پھر کوٹھری میں اُٹھا کر لیجایا جاتا ہے۔

ان سب کے بعد وداع کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ جہیز باہر نکالا جاتا ہے اور اُس کی ایک فہرست تیار کرکے نوشہ کے باپ کو دیجاتی ہے۔ جہیز کے پلنگ پر دلہن کا پُر تکلف دوپٹہ جو اُسکے برات کے جوڑے میں ساچق کے روز آتا ہے آرایش کے لیے ڈال دیتے ہیں۔ اسوقت دلہن کے پاس جاکر سب عورتیں اُس سے گلے ملکر روتی ہیں اور دلہن خود بھی چیخیں مار کر روتی ہے یہ ہو چکنے کے بعد نوشہ کو گھر میں پھر بلوایا جاتا ہے اور چوکی پر کھڑا کرکے دودھ پلایا جاتا ہے آدھا دودھ نوشہ پی لیتا ہے باقی کا آدھا بچا ہوا دلہن کو پلاتی ہیں۔ وہی نقدی روپیہ جو شربت پلائی دولہ والے دلہن والوں کو دیدیتے ہیں اسوقت دلہن والے کچھ اپنی طرف سے اور ملاکر نوشہ کے ہاتھ پر بطور سلامی رکھدیتے ہیں۔ دلہن کا بھائی ایک سہرا وداعی کا نوشہ کے سر پر باندھتا ہے اور نوشہ کے سلام کرنے پر ایک روپیہ یا کچھ زیادہ اُسکے ہاتھ پر رکھدیتا ہے پھر دلہن کے اور عزیز علیٰ قدر حیثیت کچھ نقدی نوشہ کو دیتے ہیں یہ سہرا اسقدر نیچا ہوتا ہے کہ پاؤں تک اُس کی لڑیاں پہنچ جاتی ہیں۔ اس رسم کے ختم ہونے پر نوشہ دلہن کو اپنی گود میں اُٹھاتا ہے۔ اگر وہ کسی وجہ سے معذور ہووے تو اُسکا کوئی عزیز قریب کے رشتے کا اُسکو اُٹھا کر پالکی میں لاکر بٹھا دیتا ہے۔ دلہن کے ہمراہ پالکی میں نوشہ کی بہنیں بھی بیٹھ جاتی ہیں جنکی تعداد دو سے لیکر چار تک ہوتی ہے۔ دلہن کے دوپٹے کے چاروں کونوں کو اس طرح باندھتے ہیں کہ ایک کونے میں پان کے بیڑے کی دوسرے میں ایک اکبرآبادی پیسے کی تیسرے میں

تھوڑے چاولوں کی اور چوتھے میں ہلدی کی ایک گرہ کی گانٹھ ہوتی ہے پالکی کے اوپر بطور صدقہ کسی قدر چاول کچھ گڑ اور تھوڑے پیسے رکھدیتے ہیں جسکے مستحق نوشہ کے گھر پالکی اُترنیکے وقت کہار ہوتے ہیں۔

جب یہ ساری رسوم پوری ہوچکتی ہیں تو نوشہ گھوڑے پر سوار ہوجاتا ہے تاشے باجے بجنے شروع ہوجاتے ہیں۔ جلوس اس ترتیب سے بازار میں ہوکر نکلتا ہے کہ اول تاشے باجے اور دیگر نمایش کی چیزیں پھر نوشہ اور اُسکے ہمراہی۔ اُسکے بعد دلہن کی پالکی۔ پھر جہیز کا پلنگ اور دوسری چیزیں متعلق جہیز کے ہوتی ہیں۔ سب سے اخیر میں کچھ دیگیں کھانے کی ہوتی ہیں جو کہ دلہن والے نوشہ کے مہمانوں کے شام کے کھانے کے لیے بھیجتے ہیں بازار میں سب لوگوں کو نوشہ برابر سلام کرتا ہوا جاتا ہے اور صدقہ بھی برابر جاری رہتا ہے۔ جب جلوس مکان پر پہنچتا ہے۔ تو تاشا باجا بند ہوجاتا ہے۔ اور پالکی لاکر نوشہ کے گھر کے دروازے پر رکھی جاتی ہے اسوقت نوشہ کا کوئی رشتہ دار دلہن کے پاؤں دودھ سے دہوتا ہے۔ اور پھر دولہ یا کوئی اور قریب کا رشتہ دار گود میں اُٹھاکر دلہن کو لاتا ہے۔ راستے میں دلہن کی نہن یعنی سواسن اپنا دوپٹہ روک کر کھڑی ہوجاتی ہے اور کہتی ہے کہ "جبتک میرا نیگ نہ ملے گا۔ اُسوقت تک میں دلہن کو اندر گھر میں نہ جانے دونگی"۔ جب نوشہ بقدر اپنی حیثیت کے اُسکو کچھ دیدیتا ہے۔ تب وہ اُسکو اندر جانے دیتی ہے۔ دلہن کو اُسی جہیز کے پلنگ پر لیجاکر بٹھا دیا جاتا ہے۔ اس عرصے میں کل سمدھنیں دلہن کے گھر سے واپس آجاتی ہیں۔

جب سونے کا وقت قریب ہوتا ہے تو نوشہ اور عروس کو کھیر کھلائی جاتی ہے۔ جو کہ خاص نوشہ ہی کے گھر میں پکتی ہے دولہ اور دلہن آمنے سامنے بٹھائے جاتے ہیں۔ سات مرتبہ نوشہ اپنے ہاتھ سے دلہن کو کھلاتا ہے اور اسی طرح سات مرتبہ دلہن کی ہتیلی پر کھیر رکھکر دولہ کو چٹوائی جاتی ہے۔

بیانِ سوم متعلق چوتھی وچالا وغیرہ

دوسری صبح کو دلہن کے بھائی یعنی سواسی اپنی بہن کے لیے کچھ مالیدہ شیرنی اور پھولوں کا زیور لیکر اپنے بہنوئی کے گھر آتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک سفید چادر بچھا کر دولہ دلہن کو پھر آمنے سامنے بٹھاتے ہیں۔ جب دلہن کو پھولوں کا زیور پہنایا جا چکتا ہی تو نوشہ اپنے ہاتھ سے مالیدے کے سات لقمے کھلاتا ہی اسی طرح سات لقمے دلہن کے ہاتھ پر رکھکر نوشہ کو کھلائے جاتے ہیں۔ پھر ایسے ہی بعض جگہ علاوہ مالیدے کے ٹلوا بھی کھلایا جاتا ہے۔ اس رسم کے ہو چکنے کے بعد نوشہ کھڑا ہوجاتا ہی اور دلہن کو اُسکے بھائی اپنے ہمراہ لیجاتے ہیں۔ اس سے قبل اُسی روز نوشہ کے باپ یا اور قریب کے رشتہ داروں کی طرف سے دلہن کے مُنہ دیکھنے یا اس نام سے موسوم کرکے دلہن کو نقدی یا زیور دیدیا جاتا ہی۔ جو جلیبیاں کہ دلہن کے بھائی اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ اُنکو ایک سوسے کے رومال میں باندھکر دیدیتی ہیں۔ شام کے وقت نوشہ کو چوتھی کی رسم ادا کرنے کے لیے بُلایا جاتا ہی اس رسم پر بعض غریب صرف نوشہ ہی کو بلا لیتے ہیں جسکے ہمراہ ایک سواسن اور دو تین گھر کے لڑکوں کا ہونا ضروری ہی۔ شیرنی پھولوں کے زیور اور فصل کی ترکاریوں خصوصاً لکڑیوں اور بیگنوں کے علاوہ پھولوں کی بنی ہوئی چار گیندیں اور چار چھڑیاں بھی نوشہ اسپنے ہمراہ لیجاتا ہی بعد نماز مغرب زمین پر نوشہ اور دلہن دونوں کو مقابل میں بٹھا کر اول دلہن کو پھولوں کا زیور پہنایا جاتا ہے اُسکے بعد ایک طباق میں کھیر لگا کر جسکو سنکو کہتے ہیں دونوں کے درمیان میں رکھی جاتی ہے اول نوشہ اسپنے ہاتھ سے مقررہ قاعدے کے موافق دلہن کو سات لقمے اس کھیر کے کھلاتا ہی۔ پھر دلہن کی ہتیلی پر رکھکر نوشہ کو بھی سات مرتبہ دلہن کے ہاتھ کی ہتیلی پر سے کھیر چٹوائی جاتی ہی جو کچھ کہ بچ رہتی ہی وہ اُسی جگہ سے سواسیوں اور سواسنوں کو تقسیم کردیجاتی ہی۔ جب طباق خالی ہوجاتا ہی۔ تو دونوں

دولہ اور دلہن کے ہاتھ اُسی طباق میں دہلائے جاتے ہیں پھر چار کچے پیسے یعنی اکبرآبادی پیسے کچھ پان اور وہ کل چیزیں جو دلہن کے دوپٹے کے کونوں میں وداع کے وقت اُسکے گھر سے باندھ دی گئی تھیں۔ اس طباق میں کھول کر ڈالدی جاتی ہیں۔ اگر ہاتھوں میں کنگنا بندھا ہوتا ہے تو اُسکو بھی اس طباق میں کھول کر ڈالدیتی ہیں۔ ان سب چیزوں کے دو برابر حصّے کیے جاتے ہیں۔ آدھا دلہن کے دونوں ملے ہوے ہاتھوں پر رکھتے ہیں اور دوسرا آدھا نوشہ کے ہاتھوں پر۔ تھوڑی دیر ہاتھوں پر رکھنے کے بعد دونوں پھر اُسی طباق میں ان چیزوں کو ڈال دیتے ہیں۔ جس میں کہ پھر انکو ملا کر آدھا آدھا کر کے موجودہ عورات اُن دونوں کے ہاتھوں پر رکھدیتی ہیں۔ وہ ان چیزوں کو پھر طباق میں ڈالدیتے ہیں۔ غرضکہ سات مرتبہ یہی عمل کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد طباق کو درمیان سے اُٹھا لیا جاتا ہے۔ پھر ترکاری لائی جاتی ہے سات قسم کی ترکاری نوشہ کے آگے اور سات قسم کی دلہن کے آگے رکھی جاتی ہے۔ نوشہ اور دلہن دونوں کے ہاتھوں میں پھولوں کی چھڑیاں دیدی جاتی ہیں۔ نوشہ اپنے ہاتھ سے دلہن کے دونو شانوں کو اس چھڑی سے چھوتا ہے۔ اور دلہن کی سوہاسنیں اسکی طرف سے نوشہ کو اُسی کے ہاتھ سے چھوا دیتی ہیں۔ جب دونوں آپس میں ان چھڑیوں اور ترکاریوں سے کھیل چکتے ہیں تو پھر سوہاسنیں آپس میں خوب چوتھی کھیلتی ہیں اسکے بعد نوشہ اپنے ہاتھ سے دلہن کے سر کی چوٹی کھول دیتا ہے اور سوہاسنیں اُسکو اُٹھا کر اندر آراستہ کرنیکے لیے لیجاتی ہیں اسکے بعد نوشہ اور مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ جب کھانے سے فارغ ہو چکتے ہیں تو سب مع دلہن کے گھر واپس آجاتے ہیں۔ نوشہ کے ہمراہ دلہن کے گھر سے پھیکے پکے ہوے چاولوں کا چوبہ اور دلہن کے ساتھ گڑ چانول۔ کچھ نقدی اور ایک نہایت نفیس پہننے کا جوڑا بھیجا جاتا ہے۔ پس اس طرح چوتھی کی رسم بھی ختم ہوجاتی ہے۔

اسکے بعد چالے شروع ہوتے ہیں۔ دو چار اور آٹھ روز کا ایک چالا متصوّر ہوتا ہے

تعداد چالوں کی کُل چار ہوتی ہے۔ ایک دو تو خود ہی ماں باپ اپنے گھر میں او اپنے خرچ سے کرتے ہیں اور دو تین قریب کے رشتہ دار کر دیتے ہیں۔ جنکو زیادہ مقدرت ہوتی ہو وہ مہمانداری کرتے ہیں۔ اور نہ صرف دولہ اور دلہن ہی کے بلا لینے پر اکتفا کرتے ہیں۔ نوشہ کچھ شیرینی اپنے ہمراہ لیجاتا ہے اور دلہن ہر چالے پر وہی سوئی کے رومال میں بندھی ہوئی جلیبیاں لیجاتی ہو جنکو کہ واپسی کے وقت پھر وہ ساتھ لے آتی ہو جب نوشہ اور اُسکے ہمراہیان کھانے وغیرہ سے فارغ ہو چکتے ہیں تو مع دلہن کے گھر واپس آجاتے ہیں واپسی کے وقت اُس کی طرف سے جس نے چالا کیا تھا۔ دولہ کو مٹھائی وغیرہ کا چوبہ اور دلہن کو ایک پہننے کے لیے جوڑا کچھ نقدی اور گڑ چاول دیے جاتے ہیں۔ اس اناج کو جس میں کہ اکثر چنے کی دال بھی شامل ہوتی ہو اور اُس نقدی کو جو دلہن کے میکے۔ یا میکے والوں کی طرف سے دلہن کی سُسرال میں آتی ہو۔ سیدا کہتے ہیں۔ یہ سیدا دلہن کے میکے سے چند سال تک ہر تیوہار پر ہمیشہ آتا رہتا ہو۔ عید کے سیدے میں بجائے چاول چنے کی دال یا آٹے کے زیادہ تر سوتوں کا رواج ہو اگر شوہر کے کنبے میں کسی جگہ یہ دلہن اول مرتبہ شادی یا غمی کسی رسم میں جاویگی تو اُس گھر والے پر یہ امر لازمی ہوگا کہ وہ اُسکے لیے جوڑا یا صرف دوپٹہ اور کسی قدر شیرینی کا چوبہ بنا کر ضرور بھیجے۔ اگر بیاہی ہوئی بیٹی کو میکے والے اپنے یہاں بلاوینگے۔ تو اُن کو بھی سیدا اور دوپٹہ دینا ضرور ہوگا۔

دلہن کے آنے جانے پر ایام و شہور کا لحاظ

شادی ہونے کے ایک برس کے بعد تک دلہن کے میکے اور سسرال میں آنے جانے کے لیے مہینوں اور دنوں کا بہت بڑا خیال کیا جاتا ہو۔ محرم۔ صفر (تیرہ تیزی) اور شعبان (میرانجی) کے آدھے آدھے مہینے دلہن کو اپنے میکے ہی میں یعنی ماں ہی کے گھر پر صرف کرنے ہوتے ہیں۔ اسی طرح محرم شبرات اور ہولی دیوالی وغیرہ تیوہار میکے ہی میں

کرنے ہوتے ہیں۔ رمضان شریف کے پورے مہینے میکے میں رہنا ضروریات سے ہے
اور اس عرصے میں نوشہ کو بھی بالا نحس سمجھا جاتا ہی دلہن کو عید الضحیٰ یعنی بقرعید کا تیوہار
آدھے روز اپنے گھر پر اور آدھے روز سسرال میں کرنا ہوتا ہی اسلیے وہ اُسدن دوپہر
کے وقت سسرال میں آجاتی ہی۔ دلہن کے لیے عورتوں کے قانون کے مطابق یہ
بھی ضروری ہی کہ وہ ماہ ربیع الثانی اور شوال کی رویت ہلال اپنی سسرال ہی میں کرے
اسلیے اسکو بالکل آخر رمضان اور آخر ربیع الاول ۲۷ یا ۲۸ تاریخ کو اپنی سسرال میں
آجانا ہوتا ہی۔ ان سب قواعد آمد و رفت کا لحاظ صرف ایک برس تک رہتا ہے پھر
کوئی روک ٹوک کسی قسم کی آنے جانے میں نہیں رہتی ہے۔ علاوہ ان قواعد آمد و رفت کے
کچھ عرصے تک نئی دلہن کے تکلفات اور قواعد نشست و برخاست بھی حد درجہ عجیب و
غریب ہوتے ہیں۔ جسوقت سے کہ وہ وداع کے روز اپنی سسرال کی زمین پر قدم رکھتی
ہی۔ اُسیوقت سے وہ ایک ایسا لمبا گھونگٹ کہ جسکی چونچ اُسکے پاؤں تک پہنچ جاتی ہے۔
کاڑھکر یعنی اوڑھکر ایسا سر نیچا کرکے بیٹھتی ہے کہ سر اور پاؤں میں شاید ایک بالشت کا فاصلہ
بھی مشکل سے رہتا ہو۔ برس دو برس تک ہر وقت اپنی سسرال والونکے سامنے یہ گھونگھٹ
کاڑھے رہنا ضروریات سے ہی۔ اگرچہ امتداد زمانے کے ساتھ اس کی لمبائی میں بھی فرق
آجاتا ہی۔ کھانے میں اسدرجہ تکلف ہوتا ہے کہ الاماں اپنے ہاتھ سے تو یہ غریب معصوم
دلہن بالکل کھانا جانتی ہی نہیں۔ دوسری عورتوں کو اس بیچاری کو کھلانا ہوتا ہی۔ پھر اُس میں
بھی یہ کیفیت ہوتی ہی کہ جب نوالہ مُنھ میں دیا جاتا ہی تو کبھی ناک میں جاتا ہی کبھی نتھ میں
اٹکتا ہی۔ کبھی آنکھوں اور گالوں اور ماتھے کو بگاڑتا ہی۔ غرضکہ عجیب دل لگی ہوتی ہی
بڑی دقتوں سے آخر خدا خدا کرکے ان بہو صاحب کے مُنہ میں دو تین لقمے کھانیکے
جاتے ہیں۔ کھانے پینے نہانے اور دوسری حاجات ضروریہ سے فراغت حاصل
کرنے میں اسدرجہ شرم کرنے اور اپنی جان پر ایسی سخت مصیبت اُٹھانے کی وجہ سے

اکثر یہ جاہل اور نادان عورتیں بیمار ہو کر مفت میں تکلیف اٹھاتی ہیں۔ ان بدنصیبوں کے لیے عرصے تک سسرال بالکل مثل قید خانے کے ہوتی ہے۔ اکثر خاندانوں میں ایک یہ رسم بھی جاری ہے کہ جب کبھی دلہن اپنے میکے سے سسرال کو آوے تو وہ اپنی ماں یا عزیزوں سے پہلے ملکر خوب رولیوے تب سواری یا ڈولی میں بیٹھے۔ ہر عورت کو اپنے شوہر سے دو تین سال تک عموماً کسی قسم کی بات اور لوگوں کے سامنے کرنا نہایت زبوں اور سخت بیحیائی میں داخل ہے اگر کوئی عورت ان قواعد پر عمل نہیں کرتی ہے تو وہ عورتوں کے نزدیک بہت بڑی بیحیا اور بے شرم سمجھی جاتی ہے۔

شادی کے متعلق جسقدر رسوم کا حال کہ مجکو اپنے ذاتی تجربہ اور تحقیق دقیق سے معلوم ہو سکا ہے اسکو قریب قریب میں نے اپنے نزدیک نہایت شرح و بسط سے لکھدیا ہے اور حتی المقدور کسی ضروری رسم کو فروگذاشت نہیں کیا ہے تاہم عورتوں کے غیر منضبط اور غیر محدود قوانین ہونیکی وجہ سے میں بالکل اس امر کا دعویٰ نہیں کر سکتا ہوں کہ یہ میرا مضمون پورا اور مکمل ہے اب بھی اسقدر رسمیات لکھنے سے رہگئی ہیں کہ جنکے لکھنے میں کئی اجزا سیاہ ہوجاتے مگر میںنے اُنکو غیر ضروری سمجھکر اور نیز طوالت کے خیال سے اس جگہ بیان نہیں کیا ہے مگر یہ خوب یاد رہے کہ جو لوگ مفلسی کی وجہ سے شادیوں میں فضول خرچی اور دہوم دہام نہیں کر سکتے ہیں وہ لوگ اگرچہ عقد شرعی کے نام سے اس ضروری کام کو سرانجام دے لیتے ہیں۔ مگر سوائے بازاری دہوم دہام زینت اور جلوس اور رقص و سرود و تاشے و باجے کے اُنکے گھروں میں ان رسوم پر پورا پورا عملدرآمد ہوتا ہے یہ رسوم قریب قریب اس شہر کے کل مسلمان خاندانوں میں علی العموم رائج ہیں اب بعض بعض تعلیم یافتہ اور متدین اشخاص انکے انسداد میں بہت کوشش کر رہے ہیں۔ اور میں یہ کہنے سے خوش ہوں کہ وہ اس ضروری کام میں کسی قدر کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

راقم ابوالقاسم محمد باسط علیخاں

از آگرہ

حضرت انسان

قدیم زمانے کی بہت سی انسانی نسلیں جنگلی برہنہ رہنے والی وحشی تھیں۔ جنکو نہ اُس دولت کا حال معلوم تھا جو اُنکے قدموں کے نیچے زمین میں چھپی پڑی تھیں اور نہ اُس ترقی علم و ہنر کی خبر تھی جو آیندہ زمانے میں اُن کی اولاد کے لیے جمع تھی۔

آدمی کا پہلا خیال اپنی جسمانی ضرورتوں کے لیے تھا اُسکی پہلی خواہش کھانیکے لیے خوراک گرمی کیواسطے آگ پناہ کے لیے کسی جگہ کی تھی۔ لیکن دیکھو پہلی ہی تدبیریں جو اُسکو اپنی بسراوقات کے واسطے کرنا پڑیں وہ حیوانات سے کسقدر الگ ہیں۔

حیوان جہاں پیدا ہوتا ہے تو قدرت اُسکے واسطے ویسی ہی پوشش دیتی ہے جو اُس مقام کے مناسب ہو جہاں وہ رہتا ہے مناسب خوراک اُسکے واسطے نزدیک ہی مہیا کر دیتی ہے لیکن دنیا میں انسان برہنہ پیدا کیا گیا ہے اور اپنے واسطے خوراک اور پوشاک کا جو اُسکے رہنے کے مقام کے مناسب ہوں متلاشی کر دیا گیا ہے اگر اُسکا چمڑا بالوں یا اون سے ویسا ہی گھنا ہوتا جیسا لنگوروں یا بھیڑوں کا ہوتا ہے تو وہ آرام سے ایک آب و ہوا سے دوسری آب و ہوا میں نہ جا سکتا۔ پس وہ برہنہ بنایا گیا۔ مگر وہ جہاں چاہے رہے۔ چیزوں کی نسبت دلیل کرنے اور اپنی حالت سنبھالنے کی قوت رکھتا ہے حیوان (مطلق) ویسا ہی رہتا ہے جیسا کہ وہ ہمیشہ سے تھا۔ مگر انسان کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا بلکہ جو کچھ اُسکے بزرگوں نے اس سے پہلے کیا ہے اُس سے فائدہ اُٹھاتا اور اسپر ترقیاں کرتا ہے۔ انسان عقاب کی ایسی تیز نگاہ نہیں رکھتا مگر وہ ایسے آلات بنانیکی قوت رکھتا ہے جنسے ایسے ستارے نظر آتے ہیں جنکی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں ہزار برس کا زمانہ گذر گیا ہے۔ اور جو اُسپر یہ بھی ظاہر کر دیتے ہیں کہ آفتاب اور دیگر ستاروں میں کون کونسی دھاتیں ہیں۔ انسان میں ہرن کی ایسی تیز رفتاری نہیں ہے مگر اُس میں دخانی کلوں کے بنانے بحری اور بری مسافت طے کرنیکی قدرت ہے

انسان میں گھوڑے کا ایسا زور نہیں ہی مگر اُسنے کلوں کو جنسے ہزاروں گھوڑوں کا کام نکلتا ہے
بنانا سیکھا ہے۔

انسان میں جتنی جسمانی یا دماغی قوت ہی وہ استعمال سے ترقی کرتی اور خراب استعمال سے
برباد ہو جاتی ہے وحشی جسے تلاش معاش میں برابر جسمانی قوت کو کام میں لانا پڑتا ہی بمقابلہ
شایستہ لوگوں کے مہارت کے باعث تیزرو اور خود بیں ہو جاتا ہی۔ برخلاف اسکے شائستہ
آدمی اپنی دماغی قوتوں کو زیادہ کام میں لاتے ہیں اور تحصیل علم اور اپنے علم سے فائدہ اُٹھانے
میں وحشیوں سے بڑہجاتا ہے۔

انسان کے زمین پر رہنے سے بہت عرصہ پہلے میٹھے پانی کے چشمے پہاڑوں کے
دامن میں گھاٹیوں اور دریا کے آبدانوں کے ساتھ ساتھ جو اُنھوں نے اپنی کوشش سے
بنائے تھے بہا کرتے تھے اور انسان کے زمین پر آنیکے بعد بھی ویسے ہی جاری تھے نہ کبھی
دم لیتے تھے اور نہ خشک ہوتے تھے پس اُسکو اپنی پیاس بجھانیکے ذریعے تلاش کرنے میں زیادہ
دقت نہ پڑی اور اپنے رہنے کے لیے جگہ پسند کرنے میں وہ بیشک ایسی جگہ رہتا تھا جہاں چشموں
اور سوتوں تک اُسکی رسائی ہو سکی۔

مگر جس کھانے کی اُسے ضرورت تھی وہ ایسی آسانی سے نہ ملتا تھا۔ پہلی چیزیں جنپر وہ
بسر کرتا تھا جنگلی میوے اور بیر تھے اور اُس کی پہلی قیامگاہ کسی دور تک پھیلے ہوئے درخت
کا سایہ تھا یا کسی لٹکی ہوئی چٹان یا کسی تہ زمین کے غار کی پناہ مچھلیوں کو جو اُسکے پیچھے دریا
میں بہتی تھیں اور ہرنوں کو جو اُسکی پشت پر گنجان جنگلوں میں کودتے پھرتے تھے کھانے کی
خواہش اُسے ہوتی ہوگی مگر یہ اُن کو مارنے والے ہتیاروں کے بغیر نہ مل سکتے تھے یہ
کب ممکن تھا کہ ہمیشہ کے لیے اُسکو یہی خواہش رہتی اور وہ آلات اور ہتیار نکالنے کے ذریعوں
کے لیے کوشش نہ کرتا۔

پس سب سے پہلی چیز جسکی ضرورت انسان کو تھی کوئی تیز دہار کا آلہ تھا اور اس قسم کا آلہ

ضرور بیکار ہوتا جب وہ اس چیز سے زیادہ سخت نہوتا جسے اُن کو کاٹنا یا قتل کرنا تھا۔ پہلے پہل وہ دہاتوں کی بابت کچھ نہ جانتا تھا گو کہ اُن میں سے چند اگرچہ وہ بہت زیادہ سخت نہ تھے سطح زمین کے قریب اُسکے پیروں سے نزدیک موجود تھے پس اُسکا پہلا خیال پتھر کے آلات بنانے کا ہوا۔

اُس قدیم زمانے کا نام "سنگی زمانہ" رکھا گیا ہے جب پتھر اور دیگر ایسی ہی اشیا مثل ہڈی، لکڑی اور سینگ سے مختلف قسم کے ہتیار بنائے جاتے تھے چقماق پتھر کا استعمال بہت ہوتا تھا کیونکہ ایک ہی سخت ضرب سے چاقو کے پھل کی مانند تیز تیز اُس سے علیحدہ ہو سکتے تھے دوسری قسموں کے چقماق میں اُنکو ایک قسم کے گول پتھر و سنگریزہ پر گھسکر ایک دہار نکالی جاتی تھی یا اُس سے ایک بھدی قسم کی موگریاں بنائی جاتی تھیں۔ اس قسم کے پتھر اور چقماق کے نمونے قدیم زمانے کے ہر انسان کی قبر یا اُسکے رہنے کے غار میں پائے جاتے ہیں وہ ہندوستان میں دریاے دمودر۔ اور سون کے اندر ملے ہیں اور اُس ملک کی چند وحشی اقوام نے اُن کا استعمال حال ہی میں ترک کیا ہے ان پتھروں میں سے اکثر شکل میں بادام کی طرح ہیں جنکے ہر طرف کاٹنے والی تیز دہار ہے اُنکے انداز مختلف ہیں چند اُن میں سے چھ انچ لمبے اور تین انچ چوڑے ہیں اور دیگر اُنسے بہت بڑے ہیں۔ سب سے پرانے پتھر کے اوزار جو نہ تو سان رکھنے سے تیز ہوئے نہ صیقل سے جنپر جلا ہوئی۔ خاصکر اُن مقامات پر دستیاب ہوئے ہیں جو ڈرفٹ کے نام سے مشہور ہیں یعنی وہ کنکر مٹی پتھروں کے نیچے جو دریا اپنے ساتھ بہا لائے تھے دبے ہوئے ملے ہیں۔

مگر رفتہ رفتہ آدمی نے پتھر سے آلات کو اچھی صورت کا بنانا سیکھا یہانتک کہ عمدہ ساخت کی برچھی کے پھل۔ خنجر۔ تیر ہتوڑے اور دیگر آلات تیار ہونے لگے اور حال ہی کے زمانے میں اُسنے اُنپر جلا کرنیکا ہنر سیکھا۔ پس یاد رکھو کہ پہلے جسے "سنگی زمانہ" کہتے ہیں انسان نے صرف پتھروں کا گھسنا سیکھا تھا اور بعد ازاں اُس زمانے میں جسے "نیا سنگی زمانہ" کہتے ہیں

اُسنے اُن پر سان رکھنا اور صیقل کرنا سیکھا۔ خوبصورت آلات اور اوزار خاصکر اُن غاروں میں ملے ہیں جو دنیا میں کسی جانور کی سکونت سے پہلے پانی نے بنائے تھے۔ آدمی ان غاروں کو صرف سکونت ہی کے واسطے کام میں نہیں لاتے تھے بلکہ مُردوں کو بھی اُن میں دفن کرتے تھے اور مختلف یادگاروں سے جو اُنکے نزدیک ملی ہیں یہ خیال کیا جاتا ہی کہ دفن کرتے وقت دعوتیں ہوتی تھیں اور کھانا اور ہتیار اور زیورات بھی مُردے کے ساتھ دفن کردیے جاتے تھے کیونکہ اُنکے دوستوں کو یہ معلوم تھا کہ اُنھیں ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ دوسری دنیا کے بڑے سفر کو جاتے ہیں۔

یہ آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہی کہ یہ ہتیار انسانوں کو اُن جانوروں کے حملے سے بچنے کے لیے جن میں وہ رہتا تھا کسقدر مفید تھے کیونکہ اُنسے وہ صرف اپنے اور اپنے خاندان کو بچا بھی نہیں سکتا تھا بلکہ اُن قوی الجثہ اور عجیب الخلقت جانوروں کو جو اب نابود ہیں مگر اُس زمانے میں زمین پر بکثرت پائے جاتے تھے قتل کرسکتا اور اس طرح اپنے متعلقین کیواسطے خوراک جمع کرتا تھا یہ امر یقینی ہی کہ وہ جانوروں کو مارتا اور کھاتا اور اُنکے چمڑے پہنتا اور اُنکے جبڑوں کی ہڈیوں سے مضبوط ہتیار بنا لیتا تھا۔

یہ خیال کرنا حیرت انگیز ہے کہ پہلے زمانے کے آدمی ان پتھروں سے جو وہ بھدی طرح بنا لیتے تھے کیا کیا کام لے سکتے تھے ان آلات سے وہ درخت کاٹتے تھے اور شاید آگ کی مدد سے انہیں کھوکھل کرکے ڈونگیاں بناتے تھے کیونکہ سب سے جاہل وحشی بھی فوراً جان سکتا تھا کہ لکڑی پانی پر تیرتی ہی اور ایک ہی تنہ سے بنی ہوئی ڈونگیاں آج کے دن تک ہندوستان کے بعض حصوں میں عام طور سے پائی جاتی ہیں۔ اب وہ لوہے کے اوزاروں سے بنائے جاتے ہیں مگر گو کہ اوزار بدل گئے ہیں نمونہ اُنھیں ڈونگیوں کی طرح ہی جیسا کہ قدیم زمانے کے آدمی پتھر کے اوزاروں سے بناتے تھے۔ اس طرح کے اوزار سے قدیم زمانے کے آدمی اپنے شکار کو مارتے اور اُسکو کاٹتے تھے۔ گودا چوسنے کی ہڈیاں

توڑتے تھے سمندر کی سیپیاں اُن میں سے مچھلیاں نکالنے کو توڑتے تھے سوائے اسکے اور بہت سے کام نکالتے تھے جو ہمارے واسطے ایسے کند اور بھدے اوزاروں سے نکالنا غیر ممکن ہی۔ اُن میں ویسا ہی ہنر اپنے پتھروں کے اوزاروں کے استعمال کا تھا جیسا کہ ہم میں اپنے لوہے کے اوزاروں کے استعمال کرنیکا ہی۔

انسان پہلے ہی کیسا ہی اُجڈ اور جاہل ہو مگر وہ بے عقل کبھی نہ تھا وہ ہمیشہ اُس قوت کو جسے ہم عقل یا حس مشترک کہتے ہیں تیزی سے استعمال کرتا تھا اور اس حس نے اُسے بتا دیا کہ دو لکڑی کے ٹکڑوں کو آپس میں رگڑنے سے آگ مل سکتی ہی۔ علاوہ بریں اپنے چقماق کے اوزاروں کو رگڑتے وقت اُنھوں نے چنگاریاں اُڑتے دیکھی ہونگی جس سے اُن کو یہ ثابت ہو گیا کہ آگ ایک چیز کو دوسرے پر رگڑنے سے نکل سکتی ہی۔ جب اُنکو جاڑا معلوم ہوتا تھا تو وہ اپنے ہاتھ ملتے تھے اور اُنھیں گرمی معلوم ہوتی تھی پس اُنھوں نے تجربہ کیا کہ ایک لکڑی کے ٹکڑے کو دوسرے لکڑی کے ٹکڑے پر رگڑنے سے کیا نتیجہ نکلتا ہی اور پہلے اُن کو یہ معلوم ہوا کہ ہر ایک گرم ہو جاتا ہے اور پھر یہ کہ شعلے نکلنے لگتے ہیں۔

پہلے انسان کچا گوشت کھاتے تھے جیسا کہ چند شمالی اقوام اب بھی کرتی ہیں مگر رفتہ رفتہ اُنھوں نے اُسے پکانا سیکھا صرف گوشت کو آگ پر رکھکر پکا لیتے تھے بعد ازاں اُنھوں نے ایک سوراخ کھودا اور ذبح کیے ہوے جانوروں کی کھال سے اُسے منڈھا اُس میں پانی بھرا اور گوشت رکھا اور چند پتھر آگ کی طرح سرخ کیے جنکو وے متواتر برتن میں ڈالتے رہے جبتک پانی اتنا گرم ہو گیا کہ گوشت پک جائے۔

رفتہ رفتہ اس سے بھی اچھا طریقہ دریافت ہوا کہ ٹوکریوں میں کھانا بھر کر انگاروں پر رکھکر پکا لیا جاوے۔ مگر ان پر پیشتر باہر کی جانب مٹی لگا لیتے تھے تا کہ اُن میں آگ نہ لگے۔

یہ دیکھکر کہ جلنے سے مٹی کتنی سخت ہو جاتی ہی آدمیوں نے خود مٹی کا استعمال اور اُس سے بھدے برتن بنانا سیکھا جو پہلے دہوپ میں خشک کیے جاتے تھے اور پھر آگ میں جلائے جاتے

اور سخت کیے جاتے تھے برتن بنانیکی اصلیت یہ تھی جس سے آخر کار انسانوں نے خوبصورت مٹی کے برتن بنانے کا ہنر دریافت کیا اور اُسکو کام میں لائے۔ اس طرح برتن بنانیکا ہنر ٹکا نیکے ہنر سے پیدا ہوا ایک ایجاد دوسری سے اسی طرح ہوتی رہی جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ انسان گو کہ وہ شروع میں کیسا ہی اُجڈ و جاہل ہو مگر جانوروں کی طرح ایک ہی حالت پر قائم نہیں ہی وہ ایک درجے سے دوسرے درجے پر ترقی کرتا ہی اور میزان ہستی میں اونچا ہوجاتا ہی اور اس تجربے سے فائدہ اُٹھاتا ہی جو اُسکے آبا و اجداد سے ورثہ میں ملا ہی۔

جنگلی اور خانہ بدوش وحشی کی حالت سے جو جڑیں چباتا یا کسی چٹان یا درخت کے پیچھے اپنے شکار پر جھپٹنے کے لیے کھڑا رہتا تھا جسے ہر صبح کو یہ بھی یقین نہوتا تھا کہ پیٹ بھر کھانا ملنے کے قبل ہی رات ہوجائیگی یا نہیں انسان رفتہ رفتہ ترقی کر کے ایک گڈریہ یا کاشتکار بنگیا اس عرصے میں صرف اُسنے اُس زمین کی جسپر وہ رہتا تھا وسعت ہی نہیں دریافت کرلی تھی بلکہ اُسکو کسیقدر اپنی بزرگی جنگل کے جانوروں اور ہوائی چڑیوں پر معلوم ہونے لگی تھی۔

چند فرقوں نے زمین کے مختلف حصوں میں یہ دریافت کر کے کہ بعض جانور گوشت اور دودھ جو اُنکی خوراک کے لیے ملتا ہی اور چمڑے کیواسطے خاصکر بچوں کے چمڑے کے لیے جس سے ملایم کپڑے بن سکتے ہیں کیسے مفید ہیں۔ ان جانورونکو پالنا اور جمع کرنا شروع کردیا اور اُن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جہاں گھاس بکثرت اور عمدہ ملسکتی تھی لیجانے لگے یہ آدمی پہلے چرواہے یا گلہ بان تھے جو خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے اور خیموں میں رہتے تھے جو آسانی سے اُتارے اور پھر ایستادہ کیے جاسکتے تھے۔

چند فرقوں نے گلہ بانوں کی زندگی بسر کی مگر دیگر فرقوں نے آباد ہونا پسند کیا قدیم کاشتکار جنگلوں کو جلا دیتے تھے اور اُسی زمین کو جو اس طرح صاف ہوجاتی تھی کاشت کرتے تھے مگر وہ اُس زمین پر چند ہی برس رہتے تھے جسکے بعد یہ معلوم کر کے کہ اُس زمین کی زرخیزی کم ہوگئی ہے وہ آگے بڑھجاتے تھے اور جنگل کا نیا قطعہ صاف کرلیتے تھے۔

زمین کو بخوبی جوتنے کے لیے پُرانے زمانے کے پتھر کے ہتیار کافی نہ تھے اور پتھر کے آلات کی جگہ عمدہ اور مضبوط دہاتوں سے بنے ہوئے آلات کی اب ضرورت تھی علاوہ بریں چونکہ آدمی ایک ہی جگہ رہتے تھے وہ سنگی زمانہ کے آدمیوں کی طرح جھونپڑوں پر یا مثل خانہ بدوشوں کے خیموں پر قانع نہ تھے بلکہ اُن کی خواہش اپنے مکانات کو خوشنما اور اصطبل اور مویشی اور غلہ جمع کرنے کے لیے کھلیاں بنانیکی تھی اسی حالت میں کاشتکاروں نے خوشی سے اوروں کو جو اُن کے مکانات اور آلات بنا سکتے تھے کام میں لگایا۔ اس طرح پر یکے بعد دیگرے مختلف تاجر پیدا ہو گئے جسنے مختلف خاندانوں اور گھرانوں کو ایک دوسرے کی مدد و آسانی کیواسطے جمع کر دیا اس طرح گھروں گاؤں اور گاؤں سے قصبے اور قصبوں سے شہر بنگئے۔ تجارت کی پہلی صورت یہ تھی کہ ایک چیز کے بدلے میں دوسری چیز دیتے تھے اور یہ بدلے کے نام سے مشہور ہے پھر جتنی جتنی تبادلے کی رسم بڑھتی اور تجارت ترقی کرتی گئی چیزونکو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانا آسان سمجھا گیا خاصکر جب بعض اوقات انکی زیادہ ضرورت نہ ہوتی پھر رفتہ رفتہ آدمی تبادلے کے ایک مشترک وسیلے پر راضی ہوئے جسکے لیجانے میں آسانی ہوتی قیمت میں تغیر نہوتا اور جسے آسانی سے نقصان نہ پہنچتا پس جب اُنسے ہو سکا تو آدمیوں نے دہات کے ٹکڑے مقرر کیے اور پہلے کانسے کے سکّے بنائے اور پھر سونے چاندی کو استعمال میں لائے جو بہت کمیاب اور بدیں وجہ دیگر دہاتوں سے زیادہ قیمتی ہونیکی وجہسے سکہ بنانے کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔

محمد نبی خاں منشی فاضل

قدسیہ

ہماری کہانی ماہ اگست سے شروع ہوتی ہے۔ اسوقت موسم گو عین برسات کا ہی مگر آجکل نہ زمین پر سبزہ لہراتا ہی نہ آسمان پر بادل گرجتے ہیں۔ پرند بیچارے پانی پانی چلاتے پھرتے ہیں چرند اپنی خوراک کی تلاش میں ادہر اُدہر ناکام پھرتے نظر آتے ہیں۔ درخت بیچارے سال بھر سے

اپنی پرانی پوشاک کے عوض نئی سبز قبا پہننے کی اُمید باندھ رہے تھے وہ بھی اپنی اس ناامیدی کے غم میں سوکھ رہے ہیں۔ دریا۔ تالاب۔ جھیل وغیرہ جو خصوصاً اس موسم میں بالکل لبریز ہو جاتے تھے اور دیکھنے والے کے لیے ایک خاص دلچسپی پیدا کرتے تھے۔ افسوس کہ وہ بھی اب ایک بھیانک صورت بنائے مایوس سے معلوم ہوتے ہیں۔ کسان بیچارے سال بھر محنت کر کے اس موسم پر اپنی محنت کے پھل کا دار و مدار سمجھ رہے تھے مگر بارش کے نہ ہونے کی وجہ سے غریب مایوس ہو کر پریشان پھر رہے ہیں۔ جو کچھ غلہ کہ اپنے پاس تھا اُسے بونے کے کام میں لائے اور اب ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دعائیں مانگ رہے تھے مگر ظالم آسمان نے ان بیچاروں کی ایک نہ سُنی ہر شخص اسی فکر میں مبتلا تھا کہ اب وہ اپنی زندگی کیسے گزارے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو کیسے سنبھالے۔ بے زبان گائیں بھینسیں کیونکر زندہ رہیں کیونکہ ان بیچاروں کو زمین ہی نے پرورش کیا۔ بڑا کیا۔ کھلایا پلایا غرض زمین ہی پر اُن کی زندگی کا دارومدار ہے۔ ہر چیز پر اس غیر معمولی قہر سے مایوسی کا عالم چھایا ہوا ہے۔ گرمی شدت کی ہے اور پانی کا کہیں نام نہیں اچھے اچھے باغات ویران ہو رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پھل پھولدار پودے سوکھ سوکھ کر گر رہے ہیں۔ بوے ہوئے کھیت خشک پڑے ہیں مگر امید نے اب بھی ہر چیز کو سنبھال رکھا ہے۔ جہاں کبھی ذرا ابر کا ٹکڑا نظر آیا اور یہ بیچارے سب کے سب خوش ہو جاتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اب تمام دنیا اسی سے ہری بھری ہو جائیگی۔ جہاں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا ذرا سا جھونکا آگیا کہ بیچاری سوکھی سوکھی ٹہنیاں خوش ہو ہو کر جھومنے لگیں ۔۔ مگر تھوڑی دیر میں وہی ناامیدی اور مایوسی اُنھیں گھیر لیتی ہے اور پھر یہ سب ویسے ہی پژمردہ ہو جاتے ہیں بیچارے کسانوں کے دل سے کوئی پوچھے کہ اُنھوں نے کس اُمید پر دانہ بویا۔ باغبانوں سے کوئی پوچھے کہ اُنھوں نے چھوٹے بڑے پودوں کو کس خیال پر ایسی محنت اور مشقت سے پرورش کیا۔ زمینداروں کے دلوں سے کوئی پوچھے کہ وہ اپنی آمدنی کی امید پر کیسے کیسے محل باندھ رہے تھے مگر افسوس کہ آخر ش سب امیدیں خاک میں مل گئیں اور قحط سالی نے ان بیچاروں کو برباد کر دیا

جس جگہ کا واقعہ میں ناظرین کے پیش نظر کرتا ہوں وہ سومناتھ سے بیس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے گاؤں سے جنوب کی طرف تھوڑے ہی فاصلے پر ایک خوبصورت مگر پرانے وقت کی کوٹھی نظر آتی ہے۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ کوٹھی مرزا عارف بیگ کی ہے۔ مرزا عارف بیگ اسوقت کوئی اکیس یا بائیس سالہ نوجوان ہیں۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد یہ پوری جائداد کے مالک ہو گئے اور اسوقت یہ سب سے بڑے زمیندار ہیں۔ مالدار ہونیکے سوا عارف نہایت ہی خلیق مہذب اور تعلیم یافتہ جوان بھی تھا۔ چلیے ہم اپنے ناظرین کو اس کوٹھی کے اندر کی سیر کرالائیں اور دیکھیں کہ اسوقت اندر کیا ہو رہا ہے۔ اسوقت صبح کے کوئی آٹھ نو بجے ہیں باہر برآمدے میں گجرات کے رواج کے مطابق ایک بڑا سا پنگوڑا پیتل کی زنجیروں میں لٹک رہا ہے اسپر ایک تو ہمارا دوست عارف بیٹھا ہے اور دوسری ایک نہایت ہی حسین لڑکی جسکی عمر قریباً کوئی اٹھارہ سال کی ہوگی وہ ہے یہ عارف کی لائق بیوی قدسیہ ہے ان دونوں کے بیچ میں ایک چھوٹا سا گر موٹا سا خوبصورت بچہ اپنی ماں (قدسیہ) کی چوڑیوں سے کھیل رہا ہے قدسیہ کی گفتگو اور پاکیزہ خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی بڑی تعلیم یافتہ اور خلیق ہے۔ اسوقت کے اس سین سے بھی کسقدر خوشی کا اظہار ہو رہا ہے ایک دوسرے کو جان سے زیادہ چاہنے والے۔ اُمنگوں اور آرزوؤں سے بھرے ہوئے شوہر بیوی اپنی سچی محبت کے عزیز پھل کو لیے بیٹھے کچھ باتیں کر رہے ہیں ان تین ماں باپ اور بچے سے زیادہ خوش نصیب اور کون ہو سکتا ہے۔ اسوقت کوئی شخص یا کوئی چیز ایسی نہیں جو اُن کی اس خوشی اور مسرت میں آکر مخل ہو اور اس چین سے گزرنے والی گھڑی کو خراب کردے۔ مگر اس دنیا میں ایسا کون شخص ہوگا جو بغیر کسی مصیبت یا فکر میں مبتلا ہوئے خوشی سے زندگی بسر کرتا ہو۔ انسان اس دنیا میں کیوں آتا ہے محض اسی وجہ سے کہ اس صحرا نوردی کا مزا چکھے آفت و مصیبت میں گرفتار ہو رنج والم سہے اور کالیف و ناکامیوں کے ہاتھوں برباد ہو جائے۔ اسکے سوا کیا ہے۔ اگر ایک گھنٹہ خوشی کا ہے تو ہزاروں دن رنج و فکر میں کٹتے

ں۔ اگر ایک بات دل بڑھانے کی ہے تو ہزاروں باتیں دل دکھانے کی ہیں۔ مسرت
وشی۔ امید۔ آرزو اور تمنا کا نام ہی نام ہے نہ کبھی امید بر آتی ہے۔ نہ کبھی تمنائیں پوری ہوتی ہیں
رض انسان کی زندگی بس یہی ہے کہ

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بس اسی کو زندگی کہتے ہیں وہ لوگ بہت ہی خوش قسمت ہیں جنھیں بچاری موت ہاتھ
ہاکر اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور دنیوی جھگڑوں سے انھیں نجات دیتی ہے افسوس ہے
ن لوگوں پر جو اس دنیا کو راحت اور آرام کی جگہ سمجھتے ہیں اور یہاں رہنے کی خوشیاں مناتے ہیں
ور صد افسوس ہے اُن لوگوں پر جو اپنے آپ تو مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں اور اسیر جائیں
نگتے ہیں منتیں مانتے ہیں اور جانے کیا کیا کرتے ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ ایک فرزند بخشے تاکہ
س بیچارے کو بھی اس دنیا میں لائیں اور رنج و عذاب میں پھنسائیں۔

ہاں مگر ان میاں بی بی کے اسوقت بیٹھ کر باتیں کرنے سے تو خوشی ظاہر ہے مگر باتیں سننے
سے معلوم ہوتا ہے کہ فلک کی کجروی نے انھیں بھی نہ چھوڑا۔

عارف۔ شہر بھر میں اب کسی کے پاس کچھ نہ رہا ہمارے کسان اور مزدور سب بھوکے مر رہے
ں اب کیا کیا جائے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

قدسیہ۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ مگر غریبوں کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔ ہمیں اُنکی مدد
رنا لازمی ہے۔ میری رائے میں تو ہمارے پاس جو غلہ ہے اُس میں سے اُنھیں تھوڑا تھوڑا دیتے
ہنا چاہیے۔ تاکہ ان بیچاروں کی جانیں بچیں۔

عارف۔ ہاں مگر یہ کب تک دیے جاؤگی اور پھر ہم خود کیا کرینگے۔

قدسیہ۔ ہمارا اللہ ہے۔ ہم دو آدمی کی جانیں اتنی جانوں سے کسی طرح بڑھکر نہیں ہو سکتیں۔
اسنے میں باہر کچھ شور معلوم ہوا۔ عارف دوڑتا باہر گیا دیکھتا کیا ہے کہ شہر کے بہت سے

غریب آدمی جمع ہوئے ہیں اور رو رو کے کہہ رہے ہیں کہ ہماری بُری حالت ہو رہی ہے بارش کا نام نہیں کھیتی سوکھ رہی ہے۔ گائیں بھینسیں بھوکی مر رہی ہیں اور تھوڑے دنوں میں ہماری اور ہمارے بال بچوں کی بھی یہی حالت ہوگی۔ غرض اسی طرح سے بہت دیر تک اپنا دکھ روئے بیچارا عارف ان لوگوں کی ایسی حالت دیکھکر سخت رنجیدہ ہوا اور انھیں ہر طرح سے دلاسا دے دلاکر یہی کہتا تھا کہ جب تک میری جان میں جان ہے میں تمھیں ہر طرح سے سنبھالنے کی کوشش کرونگا یہ سُنکر غریب کسانوں کے حوصلے بڑھے اور وہ خوش ہو کر اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے مگر بیچارے انسان کو کب آرام ملسکتا ہے۔ تھوڑے دن ان بیچاروں نے اسی پریشانی سے گزارے اور پھر فاقہ کشی کی حالت پہنچگئی۔ اچھے اچھے جانور مر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے بے غذا اس قہر آلود دنیا سے کوچ کر رہے تھے۔ بڑے بڑے دلیر مرد فاقہ کی وجہ سے لاغر ہو چلے تھے۔ غرض شہر بھر میں کوئی ایسا نہ تھا جسکے گھر سے رونے پیٹنے کی آواز نہ آتی ہو۔ مالدار زمینداروں کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ وہ اپنے گھر بار کو چھوڑکر چھوٹے چھوٹے بچوں اور آرام و آسایش میں رہی ہوئی بیبیوں کو لیے ہوئے پیادہ پا سومناتھ کی طرف نکل چلے تاکہ وہاں چلکے مزدوری کرکے اپنا پیٹ بھریں۔ اس درمیان میں رحم دل عارف اور قدسیہ نے اپنے ہاں کا تمام غلہ اور روپیہ ان بیچارے غریبوں کو دے دلاکر صرف کر دیا تھا اور اب انکے پاس بھی کچھ تھوڑا ہی سا اناج رہگیا۔ تھوڑے دنوں بعد نوبت بہ اینجا رسید کہ انھیں اپنی جان بچانیکے لیے کل جائداد گائیں بھینسیں کوڑیوں کے دام بیچڈالنی پڑیں۔ اور فاقہ کشی کی نوبت پہنچی فاقہ کشی کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ آہ اے زمانہ تیرے بھی تبدلات آدمی کو عجب حیرت میں ڈالدیتے ہیں۔ کل تو مرزا عارف بیگ بھوکوں کو کھلاتے تھے ننگوں کو پہناتے تھے اور آج وہی بھوکے پیاسے پڑے ہیں۔ جو کپڑے بدن میں پہنے ہوئے تھے وہی اُنکے پاس ہیں۔ وہی اُنکی جائداد اور وہی اُن کی دولت۔ اسی پر چاہے امیر کہلائیں چاہے

فقیر اسی پر چاہے حکومت کریں چاہے گدائی۔ افسوس کہ جنہوں نے اپنی زندگی ہمیشہ عیش و آرام میں بسر کی تھی آج اُن کی یہ حالت ہے۔ جسکے دسترخوان پر کئی آدمی ہمیشہ موجود رہتے تھے آج وہ کسی اور کے دسترخوان کا محتاج ہے۔ آفت زدہ عارف کبھی تو اپنی کوٹھی کے در و دیوار دیکھتا تھا اور کبھی اپنی پیاری اور غمگسار بیوی اور بچے کو۔ کل ہی کوٹھی کسقدر اعلیٰ درجے کے قالینوں اور فرنیچر سے آراستہ تھی اور آج یہ تینوں ایک بورئیے کے ٹکڑے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

افسوس کہ جو شخص ہزاروں لوگوں کو اپنی دولت سے بھوکے مرتے بچاتا تھا آج وہ اُس کی پیاری بیوی اور ننھا سا بچہ بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔ آہ جس شخص کے نوکروں کی بیویاں زر و زیور میں لدی رہتی تھیں۔ آج اسی کی بیوی ایک پھٹی پُرانی ساڑی پہنے ہوئے ہے۔ جس بچے پر ہزاروں جانیں دن بھر میں قربان کی جایا کرتی تھیں۔ آج وہی بچہ بھوکا پڑا سو رہا ہے۔ افسوس بیچارہ بچہ اپنا ننھا سا انگوٹھا چوستے چوستے تھک گیا۔ اسے کیا معلوم کہ اسکے پیارے ماں باپ پر اسوقت کیا گزر رہی ہے۔ اسے کیا فکر ہے کہ آج یہ کہاں سو رہا ہے اور کل کہاں ہوگا۔ افسوس بیچارے اسقدر ننھے سے بچے کو ایسی بھوک پیاس کی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ بیچاری ماں کہاں تک اپنا دودھ پلایا کریگی۔ اُف اس معصوم کی بُری حالت ہے۔ بچہ تو اپنی بے خبر نیند میں پڑا سو رہا تھا۔ مگر بیچارے مصیبت زدہ ماں باپ جانے کیا سوچ رہے ہیں۔ جب بہت دیر اسی سکوت کی حالت میں گزری تو غریب قدسیہ نے نہایت ہی خندہ پیشانی سے اپنے پیارے شوہر کی طرف دیکھا اور اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اپنے خاوند کے رنج کو دور کرنے لگی۔

قدسیہ۔ ہم بھی کیا خوش نصیب ہیں کہ آج ہمیں موقع ملا کہ ہم اپنے پیدا کرنیوالے کی قدرت اور قدرت کے تماشوں کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ اس حالت میں رہنے سے ہمیں یہ بھی تجربہ حاصل ہوجائیگا کہ بیچارے غریب لوگ اپنی زندگی کیونکر بسر کرتے ہیں۔ ان

ان بیچارے غریبوں کو دیکھو کہ جو برسوں اپنی زندگی اسی حالت میں گزارتے ہیں نہ کھانیکو روٹی نہ رہنے کو گھر میسر آتا ہی ایک حالت میں رہنے سے ہمیں غربت اور مفلسی کی تمیز نہیں ہو سکتی۔ تھوڑے دن ایسے بھی گزارنے چاہیے۔

عارف۔ ایسی حالت میں ایسی باتیں سُنکر کچھ تعجب سا معلوم ہوتا ہی۔ میں تو سمجھا تھا کہ اور عورتوں کی طرح تم بھی دن رات رویا کروگی مگر نہیں اب مجھے معلوم ہوا کہ تم واقعی میرا ساتھ دوگی۔

قدسیہ۔ مگر فی الحال ہمیں ایک کام کرنا چاہیے وہ یہ کہ یہانسے نکلکر سومناتھ چلے چلیں۔ وہاں میرے کچھ عزیز بھی ہیں۔ انسے بھی ہمیں کچھ مدد ملیگی اور دوسرے تم بھی وہاں کوئی ملازمت اختیار کرلینا۔ انشاءاللہ تھوڑے دنوں میں ہماری حالت سدہر جائیگی اور پھر ہم خدا کے فضل سے اپنے گھر واپس چلے آئینگے اور ویسے ہی آسودہ اور خوش خرم رہنے لگیں گے۔

عارف۔ ہاں ہمیں یہانسے ضرور چلدینا چاہیے اور اسوقت کچھ نہ کچھ کام کرنا چاہیے تاکہ ہمیں کھانے کو روٹی اور پہننے کو کپڑا ملجائے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہم جائیں کس طرح۔ نہ تو ہمارے پاس کوئی گاڑی یا گھوڑا ہی نہ شہر میں کوئی اور زمیندار رہے جسکی گاڑی منگا کریں تمہیں بٹھا کرلے چلتا۔

قدسیہ۔ اُنہہ۔ یہانسے سومناتھ چلنا کیا بڑی بات ہے۔ گاڑی کی ضرورت ہی کیا ہی جب تم ساتھ ہو تو پھر پیدل چلے چلنا کیا دشوار ہے۔ ابھی سیر کرتے ہوئے چلے جائینگے ہاں اتنی اجازت تمہیں دینی ہوگی کہ پردہ ایسی حالت میں اچھی طرح سے ہو نہیں سکے گا۔

عارف۔ پردہ۔ تمہیں یہ معلوم ہی کہ تمسی عورتوں ہی کے لیے پردے کی بالکل ضرورت نہیں ہی۔ اور پھر اب ہماری حالت ہی کیا ہی۔ اب ہم وہ مرزا عارف نہیں رہے۔

ایک معمولی کسان یا مزدور کی حالت میں ہیں مگر تم بھوکی بہت ہو تم سے اُٹھا تک تو جاتا نہیں
تم اتنی سخت منزل کیسے طے کرو گی۔ یہ بالکل ناممکن بات معلوم ہوتی ہی کہ تم اتنی دور پیدل
چلو گی۔ قدسیہ تمھیں دیکھکر مجھے سخت رنج ہو رہا ہے۔ میری وجہ سے تمھیں یہ سب تکلیفیں
ہو رہی ہیں۔ اس تکلیف میں بھی تم میرا کس قدر ساتھ دے رہی ہو۔ مجھے رہ رہکر یہی خیال
ہوتا ہی تم بھوکی پیاسی ایسی سخت دہوپ میں دن بھر کیسے چلو گی۔ الہی جس بیچاری نے کبھی
گھر سے باہر قدم تک نہ رکھا تھا آج اُسے میلوں چلنا ہوگا۔ اُف اور ہمارا لخت جگر حفیظ (بچے کی طرف
جھک کر ایک بوسہ لیکر) بیٹا تمھیں بھی یہ مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ تم بھی ایسی کڑی دہوپ میں سفر
کرو گے۔ افسوس بھوک کے مارے بیچارے کی بُری حالت ہی۔ ٹھرو میں تمہارے لیے کچھ کھانیکی
چیزیں کہیں سے لاتا ہوں یہ کہکر بیچارہ عارف اُٹھ کر باہر گیا۔ (باقی آیندہ)

احمد

اڈیٹوریل

آثار زمانہ۔ زمانے کے آثار انسانی خیالات اور تمدنی و ملکی تغیرات سے پہچانے جاتے
ہیں۔ اور اصل تو یہ ہی کہ انھیں خیالات اور تغیرات کو آثار کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ زمانہ انسانی
تاریخ کی شاہراہ کو کہتے ہیں اور جیسے کہ ایک مسافر کو اپنے دوران سفر میں مختلف اقسام کی اشیا
جنگل پہاڑ دریا جھیل میدان شہر ویرانہ وغیرہ نظر آتے ہیں۔ اسی طور پر ایک تاریخ داں کی آنکھوں کے
سامنے سے انسانی حالات کے عجیب و غریب نظارے گذرتے رہتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ
مسلمان انگریزی تعلیم کو کفر سمجھتے تھے اور سرسید کو جو انگریزی تعلیم کے حامی تھے دشمن اسلام جانتے تھے
بعض لوگوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی یہی قرار دیدیا تھا کہ سرسید کی تکفیر و تردید میں رسالے اور
کتابیں لکھیں اور دنیا و آخرت کی سرخروئی حاصل کریں۔ تاریخ داں آدمی کی آنکھوں نے ایک وہ
نظارہ دیکھا تھا اور ایک نظارہ آج دیکھ رہی ہیں۔ انھیں بزرگوں کی اولاد جو سرسید کے مخالف تھے

اسی علی گڈھ کالج میں وہی تعلیم حاصل کرتے ہیں جس تعلیم کی حمایت نے سرسید کو لوگوں کی نگاہ میں کافر ٹھہرایا تھا۔ اسی طور پر سب سے اول لکھنؤ کی کانفرنس میں جب علی گڈھ میں زنانہ نارمل اسکول قائم کرنے کا مسئلہ سکرٹری صیغہ تعلیم نسواں نے پیش کرنا چاہا تو اکثر احباب دل سے ناخوش تھے کوئی کہتا تھا کہ اس مدرسے میں کوئی شریف آدمی اپنی لڑکیوں کو کیوں بھیجیگا۔ اور بعضوں کے نزدیک یہ مدرسہ کالج کے لیے باعث نفرت تھا۔ ہم نے نہایت خاموشی اور استقلال سے سب کے اعتراضات کا جواب مناسب طریقے سے دیا۔ تغیر خیالات کی امید میں کام کرنا شروع کر دیا۔ آج ہم نہایت خوشی سے اس بات کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے صرف مدرسہ ہی جاری کر کے نہیں دکھایا بلکہ ہماری امیدیں اس باب میں پوری ہو گئی ہیں کہ زمانے نے اپنا رنگ بالکل بدل دیا ہے۔ بیسیوں شریف آدمیوں کی درخواستیں ہمارے پاس موجود ہیں کہ ہماری لڑکیوں کو اپنے مدرسے میں بھرتی کر لو ہم نے تعجب انگیز خوشی کے ساتھ سُنا ہے کہ ہمارے ضلع کے حضرات شروانی پٹھانوں میں سے بھی بعض نے ارادہ کر لیا ہے کہ بورڈنگ ہوس کھلنے پر وہ اپنی صاحبزادیوں کو اس مدرسے میں بھرتی کرا دینگے۔ اب اگر ایسے شریف اور معزز لوگوں کے یہ خیالات ہیں تو ہمیں اپنی کوشش میں کامیابی کا پورا اطمینان ہے اور ہماری قوم کو ان خیالات کی ابتدا اپنے حق میں مبارک خیال کرنی چاہیئے

اپیل

ہمارے صیغہ کی پرجوش حامی اور سچی ہمدرد مسز علی اکبر صاحبہ نے انگریزی میں ایک پُر درد اپیل تعلیم نسواں کے متعلق ہمارے پاس بھیجی ہے۔ ہم اُسکو ترجمہ کر کے ناظرین خاتون کے سامنے پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ اسکی طرف متوجہ ہونگے۔ اڈیٹر۔

مسلمانوں نے اتنی تعلیم تو نہایت کامل طور پر حاصل کی ہے کہ وہ اس جملے کی صداقت سمجھتے ہیں کہ "قابل سر بلند رہتا ہے"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اب وہ وقت نہیں رہا کہ ہم اپنا وقت فضول گوئیوں میں ضائع کریں اور لوگوں کی ہمدردانہ عنایات کے بھروسے پڑے رہیں۔ ہندوستان

یں اپس کا مقابلہ دن بدن سخت ہوتا جاتا ہی اور چونکہ یہ بھی مانا گیا ہی کہ ہندو تعداد میں زیادہ ہونیکی وجہ سے مسلمانوں سے بہت زیادہ بڑھے ہوئے ہیں اور پھر وہ اپنی زندگی نہایت کم خرچی سے بسر کرتے ہیں اسلیے اہل اسلام کو اور بھی زیادہ ضروری ہی کہ وہ وقت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اور اپنے خواب غفلت سے جاگ اٹھیں۔ قوم کے سر برآوردہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ تعلیم دیں۔ مولویوں اور ملا نوں کو چاہیے کہ وہ وعظ کہیں نہیں بلکہ ہر سمجھ دار مرد اور عورت کو چاہیے کہ وہ اس کام کو اپنے ذمے لیلے۔ لوگوں کو تعلیم دے اور اپنے ہمقوم بھائیوں اور بہنوں کے ذہن نشین کرے کہ اسوقت اول ضرورت اس بات کی ہی کہ وہ سب ملکر ایک متفقہ حملہ کریں اور اس خیالی سدّ راہ کو جو مغربی تعلیم کے اور ہمارے راستے میں حائل ہی۔ گرادیں

مغربی تعلیم سے وہ تعلیم مراد ہے کہ جو آجکل ہماری ہستی کے قیام کے لیے اشد ضروری ہے علاوہ ازیں یہ قابل غور ہے کہ تعلیم کا منشا چند محرروں کا پیدا کرنا نہیں ہی بلکہ تعلیم ہر مرد عورت اور بچے کو اُس بام ترقی کی طرف جسپر وہ چڑھنا چاہتا ہے لیجاتی ہے۔ مسلمان اس بات پر فخر کرسکتے ہیں کہ ان میں بڑے بڑے بہادر اور مشہور عالم۔ ماہر۔ شاعر اور ادیب ہو گزرے ہیں مگر فی الحال جس کی انھیں ضرورت ہے وہ یہ ہی کہ اسوقت وہ زمانے کے ساتھ چلیں اور جب تک وہ یہ نکرینگے اُن کی نجات کی کوئی امید نہیں ہوسکتی۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے آپ کو اس میں فنا کردیں اور اسکو لازمی سمجھیں۔ اور ایک بار جب ہم اپنے منزل مقصود تک پُہنچ گئے تو پھر گورنمنٹ کی عنایات اور نیز اور طرف سے مہربانیاں ہم پر ابر رحمت کی طرح بن مانگے برسنے لگیں گی۔ لہذا ہر فرد بشر جو ہماری قوم کے ساتھ وابستہ ہی اُسکا یہ عین فرض ہے کہ وہ اس اُصول رستی کو سیکھے اور سکھلائے کہ اگر ہمنے تعلیم حاصل نہ کی تو باوجودیکہ گورنمنٹ ہم پر مہربان ہی ہم تباہ و برباد ہو جائینگے۔

جب ہمنے اس اُصول کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تو اسپر بھی خود بخود یقین ہو جائیگا کہ اگر مردوں کی تعلیم اسقدر ضروری ہی تو پھر تعلیم نسواں کچھ کم اہم نہیں معلوم ہوتا ہی کہ اس مسئلہ پر زیادہ غور

نہیں کیا جاتا مگر میری رائے میں تو یہی ذرا سی کاہلی ہماری قوم کا قطعی ناس کر دے گی اور زندگی
کی دوڑ میں ہم بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ یورپ کے تجربے سے یہ بات روز روشن کی طرح
سے ظاہر ہے کہ عورت کا اثر امور خانگی اور خصوصاً اپنے بال بچوں پر اور تمام اثرات پر غالب ہے اور
اگر وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہونے کی وجہ سے اعلیٰ خیال نہوگی اور معلومات عامہ سے بے خبر ہوگی
تو ظاہر ہے کہ وہ ضروریات وقت کو سمجھ نہ سکیگی اور اپنی اولاد کو اعلیٰ تربیت کا فائدہ نہ پہنچا سکیگی
ایک پڑھی لکھی اور تعلیم یافتہ ماں ضرور ہے کہ اپنی لڑکی یا لڑکے کے دل کو نیک اور شریفانہ خیالات
سے بھر دیگی اور اُسکا متواتر اثر اوائل عمر ہی میں بچے کے دل پر ایسا ہوگا کہ وہ اپنی آیندہ
زندگی میں دنیوی تکلیفات اور مشکلات کا مقابلہ کرنیکے لیے پوری طرح سے تیار ہو جائیگا۔
یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تعلیم یافتہ ماؤں کی ایسی پرورش ہوتی ہے کہ پھر واعظوں کی پند و نصائح کی
کوئی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ ایسی تربیت کا اثر جو بچوں کے دلوں پر ہوتا ہے وہ ان واعظوں کی نصیحتوں
سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔

ان واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مجالس کی جنکا اصلی مقصد تعلیم نسواں کی اشاعت
ہے مدد کرنا کس قدر ضروری ہے۔ مثال کے طور پر میں اس سکول کو پیش کرتی ہوں جو شیخ
عبداللہ صاحب نے جاری کیا ہے۔ اس سکول کے برقرار رکھنے کے لیے جو جو سختیاں پیش آئی ہیں
اور جو جو تکلیفیں اُٹھانی پڑیں اُنکا اندازہ اُنھیں لوگوں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے اسکے لیے کوشش
اور محنت کی اور جنھیں اس سے کوئی تعلق ہے۔ اُن باہمت لوگوں کا احسان ماننا چاہیے جنھوں نے
اُسے برباد نہ ہونے دیا۔ ان لوگوں کا تمام قوم پر احسان ہے کیونکہ اُنھوں نے وہ کام کیا ہے جو کم لوگ
کرینگے یعنی باوجود سرمایہ کم ہونے کے اُنھوں نے اپنی کشتی کو باوجود مخالف ہوا کے اس طوفان کے
بڑے بڑے گردابوں سے بچا کر صاف نکالا۔ کون ایسا مسلمان ہوگا جسکے دلمیں ذرا بھی قومی ہمدردی
ہو اور پھر وہ انکا احسانمند نہ ہو۔ خدا اُنکی کوششوں میں جو وہ ہماری قوم کے لیے کر رہے ہیں۔ ترقی
اور کامیابی عطا کرے۔ آمین

روسی عورت کی تقریر

روس کے رسالہ الوقت نے ایک روسی مسلمان عورت کی حسب ذیل تقریر چھاپی ہے۔ ہم عربی کے اخبار اللواء سے اسکا ترجمہ کرکے لکھتے ہیں۔

صاحبان۔ اس لفظ سے میں ان لوگوں کو عام طور پر جو میری قوم ہیں۔ اور اُن لوگوں کو خاص طور پر "جوڈیوما" (روس کی پارلیمنٹ) میں میرے اہل قوم میں سے بحیثیت ہمارے نائب ہونیکے شریک ہیں مخاطب کرتی ہوں۔ میں اپنی تمام بہنوں کی طرف سے آپ حضرات سے اپیل کرتی ہوں کہ اب ہماری اُس آزادی۔ اور اس جائز حقوق کی لگام کو جو بحیثیت مسلمان ہونیکے ہم رکھتے ہیں ہمارے ہاتھوں میں عنایت فرمائے۔ ہم نہیں جانتے کہ جہالت اور بد دماغی کا الزام کب تک ہمارے اوپر لگایا جائیگا۔ اب تک بھی اس الزام کے ہم مستحق ہیں یا نہیں لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اسلام۔ ہمارے روشن مذہب اسلام۔ ہمارے پاک مذہب اسلام نے جاہل۔ عالم۔ عقلمند اور بیوقوف۔ بد دماغ اور مدبر سب کے حقوق یکساں رکھے ہیں ان سب احمقانہ صفات رکھنے کے بعد بھی ہم کو ہمارے جائز حقوق لینے کا اختیار ہے۔ میں اُن چند عورتوں کی جنھوں نے خدا کی دی ہوئی دماغی قوتوں کی بدولت دنیا میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھایا۔ نام لیکر یہ دکھانا نہیں چاہتی کہ ہم مردوں سے بہتر ہیں۔ میں اگر عائشہؓ کا نام لوں گی تو میرے ہمقوم مرد اُنکے پاک شوہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی مثال پیش کرینگے۔ میں اگر سکینہؓ کا نام لونگی تو لوگ اُنکے باپ امام حسینؓ کا نام لینگے۔ اسلیے میں بالعموم یہ احمقانہ دعوی نہ کروں گی۔ کہ عورتیں مردوں سے زیادہ کارکن ہیں۔ کیونکہ خدا نے کہا ہے کہ "مرد عورتوں پر داروغہ ہے۔

میں اپنے ہمقوم مردوں کو دیکھتی ہوں اُنکی قابلیت۔ اُنکی لیاقت اُن کی عقلمندی اُنکی ذہانت کا ممکن نہیں کہ عورتیں مقابلہ کرسکیں۔ یوروپ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ عورتیں اُنکے سامنے ایسی نظر آئینگی جیسے آفتاب کے سامنے ستارہ میری خواہش مردوں سے اسیقدر ہے کہ ہمارے مذہب نے اور صرف ہمارے مذہب نے ہم میں اور مردوں میں مساوات رکھدی ہے۔ مذہب نے ہم پر احسان کیا ہے کہ مردوں پر ہماری دستگیری فرض کردی ہے۔ میں اسی فرض کو مردوں کو یاد دلاتی ہوں۔ میں بھی چاہتی ہوں کہ وہ جس طرح اپنے لڑکوں کی تعلیم میں اپنی محنت۔ دولت اور وقت صرف کرتے ہیں اسی طرح لڑکیوں کی تعلیم میں بھی صرف کریں۔ میں یہ دیکھکر خوش ہوں کہ ہمارے مردوں کی کوشش سے جابجا زنانے مدرسے کھل رہے ہیں۔ اور بہت سے مدرسے میری بہنوں نے بھی کھولے ہیں لیکن ابھی وہ ہماری ضرورت کے لحاظ سے ناکافی ہیں۔

ایک آرزو میں اپنے مردوں سے اور رکھتی ہوں وہ یہ کہ جب وہ ڈیوما میں اپنے ہمقوموں کی وکالت کرتے ہیں تو ہمکو نہ بھولجایا کریں۔ اور اُسکے ساتھ ہی وہ اسبات کی بھی کوشش کریں کہ ہم کو ووٹ کا حق حاصل ہوجائے۔ کیونکہ مسلمان عورتیں خصوصیت کے ساتھ اسکا استحقاق رکھتی ہیں۔ ہم جائداد کے مالک ہیں ہمارے پاس بڑے بڑے علاقے ہیں۔ اسلیے ووٹ دینے کا حق ہم کو ضرور ملنا چاہیے اے میرے قوم کے لائق بیٹو تم چاند بنو تم آفتاب بنو لیکن اسکے ساتھ ہی ہم کو نہ بھولو۔

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی — بیاد آر حریفان بادہ پیمارا

ہم خوش ہیں کہ ہمارا شیخ الاسلام ہمارا طرفدار ہے۔ وہ اُن اسلامی حقوق دینے کی پوری وکالت کرتا ہے جو شریعت نے ہمکو دیے ہیں۔ اور وہ جانتا ہے کہ قومیت کی بنیاد

کا مدار ہماری اور ہماری ذات پر ہے۔

میں اس موقع پر قرآن کے اُس مدرسہ کا ذکر کرنا نہیں چاہتی جو ہمارے مردوں کے تغافل کا شکار ہو گیا ہے۔ بلکہ میں اسوقت صرف اپنے حقوق کا اظہار کرنا چاہتی ہوں اور مجھے امید ہے کہ میرے معزز بھائی جنکے دل میں خداوند کے فضل سے پوری اسلامی روح موجود ہے اس طرف جلد متوجہ ہو جائینگے۔ اور پھر ایسے ایسے ہزاروں مدرسے بن سکتے ہیں۔ میں خوش ہوں کہ میرے ہمقوم راستباز حق گو حق میں ہیں۔ اسلیے میں اپنے قوم کے بہادروں پر ہر طرح اعتماد کرتی ہوں۔

ایران کی پارلیمنٹ

ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمان ہر قسم کی ترقی بہت جلد کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اسلام کا دامن نچھوڑیں کیونکہ ہمارے مذہب میں خصوصیت کے ساتھ ترقی کے تمام گُر موجود ہیں۔ جو انسان کو بحیثیت انسان ہونیکے قوم کو بحیثیت قوم ہونیکے ترقی کی اس اعلیٰ سے اعلیٰ اور بلند سے بلند چوٹی پر پہنچا سکتے ہیں جہاں دوسری قوموں کا پہنچنا ناممکن ہے۔

خاتون کے کسی گذشتہ نمبر میں ناظرین نے پڑھا ہوگا کہ لندن میں جو اسوقت کے موجودہ تہذیب تمدن اور ترقی کا سرچشمہ ہے۔ عورتوں نے وزیر اعظم کے یہاں جاکر بڑا شور و غل مچایا۔ اور ووٹ دینے کا حق حاصل کرنا چاہا لیکن اُن کو پولس نے دھکے دیکر نکالدیا۔ اور آخر کچھ بھی نہ ہو سکا۔ اُسکے مقابل میں ایران میں جو کہ ایک اسلامی سلطنت ہے اور وہاں ابھی کل ہی پارلیمنٹ قائم ہوئی ہے۔ عورتوں کو ووٹ کا حق ملگیا۔ وہ کسی شخص کو اپنا وکیل بناکر اُسکے ذریعے سے ووٹ دیسکتی ہیں۔ اس سے ایک عظیم الشان فائدہ یہ ہوگا کہ عورتیں جو کہ خانہ نشین ہیں اُن میں پالٹیکس کا مذاق پیدا ہو جائیگا۔ اور وہ ملک اور حکومت کے حالات سے بیخبر نہ رہیں گی علاوہ بریں اسکا اثر آیندہ نسلوں پر یہ پڑیگا کہ وہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی پولیٹکل مذاق سے آشنا ہو جائینگے اور ماں کی گود ہی سے ملکی حالات کی طرف اُن کی توجہ مصروف ہوگی۔ اسلیے ہم پیشین گوئی

کر سکتے ہیں کہ فارس کی آیندہ نسل نہایت مدبر ہوگی۔ اور عورتوں کو جو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگیا ہی یہ ایران کے لیے ایک بہت بڑی رحمت الٰہی ہی جو آیندہ اسکے لیے بیحد مفید ثابت ہوگا۔

اعلان چندہ - جو ڈپوٹیشن بسرکردگی سید احمد صاحب طالب علم مدرسۃ العلوم سہارنپور۔ ڈیرہ دون مسوری اور میرٹھ کی جانب چندہ جمع کرنے کو بھیجا گیا تھا وہ واپس آگیا ہے اور مبلغ سات سو اٹھارہ روپیہ اس ڈپوٹیشن سے سکرٹری فیمیل ایجوکیشن کو وصول ہوے۔ مفصل حساب آیندہ پرچے میں مع شکریہ اُن حضرات کے جنھوں نے ممبران ڈپوٹیشن کی اعانت فرمائی اور اُنکو چندہ دیا شایع کیا جائیگا۔

اعلان چندہ نمبر ۲ - خواجہ شری حسن یاور خاں جی نے صدر، گڑہ کاٹھیاواڑ سے مبلغ ایکسو روپیہ فیمیل ایجوکیشن کے لیے بھیجے ہیں۔ ہم صاحب موصوف کی فیاضی اور ہمدردی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اعلان چندہ نمبر ۳ - اُن بیگم صاحبہ نے جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتیں اور جنھوں نے ایک ہزار روپیہ کی رقم یک مشت فیمیل ایجوکیشن کے لیے عطا فرمائی تھی۔ حال میں پھر تینس (۳۰) روپیہ ہمارے پاس بھیجے ہیں۔ ان بیگم صاحبہ کے حسب حال کسی ایرانی شاعر کا وہ شعر ہے جو اُسنے شاہجہاں بادشاہ کی لائق بیٹی جہان آرا بیگم کی تعریف میں لکھا تھا۔ ؎

بذاتِ او صفاتِ کردگار ہست
کہ خود پنہان و فیضش آشکار ہست

خوشخبری

اس سے پیشتر بارہا خاتون کے صفحات میں ہم اُس بڑے احسان کا اعتراف کر چکے ہیں جو حضورِ عالیہ ہر ہائنس بیگم صاحبہ آف بھوپال نے فرقۂ اناث پر کیا ہے اور کر رہی ہیں۔ اب ایک جدید ثبوت ہر ہائنس نے اپنی اُس بڑی ہمدردی اور دلچسپی کا دیا ہے جو اُنکو تعلیم نسواں کے ساتھ ہے ناظرین کو معلوم ہوگا کہ ہم ایک عرصہ سے اس فکر میں تھے کہ تعلیم نسواں کے لیے ایک عمدہ نصاب تیار ہوجائے۔ لیکن مالی دقتیں ہماری سدِّراہ تھیں تاہم گذشتہ اشاعت خاتون میں اُس نصاب کا ایک خاکہ شائع کیا تھا اور اپنا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ بہت جلد یہ کام شروع کر دینگے۔ خوش قسمتی سے خاتون کے پرچے میں جسمیں وہ خاکہ تھا حضورِ عالیہ کی شاہانہ نگاہ سے گزرا اور حضور عالیہ نے فوراً بغرض ہماری دستگیری مبلغ پانچہزار روپیہ ترتیب نصاب کے لیے عطا فرمایا۔ حضور عالیہ کے اس احسان کو ہمارے ملک کی موجودہ خاتونیں اور آیندہ نسلیں بڑی شکر گزاری اور احسان مندی سے یاد کرینگی۔ اور ہم حضور عالیہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کافی الفاظ نہیں پاتے۔ صرف اس دعا پر اکتفا کرتے ہیں۔ کہ خداوند عالم حضورِ عالیہ کے دولت واقبال و مراتب میں روز افزوں ترقی دے اور اُن کا فیض عام خواتین کی بہتری اور بہبودی کے لیے قائم اور جاری رکھے۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۰۱

خاتون

جلد ۴ | ماہ جمادی الثانی ۱۳۲۵ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۰۷ء | نمبر ۸

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

علی محمد خاں کے اہتمام سے
مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

خاتون

۱ - یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علی گڑھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہی اور اسکی سالانہ قیمت (عہ) اور ششماہی ۱۲؍ ہے

۲ - اس رسالے کا صرف ایک مقصد ہی یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑہی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳ - مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہی اور جبتک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی اُمید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہورہے ہیں اُسکی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہینگے۔

۴ - ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑہنے کی انکو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اُس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہی معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵ - ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں"

۶ - اس رسالے کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہی اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے طیار کیا جائیگا۔

۷ - تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڑہ ہونی چاہیے"

تاج محل

(چاندنی رات کی سیر)

تعمیر کی خوبی کے لحاظ سے دنیا میں سات عمارتیں مشہور ہیں - اور تاج محل ان سب سے زیادہ ممتاز عمارت ہے - یہ ارجمند بانو ممتاز محل کا مقبرہ ہے جسے اسکے خاوند شاہجہان نے اپنی بیوی اور ملکہ کی یادگار میں بنوایا تھا - مشہور ہے کہ جب اور فانی انسانوں کی طرح ارجمند بانو کو بھی پیغام اجل آیا تو ملکہ نے رخصت ہوتے ہوئے اپنے خاوند اور بادشاہ سے یہ الفاظ کہے۔ "سرتاج - موت آن پہونچی - رخصت - یہ جسم خاکی اب تھوڑی دیر میں خاک میں مِل جائیگا مگر خیال رہے کہ محبت کو موت تک نہیں آتی - محبت ہمیشہ ہمیشہ تک قایم رہتی ہے۔ اسلیے میری محبت کی یاد میں میری قبر پر ایک ایسی عمارت بنوانا جو ہمیشہ ہمیشہ یادگار رہے" بادشاہ کی آنکھ میں آنسو ڈبڈبا آئے دل بھر آیا - اور بھرائی ہوئی آواز میں کانپتے ہوئے لبوں سے بیوی

کا ہاتھ ہاتھ میں لے کر جواب دیا اچھا اور ملکہ نے مسکرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور اس ناپائدار دنیا سے ہمیشہ کے لئے کوچ کر گئی۔ خاوند نے بیوی کی آخری خواہش کو یاد رکھا چنانچہ خود بادشاہ کے عہد ہی میں ان خاوند اور بیوی کی سچی محبت کی یادگار جس کا نام تاج ہے بن کر قائم ہو گئی۔

اگر آگرہ کے اسٹیشن سے گاڑی میں سوار ہو کر چلئے تو پاؤ گھنٹہ میں آدمی تاج محل پہنچ جاتا ہے گاڑی سنگ سرخ کے ایک بلند اور عالیشان دروازہ کے سامنے ٹھیرتی ہے۔ اس دروازہ سے گذر کر ہم باغ میں داخل ہوتے ہیں۔ باغ سے جو راستہ تاج کو جاتا ہے اسکے دونوں طرف سرو کے درخت ہیں جو رات کو تاریکی میں بالکل ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا ماتم کرنے والے سیاہ لباس پہنے عالم سکوت میں کھڑے ہیں۔ ان درختوں سے آگے چنبا چنبیلی کے پودے اور گلاب کے تختے ہیں۔ پھول اور کلیاں ملکہ ارجمند کی دلی خواہش پوری ہونے کی خوشی میں شاخوں پر مسکرا رہی ہیں۔ ہوا خوشبو سے بسی ہوئی ہے۔ غرض رات کی سیاہی۔ پھولوں کی سفیدی۔ چاروں طرف کی خاموشی۔ ہوا کی مہک اور شبنم کی نمی نے ایک عجیب لطف پیدا کر رکھا ہے۔ تاج کی عمارت کچھ فاصلہ پر ہے مگر چونکہ چاند ابھی نہیں نکلا ایک دھندلے عکس سے زیادہ کچھ نظر نہیں آتا اس اندھیرے میں تاج کی عمارت خواب کے نقشہ سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی البتہ قریب کرے میں ایک ہلکی نورانی روشنی نظر آتی ہے۔ اسکا پرتو دروازہ پر پڑتا ہے جس سے سنگ مرمر کی چمک عجیب بہار دکھاتی ہے۔

اب چلتے چلتے ہم راستہ کے وسط تک پہونچ گئے ہیں یہاں ایک سنگ مرمر کا تالاب ہے جس کے گرد سنگ مرمر اور بیچ میں ایک آبی درخت ہے جسکی بیل چاروں طرف پھیل رہی ہے ایک پھول کھلا ہوا ہے۔ یہ تالاب سنگلدیپ کے مشہور تالاب سے بہت مشابہت رکھتا ہے اور پھول بالکل گل بکاولی معلوم ہوتا ہے۔ جس کے دیکھنے سے بے نور آنکھوں میں نور پیدا ہوتا ہے۔

ایلو۔ وہ دیکھنا چاند بھی نکل آیا اب تو نقشہ بھی تبدیل ہو گیا۔ تاج کی عمارت صاف نظر آنے لگی

عمارت ہے یا خدا کی شان - کس قدر بلند - کس قدر خوبصورت کس قدر سفید گویا فرشتوں نے اسے نور سے بنایا ہے اور خاوند بیوی کی سچی محبت کی یادگار قائم کرنے کے لیے بہشت سے دنیا میں چھوڑ گئے ہیں - چاند کی روشنی میں سنگِ مرمر کی چمک آنکھوں کی روشنی کو بڑھاتی ہے اور بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواب میں باغ عدن کا نقشہ دیکھ رہے ہیں قدم آگے بڑھاتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہو کہ آنکھ کھل جائے اور طلسم ٹوٹ جائے -

تاج ایک ہشت پہلو عمارت ہے جس پر ایک بلند گنبد ایرانی وضع کا بنا ہوا ہے جس چبوترہ پر یہ قایم ہے اُسکے چاروں طرف چار مینار ہیں جنکی سر بفلک چوٹیاں نیلے آسمان میں غائب ہو گئی ہیں گویا پھیلے پڑے ہوئے ستاروں سے باتیں کر رہی ہیں اور اُنکا دل بہلا رہی ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے گویا چار سیڑھیاں آسمان سے زمین تک لگی ہیں جن سے اتر کر فرشتے اِن خاوند اور بیوی کی روح کو ثواب پہونچانے کے لیئے درود پڑھتے ہیں تاج کے دائیں اور بائیں دو اور عمارتیں سنگ سرخ کی ہیں جنمیں سے ایک مسجد ہے اور دوسری تسبیح خانہ - یہ اس خوشنما عمارت کے حسن کو اور بھی دوبالا کرتی ہیں - رات کے وقت گو پچہ کاری کا کام اچھی طرح نظر نہیں آتا مگر پتھر کے پھولوں اور بیلوں کو سرسری طور پر دیکھ کر بھی حیرت ہوتی ہے - جڑاو ایسا نفیس ہے کہ سونے اور چاندی کے کام کرنے والے سادہ کار بھی دیکھ کر حیران رہیں اور بڑے بڑے سنگ تراش اور بت تراش دانتوں میں انگلی دبائیں مگر تاج کی خوبی دیکھنے سے متعلق ہے تحریر میں نہیں آسکتی -

آؤ اب باب الزیارت سے ہو کر قبر کو بھی دیکھ آئیں - بیچ میں سنگِ مرمر کی قبر ارجمند بانو کی ہے اور دائیں طرف بادشاہ کا مزار ہے - دونوں قبروں کے گرد سنگ مرمر کا کٹہرا کھڑا ہے سنگ مرمر کی چادر اوڑھے ہے تمام دنیا کے جھگڑوں سے آزاد یہ سونے والے کس مزے کی نیند سو رہے ہیں موت کو تکلیف وہ کہا جاتا ہے - مگر یہاں تو یہ عین خواب راحت معلوم ہوتی ہے شاہجہاں کسقدر عالیشان بادشاہ تھا - ارجمند بانو کس قدر حسین ملکہ تھی مگر تخت و تاج کو

قیام نہیں۔ موت سخت ہی تاج و پل کے پل میں اٹھا کر طاق فنا میں رکھ دیتی ہے۔ حسن
کا مادر خواب سے زیادہ نہیں ہوتا۔ مگر محبت جس سے زندگی کا قیام رہتا ہے موت کے بعد
بھی قائم رہتی ہے۔ وقت اور موت سب چیزوں پر غالب ہیں مگر محبت سے شکست پاتے
ہیں۔ کیونکہ محبت جذبہ الٰہی کا ایک حصہ ہے اور نور خدا کا ایک لمعہ ہے۔ جو انسانوں کے سینے
کو روشن رکھتا ہے اور ہدایت دکھاتا ہے۔

خوش ہیں وہ خاوند اور بیوی جن میں سچی محبت ہے۔

راقمہ

نازن بیگم

سفر ہند

مس ... کے ... ہے جو ایک مسلمان خاتون ہیں۔ اور لندن ہی میں وہ پیدا
ہوئیں اور وہیں تعلیم پائی۔ جب ان کو ہندوستان کی سیاحت کے لئے کھینچ لائی
دلکے۔ وہ خطوط جو دوران سیاحت میں وہ اپنی سہیلی لیلی کے نام بھیجا کرتی تھیں ہم کو ملے
ہیں۔ ہم ان کا ترجمہ خاتون میں امید ہے کہ سلسلہ وار چھاپ سکیں گے۔ ان خطوط میں
بہت سی معلومات کے علاوہ رسم و رواج کی اصلاح بھی ہے

اڈیٹر

مائی ڈیر لیلی۔

میں نے تمہیں جہاز سے ایک خط لکھا تھا جس میں سے راستہ کی تمام باتیں بیان کی
ہیں اور جو جو دلچسپ منظر میں نے دیکھے تھے وہ بھی بہت اچھی طرح سے بیان کئے ہیں۔ عدن
سے ورے جو چاندنی رات کا سین بیان کیا تھا وہ واقعی نہایت ہی دلچسپ تھا۔ اب تک میری
آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے۔ چاندنی رات میں سمندر بھی عجیب بہار دکھاتا ہے۔ وہ موجوں

زا اترا کر اچھلنا۔ وہ الٹا پلٹا کھا کر چاند کی روشنی میں چمکنا چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کا خوش
دکر پانی کی سطح پر کودتے پھرنا کیا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ کاش میں ورات ایسی جگہہ پر گذارتی
ن لیلی اسوقت اگر تم ہوتیں تو یہی کہتیں کہ بس اب جہاز یہاں روکدو اور یہیں ٹھیرا رکھو۔ خیر
تیں تو میں نے تمہیں لکھدی ہیں۔ اب میں تمہیں اپنے ہندوستان کے سفر کا بیان لکھونگی
تک تو میں ہندوستان کے باہر تھی مگر آج صبح میں نے ہندوستان کی زمین قدم رکھا
رمیں جس کے لیے ہمارے باپ داوا نے کیسی کیسی سختیاں اٹھائی تھیں۔ کیسی کیسی لڑائیاں
یں کیسی کیسی جگہہ خود بھی قتل ہوئے اور اپنے دشمنوں کو بھی قتل کیا۔ غرض بڑی بڑی بہادریاں
مائیں۔ اور ایسے ملک کو پورے طور سے اپنے قابو میں لے لیا۔ مگر خیر اس تاریخ سے
ں کیا کرنا ہے

آج صبح کو سات بجے ہمارا جہاز کراچی بندر کے سامنے ٹھیر گیا اور جو لوگ کراچی اترنے
لے تھے ان کو ایک چھوٹی سی لانچ میں بیٹھکر کنارے پر آنا ہوتا ہے۔ میں چونکہ کراچی جانیوالی
ں تو مجھے بھی اپنے بڑے جہاز سے جس میں میں نے تیرہ دن گذارے تھے اس سے جدا
نا پڑا۔

مگر زیادہ افسوس اس بات کا ہے اسمیں میں نے کئی دوست پیدا کئے تھے اور جبتک
جہاز میں تھی مجھے یہی معلوم ہوتا تھا کہ میں اپنے وطن میں ہوں کیونکہ اس جہاز میں جتنے میرے
تھی تھے سب یوروپ سے ہی آرہے تھے۔ غرض میں نے اپنے سب دوستوں سے
ربائی (خدا حافظ) کہا اور لانچ میں سوار ہوگئی۔ کوئی آٹھ دس منٹ میں ہم لوگ بڑے بڑے
ازوں کے ارد گرد پھرتے ہوئے کنارے پر پہونچ گئے۔ اس وقت کنارے پر دو چار
رنز اور ایک ہندوستانی نوجوان انگریزی لباس میں کھڑے ہوئے تھے۔ جونہی ہم لوگوں
نے لانچ میں سے اتر کر ہندوستان کی پیٹھہ پر پیر دیا کہ اس ہندوستانی جوان نے نہایت ہی
یستگی سے مجھسے آن کر پوچھا کہ "مس ماؤنٹ بولر آپ ہی ہیں" میں نے کہا ہاں پھر میں نے

ان سے پوچھا کہ آپ کا اسم شریف اُنھوں نے جواب دیا" میرا نام ایم۔ ایس ہے" جب میں
نے ایم۔ ایس کا نام سنا تو میں نے اُنسے فوراً پوچھا کہ آپ مسٹر مظفری کو جو انگلینڈ میں ہیں جانتے ہیں
جسکے جواب میں اُنھوں نے کہا کہ وہ میرے بڑے پرانے دوست ہیں اور انھوں نے
مجھے آپ کی نسبت لکھا ہے اور اسی وجہ سے میں یہاں آپ کو لینے آیا ہوں" میں نے
ان سے شیک ہینڈ کیا اور ان کے نام جو خط تو نے اپنے دوست مظفری سے لیا تھا
وہ دیا۔ انھوں نے خط کو اپنے ہاتھ میں رکھکر نوکروں سے اسباب گاڑی پر رکھنے کا حکم
دیا۔ انھوں نے یہ حکم اپنی زبان میں دیا تھا جو میں خاک بھی نہ سمجھ سکی مگر اس حکم کی جب تعمیل
ہوئی تو میں سمجھ گئی کہ یہ ہی بات تھی۔

ہندوستان میں پونہچتے ہی مجھے بڑی خوشی حاصل ہوگئی اور تمام اطراف میں ادہر اُدہر
دیکھنے لگی مگر جدہر میری نگاہ اٹھتی تھی ادہر لوگ کالے ہی کالے نظر آتے تھے۔ ایک تو انگلینڈ
کا کنارہ تھا کہ تندرست لڑکے اور لڑکیاں اطراف میں چھوٹی چھوٹی چیزیں چنتی کھڑی ہو جایا کرتی
تھیں اور انہیں دیکھکر جی خوش ہوجاتا تھا اور ایک یہ کنارہ ہے کہ کالے کالے آدمی ادہر
اُودہر نظر آتے ہیں مگر یہ سنکر تم تعجب کروگے ان مزدوروں کو دیکھکر میں اسقدر شرما گئی کہ پھر
مجھسے آنکھ اُٹھائی ہی نہ گئی۔ اور نہ میں کچھ کہہ سکی۔ یہ میری زندگی میں پہلا ہی وقت تھا کہ مجھے
ایسا شرمندہ ہونا پڑا۔ اور اگر تم سنوگی تو تم بھی شرما جاؤگی اور کسی کے سامنے ذکر تک نہ کروگی
بات یہ تھی کہ یہ لوگ سوا ایک کپڑے کے جو ان کی کمر کے اطراف میں بندھا ہوا تھا بالکل ننگے تھے
میں اسی خیال میں تھی کہ یہ لوگ عام طور پر ایسی حالت میں کس طرح سے پھرتے ہیں کہ اتنے
میں مسٹر ایم۔ ایس نے کہا کہ چلئے گاڑی میں۔ میں اور یہ گاڑی پر سوار ہوگئے اور چلے۔ میں ادہر اُدہر
دیکھتی جا رہی تھی مگر سوائے کالے کالے مردوں کے اور چھوٹی چھوٹی عمارتوں کے اور
کوئی دلچسپ بات نظر نہ آئی۔ یہاں کا لباس بھی عجیب الٹا ہے بعضے تو ڈہیلی ڈہیلی پتلون جسے
یہاں کے لوگ پائجامہ کہتے ہیں وہ اور اسپر ایک بڑی سی قمیص اور اوسکے اوپر ایک ڈہیلا اور

لمبا سا کوٹ پہنتے ہیں اور بعضے ایک چادر کو کمر پر لپیٹ دیتے ہیں اسپر ایک قمیص اور اسپر
کوٹ پہن لیتے ہیں۔ پائجامہ بھی کئی قسم کے ہوتے ہیں بعضے تو بدن سے چپکا ہوا پہنتے ہیں
اور بعضے ڈھیلا۔ غرض کئی مختلف قسم کے لباس ہوتے ہیں۔ ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے
اور مسٹر ایم سے باتیں کرتے ہوئے میں جا رہی تھی مگر دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ ابتک میں نے
ایک بھی عورت نہیں دیکھی اسکی کیا وجہ ہے۔ پھر یہ خیال ہوا کہ شاید صبح ہے اسلیئے یہاں کی
عورتیں باہر نہ نکلتی ہوں۔ مگر پیاری لیلی میں تو سچ کہونگی کہ عورت بغیر ہر چیز کس طرح روکھی پھیکی
نظر آتی ہے کسی چیز میں لطف نہیں آتا۔ عورت ہر چیز کی جان ہے اگر جان نہو تو قالب کسقدر
وحشتناک معلوم ہوتا۔ یہی بازار جو اس وقت کیسا برا معلوم ہوتا ہے اگر یہاں عورتیں چلتی پھرتی
نظر آتیں تو اسی میں ایک خوبی پیدا ہوتی۔ میں انہی خیال میں تھی کہ گاڑی ایک چھوٹے سے
بنگلہ کے سامنے رک گئی۔ میں نے دیکھا کہ اسکے پھاٹک پر ایک چھوٹی سی تختی لگی ہے جسپر
ایم۔ ایس۔ لکھا ہوا ہے۔ اتنے میں تو مسٹر ایم گاڑی سے اتر گئے اور مجھے بھی اتارنے لگے
میں نے کہا کہ میں تو کسی ہوٹل میں جاؤنگی آپ کو کیوں تکلیف دوں۔ یہ کہکر میں انہیں ٹالنے
لگی مگر انہوں نے کہا کہ مس ٹریولر آپ معاف کریں کہ میری بیوی آپ کو لینے نہیں آئیں مگر وہ بہت
ہی اشتیاق رکھتی ہیں کہ آپ کو اپنا مہمان بنائیں۔ آپ تشریف لیچلیے تو آپ اُنسے مل سکیں گی
وہ باہر آنہیں سکیں،، یہ سنکر مجھے بھی شوق ہوا کہ یہاں کی عورتوں سے تو ملوں اور پھر مسز ایم شاید
بیمار ہیں جو باہر نہیں آسکتیں میں نے ان کی دعوت قبول کی اور گاڑی میں سے اتر گئی۔ وہ
مجھے کمپاونڈ میں سے پچھلی طرف لے گئے اور وہاں سے ایک سیڑھی پر چڑھ گئے۔ میں بھی انکے
پیچھے پیچھے ہولی اور ایک منزلہ اوپر چڑھ گئی اوپر چڑھنے کے بعد دیکھتی ہوں کہ واقعی ایک لیڈی میرے
انتظار میں کھڑی ہیں انکا قد گو چھوٹا سا ہے مگر بدن خاصا موٹا ہے۔ چہرہ سے گو حسین تو نہیں ہیں مگر بڑی
بھلی اور محبتی معلوم ہوتی ہیں۔ ان سے پیچھے کو ہٹی ہوئی ایک پندرہ سولہ سالہ لڑکی کھڑی ہوئی
تھی۔ شباہت میں گو یہ لڑکی اُس بڑی لیڈی کے بہت ملتی جلتی تھی۔ مگر اس کا رنگ ان سے

کھلا ہوا ہے اور چہرہ زیادہ دلکش ہے قد گو اتنا ہی ہے مگر بدن نہایت ہی سڈول ہے - یہ
وکیہی تھی کہ مسز ایم نے مجھے ان سے انٹرڈیوس کرایا کہ وہ بڑی لیڈی تو ان کی بیوی ہیں اور
وہ دوسری لڑکی جسے ان لیڈی کی لڑکی سمجھ رہی تھی وہ مسٹر ایم کی بھتیجی ہیں - ہم لوگوں نے
شیک ہینڈ کیا اور انہوں نے مجھے اندر لیجا کر بٹھایا - مگر افسوس اس بات کا تھا کہ نہ مسز ایم انگلش
جانتی تھیں نہ میں ہندوستانی - مگر بیچارے مسٹر ایم ہمارے درمیان گویا مترجم مقرر کیے گئے
ہیں اور انکے ذریعہ سے ہم لوگ ایکدوسرے سے بول چال لیتے ہیں - ان لڑکی یعنی مس
بی سمجھ سکتی ہیں - مگر بول نہیں سکتیں انہوں نے شاید دو تین کتابیں پڑھی ہیں - تھوڑی دیر تو
میں ڈرائنگ روم میں میٹھی باتیں کرتی رہی اور انکے لباس دیکھتی رہی - مسز ایم نے تو ایک
ریشم کا کپڑا اپنے بدن پر کچھ اس خوبی سے لپیٹا تھا -
کہ اس سے بدن کا ہر عضو ڈھنک گیا اور پھر ایک خوبصورتی پیدا ہوگئی - معلوم ہوتا ہے
گویا پرانے گریک زمانہ کا اسٹیچو ہے کہ ایک بڑی سی چادر اپنے بدن پر لپیٹ لی اور پورا بدن
ڈہانک لیا - اچھا یہ تو مسز ایم کا لباس تھا مگر مس بی کا لباس تو اس سے بھی اچھا اور بہت ہی سدہرا
ہوا تھا یعنی ایک بڑا سا ڈھیلا ڈھیلا سا یہ گردن سے لیکر ٹخنہ تک جسمیں سینہ کے پاس اور آستینوں پر
جھالریں اور لیسیں ٹکی ہوئی تھیں اور سر پر ایک مہین سا کپڑا جسے یہ لوگ دوپٹہ کہتے ہیں اوڑھے
ہوئے تھیں پیر میں نہایت اچھے بوٹ تھے - یہ ذرا فیشن ایبل اور سدہری ہوئی معلوم ہوتی تھیں
اسکا لباس مجھے بہت پسند آیا کیونکہ یہ نہ تو پورا انگلش تھا کہ برا معلوم ہوتا یعنی کمر کسی ہوئی ہوا اور سینہ کے
پاس بہت تنگ ہو یا ٹخنوں سے بہت اونچا ہو اور اوپر کوئی کپڑا نہ ہو - واقعی میں تو انگلش لباس
کے سخت خلاف ہوں اور نہ مسز ایم کی طرح پرانی چیز ہو جو ہزاروں سال قبل کے لوگ پہنا
کرتے تھے - اس لباس میں ایک نئی بات نکلتی ہے میں تو ہر لیڈی کو یہی راسے دوں گی
کہ وہ مس بی - سا لباس پہنا کریں - خیر زیور انکا بہت ہی کم تھا یعنی جتنا ہم لوگ پہنتے ہیں - یعنی
ہاتھوں میں ایک ایک سونے کی نفیس چوڑی - کان میں چھوٹے اور خوبصورت سے ایرنگ

اور گلے میں ایک ہلکا ہار۔ ان لوگوں سے تھوڑی دیر باتیں کیں اور پھر مسز ایم نے مجھے اپنا کمرہ
جو اُنہوں نے میرے لیے رکھا تھا بتلایا۔ میں اندر گئی منہہ ہاتھ دھویا۔ کپڑے بدلے بال ٹھیک
کیے اور باہر آئی۔ باہر ڈرائنگ روم میں ایک طرف تو مسٹر ایم بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور
دوسری طرف مس بی بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں جب گئی تو مس بی نے اٹھکر مجھے جگہہ دی۔ مسٹر ایم
نے اخبار چھوڑا اور مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ پھر میں نے مس بی سے پوچھا کہ کیا پڑھتی ہو۔
اس نے ٹوٹی پھوٹی انگلش میں جواب دیا آجکل کہیں نہیں جاتی ہے۔ میں نے کہا خدانخواستہ آپ بیمار تو نہیں۔ اس نے
کہا نہیں۔ لیکن اب میں بڑی ہو گئی ہوں اور پردہ کرتی ہوں۔ میں اس پردہ سے کچھ نہ سمجھ سکی
میں نے دہرا کر پوچھا اور مسٹر ایم نے مجھے سمجھایا کہ جب لڑکی بڑی ہوتی ہے اس وقت اس کا باہر
جانا آنا سب بند ہو جاتا ہے۔ کسی کے سامنے پھر وہ نہیں جا سکتی نہ کسی سے بات چیت کر سکتی ہے
غیر مرد تو کیا اپنے رشتہ داروں سے بھی مل نہیں سکتی۔ نو دس برس تک تو لڑکی کو لڑکے کے
برابر حق حاصل ہے مگر اسکے بعد وہ بیچاری عمر بھر کے لیے قید میں پڑ جاتی ہے۔ پھر میں نے کہا
اگر کہیں باہر جانا ہو تو کیا کریں یہ سنکر وہ کہنے لگے کہ اس وقت ایک بڑا سا سر سے پیر تک کپڑا
اوڑھ لیتی ہیں اور اسمیں آنکھوں کے لیئے دو سوراخ ہوتے ہیں اس چیز کو برقعہ کہتے ہیں۔ یہ برقعہ
اوڑھکر گاڑیوں میں جا سکتی ہیں۔ میں نے کہا کہ افسوس بیچاری کو سخت تکلیف ہوتی ہوگی۔ ان کی
تندرستی میں فرق آجاتا ہوگا اور باہر دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کیا کیا چیزیں ہیں ان سے تو یہ بیچاریاں
بالکل محروم رہتی ہونگی۔ مسٹر ایم نے کہا قطعی۔ میں نے پوچھا بھلا اس کی کوئی وجہ بھی ہے۔ انہوں
نے کہا ہاں عصمت و عفت۔ یہ سنکر مجھے سخت غصہ آیا سخت رنج ہوا اور ایسے الفاظ سن کر مجھے
سخت پریشانی ہوئی کہ پردہ برائی کے لیئے ایک روک ہے۔ میں نے بھی غصہ میں آکر کہدیا کہ افسوس
ہے آپ لوگوں کو اپنی بیوی بچوں کے لیے ایسا برا خیال ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک برائی نہ ہو تب تک
اسکے روکنے کی تجویز کیونکر ہو سکتی ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں مان سکتی کہ یہاں کی لیڈیز ایسی بری
ہیں کہ ان کے لیئے یہ قید مقرر کی گئی۔ آپ لوگوں کو واقعی افسوس ہونا چاہیئے کہ آپ اپنی عورتوں کی

ایسے کلمات نکالتے ہیں۔ یہ سنکر مسٹر ایم نے کہا کہ ہمیں تو کبھی ایسا خیال نہیں ہے مگر میں نے آپکو
پردہ کی، بد تہذیبی اور آجکل جو پردہ ہوتا ہے وہ صرف ایک رواج کو قائم رکھنے کے لیئے ہے" میں نے کہا
خوب وہ بیچاری قید میں پھنسی رہیں۔ تکلیفیں اوٹھائیں۔ نہ کسی چیز کو دیکھ سکیں نہ سمجھ سکیں نہ خود تعلیم حاصل
کریں نہ تعلیم یافتہ عورتوں سے مل جل سکیں۔ اپنی تندرستی کا ناس کردیں۔ بچوں کی تندرستی بگاڑ دیں
نہ کسی کا ہاتھ بٹا سکیں نہ کسی کو فائدہ پہونچا سکیں بلکہ نہ وہ خود تو کیا بلکہ تمام قوم خراب ہو رہی ہے اور
آپ کو پہلے رواج کی سوجھی ہے۔ مگر آپ لوگ جو اس قدر تعلیم یافتہ اور سربرآوردہ ہیں تو کیا آپ
لوگ بھی اس فضول رواج کو روک نہیں سکتے؟ جس کے جواب میں مسٹر ایم نے کہا کہ جی تو بہت
چاہتا ہے مگر انگشت نمائی کا خوف ہے دنیا بھر ہنسنے لگیگی اور لوگ برا بھلا کہیں گے" اس سے
مجھے معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں یہ لوگ ڈرپوک ہیں۔ اسجگہ پر اگر کوئی انگریز ہوتا تو وہ کسی سے نہ چوکتا نہ کسی کی
پروا کرتا اور واقعی پہلی جبتک ایسی ہمت نہ ہو تو ہم ہرگز ترقی نہیں کرسکتے۔ کیا وجہ ہے ہملوگ دنیا بھر میں
سب سے زیادہ ترقی یافتہ لوگ شمار کیے جاتے ہیں۔ ہم لوگ ایسی باتوں میں کبھی ڈرتے نہیں۔
جو بات اچھی ہوئی اسے کمت سے اختیار کی جو بات بری نظر آئی اسے فوراً چھوڑ دی۔ ہم اپنی حالت
کو ہر وقت بدلتے رہتے ہیں اور یہ لوگ اپنی پرانی رسم و رواج کو قائم رکھنے میں اپنا فخر سمجھتے ہیں۔
دس سال پیشتر ہماری کچھ اور حالت تھی آج کچھ اور ہے۔ اُس وقت ہمارا لباس کچھ اور تھا آج کچھ اور
اُس وقت ہمارے رہنے سہنے کی ترکیب کچھ اور تھی اور اب کچھ اور ہے۔ نئی نئی چیزیں بنتی رہتی ہیں
نئی نئی کلیں ایجاد ہوتی جاتی ہیں۔ اسمیں نہ صرف ہمارے اخلاق سدہرتے ہیں بلکہ ہماری تجارت
میں ترقی ہوتی ہے۔ اور دن بدن مالدار بنتے ہیں اور اپنے دولت سے اور طاقت سے دنیا بھر
کو فائدہ پہونچاتے ہیں۔ اس وقت اس کمرے میں بیٹھی ہوں اور کئی چیزیں میں دیکھ رہی ہوں جو
انگلینڈ کی بنی ہوئی ہیں کپڑا جو یہ لوگ پہنے ہوئے ہیں سب ہمارے ہاں کا بنا ہوا ہے۔ تصویریں
جتنی لٹکی ہیں سب ہمارے ہاں کی بنی ہوئی ہیں۔ نہ صرف بنی ہوئی ہیں بلکہ ہمارے بڑے بڑے
لوگوں کی ہیں۔ ایک طرف ٹینیسن ہے تو ایک طرف شیکسپیر ہے۔ ایک طرف لارڈ رابرٹس ہے

تو ایک طرف گلا ڈسٹون سے ہے ۔ کیا ہندوستان میں ایسے لوگ نہیں گذرے یا نہیں ہیں کیا تواریخ
میں ہم نے مغل بادشاہوں کے بڑے بڑے قابل قدر کام نہیں پڑھے ۔ کیا سیواجی اور ٹیپو کی
بہادری سے ہم ناواقف ہیں یہ تو خیر پرانے زمانے کے لوگ ہیں کیا اس وقت ہندوستان میں ایسے
بڑے آدمی نہیں ہونگے مگر نہ ان کی ایسی تصویریں چھپتی ہیں نہ ان بیچاروں کو یہ عزت دی جاتی ہے ۔
ان لوگوں کو اب ہشیار ہوجانا چاہیے ۔ یہاں کی لیڈیز کو اب اپنے ملک اور قوم کو سدھارنے کی
کوشش کرنی چاہیئے ۔ اور جس طرح ایک قاز پانی میں سے نکل کر پر جھاڑ کر بالکل صاف ہوتا ہے
اور پھر اُڑ جاتا ہے ۔ اسی طرح سے انہیں بھی ان پرانی پرانی باتوں کو ترک کر کے زمانہ کے ساتھ
چلنا چاہیئے ۔ ہیں مگر یہ کہاں سے کہاں آگئی تو یہ گویا میں تو کوئی لیکچر دینے کھڑی ہوگئی ۔ اس وقت
گرمی شدت کی ہے ۔ اور سورج برابر بڑھا چلا جارہا ہے ۔ ہم لوگ وہاں اپریل اور مئی کے لیے ترستے
رہتے تھے کیونکہ ان مہینوں میں ہمیں سورج نظر آتا ہے اور زور گرمی بھی پڑتی ہے مگر یہاں توالامان
رات دن پسینے میں کہ بہ رہے ہیں ۔ اب میں اپنا لمبا چوڑا خط بند کرتی ہوں ۔ مسٹر مظفری سے میرا
سلام کہنا اور کہدینا کہ مسٹر ایم سے ملکر ہمیں نہایت خوشی ہوئی ۔ اور میں انہیں کے ہاں ٹھیری ہوں

تمہاری پیاری

مس ۔ اے ۔ کے

بہ سلسلۂ سابق ماڈرن ریڈر

مسٹر ہالیبرٹن کی مصیبتیں

ایکدن صبح کو مسٹر الیشلی نے ایک شلنگ اپنی میز پر رکھا ہوا پایا ۔ لین صاحب سے دریافت
کیا تو انھوں نے لاعلمی ظاہر کی ۔ ولیم سے جو پوچھا تو اس نے کہا " ہاں کاغذوں کے ٹوکرے
میں سے اسکو چنکر میز پر رکھدیا تھا "
مسٹر الیشلی ۔ نہ معلوم یہ شلنگ کس کا ہے ۔ میرا حساب تو ہمیشہ پاک رہتا ہے یہ میرا نہیں ہے

ضرور تمہارے ہی جیب سے گرا ہوگا۔
ولیم مسکرانے لگا دل ہی دل میں کہا کہاں میں اور کہاں شلنگ۔ شرماکر کہا نہیں حضور یہ میرا نہیں ہے"۔
مسٹر ایشلی ولیم کی ایمانداری پر متعجب ہوکر اوس کی طرف دیکھنے لگے ولیم کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔
مسٹر ایشلی "سچ بتاؤ کہ تمہارا چہرہ کیوں تمتا اوٹھا" اتنا پوچھنا تھا کہ ولیم پانی پانی ہوگیا مسٹر ایشلی کو شبہ ہوا کہ ہو نہو اس شلنگ کے متعلق ضرور کوئی پوشیدہ راز ہے۔ اور اوسکے دریافت کی اونہیں بڑی کد ہوئی۔ ولیم سے کہا کہ "مجھے صاف صاف بتاؤ کہ کیا اسرار ہے اور تمہاری اس درجہ شرمندگی کی وجہ کیا ہے۔
ولیم نے نہایت پس وپیش کرکے کہا "اصل یہ ہے کہ جب یہ شلنگ مجھکو ملا تھا میرے دل میں یونہی سا خیال گذرا تھا کہ کاش میں اسکا مالک ہوتا مگر جانتا نہیں کہ اسی کو لے لوں۔ آپ کے میرے طرف دیکھنے سے مجھے ایسا معلوم ہوا گویا آپ میرے دل کے خیال کو پڑھ رہے ہیں اسلیے میں گڑ گیا۔
مسٹر ایشلی (مسکراکر) اچھا مجھے سچ سچ بتاؤ تمنے کبھی کسی دوسرے کی چیز لی ہے۔
ولیم۔ نہیں جناب کبھی نہیں بلکہ اسکا خیال تک میرے دل میں تمام عمر نہیں گذرا ہے۔
مسٹر ایشلی۔ کیوں کیا حرج ہے اکثر لڑکوں کو تمہارے سن کے میں جانتا ہوں چھوٹی چھوٹی چیزیں ادہر ادہر کرلینے کو کوئی جرم نہیں سمجھتے۔
ولیم۔ پھر کیا ہوا اون لوگوں کو کسی نے نہ سکھایا ہوگا کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے اور اس کا وبال کہاں تک پہنچتا ہے"
مسٹر ایشلی۔ اچھا اب یہ تو کہو کہ اوس شلنگ کی آرزو کیوں کرتے تھے کیا کھیلنے کی گولیاں یا مٹھائیوں کی ٹکیاں تمہیں خریدنے کی تمنا تھی۔

ولیم۔ رجھیپ کر انہیں جناب اپنے لیئے نہیں بلکہ دوسرے کے لیئے۔

مسٹر الیشلی۔ پھر کسکے لیئے مجھے صاف صاف بتاؤ۔

ولیم نے مجبور ہوکر کہا کہ میری اماں بہت بیمار ہیں اونکو کہتے سنا تھا کہ تھوڑی سی چاے ملتی تو اون کی طبیعت بحال ہوتی۔ مگر ہم چاے کیونکر خریدتے نہیں معلوم رازق العباد کی کیا ایسی مہربانی ہے کہ پیٹ بھر عزت کے ساتھ کھانا دونوں وقت میسر آتا ہے۔ ورنہ اسکی بھی تو کوئی ظاہری صورت نہ تھی۔

مسٹر الیشلی۔ ہاں مینے بھی تم لوگونکی تکلیف کا حال سنا ہے۔

ولیم۔ جناب نے جو کچھ سنا ہے صحیح ہے مگر ہم لوگ اوسپر شاکر ہیں۔ امان جان سے سنا ہے اور یہی ہمارا عقیدہ ہے کہ اگر یہ سب خندہ پیشانی کے ساتھ ہم لوگ جھیل لیں گے تو ایک نہ ایک روز بھلے دن نظر آئیں گے۔

مگر امانجان کی مشقت اور تکلیف دیکھکر واقعی بڑا رنج ہوتا ہے۔ مسٹر الیشلی کو کیا دل لگی سوجھی ولیم کے ستانے کو بات کاٹکر کہا "اچھا ولیم یہ تو بتاؤ کبھی مرغیوں کے دڑبے کے پاس سے گذرتے ہوے ایک آدہ انڈا جیب میں رکھ لینے کو تمہارا جی چاہا ہے؟" ولیم یہ سنکر بڑا رنجیدہ ہوا اور آنکھوں میں آنسو بھر لاکر کہا جناب میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھکو ان جرائم کے مرتکب ہونے کے قابل کبھی وہم وگمان میں بھی نہ سمجھیئے۔ ہم لوگ شریف ہیں گو غریب ہیں۔

مسٹر الیشلی نے دلاسا دیکر کہا نہیں نہیں مینے تم سے دل لگی کی تھی مینے سنا ہے کہ تمہارے والد ایک مذہبی پیشوا تھے۔

ولیم۔ نہیں جناب بدقسمتی سے اونہیں یونیورسٹی کی تعلیم نہ ملی اسلیئے دینی خدمت کرنے سے محروم رہے۔ مگر میرے دادا مرحوم ڈیون شایر کے اسقف تھے۔ نانا مرحوم لندن کے ماموں بھی دینی کام پر معمور ہیں۔

مسٹر الیشلی نے مسکراکر پوچھا کیا اب تم لوگ اس ہی کوشش میں ہو کہ اپنی گم شدہ حیثیت پھر

حاصل کرلو۔

ولیم۔ جناب اسی امید پر تو سر دُھن رہے ہیں کہ جس طرح بن پڑے ہاتھ پاؤں مارکر آگے بڑہیں۔

مسٹر ایشلی۔ اب کہو کہ تم بڑے ہوکر کیا بننا چاہتے ہو۔

ولیم۔ اپنی بابت کیا کہوں البتہ میرے بہائیوں کو مجھسے زیادہ ترقی کا موقع ملیگا۔ کیونکہ وہ اسکول میں تعلیم پارہے ہیں۔ اور میری جو پوچھئے تو کارخانے میں کام کرتا ہوں وہ بھی ادنی درجے کی ملازمت۔ آپ کی مہربانی سے شام کو کچھ وقت جو مل جاتا ہے لکھنے پڑھنے میں صرف کرتا ہوں کیا بتاؤں کہ آیندہ چلکر کیا بنوں گا۔

مسٹر ایشلی۔ ہاں میں نے سنا ہے کہ تمہاری بہن انہی تکلیفوں کی وجہ سے جان بحق ہوگئی۔

ولیم۔ ہوتا تو یوں ہی مگر اوس مسبب الاسباب نے مسز ریس اور اون کی خادمہ کی دلکو اوس کی طرف ایسا مائل کر دیا تہا کہ اوسکی کوئی احتیاج باقی نرہی

ولیم اور اوسکے مالک میں یہ باتیں ہو ہوا کر ولیم کام پر آیا۔ مسٹر ایشلی گھنٹوں سوچتے رہے۔ کبھی تو ولیم کی دیانت اور راستبازی کی داد دیتے تہے کبھی اوسکے ماں کے فہم اور تربیت پر عش عش کرتے تہے۔ ایک دن مسٹر ایشلی نے ولیم کو کمرے میں بلاکر کہا کہ میں نے اپنا حساب کرکے پھر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک شلنگ کم ہے۔ ضرور گمشدہ شلنگ وہی ہے جس کو تم نے پڑا پایا ہے۔ خیر تمہاری دیانت کے انعام میں یہ دو شلنگ نہیں دیتا ہوں ان سے اپنی والدہ کے لیے چاے خرید نا۔

اس واقعہ کے بعد مسٹر ایشلی نے کچھ سوچ سمجھکر ولیم کو چھوٹی خدمت سے بری کرکے کارخانے کے امیدواروں میں (اپرنٹس) شامل کرلیا جس میں آیندہ کے لیے ولیم کو ہر طرح کی ترقی کی امید تھی۔ اس قسم کی امیدواری کام میں تنخواہ ملنے کا دستور نہ تہا۔ کیونکہ اکثر شرفا کے لڑکے ترقی کی امید پر یہ کام کیا کرتے۔ چنانچہ چند روز سے سرل ڈربی اس زمرہ میں داخل تھا۔ مگر مسٹر ایشلی نے ولیم

کی احتیاج کو مدنظر رکھکر ہفتہ وار اوسکو آٹھ شلنگ دینا منظور کیا۔ اور ہنری کو اکثر ولیم کی صحبت میں رہنے کا حکم دیا۔ ولیم کے ساتھ ایشلی صاحب کے اس برتاؤ سے سرل بڑا خار کھاتا تھا۔ سرل جس وقت داخل ہوا تھا اوسکو یہ امید تھی کہ ولیم ہمیشہ ملازم رہیگا اور سرل اوس پر حکمرانی کیا کریگا مگر اب چونکہ دونوں ایک درجے میں رکھے گئے تھے ایشلی صاحب کا یہ معاملہ اوسکو سخت ناگوار ہوا مگر مجبور تھا کیونکہ اوسکے والد ڈیرہ صاحب نے اوسکو جبرًا کارخانے میں ڈھکیلا تھا اس امید پر کہ اگر وہ ایشلی صاحب کا منظور نظر ہو جاسے تو کبھی نہ کبھی اونکا جانشین ہو جاوے گا۔ کیونکہ ہنری سے دائم المرض لڑکے کی زندگی کی کس کو اُمید تھی۔

جیوں جیوں دن کٹتے تھے مسز ہالبرٹن کو فرانک اور اڈگار کی اعلیٰ تعلیم کی فکر بڑہتی جاتی تھی۔ اسکول میں جو تعلیم اونہیں ملتی تھی اوس میں لاطینی اور یونانی کی طرف زیادہ تو غل تھا۔ انگریزی اور اوسکے متعلق اور شاخوں کی تعلیم رہی جاتی تھی۔ اونکے لڑکے بھی ماشاءالله سے جیسے شنوا اور نیک بخت ماں بھی ویسی ہی فہمیدہ اور عاقلہ پھر کیا پوچھنا۔ مان بات بات پر لڑکوں کو تعلیم دیتی تہیں اور قدم قدم پر دل بڑہاتی تہیں۔ اس وجہ سے بچے بھی لکھنے پڑہنے ہی کو اپنی آل زندگی سمجھتے تھے اور اسی اصول کے لیئے ''یا سر یا کلاہ'' جان توڑکر کوشش کرتے تھے۔ اسکول میں معلم اون کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اونکی تمثیل دوسرے لڑکوں کو دیتے تھے۔ اونکی ماں نے اونکو انگریزی سکھانے کا بیڑا خود اوٹھایا تھا۔

شام کو جب دونوں لڑکے اسکول کے سبق تیار کرنے سے فارغ ہوتے تھے تو ولیم اپنا پڑہنا رکھکر اون لوگوں کو یونانی اور لاطینی کے قواعد سکھاتا جس کو اوسنے اپنے لائق فائق باپ سے سیکھا تھا۔ اوسکے بعد مسز ہالبرٹن سب کام کاج چھوڑکر بچوں کے پاس آبیٹھتیں اور انگریزی زبان کی انشا پردازی جغرافیہ تواریخ وغیرہ سکھاتیں۔ اس طرح لڑکے آٹھوں پہر تحصیل علم کے پیچھے سرگرم رہتے تھے اور دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے تھے۔

فرانک کا ایک ہم جماعت تھا فلپ کلسن ڈاکٹر گلن کا بڑا بیٹا اوس سے اور فرانک سے

ایک قسم کی دوستی تھی ایک دن فرانک نے ایک خط فلپ کو اس مضمون کا لکھا "پیارے فلپ مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے ساتھ کل مچھلی کے شکار کو جا نسکوں گا کیونکہ والدہ کہتی ہیں کہ اس ہفتہ میں ایک دن ہم لوگوں کی تعطیل ہو چکی ہے پھر کل اسکول سے غیر حاضر ہونا نامناسب ہے پس امید ہے کہ میری غیر حاضری معاف کرنا۔" فلپ اس رقعہ کا جواب لکھ رہا تھا کہ اتفاقاً گلسن صاحب وہاں آ گئے۔ بیٹے کو لکھتے دیکھکر پوچھا "کیوں صاحب کیا اپنا سبق تیار کر رہے ہو"

فلپ۔ نہیں ابا ایک ضروری بات کو خط لکھ رہا ہوں خط کو ہاتھ میں لیکر گلسن صاحب نے دیکھا

"پیارے فرانک مجھے تمہارا افسوس ہوا کہ تم"

مسٹر گلسن۔ ایں تم ایسی خراب املا لکھتے ہو۔

فلپ۔ اس میں میری کیا تقصیر اسکول میں تو ہم لوگوں کو زیادہ تر لاطینی اور یونانی لکھائے جاتے ہیں اسلیئے انگریزی میں زیادہ ترقی نہیں ہو سکتی۔

مسٹر گلسن۔ مگر تمہارے دوست فرانک ہالیبرٹن نے تو خوب لکھا ہے۔

فلپ۔ اوسپر کیا منحصر ہے اوس کا چھوٹا بھائی بھی خوب لکھتا ہے۔ سبب یہ ہے کہ وہ گھر میں انگریزی انشا پردازی سیکھتے ہیں۔

گلسن صاحب۔ کیا اونکے معلم مقرر ہیں۔

فلپ۔ نہیں ابا وہ لوگ بہت نادار ہیں۔ اونکی ماں بڑی قابل ہیں وہ خود ہی اونکو تعلیم دیتی ہیں۔ سنتے ہیں کہ یہ لڑکے بڑے شریف گھرانے کے ہیں اور ایسے دیانت دار کہ آپ کو سنکر تعجب ہوگا کل ہی کی بات ہے کہ ماسٹر صاحب نے قواعد میں سے ایک مسئلہ ہم لڑکوں کو حل کرنیکو دیا تھا۔ اڈگار فرانک کا چھوٹا بھائی آیا اور کہا کہ میں گھر میں اپنے بھائی ولیم کے پاس اس کی مشق کر چکا ہوں۔ اب تو میں اسکو آسانی حل کر دونگا تو مجھے اور لڑکوں سے زیادہ نمبر ملیگا۔ یہ ٹھیک نہیں مجھے دوسرا مسئلہ دیجئے۔" یہ راستبازی دیکھکر ہم سب حیران ہو گئے اور ماسٹر صاحب نے بھی بڑی تعریف کی۔

مسٹر گلن۔ بیشک بڑے ہی اچھے لڑکے ہیں تم فرانک کو آج شام کو میری طرف سے چاے پر مدعو کرو۔ میں اوس لڑکے سے ملنا چاہتا ہوں۔

فلپ نے باپ کے ایما سے فرانک کی دعوت کی شام کو فرانک فلپ کے ہاں آیا۔ گلن صاحب اوسکی سمجھہ بوجھہ تہذیب شائستگی دیکھکر سخت متعجب ہوئے۔ اوس سے گفتگو کرکے گلن صاحب نے بہت ساری خانگی باتیں دریافت کیں۔ مسٹر گلن اور فرانک کی گفتگو بہت طویل ہے جو اختصار کے خیال سے قلم انداز کی گئی۔ حاصل کلام یہ مسٹر گلن نے فرانک کے ذریعے سے مسٹر ہالیبرٹن سے استدعا کی کہ وہ اون کے دونوں لڑکے فلپ گلن اور جارج گلن کو مثل فرانک اور اوسکار کے خانگی طور سے تعلیم دیا کریں۔

مسز ہالیبرٹن نے نہایت شادی سے فوراً قبول کرلیا ہر روز شام کو گلن صاحب کے دونوں لڑکے آکر مسز ہالیبرٹن کے پاس انگریزی سیکھہ جایا کرتے۔ تین مہینے میں اون لوگوں نے نمایاں ترقی کی۔ گلن صاحب نے سولہ اشرفی سالانہ کے حساب سے چار اشرفیاں مسز ہالیبرٹن کو بھجوادیں۔ مسز ہالیبرٹن لڑکوں کو بلا اجرت تعلیم دیتی تھیں یہ چار اشرفیاں یعنی ماہواری بیس روپیے کی آمدنی اونہیں نعمت غیر مترقبہ معلوم ہوئی۔ انہوں نے ان اشرفیوں کا شکریہ گلن صاحب کو لکھہ بھیجا اور اپنی ناداری کا تذکرہ بھی کیا کہ آپ کی طرف سے گویا یہ بڑی امداد تھی۔ میری حالت اچھی رہتی تو میں فلپ اور جارج (جو میرے بچوں کی طرح مجھے عزیز ہیں) کی تعلیم کی اُجرت ہرگز نہ لیتی۔

گلن صاحب کو مسز ہالیبرٹن سے ملاقات کا بہت شوق تہا مگر موقعہ ڈھونڈھتے تھے۔ اب یہ موقع ہاتھہ لگا۔ ایک دن گلن صاحب کے ایک دوست نے فلپ کی انشا دیکھکر بہت تعجب کیا اور کہا کہ اتنی کم مدت میں اسنے ایسی ترقی کیونکر کی۔ اس ہی پر بات چلی تو مسز ہالیبرٹن کا تذکرہ نکلا۔ اُون صاحب نے بھی استدعا کی کہ کسی طرح مسز ہالیبرٹن کو میرے لڑکے کو پڑہانے پر راضی کیجئے۔ اسہی کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے گلن صاحب مسز ہالیبرٹن کے ہاں آئے

اون سے بات چیت کرکے بہت خوش ہوئے اور اون کی قابلیت اور تہذیب دیکھکر دنگ رہ گئے۔

آخر وہ نیا لڑکا بھی مسز البرٹن کی شاگردی میں داخل ہوا۔ اس طرح شدہ شدہ دس لڑکے مسز البرٹن کے اسکول میں داخل ہوگئے۔

اب مسز البرٹن نے اور لڑکوں کو لینا موقوف کیا کیونکہ اونکو اپنے خانگی فرائض بھی انجام دینا تھے۔ الغرض اس طرح اونکی آمدنی میں معقول اضافہ ہوا تو لڑکوں کی حالت میں بھی ترقی ہوئی۔ اسکول کے علاوہ ایک پرانے پروفیسر کے پاس اجرت دیکر فرانک اور اوٹو کارڈ پڑھنے لگے۔ ایک شخص نے فرانسیسی زبان کی ایک درسگاہ کھولی تھی ولیم بھی اجرت دیکر ہفتہ میں دو دن اوسکے پاس فرانسیسی سیکھنے لگا۔ کیونکہ کارخانے میں اوسکو اکثر اہل فرانس سے سابقہ پڑتا تھا کاروبار کی باتوں کے لیے اوسکو فرانسیسی جاننا ضرور تھا۔ الغرض اوس کریم کارساز کی کارسازی سے مسز البرٹن کے بچوں کے پڑھنے کا خاصہ بندوبست ہوگیا۔ اب اللہ تعالیٰ اون کو کامیاب اور بامراد کرے۔ آمین

الحمد للہ کہ اس قصہ کا پہلا حصہ تمام ہوا جو میرے خیال میں خاتون کی غرض کماحقہ پوری کرتا ہے۔ نصیحت آمیز عبرت خیز سبق آموز۔ فرمانبردار بیٹے۔ چاہنے والی بہن۔ مطیع زیرک محبت کرنیوالی بیوی۔ ماں کی پیاری عاقلہ مصیبت زدہ ماں۔ سب کے لیے ہدایتیں اور مثالیں موجود ہیں قصہ کا قصہ نصیحت کی نصیحت۔

عاقلے را اشارہ کافی است

اسکا دوسرا حصہ جس میں مسز البرٹن اور دیگر صاحب اثر کی اولاد کا حال ہے۔ چونکہ خاتون کی غرض سے کسی قدر باہر ہے۔ اس لیے اس قصہ کو میں ختم کرتی ہوں۔ اگر صرف قصہ کی غرض سے میری ناظرین نہیں اپنی خواہش چاہئیں تو بعد کو اوسکو بھی بشرط فرصت پیش کرونگی انشاء اللہ تعالیٰ۔

سہیر وردیہ

خوابِ عبرت

ایک روز ہم علی الصباح چند احباب کے ساتھ قلعہ گولکنڈہ کی سیر کو گئے۔ قطب شاہی محلوں کی اونچی اونچی دیواریں اور مساجد اور حمام اور دیگر عمارات اپنی شکستہ حالی میں بھی زمانۂ سلف کی عظمت کو یاد دلاتی ہیں۔ اِن عبرتناک کھنڈروں کے دیکھنے سے جو حالت انسان کے دل پر گذرتی ہے اُس سے ہم مستثنیٰ نہ تھے۔ یہاں سے ہم قطب شاہی گنبد دیکھنے گئے جو قلعہ کے باہر جانبِ شمال واقع ہیں۔ اُن خوبصورت اور عالی شان مقبروں پر نظر ڈالنے سے کچھ عبرت افزا اثر دل پر ہوا۔ اُن کے اطراف وجوانب کی ویرانی اور کھنڈروں کے بھیانک منظر سے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ بعض مقبروں پر اِن میں آرام کرنے والوں کا نام اور تاریخ وفات بھی لکھی تھی۔ اور بعض پر صرف چند آیات کندہ تھیں۔ ایک قبر کے کتبہ پر چند فارسی اشعار کندہ ہیں اور یہ مصرع تو دنیا کو نظروں میں بے وقعت کر دیتا ہے۔

خوش بیا بنشیں کہ ما ہم جسم و جانے داشتیم

بعض گنبدوں کی از سرِ نو مرمت ہوئی ہے جو دور سے نہایت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اِس قبرستان کے مغربی حصہ میں بہت سی سیاہ پتھر کی قبریں ہیں جن میں سے بعض پر وصیت کندہ ہے۔

جب پھر پھرا کر تھک گئے تو ہم زندوں نے بھی ایک مقبرہ میں آرام کیا۔ آنکھ جو لگ گئی تو دیکھتا کیا ہوں کہ ایک خوشنما باغ ہے اُس کے روشوں میں میوے اور پھولوں کے درخت کثرت سے ہیں۔ ہر طرف شفاف پانی کے چشمے بہ رہے ہیں۔ درختوں پر رنگ برنگ کے خوش گلو پرندے اپنی اپنی بولیوں میں نیچر کی مدح سرائی کر رہے ہیں۔ اِس کے وسط میں ایک عالی شان محل تھا جو قدیم زمانے کا معلوم ہوتا تھا۔ محل کے دروازہ پر دو دربان دست بستہ کھڑے تھے۔ اِن کی صورتیں نورانی تھیں اور لباس سر سے پیر تک سفید تھا۔ جب میں اُن کے قریب پہونچا تو وہ مجھ سے کچھ کہنے ہی کو

تھے کہ ایک مرتبہ دروازہ کھلا اور اندر سے ایک حسین لڑکی نکلی اور دربانوں سے مخاطب ہوکر کچھ کہا جسکو میں مطلق نہ سمجھ سکا۔ اس کے حسن کی تعریف میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ "لا عین رأت ولا اذن سمعت" یعنی کہ نہ آنکھوں نے ایسا نظیر دیکھی اور نہ کانوں نے سنی۔

اس کے بعد دربانوں نے مجھے اشارہ سے محل میں داخل ہونے کی اجازت دی۔ میں اس لڑکی کے پیچھے پیچھے چلا۔ جیسے ہی میں محل میں داخل ہوا تو عجیب وغریب خوشبوؤں سے میرا دماغ معطر ہوگیا۔ کئی وسیع اور عجیب طرز کے کمرے طے کرنے کے بعد وہ لڑکی مجھے بڑے ہال میں لیگئی۔ جہاں سونے چاندی کی بہت سی جڑاؤ کرسیاں اور ایک مرصع تخت بچھا تھا۔ وہ تخت کے قریب مجھے ایک کرسی پر بٹھا کے چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ پیچھے سے ایک دروازہ کھلا۔ اور بہت سے خوبصورت اور کمسن لڑکے اور لڑکیوں کے جھرمٹ میں ایک شخص آتا ہوا نظر آیا۔ جس کے سر پر تاج تھا اور چہرہ پر شاہی رعب داب برستا تھا۔ اس کے پہلو میں ایک خاتون تھی اس کے چہرہ پر بھی شاہی تمکنت اور جلال کے آثار نظر آتے تھے۔

ان کو دیکھکر میں اپنی کرسی سے اٹھا اور تسلیمات بجالایا۔ وہ نہایت متانت سے میرے سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھا۔ اور تخت پر مع اوس خاتون کے جلوہ افروز ہوگیا۔ اوس نے مجھ سے پوچھا کہ "تم اس وقت کہاں ہو اور میں کون ہوں" میں نے اظہار لاعلمی کیا۔ اس پر خود ہی بڑی مہربانی سے یہ فرمایا کہ "سنو! یہ مقام خداوند عالم نے میرے لیئے مقرر کیا ہے اور یہ لڑکیاں اور لڑکے جو تم دیکھتے ہو حور وغلمان ہیں۔ میرا نام عبداللہ قطب شاہ ہے اور جس خاتون کو تم میرے پہلو میں دیکھ رہے ہو یہ میری پیاری بی بی ہے"۔

میں نے عرض کیا کہ حضور کا اور حضور کی اولاد کا منشا ان مقبروں کی تعمیر سے کیا تھا فرمایا کہ "ان باتوں سے گو ہم کو تو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہونچتا اور نہ ہم نے اپنے آرام کے لیئے یہ گنبد بنوائے تھے۔ بلکہ ان کی تعمیر سے ہمارا یہ مقصد تھا کہ آیندہ آنے والی نسلیں یہاں آئیں اور ہمارے اس عالم بے کسی سے عبرت حاصل کریں۔ ہمارے عمدہ کاموں کی تقلید کریں اور ہم سے جو غلطیاں

سرزد ہوئیں اور جس سے باہمی نفاق اور خانہ جنگیاں برپا ہوئیں اُن سے پرہیز کریں۔ مگر افسوس ہے کہ ہم نے تم میں سے کسی کو بھی اپنے منشا کے موافق عمل کرتے نہ دیکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کی اخلاقی حالت بہت خراب ہو گئی ہے اچھا اگر تکلیف نہ ہو تو حیدرآباد کے مرد اور عورتوں کی کچھ موجودہ حالت بیان کرو"

میں نے عرض کیا کہ "اگرچہ یہ ایک مشکل کام ہے لیکن تعمیل حکم بھی ضروری ہے۔ فی الحال صرف عورتوں کی حالت عرض کرتا ہوں جس سے مردوں کی تعلیمی و اخلاقی حالت کا نقشہ خود بخود حضور کے سامنے کھچ جائے گا۔

سب سے پہلے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں صرف انہیں عورتوں کا حال بیان کرونگا جو خاص حیدرآباد کی ہیں یعنی جن کی کئی پشت یہاں گذری ہیں۔ ان میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں کیونکہ ان دونوں قوموں کے مردوں اور عورتوں کی حالت یہاں پر ترقی اور تنزل کے لحاظ سے ایک سی ہے۔

حیدرآباد دکن اس زمانہ میں بھی سلطنت مغلیہ کی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ اور بہت سے پرانے زمانے کے ملکی و درباری آئین بھی اس وقت تک یہاں رائج ہیں۔ امراء و جاگیردار و منصبدار وغیرہ کثرت سے ہیں۔

یہاں کی عورتوں کے تین مدارج ہیں۔

ایک۔ وہ عورتیں ہیں جو بالکل جاہل اور پرانے رسم و رواج کی پوری پابند ہیں۔

دوسرے۔ وہ عورتیں جو اپنی حالت کو بدل رہی ہیں۔ یعنی تعلیم و شائستگی ان میں پھیل رہی ہے

تیسرے۔ وہ عورتیں جو شائستہ اور تعلیم یافتہ گنی جاتی ہیں۔

پہلے درجہ کی حالت تو ناگفتہ بہ ہے۔ اس درجہ کی ہندو اور مسلمان عورتوں میں کیا بلحاظ مذہب اور کیا بلحاظ رسم و رواج اور توہمات بہت کم فرق ہے۔ اکثر مسلمان عورتیں دیوتاؤں کی پوجا

کرتی اور نذریں چڑھاتی۔ اور اناکو مانتی ہیں۔ برہمن کے قول کو مثل اپنے مذہب کے کسی مولوی یا مشایخ کے جانتی ہیں۔ شہر میں جب ہیضہ آتا یا چیچک پھیل جاتی ہے تو یہاں کے ہندو اور مسلمان عورتیں عموماً سب سے پہلے برہمن کی راے سے پوجا پاٹ کے ذریعہ اپنے گھر کو اس بلا سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ محرم اور عُرس وغیرہ کے موقعوں پر بھی ہندو اور مسلمان عورتیں دونوں کثرت سے منتیں مانتی اور ہر مقدس جگہہ پر نذر نیاز چڑھاتی ہیں۔ اس درجہ کی مسلمان عورتیں نماز کی بہت کم پابند ہیں۔ البتہ بعض بعض رمضان کے روزے رکھہ لیتی ہین۔ اس طبقے کی اکثر عورتیں منشیات کا استعمال بھی کرتی ہیں۔ اور اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی افیون وغیرہ کھلاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے بچپن ہی سے اس طبقے کے بچوں میں منشیات کی عادت پڑ جاتی ہے۔ عورتیں تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور دیہات میں تو تقریباً کل عورتیں اسی طبقے سے تعلق رکھتی اور بے حد جاہل اور گمراہ پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے جو عورتیں کسی قدر متمول ہیں وہ تو اپنے شوہروں اور اپنی دولت کو۔ لباس۔ زیور اور فضول خرچی میں بیدریغ خرچ کرتی ہیں۔ شادی بیاہ تو بڑی چیز ہے۔ معمولی تقریبوں میں بھی ہزارہا روپیہ صرف کر دیتی ہیں۔ اور پھر بھی سیری نہیں ہوتی ان کے شوہر ان کا کہنا زیادہ مانتے ہیں اور لغو سی لغو باتوں میں بھی ان کی خاطر شکنی کو ہرگز گوارا نہیں کرتے۔

یہاں کے مردوں اور عورتوں میں تقلید کا مادہ بہت زیادہ ہے اس لیئے ہر شخص اپنے سے زیادہ متمول کو جیسا کرتے دیکھتا ہے۔ وہ بھی باوجود بے استطاعتی اُسی کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس درجہ کی عورتوں میں بہت سی ایسی ہیں جن کے خاندان میں پشت ہا پشت سے عورتیں جاہل چلی آرہی ہیں۔ اور عموماً تعلیم کو عورت کے لیئے نہ صرف بُرا بلکہ گناہ کی حد تک پہونچا ہوا سمجھتی ہیں۔ اور اس طبقے کے مرد بھی قریب قریب اسی کے ہم خیال پائے جاتے ہیں۔

دوسرے درجہ کی عورتیں عجیب کشمکش میں ہیں۔ ان میں کسیقدر تعلیم کا رواج بھی ہو چلا ہے

مگر صرف قرآن شریف اور دو ایک کتابیں اردو کی پڑھ لینا ان کی کل کائنات ہے۔ مجموعی حیثیت سے ان کی حالت ترقی پذیر ہے۔ لیکن بیچاریوں کو نہ تو پہلے درجہ کی عورتوں کی سوسائٹی پسند ہر اور نہ تیسرے طبقے کی مہذب سوسائٹی ہی میں انہیں جگہ ملتی ہے۔

ان میں روزہ نماز کی بھی ایک حد تک پابندی پائی جاتی ہے اور ان میں تعویذ گنڈوں اور فال و پوجا وغیرہ کا رواج بھی بہ نسبت پہلے طبقے کے کم ہے۔ اس درجے کی چند لڑکیاں مدرسوں میں بھی جاتی ہیں۔ لیکن فضول خرچی اور شادی بیاہ وغیرہ کے معاملہ میں پچھلے درجہ کی عورتوں سے کسی طرح کم نہیں۔

تیسرا درجہ جو شایستہ اور مہذب گنا جاتا ہے اس طبقے کی عورتوں کی حالت یہ ہے کہ اُن کی تعلیم میں کوئی بات مانع نہیں ہے مگر عموماً ناقص تعلیم ہوتی ہے۔ انگریزی ضرور پڑھائی جاتی ہے۔ جو متمول ہیں وہ تو برائے نام انگریز استانیاں بھی رکھتی ہیں اور جو متوسط ہیں وہ مدرسوں میں بھیجی جاتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آجتک اس طبقہ کی کسی لڑکی نے مڈل تک بھی مدرسہ میں تعلیم نہیں پائی اور نہ اُردو فارسی یا دینیات ہی میں کوئی ممتاز درجہ حاصل کیا۔

اس درجہ کی عورتیں اپنا لباس بالکل بدل رہی ہیں اور عموماً انگلش فیشن کی جاکٹ اور ریشمی ساڑیوں کا رواج ہوتا چلا جا رہا ہے۔ زیور نام کو نہیں پہنتیں۔ پارسی اور انگلش لیڈیوں سے ملنے جلنے کی زیادہ آرزومند اور اُن کی تقلید کرنے کی زیادہ شائق رہتی ہیں۔ نماز روزہ کی بہت کم پابند ہیں۔ اور ان ہی نمائشی باتوں کی وجہ سے مہذب مشہور ہیں۔ ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔

اب اگر عام طور پر یہاں کی عورتوں کی موجودہ حالت پر نظر ڈالی جائے تو ان کی حالت بے حد اصلاح طلب ہے۔ اُن کے اخلاقی ضعف کی وجہ سے دولتمند مفلس ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کی بدولت مردوں میں سے بھی شجاعت۔ بہادری۔ ہمت۔ دلیری مفقود ہوتی جاتی ہے۔ بہ نسبت مردوں کے یہاں کی عورتیں ذرا زیادہ سمجھدار اور تندرست نظر آتی ہیں۔

اگر ان کی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے تو حیدرآباد بہت ترقی کر سکتا ہے۔ یہاں کے زنانہ آداب ملاقات بہت سخت اور تکلیف دہ ہیں۔ چند سال سے یہاں ایک انجمن نسواں قایم ہے جس میں خاص حیدرآباد کی دو ایک خواتین بھی ممبر ہیں۔ گو یہاں کے مرد اور عورت اپنی قدیم صفت مہمانی میں مشہور رہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ عورتوں کی جہالت کی وجہ سے یہ قومی صفت بھی معرض زوال میں نظر آتی ہے۔

بچوں کی پرورش نہایت خراب اصول پر ہوتی ہے۔ اکثر بچے ادنیٰ درجہ کی سوسائٹی میں پرورش پاتے ہیں۔ ان کی اخلاقی اور مذہبی تعلیم کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ اور سررشتہ تعلیمات میں بھی ضروریات وقت اور مقتضیات زمانہ کے مطابق ان کی ترقی حالت پر بمقابلہ اور دیسی ریاستوں کے کچھ زیادہ توجہ نہیں کیجاتی۔

کئی سال سے ایک مدرسہ خاص پردہ نشین لڑکیوں کی تعلیم کے لیئے قائم کیا گیا ہے جسمیں سارے حیدرآباد سے تیس لڑکیاں بھی مشکل سے آتی ہیں۔ اب حال میں مسز واکر کی سعی سے ایک مدرسہ امرا کی لڑکیوں کے لیئے قایم ہوا ہے۔ چونکہ اس کی ابھی ابتدائی حالت ہے اس لیئے اسکا ابھی کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہوا۔

جو لوگ حیدرآباد کی اب سے پندرہ بیس برس بیشتر کی حالت بیان کرتے ہیں اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کچھ ترقی ہوئی ہے مگر بہت کم۔ اسی نسبت سے مردوں کی حالت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اِن کی نسبت اتنا کہنا کافی ہے کہ یہاں جب سے یونی ورسٹی تعلیم کی بنیاد ڈالی گئی ہے اُس وقت سے ابتک صرف پانچ چار اہل ملک نے بی۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کرنے کی زحمت گوارا کی ہوگی۔

یہ حالت ہمارے موجودہ تمدن کی ہے۔ میری تمنا ہے کہ میں حضور کی زبانی قطب شاہی زمانے کے کچھ حالات سنوں یہ فرمایا کہ "اب بہت دیر ہوگئی ہے پھر جب کبھی تم آؤگے تو ہم بھی اپنے زمانے کی کچھ رام کہانی سنائینگے" میں رخصت ہو کر باغ کے باہر پہونچا تھا کہ آنکھ کھل گئی۔

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

سید محمد نقی

ایک بلبل کی سرگذشت

آج سے دس مہینے قبل میں کشمیر کے ایک نہایت ہی شاداب حصہ میں پیدا ہوئی ۔
وہاں ایک خوشنما درخت کے ہرے ہرے پتوں میں میرے ماں باپ نے اپنی ذاتی محبت
سے چھوٹے چھوٹے تنکوں کا میرے لئے ایک گھر بنایا اور اسی گھر میں میری پیدائش اور پرورش
ہوئی۔ میری پیدائش کے بعد جب تک میں نے ہوش سنبھالا میرے ماں باپ نے میری بڑی
حفاظت سے محبت سے پرورش کی ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ رکھتے ۔ اور اپنی ہی چونچ سے
مجھے دانہ بھی کھلاتے ۔ نہ کبھی کسی پرند کو میرے پاس پھٹکنے دیتے نہ کسی جانور کو قریب آنے
دیتے ۔ اگر میرے باپ کہیں جاتے تو میری ماں مجھے اپنے پروں میں سمیٹے ہوئے بیٹھتی ۔ یا
مجھے اپنی ساتھ لے جاتی ۔ مجھے ذرا بھی تکلیف ہوتی تو گویا انکی جان نکلجاتی ۔ غرض انہوں نے
مجھے بڑے نازوں سے پالا اور میں بھی ان کی طرح نازک اور خوبصورت ہوتی گئی مگر جوں جوں
میں بڑھتی گئی اور دنیا کے کاروبار سے واقف ہوتی گئی ان کا ساتھ آہستہ آہستہ چھوڑتی گئی ۔
بعض دفعہ تو دن دن بھر ان سے الگ رہا کی ۔ اپنی سہیلیوں میں اپنا مزیدار وقت گذارا کی رفتہ
رفتہ جب خاصی بڑی ہوگئی تو میں نے اپنا رہنا سہنا بالکل الگ اختیار کرلیا اور اپنے چین
کے دن اپنے دوستوں میں اور سہیلیوں میں گذارنے لگی۔ کشمیر کے دلکش منظروں میں سیر
کیا کرتی تھی ۔ اچھے اچھے چمن میں دن رات گذار دیتی ۔ خوشنما پھولوں سے دل بہلاتی ۔ اس پھول
سے اڑکر اُس پھول پر بیٹھ جاتی اور اُس پھول سے اسپر پھدکتی ۔ کبھی اِن کی مہک سے
خود مست ہوجاتی تو کبھی اپنی میٹھی میٹھی راگنیوں سے انہیں مست کردیتی ۔ کبھی ان کی مہک

جنگل میں اُڑتی پھرتی تو کبھی پرندوں کے غول میں آکر انہیں اپنی خوبی اور حسن دکھلاتی۔ کبھی خاک میں مل کر خاکستر ہو جاتی تو کبھی صاف شفاف بہتے ہوئے چشموں میں خوش ہو کر نہانے لگتی کبھی سبز سبز قدرتی فرش پر لوٹنے لگتی۔ تو کبھی نیلے نیلے آسمان پر چکر لگاتی۔ کبھی چھوٹے چھوٹے پودوں تلے آرام لیتی تو کبھی اونچے اونچے درختوں پر چڑھ کر گانے لگتی۔ غرض جدھر جا ہتی چلی جاتی اور جو جی چاہتا کرنے لگتی نہ کوئی روکنے والا تھا نہ منع کرنیوالا۔ نہ قید کا کبھی خیال آتا نہ صیاد سے کبھی ڈر لگتا۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ آزادی میرے لیئے ہے اور میں آزادی کے لیئے۔ ایسے مزے میں میں نے اپنا بچپن گذارا اور اپنی جوانی کے دن بھی اسی طرح سے گذار رہی تھی۔ مگر زمانہ کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ آج کچھ ہے اور کل کچھ اور اس چین سے گذرنے والے زمانہ میں کبھی مجھے خیال تک نہ گذرا کہ آگے جا کر کیسی کیسی سختیاں اُٹھانی پڑیں گی۔ کیسے کیسے انقلابات اور تغیرات درپیش آئینگے۔ کیسے کیسے رنج و آفت کے صدمے جھیلنے پڑینگے۔ خیر تو میں اپنی زندگی اس مزے میں گذار رہی تھی کہ جاڑوں کا موسم سر پر آن کھڑا ہوا۔ جاڑوں میں کشمیر کی عجیب حالت ہو جاتی ہے۔ جدھر دیکھو برف ہی برف نظر آتی ہے۔ جنگلوں میں نہ وہ سہانا پن ہے نہ باغوں میں وہ لطف ہے۔ ہر طرف برف جمنے لگی۔ بڑی بڑی نہریں اور دریا جم گئے۔ بہتے ہوئے چشمے تھم گئے۔ بڑے بڑے خوشنما پہاڑ سفید سفید چادر اوڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ درخت بیچارے مرجھانے لگے۔ انسان تو اوڑھ لپیٹ کر اپنی زندگی بسر کرنے لگے مگر ہم بیچارے پرند اکڑ اکڑ کے مرنے لگے۔ ہم نے بھی یہی غنیمت جانا کہ یہاں سے نکل کر کسی گرم ملک چلے جائیں۔ تھوڑے دن وہاں گذاریں پھر اپنے وطن کے مزے لوٹنے واپس چلے آئیں۔ اسی خیال سے ہم ہندوستان کی طرف رخ کر کے اُڑ نکلے۔

کئی دن کے بعد ہندوستان پہونچے مگر اللہ کی پناہ اس سے برا ملک اور نہ کوئی دیکھا نہ کبھی سُنا نہ یہاں کے پرندوں میں وہ خوبصورتی ہے نہ یہاں کے چمن اور پھولوں میں وہ خوشبو نہ یہاں کے مردوں میں وہ رنگ روپ ہے نہ یہاں کی عورتوں میں وہ حسن و خوبی میں تو یہاں آکے کچھ دنگ سی رہ گئی اور دل ہی دل میں کہنے لگی کہ الٰہی یہ کس دوزخ میں تو نے مجھے ڈالا۔ یہاں کے لوگوں

کو دیکھکر تو طبیعت اُلجھنے لگی - دل مرجھانے لگا - جی جلنے لگا - مگر کیا کرسکتی - اسی خیال سے دل کو تسلی دیتی تھی کہ تھوڑے دن گذارنے ہیں گذار لو پھر اپنے وطن چلے جائینگے - غرض رفتہ رفتہ یہاں بھی رہنے سہنے لگے اور اپنی زندگی کے دن کاٹنے لگے -

مگر بدقسمتی نے یہاں بھی نہ چھوڑا - یہ کم بخت کبھی نچلی نہیں بیٹھتی کسی غریب کو تباہ کئے بغیر اسے کبھی چین نہیں آتا - ایک دن کا ذکر ہے کہ میں ایک چھوٹے سے چمن میں اپنا دل بہلا رہی تھی - اپنے وطن کو یاد کر رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی کہ ناگہاں کسی نے مجھپر ایک جال ڈالا اور میں اسمیں پھنس گئی - میں اس دشمن جاں کے دام میں گرفتار ہو گئی - میں بہت ہی تڑپی - مچلی - کودی - پھاندی - غرض بہتیری کوششیں کیں کہ کسی طرح اس ظالم کے دام سے چھوٹ جاؤں مگر افسوس کہ سب کوششیں بیکار گئیں اور میں اس بے رحم کے پھندے میں پھنس گئی - اسوقت میری عجیب حالت تھی مجھے اپنا پیارا وطن یاد آیا - اپنے بچپن کے دن اور لطف کی زندگی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی - اپنا گھر اپنے عزیز - اپنے دوست اور ہمجولی سب سے میں چھوٹ گئی اور اس ظالم صیاد کے دام میں بے جرم گرفتار ہو گئی - میں زار زار رونے لگی اور اپنے صیاد کو منانے لگی - سمجھانے لگی - بہت عاجزی کی منتیں کیں مگر اس سنگدل نے میری ایک نہ سنی اور مجھے لے چلا - اگلے دن یہ مجھے شہر میں گلی گلی لے کر پھراتا پھرتا تھا کہ کوئی مجھے خریدے - آخر میرے موجودہ مالک نے (افسوس ہے کہ مجھے اسے اپنا مالک کہنا پڑا) مجھے خرید لیا اور اس پنجرے میں ڈالدیا ابتک میں اسی قید بے جرم میں پڑی ہوں - سختیاں بھگت رہی ہوں - اور آزادی اور وطن کی یاد میں سر ٹپک ٹپک کر روتی ہوں - پہلے روز جب اسنے مجھے اس قفس میں بند کیا اوس روز میرا حال قابل رحم تھا - میں آہٹہ آہٹہ آنسو رو رہی تھی - زور زور چلاتی تھی - اُڑنے کی کوشش کرتی تو قفس کی چھت سے ٹکرا جاتی تھی - مچل کر نکلنا چاہتی تو لوہے کی سلاخیں مجھے روک دیتی تھیں سلاخوں کو ہٹانا چاہتی تو میرے نازک نازک پروں میں چوٹ آجاتی تھی - ہزاروں ترکیبیں کیں مگر سب بے سود - پھر میں رو رو کر اپنے بے رحم مالک کو منانے لگی - میرے رونے پر

پر وہ ہنستا اور چپ ہو جاتا تھا۔ جب سب امیدوں پر پانی پھر گیا تو پھر میں اپنے پر سمیٹے ہوئے ایک کونے میں پڑی رہی اور اپنی گذشتہ زندگی کو یاد کر کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ کبھی اس آرزو کے خیال سے دل مچلتا تو کبھی اس کھیل کود کے زمانے کی یاد ستانے لگتی۔ غرض میری بری حالت تھی۔ عجیب پریشانی تھی۔ بے چین تھی۔ بے کل تھی اور زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ میری ایسی حالت دیکھ کر رحم کھانے والا کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی ہموطن نہ کوئی ہمزبان نہ کوئی دوست نہ آشنا اپنی حالت پر میں آپ رحم کھاتی تھی۔ ظالم بے رحم انسان کے لیے میرے دل سے بد دعا نکلتی تھی۔ میں کس آزادی اور خوشی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہی تھی کہ اس ظالم نے مجھے ناحق گرفتار کیا اور یہاں اس قید میں ڈالدیا۔ رہ رہ کر یہی خیالات آتے تھے کہ اسکو مجھپر اتنی سختی کرنیکا کیا حق ہے۔ جیسے اسے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ویسے مجھے ہی۔ اگر مجھسے کوئی قصور سرزد ہوا ہے جس کے لیے یہ ظلم سہنے پڑتے ہیں تو وہ صرف یہی ہے کہ میں بلبل ہوں۔ جب بلبل ہونے پر یہ سختیاں جھیلنی پڑتی ہیں تو پھر خدائے تعالیٰ نے مجھے بلبل بنایا ہی کیوں۔ مجھے یہ میٹھی آواز کیوں دی۔ اس حسن کی مجھے کیا ضرورت تھی ع

اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی۔

کاش میں بلبل نہوتی۔ کاش مجھمیں یہ خوبیاں نہوتیں کاش میں پیدا ہی نہوتی۔ اس قید اور غلامی سے تو مرجانا بہتر ہے۔ انہیں خیالات میں غرق تھی کہ سامنے سے ایک لڑکی میری طرف آئی اور مجھے اس قدر پریشان دیکھکر مسکرائی۔ اسے مسکراتے دیکھکر مجھے اور بھی رنج ہوا اور میں نے کہا ؎

نہ ہنسئے میرے رونے پر یہ وہ آفت کا رونا ہے
کہ جسکو دیکھکر رویا کئے روح الامیں برسوں

یہ سنکر اس نے نہایت ہی میٹھی آواز سے کہا کہ "اے پیاری بلبل میں تیرے رونے پر نہیں ہنستی ہوں بلکہ تیری ایسی حالت دیکھکر مجھے اپنی پریشانی اور بے چینی یاد آگئی" اس آواز

سنے اور اس فقرہ نے مجھپر جادو کا اثر کیا اور اس اپنی غمگسار کو دیکھکر میرا رنج کچھہ کم ہوا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو اور تمہاری پریشانی کیا ہے جس کے جواب میں اس نے کہا کہ "پہلے تو اپنی سرگذشت سنا کہ تو کہاں سے آئی اور کیسے آئی" میں نے اپنے غم کی داستان اسے پوری کہہ سنائی پھر اسنے کہا کہ "

اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی

میری ستم رسیدہ بلبل۔ میں بھی تیری طرح دکھیاری ہوں۔ جیسے تو قید ہے ویسے ہی میں بھی قید میں گرفتار ہوں۔ تجھہ میں اور مجھہ میں اگر کوئی فرق ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ تو اس پنجرے میں قید ہے اور میں اس چار دیواری میں۔ جیسے تو اڑکر کہیں نہیں جاسکتی ویسے ہی میں بھی کہیں جا سکتی ہوں نہ کچھہ دیکھہ بھال سکتی ہوں۔ میرا بچپن بھی تیری طرح آزادی اور بے فکری سے گذرا نہیں بلکہ تجھسے اچھا گذرا کیونکہ تجھے تو اپنی پرورش آپ کرنی پڑی اور مجھے اسکا بھی کوئی فکر نہ تھا۔ جو جی چاہے کرتی تھی اور جس طرح چاہے رہتی تھی۔ جدہر چاہے چلی جاتی اور جس سے چاہے ملتی تھی۔ دنیا بھر مجھے بڑے پیار سے رکھتی تھی نہ کوئی ستاتا تھا نہ کوئی کچھہ کہتا تھا گھر بھر کی میں لاڈلی تھی اور ہر شخص میرے ناز اٹھاتا تھا غرض بڑی خوشی سے اپنے دن گذار رہی تھی۔ کہ ایکدن جب میں ذرا بڑی ہوئی تو ان لوگوں نے مجھے بند کر دیا یعنی باہر جانے سے روک دیا۔ آہ وہ پہلا روز مجھے خوب یاد ہے۔ عجیب پریشانی تھی اور سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں نکل جاؤں کہیں چلی جاؤں اور اس قید سے رہا ہو جاؤں۔ اپنی سہیلیوں سے ملوں اور ویسے ہی لطف کے دن گذاروں۔ غرض عجیب بے چینی تھی۔ دن بھر تیری طرح میں بھی رویا کی اور اپنے بچپن کے دوستوں کی یاد میں جان کھویا کی۔ نہ کسی سے بات چیت کرنے کو جی چاہتا تھا نہ کسی سے ہنسنا بولنا بھاتا۔ کسی طرح چین نہ آتا۔ ہزاروں خیالات آتے رہتے۔ طرح طرح کی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھرتی تھیں۔ وہ دن کیا تھا ایک پہاڑ سا دن تھا۔ کسی طرح کٹتا نہ تھا۔ بایسکل کی طرح ادہر ادہر پھرتی تھی۔ کبھی چپکے چپکے روتی تو کبھی اپنا سر ہاتھہ پر دہرے گھنٹوں بیٹھی سوچتی۔ غرض اس روز کی پریشانی اور تکلیفیں تجھے کہاں تک سناؤں

اس روز سے میرا بچپن جاتا رہا۔ میری آزادی کا خاتمہ ہوگیا۔ اور آجتک اسی قید میں پڑی ہوئی ہوں۔ نہ دنیا کی مجھے خبر ہے نہ میں جانتی ہوں کہ باہر کیا ہورہا ہے۔ نہ میری تعلیم ہوسکتی ہے نہ میں کسی کو کچھ تعلیم دے سکتی ہوں۔ اپنی تندرستی کا ناس ہورہا ہے اور میں اس قید کی سختیاں بھگت رہی ہوں۔ مگر ابتو کچھ کچھ عادت ہوگئی ہے اور اتنی تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ مگر جب کبھی یہ سنتی ہوں کہ میری غیر قوم کی بہنیں اپنی آزادی سے نہ صرف آپ فائدہ اٹھا رہی ہیں بلکہ اپنی ہمقوم بہنوں کو بھی فائدہ پہونچا رہی ہیں۔ مردوں کا ساتھ دے کر اپنی قوم اور ملک کی بھی ترقی کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔ اس وقت میرا دل بہت مچلتا ہے۔ اچھلتا اور بے اختیار رہتا ہے کہ میں کیوں نہ اپنی بہنوں کو فائدہ پہونچاؤں۔ مگر یہ کہاں ہماری قسمت۔ ہم تو صرف جانور کی طرح اپنی زندگی گذارنے اس دنیا میں آئی ہیں۔ مرد جو کھانے کو دیں اسے کھائیں۔ ان کی خدمت کریں اور پڑے رہیں یہی ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ خیر میں اب اپنی قسمت کا دکھڑا تیرے آگے کہانتک روؤں۔ یہ سنکر میرا دل بھر آیا۔ اور ان کی اس حالت پر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ یہ دیکھکر وہ بولی وہ میری غمگین بلبل۔ صبر کر۔ تھوڑے دن اسی طرح سے گذار پھر تو تجھے بھی عادت ہوجائے گی۔ اور تو بھی اپنی باقی ماندہ زندگی کے دن میری طرح کاٹنے لگے گی قید ہماری قسمت میں لکھی ہے اور اس کی سختیاں جھیلنا ہمارا کام ہے۔ صبر کر پیاری بلبل صبر کر۔ یہ کہکر اس سے بھی نہ رہا گیا اور روتی ہوئے چلی گئی۔

دو دن اسی رونے دھونے میں گذر گئے اور تیسرے دن میں ذرا ہوش میں آئی کچھ کھایا پیا اور اپنی مصیبت کے ساتھی کو آواز دیکر بلایا اسنے آن کر مجھ سے باتیں کیں میرا دل بہلایا اور چلی گئی تھوڑے دن تک تو روز یہی ہوتا رہا کہ وہ میرے پاس آتی اور اپنی رام کہانی مجھے سنا جاتی۔ کبھی میں روتی تو وہ مناتی اور کبھی وہ روتی تو میں مناتی۔ غرض کئی دن رات اسی طرح سے گذر گئے پھر ایک ہفتہ تک وہ میرے پاس نہ آئی۔ مجھے بہت فکر ہوا۔ بڑی پریشانی ہوئی اور بہت گھبرائی کہ یہ کیا ہوا۔ لوگوں سے پوچھتی تھی مگر میری کوئی کب سنتا اور سنتا تو سمجھتا کیا پھر ایکدن کیا دیکھتی ہوں

کہ بہت سے لوگ جمع ہوئے ہیں۔ اور زور زور سے رو رہے ہیں۔ میں بہت گھبرائی۔ دل بلیوں اُچھلنے لگا۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میری پیاری غمگسار مالکہ کا انتقال ہوگیا۔ آہ وہ میری سچی دوست میرے غم کو رفع کرنے والی۔ مجھے دلاسا دینے والی۔ میری پیاری مالکہ گذر گئی۔ اب میں کیوں رہوں بس اُس روز سے میں گھل رہی ہوں نہ کچھ کھایا جاتا ہے نہ پیا جاتا ہے۔ بس اب میں بھی تھوڑے ہی دن کی مہماں ہوں۔ خدا کرے کہ اس قید سے بہت جلد نجات ملے۔ آمین

خدنگ

فخر النسا شہدہ کاتبہ

یہ اسم بامسمی خاتون علامہ ابونصر احمد بن فرج بن عمر ابری کی صاجزادی تھیں۔ علامہ ابونصر کے بزرگوں میں سے کسی نے کسب معاش کے لئے خیاطی کا پیشہ اختیار کیا تھا جو ابری کی وجہ تسمیہ ہے۔ ابری کے معنی ہیں سوئی سے کام لینے والا۔ علامہ ابونصر کا اصلی وطن دنیور تھا جو ایران وعراق کے درمیان کے سلسلہ کوہ میں واقع ہے۔ لیکن زمانہ کی ضروریات سے مجبور ہو کر علامہ مذکور نے اپنے وطن کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہا اور بغداد میں سکونت اختیار کی۔ اسی مردم خیز مقام پر ۴۸۴ھ میں شہدہ پیدا ہوئیں علامہ ابونصر نے ضروری تعلیم و تربیت کے بعد اپنی ہونہار لڑکی کو دوسرے مشہور لوگوں کے سلسلہ درس و تدریس میں شریک کرانا ضروری سمجھکر ابوعبداللہ حسن بن احمد نعمانی۔ ابوالحسن علی بن حسین بن ایوب۔ ابوالحسین احمد بن عبدالقادر بن یوسف۔ ابوالخطاب نصر بن احمد بطروی۔ طلحہ بن محمد زینبی۔ فخر الاسلام ابوبکر محمد بن احمد شاشی وغیرہ جیسے علمار کے فیض صحبت سے مستفید اور ان لوگوں کے آگے زانوے شاگردی تہ کرایا۔ شہدہ کو مطالعہ و کتب بینی سے بالطبع انس تھا اور اپنا تمام وقت وہ اسی میں صرف کرتی تھیں۔ تکمیل تعلیم کے بعد اس معززو محترم خاتون نے خود سلسلہ درس و تدریس جاری کیا۔ خطاطی کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ خوشخطی ہی "کاتبہ" کی وجہ تسمیہ ہوئی۔

شہدہ کی شادی علامہ ابونصر کے شاگرد رشید علی بن محمد بن یحییٰ سے ہوئی جو علم و فضل میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے تھے۔ اس مبارک شادی سے نہایت خوشگوار نتائج مترتب ہوئے ہیچ ہے کہ :-

(۱)

"تعلیم یافتہ عورت سے شوہر کی ترقی اور جاہل" "عورت سے تنزل ہوگا۔"

(لارڈ بریلے)

(۲)

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ ناقص العقل مردوں نے" "اپنی بیویوں کے" "تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ایسے ایسے کام کئے جو پبلک کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔"

(ڈوٹیا کوئیل)

(۳)

"اچھی بیوی صرف دنیاوی باتوں ہی میں مدد نہیں دیتی بلکہ اس سے دماغی باتوں میں بھی مدد ملتی ہے۔"

(سرجان لبک)

(۴)

"انسان کو بیوی جیسا بنا دیتی ہے ویسا ہی وہ بن جاتا ہے۔"

(ڈاکٹر ہال)

اگرچہ ساری ترقی یافتہ، متمدن اور مہذب دنیا کا انہی دانشمندانہ اقوال پر عمل ہے۔ جمیع کاموں میں بیوی کی شرکت کو موجب برکت اور ترقی کا اصلی اور حقیقی ذریعہ سمجھا جاتا ہے اور اسی کی بدولت اسے آج یہ درجہ حاصل ہے۔ لیکن آہ! اے ہندوستان! تیرے باشندوں

تھیں اور خاصکر اس قوم میں جو مسلمان کہلاتی سب آئے دن عورتیں پاؤں کی بیڑی سمجھی جاتی ہیں اوران کی شرکت بجائے ترقی بخش ہوئے کیوجہ تنزل اوران کا وجود غیر ضروری اوران کی ہستی سراسر مہمل خیال کیجاتی ہے۔ ایک وہ بھی زمانہ تھا کہ اسی قوم کی عورتیں دنیا میں کیسے کیسے کارہائے نمایاں کرتی۔ میدان ترقی میں مردوں کے قدم بقدم چلتی بلکہ مردوں کو چلاتی تھیں و اعلیٰ قابلیتوں سے بے بہرہ اور انسانی فضائل سے محروم نہ ہوتی تھیں۔ اپنے فطری حقوق سے متمتع تھیں۔ تمدنی۔ علمی۔ دینی اور دنیاوی غرض جمیع امور میں بفحوائے :۔

"والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض"

(مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں)

اور

"ومن آیاتہ خلق لھم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ"

(اور اسی کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہارے ہی جنس کی بیبیاں پیدا کیں تاکہ تم کو اون سے راحت وتسکین ملے۔ اور میاں بی بی میں پیار اور اخلاص پیدا کیا۔)

مردوں کی برابر کی حصہ دار تھیں۔

غرض اوس زمانہ میں بکثرت ایسی لایق وفایق۔ عالمہ۔ فاضلہ اولوالعزم اور جلیل القدر خاتونیں گذری ہیں جنکے مقدس زندگی کے پاکیزہ حالات اور عظیم الشان کارنامے ہمارے عروج و اقبال کے پارینہ افسانوں کے قابل دید ابواب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لائق۔ تعلیم یافتہ اور اپنے حقوق سے متمتع عورتوں کی شرکت واعانت کی بدولت اس زمانہ کے مسلمان مردوں کی حالت بھی نہایت اچھی تھی۔ ان کی زندگی کارہائے نمایاں کا سلسلہ ہوتی تھی اور مسلمان من حیث القوم معراج ترقی پر پہونچے ہوئے سمجھے جاتے تھے۔

پس اس عام قاعدہ کے موافق لائق بیوی کی شرکت و استعانت کی باعث علی بن محمد کی رفتار ترقی بہت تیز ہوگئی یہاں تک کہ خلیفہ وقت المقتدی لامر اللہ کے دربار تک رسائی ہوئی اور سلطنت کے رکن اعظم بن گئے۔ ثقۃ الدولہ کے معزز خطاب سے ممتاز ہوکر بغداد کے روسائے عظام میں شامل ہوئے۔ انہی دنوں نیک بخت شہدہ کی جب آیا دجلہ کے کنارے ایک نہایت عالیشان خانقاہ اور اس سے متصل ایک بہت بڑا عظیم الشان مدرسہ تعمیر ہوا۔ نیک نفس شہدہ ہمیشہ عام خلائق کے فائدہ رسانی کے لئے مختلف تدابیر سوچتی اور ان پر عمل کرتی رہیں اور انہی کوششوں میں سنہ ۵۷۴ھ کی تیرہویں محرم کو یکشنبہ کے روز اس پاک نہاد خاتون کا انتقال ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اگرچہ بغداد کے باب ابرز کے حوالی میں مدرسہ تاجیہ کے قریب شہدہ کاتبہ کو دفن کیا گیا لیکن حقیقت پوچھو تو:-

بعد از وفات تربت او در زمین مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار اوست

راقم

سید خورشید علی

(حیدرآباد۔ دکن)

قدسیہ

بسلسلۂ سابق

اور سیدھے بازار کا راستہ لیا اور اسی بنیے کی دوکان پر پہونچا جسکے یہاں سے اپنا پورا اسباب بیچ ڈالا تھا۔ عارف کو یہ معلوم تھا کہ بنیا اسے مفت یا ادھار کسی صورت میں مدد نہیں دیگا مگر اسکے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ تمام گانوں خالی ہوچکا تھا اور کوئی ایسا نہ تھا جو اسکے ایسی حالت پر کچھ مدد کرتا

عارف نے بنیے کو دوکان پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو اس سے نہایت ہی عاجزی سے کہا کہ "لالہ جی میں نہایت ہی شرمندہ ہوں مگر کچھہ کر نہیں سکتا سوا اسکے کہ آپ کے پاس آیا ہوں بعد میری بیوی بچے پر رحم کہا لیے اور مجھے تھوڑا سا اناج دیجئے - میں یہ نہیں کہتا کہ آپ مجھے مفت دیں بلکہ اسکے عوض مجھسے کچھہ کام لیں" یہ سنکر لالہ جی نے کہا "اجی حضرت - آپ کی خاطر کہکر تو میں نے آپ کا اتنا سب اسباب خریدا آپ کیا چاہتے ہیں - اور کام تو میرے پاس کچھہ ہے نہیں خصوصاً آپکے قابل" عارف نے پریشان ہوکر جواب دیا "لالہ جی اسوقت میں قابلیت و اہلیت کو نہیں جانتا میں اپنی بھوکی بیوی کی جان بچانا چاہتا ہوں - جو کام ہو تبلائیے میں کیے دیتا ہوں اور اسکے عوض میں مجھے کچھہ اناج دیجیے"

لالہ جی - اگر یہی مرضی ہے تو میں تبلائے دیتا ہوں - اوپر والا پورا کمرہ صاف کر ڈالو اور یہ سب اسباب اسمیں اچھی طرح سے رکھہ دینا - مگر ذرا سنبھال کر - کہیں ایسا نہ ہو کہ اسباب تم توڑ ڈالو - اگر مرضی ہے تو یہ کام کر دو اور یہ مٹھی بھر اناج لیجاؤ" بیچارے عارف نے بھی غنیمت جانا اور جھاڑو اٹھا کر اوپر چلا گیا - مگر بیچارے کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جھاڑو کیسے دی جاتی ہے - تھوڑی دیر تو کھڑے ہوکر اپنی حالت پر سوچا کیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے مگر پھر فوراً قدسیہ کا خیال آگیا اور ٹیڑھے ٹیڑھے ہاتھہ مار کر جھاڑنے لگا - جب سب کمرہ صاف ہوگیا تو پھر نیچے سے اسباب اوپر لیجانے لگا - ناظرین خود خیال کر سکتے ہیں کہ اس وقت عارف کی کیا حالت ہوگی - ایک معمولی مزدور سے بھی بدتر ہر کیونکہ وہ بھی ایک مٹھی اناج کے لیے اتنی سخت مزدوری ہرگز نہیں کرے گا - مگر اس بیچارے کو بد قسمتی نے ایسا ستایا کہ یہ ہر کام کرنے کے لئے تیار رہتا کوئی آدھا اسباب اوپر نہ گیا ہوگا کہ شام ہوگئی اندھیرا چھانے لگا - جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا عارف کا دل اور دھڑکتا اور تڑپتا اور وہ دل ہی دل میں کہتا تھا کہ بیچاری قدسیہ میری راہ دیکھتی ہوگی اس سے میں نے کہا تھا کہ میں ابھی تمہارے لیے کچھہ کھانے کو لاتا ہوں - مگر ابھی تو آدھا اسباب اور بھی پڑا ہے - وہ بیچاری کیسی پریشان ہوگی اور بیچارے حفیظ کا کیا حال ہوگا - اسے آج کچھہ بخار بھی ہے - کہیں ایسا نہو کہ اسکی طبیعت اور زیادہ

علیل ہو جائے۔ انہیں خیالات میں غرق تھا اور پریشانی اور بڑھ رہی تھی کہ اتنے میں لالہ جی آن پہونچے۔ عارف نے یہ موقع اچھا جانا مگر بہت ہی نرمی اور عاجزی سے لالہ جی سے کہا "حضور، میں اپنے گھر تھوڑی دیر کے لئے جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اناج دیجئے تو وہ بھی دے آؤں۔ میں ابھی واپس آتا ہوں اور آپ کا کام سب پورا کر دوں گا"

لالہ جی یہ سنکر بگڑ گئے اور کہا کہ "یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ کام پورا کرو اور پھر جاؤ" عارف نے پھر عاجزی سے کہا مگر لالہ جی ہاتھ پیر جھاڑتے ہوئے آگے کو نکل گئے اور اس غریب کی ایک نہ سنی۔ آخرش چار و ناچار بیچارا عارف اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ ادھر عارف کی یہ حالت ادھر قدسیہ عجب پریشان ہو رہی تھی۔ شوہر کے انتظار نے بیقرار کر دیا تھا۔ خوفناک خیالات اور ستارہے تھے جیسے اُدھر پریشان کر رہی تھی۔ حفیظ کی علالت اور بھی صدمہ پہونچا رہی تھی۔ مغرب ہو چکی تھی نہ گھر میں دیا ہے نہ چراغ۔ اپنے عزیز بچے کو گود میں لئے بیٹھی دروازہ پر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہے ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتی ہے غرض اس انتظار میں عجیب اضطراب تھا۔

آہٹ پہ کان در پہ نظر دل میں اضطراب

عادت ہی پڑ گئی ہے ہمیں انتظار کی

آخرش جب بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو کواڑ کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی اور اپنی نظر ادھر ادھر دوڑا کر دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں دور کوئی شخص آتے ہوئے نظر آیا۔ جب وہ قریب آیا تو یہ خوش ہوگئی اور اپنے خاوند سے (کیونکہ یہ عارف ہی تھا) یوں کہا "کیوں عارف خیریت ہے نا۔ اتنی دیر تم کہاں رہے" عارف نے پورا قصہ کہہ سنایا اور اناج بھی اسے دیا۔ قدسیہ نے خوشی خوشی کھانا پکایا اور میاں بیوی اپنی محنت کی کمائی کی روٹی کا مزا لینے لگے۔ کھانا کھا کر عارف نے قدسیہ سے کہا کہ آج رات تو تم آرام سے گذارو اور کل صبح ہم لوگ سومناتھ چلیں گے۔"

رات بھر تو ان میاں بیوی نے عجیب پریشانی میں گذاری اور صبح ہوتے ہی ان لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی قطاریں بہنے لگیں۔ کیونکہ آج یہ بیچارے اپنا موروثی گھر چھوڑنے

والے ہیں۔آج یہ بچارے گھر سے بے گھر ہونے والے ہیں۔آج یہ بچارے فقیروں کی طرح
در در پھرنے والے ہیں۔ آہ ایک وہ زمانہ تھا کہ یہ تو کیا ان کے گھر کا ادنیٰ خادم بھی کبھی اس
گھر کو چھوڑنے کا خیال تک نہ کرتا تھا اور آج یہ زمانہ آگیا یہ خود اس افلاس کی حالت میں اپنا
گھر بار چھوڑ کر نہ جانے کس کے ہاں اور کدھر جا رہے ہیں۔جب اُجالا خاصا ہو گیا تو قدسیہ
نے عارف سے کہا کہ "چلو یہ سہانا وقت ہم اپنے سفر میں گذاریں۔ یہ سنکر عارف بالکل خاموش
ہو گیا۔ جانے اسکے دل میں کیا کیا خیالات آرہے ہونگے۔تھوڑی دیر میں اسنے پیارے بچے
کو گود میں اُٹھا کر کہا۔بیٹا حفیظ چلو آج ہم تمھیں سیر کرالائیں روز تو تمھیں نوکر لیجایا کرتے تھے مگر آج
ہم خود تمھیں لیچلتے ہیں۔اس فقرے نے عارف کے دل پر ایک تیر کا اثر کیا اور کھڑا ہو گیا اور زبان
سے یہ چھوٹا سا لفظ نکلا "چلو"۔ اُف اس لفظ نے عجیب حشر بپا کیا۔ قدسیہ کی آنکھوں سے آنسو
بہنے لگے۔ اور اسکو روتے دیکھکر عارف بھی رونے لگا۔ دونوں ایک دوسرے سے ملکر رونے
لگے۔جب روتے روتے تھک گئے تو باہر نکل آئے۔مگر دو چار ہی قدم چلے ہونگے کہ یہ
لوگ رک گئے اور مڑ کر اپنی موروثی کوٹھی کو ایک حسرت کی آخری نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اسوقت
کا سین بھی عجیب عبرتناک ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے عارف گود میں اپنا بچہ
لئے کھڑے ہیں۔برابر ان کی بیوی ایک پرانی ساری پہنے کھڑی رو رہی ہے آہ بچارے
عارف کے دل پر اس وقت کیا گذرتی ہوگی۔اس وقت وہ اپنے باپ دادا کی موروثی کوٹھی
چھوڑ رہا ہے۔ وہ کوٹھی جس میں اسکا بچپن گذرا جس میں وہ بڑا ہوا اور جس میں وہ اپنی مزیدار
زندگی گذار رہا تھا۔افسوس کہ وہ کوٹھی ایسی حالت میں چھوڑ رہا ہے۔اسکی ہر در و دیوار سے
نہیں بلکہ ہر اینٹ سے اسے نہایت درجہ کا اُنس تھا۔اگر اس وقت اس بیجان مٹی کے ڈھیر
میں جان ہوتی کیا وہ اپنے مالک عارف کو اس طرح سے جانے دیتی نہیں نہیں اس عمارت
کا ذرہ ذرہ ان میاں بیوی کے قدموں پر گر جاتا دیں جاتا مگر ان کا دامن نچھوڑتا اے خوشنما
عمارت اب تو کیوں کھڑی ہے اونچی اونچی دیوارو اب تم کس کی ہمت پر اس قدر سرکشی کر رہی ہو

اے نفیس محرابو اب یہ تمہارا حسن کس کے لیے ہے۔ اے اچھے اچھے کمرو اب تم کس بات پر نازاں ہو۔ تمہارے سجانے والے اور تم میں بسنے والے جنکا تمہیں فخر تھا اور جن کو تمہارا فخر تھا انہیں دیکھو وہ سامنے کھڑے رو رہے ہیں سب بے حس و حرکت کھڑے تمہیں دیکھ رہے ہاں وہ یہی سوچ رہے ہونگے کہ اب تم میں کون رہے گا کون بسیگا۔ عارف کے بدلے اب تم میں لٹیروں کی ٹولیاں بسیں گی۔ قدسیہ کے سریلی آواز کے بدلے اب تم میں بوم بولے گا۔ اب بہتر ہے کہ تم بھی اپنے عزیز آقا کے یاد میں گر جاؤ مسمار ہو جاؤ اور جیسے اُس چھوٹے خاندان کی بربادی ہو رہی ہے ویسے ہی تم اپنی ہستی کو مٹا دو۔ آخرش انہوں نے اپنے مکان کو آخری سلام کرکے آگے کو قدم بڑھایا مگر آنکھیں وہیں لگی رہیں تھوڑی دیر میں کوٹھی نظر سے غائب ہو گئی اور یہ لوگ اپنی سخت منزل طے کرنے لگے۔

مصیبت پر مصیبت

اس وقت دوپہر کا وقت ہے آفتاب بالکل سر پر ہے۔ گرمی سخت شدت کی ہے۔ لو بڑے زور سے چل رہی ہے۔ درخت تو بہت سے ہیں مگر کوئی ایسا سایہ دار نہیں جس کے تلے بیچارا مسافر دو گھڑی آرام لے۔ کنوئیں راستہ میں کئی ہیں مگر کسی میں پانی نہیں جس سے غریب پیاسا مسافر اپنی پیاس بجھاسے۔ ایک سیدھی سڑک ہمارے بچھڑے ہوئے دوست عارف سومناتھ تک گئی ہے۔ شاید اسی سڑک کے ہمارے بچھڑے ہوئے دوست عارف اور قدسیہ بھی سومناتھ گئے ہونگے۔ مگر دور میں کچھ لوگ جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ دو آدمی آہستہ آہستہ قدم اوٹھاتے آگے کو بڑھ رہے ہیں۔ انمیں سے ایک کے کندھے پہ ایک گٹھری بھی ہے یہ ان بیچارے مسافروں کا اسباب ہوگا۔ قریب پہونچنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی بیچارے غریب الوطن عارف اور انکی بیوی قدسیہ ہیں۔ عارف کے کندھے پر سر ڈالے ہوئے بیچارا حفیظ پڑا سو رہا ہے۔ اسکی طبیعت بہت علیل معلوم ہوتی ہے۔ اور دھوپ نے اسے اور بھی لاغر کر دیا ہے

قدسیہ کے ساری کی آنچل میں کوئی چیز ہے جو وہ نکال کر خود کھا رہی ہے اور عارف کو بھی دے رہی ہے۔

مگر ناظرین کو یہ سنکر تعجب ہوگا یہ بچارے اس وقت درختوں کے سوکھے پتے چبا رہے ہیں۔ ان کی ایسی حالت دیکھکر ہمیں افسوس ہوتا ہے مگر یہ آخر کیا کرتے۔ اس کڑی منزل کو طے کرنے کے لیے جسم میں کچھ قوت بھی ہونی چاہئے اور پیٹ میں جب تک کچھ نہ پڑے جسم کا کوئی عضو کام نہیں کرسکتا لہذا ان بچاروں نے یہی مناسب جانا۔ زبردستی تھوڑا سا کھانے کے بعد قدسیہ نے کہا "خدا نہ کرے آج حفیظ کی طبیعت بہت بُری ہے۔ اللہ بچائے یہ سنکر عارف نے کہا کہ "آفتوں پر آفتیں آتی ہیں۔ کوئی کہانتک سہے جائے۔

جسکے جواب میں قدسیہ نے کہا کہ "آفتوں کا آنا تو ہمارے اختیار میں نہیں ہے مگر انکا سہنا بلکہ خندہ پیشانی سے سہنا ہمارے اختیار میں اور ہمارا کام ہے۔ صبر کرو تھوڑے دنوں اللہ چاہے تو ہم پہلے سے خوشی اور مسرت سے دن گذارنے لگیں گے۔ مگر مجھے اپنے حفیظ کی نسبت بڑا فکر ہو رہا ہے۔ چھوٹا سا بچہ۔ دھوپ ایسی سخت اور پھر بھوک پیاس الٰہی فضل کر" یہ کہکر سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا کنواں نظر آیا ادھر کو یہ مڑے۔ خوش قسمتی سے اس میں کچھ پانی بھی تھا۔ مگر نہ کوئیں پر کوئی چیز تھی جس سے وہ پانی نکالتے اور نہ ان کے پاس کوئی لوٹا تھا۔ تھوڑی دیر تک تو کوئی ترکیب سوچا کیے مگر پھر مایوس ہو کر کنوئیں کے برابر ایک گڑھے میں کچھ پانی بھرا تھا اسی میں سے انہوں نے چلو بھر کے پانی پیا اور پھر اپنے عزیز حفیظ کو لیے اسی کنوئیں کے کنارے پر بیٹھے رہے۔ اس وقت واقعی بچے کی حالت بہت ہی علیل تھی اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس دنیا میں چند گھنٹوں ہی کا مہمان ہے۔ بچہ کی ایسی حالت دیکھکر ماں باپ کے حواس باختہ ہوگئے۔ ادھر عارف اپنا سر دونوں ہاتھوں پر دھرے سخت پریشان بیٹھے تھے۔ ادھر قدسیہ اپنے پیارے حفیظ کو گود میں لئے بیٹھی تک رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں اس غریب ماں سے اپنے بچہ کی حالت نہ دیکھی گئی اور وہ رونے لگی۔ روتے روتے کچھ کہتی بھی

تھی - اُف اس وقت کا اسکا ایسے پرو. ولہجہ میں کتنا ایک قیامت برپا کر رہا ہے - عارف نے
اپنا سرا وٹھا کر بچے کی طرف مایوسی بھری نگاہ سے دیکھا - بچہ کا چہرہ بالکل زرد ہے - آنکھیں بند
ہیں اور بے حس وحرکت پڑا ہے - نہ آنکھیں کھولکر اپنے روتے ماں باپ کو دیکھتا ہے - نہ
ہاتھ پیر ہلا کر اپنے دل کو تسلی دیتا ہے - کہیں ایسا نہو کہ یہ اس دنیا سے کوچ کر جائے
اور اپنے مصیبت زدہ ماں باپ کے دلوں پر ایک زخم کاری کر جائے - مگر سننا اسوقت
قدسیہ کہہ کیا رہی ہے -

"حفیظ بیٹا ذرا آنکھیں تو کھولو - دیکھو اس وقت تم کہاں ہو دیکھو تمہارے ماں باپ تمہیں
کہاں کہاں لئے پھر رہے ہیں - ذرا دیکھو تو - پیارے ذرا ہوشیار ہو جاؤ ہاتھ پیر ہلاؤ یوں پڑے
رہنے سے کیا نتیجہ - میں قربان ذرا اٹھو ادہر ادہر دیکھو - تمہارے پڑے رہنے سے ہمیں سخت
رنج ہو رہا ہے - بیٹا حفیظ گھبراؤ نہیں تمہارے ماں باپ تمہارے ساتھ ہیں - ہم تینوں ساتھ
ہیں اور انشاء اللہ ساتھ رہیں گے - پیارے تم ہمارے ساتھ ہی رہوگے نا؟ دیکھو ہمت نہ
ہارنا اچھا کہیں ایسا نہو کہ تم ہمیں چھوڑ کر چلدو - پیارے حفیظ ذرا ایک بوسہ لے کہا ہم سے جدا تو
نہیں ہوگے نا - ہمیں اکیلا تو نہیں چھوڑ جاؤ گے گو یہ تمہارے مصیبت جھیلنے اور فاقہ کرنے کے
دن نہیں ہیں مگر اچھے ماں باپ کا ساتھ دینا سعادتمندی ہے - میرے لخت جگر ہمیں یوں چھوڑ
کر کہیں سدھار نہ دینا اچھا - یہ کہکر ناک کے پاس انگلی رکھی اور کہا - سانس تو ہے (آسمان کی
طرف دیکھکر) الہی اگر تو میرے غریب بچہ کو زندہ نہیں رکھنا چاہتا تو خیر میں نے اسے تیری
مرضی پر چھوڑا مگر پروردگار میں تیری درگاہ میں اپنا آنچل پھیلا کر عاجزی کے ساتھ ایک التجا کرتی
ہوں کہ میرے حفیظ کو تو ایسا ہو کا پیاسا مجھ سے جدا نکر (اپنے بچہ کی طرف مخاطب ہو کر) بیٹا حفیظ
کیا اب تم آنکھیں نہ کھولوگے - اپنے روتے ہوئے ماں باپ کو ایکبار دیکھہ تو لو - پیارے
ذرا آنکھیں کھولو - میں قربان میرے نور نظر یہ کہکر اس سے ضبط نہو سکا اور یہ زور زور سے
رونے لگی

(باقی آئندہ) آ حمد

جھولا

دکھائی راہ بہت اب کے بار جھولے کی — رُت آئی بارے پس از انتظار جھولے کی

کئی مہینے پڑا جھولتا رہا پنکھا — اتار ہی نقل ہزاروں ہی بار جھولے کی

جتن بہت سے کیے ہاتھ ٹوٹ ٹوٹ گئے — مگر کہاں وہ ہوا خوشگوار جھولے کی

تمام گرمیوں مینہ کی ہر اک دعا کیساتھ — دعائیں مانگی ہیں بے اختیار جھولے کی

بڑا سا صحن ہو، سبزہ ہو، باغ چار طرف — گھٹائیں ہوتی ہوں مہک جھک نثار جھولے کی!

جو بیٹھیں جھولنے، ہلکی پھوار پڑنے لگے — تھوڑی سی بوندوں سے شبنم نما جھولے کی!

کوئی جھلائے، کوئی جھولے جوڑ کر پاؤں، — کوئی یہ گائے غزل آبدار جھولے کی!

جو ایک جھول چکے، دوسرے کو وار ملے — نہ جان کو ہو سکون و قرار جھولے کی!

کسی کا جھونٹا رہے اور کسی کا پینگ بڑھے — کسی سے جائے کوئی شرط ہار جھولے کی!

کسی کے چھوٹ پڑیں پاؤں کوئی جھولے سر — زمیں پہ دھم سے گرے! اب بہار جھولے کی!!

خدا کا شکر ہے باری کہ مل گیا جھولا — تلاش میں تھی بہت جانِ زار جھولے کی

پڑا ہے ایک ہی چھینٹا مگر یہ عالم ہے — کہ سارے شہر میں گھر گھر پکار جھولے کی

ہلالِ چرخ نہیں برق نے اڑائی ہے — یہ پینگ جھولنے کو زرنگار جھولے کی

نہ پانی پانی ہو کیوں دیکھ ابر ڈانواڈول — زمیں پہ طرزِ روش پر وقار جھولے کی

گلوں کو شاخ پہ کیا کیا جھلائے ہے بلبل — الٰہی خیر ہو اس گلعذار جھولے کی!

ہلا نہ بیطرح بلبل کہ گل پریشاں ہیں — کمر نہ توڑے یہ تیرا پیار جھولے کی

تو روسیاہ ہو، جھولیں گے گل جب آئیگی — جھلانے والی نسیم بہار جھولے کی

کبھی نشیب کسی کو، کبھی کسیکو فراز — ہے نقل گردشِ لیل و نہار جھولے کی

نہ ہونگے ہم بھی کسی دن کہ اس گلستاں میں — ہمیشہ آئی گئی ہے بہار جھولے کی

یہ سرو باغ نہیں۔ گم ہیں نخلِ ماتم ہیں | کسی کے جھولنے کی یادگار جھولے کی
ہنسی کی بات کہو، غم کا کیا فسانہ ہے | کہ طرح ہونے لگی سوگوار جھولے کی
سُناتے ہیں ہمیں لوگوں کو واعظ خانم | برائی کرتی تھیں یوں ایکبار جھولے کی
"کہ لوگو اسی نکالی گئی ہے جنت سے | تو رسی پھینک دو تم بھی اتار جھولے کی
اسی کے دم کے سنے حوا کو دانہ کھلوایا | یہی تھی رسی وہ الله کی مار جھولے کی"
یہ فتوے سن کے نہ پوچھو کہ کس قدر دل میں | گرہ سی پڑ گئی واں پہ جو تھیں غمگسار جھولے کی
اور پہنے والا تھا جھولا، او کھٹنے والے کہیں | یہ نتیں بچ گئی ہونے سے خوار جھولے کی
سنا کسی نے جلتے تن سے یہ وعظ سن کے کہا | "بڑی بچاری تھی نہیں فوجدار جھولے کی
وہ اپنی سانپ سی چوٹی کی لیں خبر پہلے | تو ہم بھی پھینکدیں رسی اتار جھولے کی"
خدا بھلا کرے انیر اس زمانہ سازی کا | کہ جس نے بات رکھی برقرار جھولے کی"
سنائے آپ نے جھولے کے اسقدر اشعار | دگرنہ رسیاں ہوتی ہیں چار جھولے کی
اور اونچے بیٹھتے ہیں وہی جھولنے والے | زیادہ اس سے نہیں ہے سہار جھولے کی
لو ابر کھل گیا، سورج دکھائی دینے لگا | بس اب تو لیجئے پینگیں اتار جھولے کی

خدا نے چاہا تو جھولیں گے پھر جب آئیگی
جہان خشک میں فصل بہار جھولے کی

اڈیٹوریل

محمد احتشام الدین دہلوی

خوشخبری

گذشتہ پرچے میں ہمنے ناظرین خاتون اور قوم کو خوشخبری سنائی تھی کہ جناب سرکار عالیہ ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال نے مبلغ پانچہزار روپیہ واسطے ترتیب نصاب کے دئے ہیں۔ اس پرچہ میں ہم قوم کو ایک نہایت اہم خوشخبری سناتے ہیں۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ گذشتہ

سال تعلیم نسواں کمیٹی کیطرف سے ایک ڈیپوٹیشن بغرض حصول امداد حضور لفٹنٹ گورنر بہادر
کیخدمت میں حاضر ہوا تھا اور حضور ممدوح نے وعدہ فرمایا تھا کہ آیندہ بجٹ میں زنانہ اسکول
علیگڈھ کی امداد کا لحاظ رکھا جائیگا - اوسکے بعد خط وکتابت برابر ہوتی رہی اور گذشتہ
مارچ میں انسپکٹرس صاحب حلقہ اول نے اسکول کو ملاحظہ بھی فرمایا اور رپورٹ بھی کی -

اب سرکار عالیہ کی طرف سے حکم امدادی جاری ہوا ہے جسکی رو سے مبلغ پندرہ
ہزار روپیہ نقد واسطے تعمیر مکانات کے اور ڈہائی سو روپیہ ماہوار تک کی امداد منظور فرمائی ہے
اگر آج ہمارے پاس ڈہائی سو روپیہ کی آمدنی ہو تو ہم پورے ڈہائی سو گورنمنٹ سے
لے سکتے ہیں اور اگر سو روپیہ کی آمدنی ہو گی تو صرف سو ہی روپیہ ملیگا - اب بعد اس خوشخبری
کے قوم سے التجا ہے کہ ایک چالیس ہزار روپیہ کی رقم کوئی بڑی بات نہیں ہے -
اگر چالیس ہزار روپیہ جمع ہو جاے تو کل امداد کے ہم مستحق ہو جاوینگے - اور مدرسہ
نہایت شان سے چلنے لگے گا - گورنمنٹ عالیہ کی شکر گذاری ہر مسلمان پر واجب ہے -

کیفیت معائنہ زنانہ اسکول

جناب سلطانہ بیگم صاحبہ دہلوی اور سعید احمد بیگم صاحبہ مالکہ خاتون اسٹور دہلی نے
زنانہ مدرسہ میں تشریف لاکر اوسکا معائنہ فرمایا اور سلطانہ بیگم صاحبہ نے کیفیت معائنہ
لکھکر ہمارے پاس بھیجی ہے جسکو ہم نہایت شکر گذاری کے ساتھ درج رسالہ کرتے ہیں

(ایڈیٹر)

مسز عبد اللہ صاحب کے بلاوے سے اور نارمل اسکول کے دیکھنے کے شوق سے
میں علیگڈھ آئی - شکر ہے کہ پہلی اگست کو یہ شوق پورا ہوا - مگر افسوس ہے کہ کئی شہروں
میں ایک دو رہی سفر کرنیکے سبب سے زیادہ دن تک لڑکیوں سے بات چیت نہ
کر سکی - لیکن اس تھوڑے وقت میں بھی مدرسہ کی لڑکیونکی قابلیت پوری معلوم ہو گئی

کل نو مہینے اس اسکول کو کھلے ہوئے ہوئے ہیں جسمیں ڈہائی مہینے کی چھٹی رہی۔ ساڑہے چھ مہینے کی پڑہائی میں لڑکیوں نے قاعدہ ختم کرکے قرآن مجید کے پارے پڑہ لئے ہیں اور اُردو کی پہلی کتاب ختم کی۔ حساب گنتی اور لکھائی بہی خاصی اچھی ہے۔ اسکول میں بعض چھہ برس کی لڑکیاں ہیں۔ ایک چھوٹی چھہ برس کی لڑکی سے اول میں نے قرآن شریف سنا اور اُردو کی پہلی کتاب پڑہوائی۔ ایسی تیزی سے اور صاف زبان سے پڑہا کہ مجھکو بہت ہی تعجب ہوا۔ اسکی لکھائی میں ابجد کی تختی بہی درست لکھی ہوئی تھی۔ اگرچہ اور ملکوں اور قوم کے سامنے چھہ برس کی لڑکی کا اتنا جاننا کوئی نئی بات نہیں بلکہ معمولی سی بات ہوگی۔ لیکن ہمارے لئے بہت ہے کیونکہ ہمارے ہاں تو چھہ سات برس کی لڑکی کو کھیلنے اور کہانے کے ہی قابل سمجھتے ہیں۔ اتنی عمر کی لڑکیوں کا قرآن شریف اور اُردو اور سو تک ہندسہ جاننا خاصی ترقی کا نمونہ ہے۔ ایک اور چھوٹی لڑکی سے میں نے اُردو کی سری کی نظم پڑہوا کر اوسکا مطلب پوچھا کہ تم کیا سمجھتی ہو اس میں جانور کی تعریف ہے یا خدا کی اوسنے میرے ہر ایک سوال کا جواب ایسی ذہانت سے دیا کہ مجھکو بہت خوشی ہوئی اور امید ہے کہ یہ اسکول بہت جلد ہی ترقی کریگا لڑکیوں کی دیکھہ بہال اور پردے کا انتظام بہی بہت اچھا ہے۔ ایک پردہ دار مکان ہے۔ کئی اُستانیاں اور نوکر کام کاج کے لئے مقرر ہیں انکے علاوہ مسز عبد اللہ صاحبہ اور سکندر جہاں بیگم ہر روز جاکر خود اکثر لڑکیونکو پڑہاتی اور سمجھاتی ہیں۔ سلائی کا کام بہی لڑکیاں کرتی ہیں۔ نماز پڑہائی جاتی ہے جو کہ چھوٹی لڑکیاں پڑہنی نہیں جانتی ہیں وہ بہی رکوع اور سجدہ میں شریک ہوجاتی ہیں اُمید ہے کسی وقت یہی پودا بڑہکر درخت ہوگا۔ پہلیگا پہولیگا اور ہم ملک بہنوں کو فائدہ پہونچائے گا۔ مجھے اپنی ملکی بہنوں سے امید ہے کہ وہ اس مدرسے کو جو خاص ہمارا اپنا مدرسہ ہے اور ہمارے ہی فائدے کی غرض سے بنایا گیا ہے ترقی دینے کی کوشش کریں گی۔ فقط

راقمہ سلطانہ

امسال احاطہ بمبئی اور راجپوتانہ وغیرہ میں نارمل اسکول کی طرف سے دو ڈیپوٹیشن بھیجے گئے ہیں۔ بمبئی کے ڈیپوٹیشن میں قاضی عبدالعزیز صاحب سید بنیاد حسین صاحب اور ملا احمد صاحب ہیں اور ان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کسی ایک اور صاحب کو بھی اپنے ہمراہ لیجائیں۔ راجپوتانہ کے ڈیپوٹیشن میں آصف زماں صاحب۔ عبدالرحمن صاحب انصار احمد صاحب اور آغا علی صاحب ہیں۔ گو اسوقت ملک میں بکثرت ڈیپوٹیشن پھر رہے ہیں اور لوگوں پر چندوں کا بار بہت بڑھتا جاتا ہے لیکن چند قومی کام ایسے ہیں کہ جنکی امداد قوم پر فرض ہے کیونکہ وہ کسی خاص ضلع یا صوبے یا شہر سے متعلق نہیں ہیں اور نہ اونکا دائرہ کسی خاص حصے ملک تک محدود ہے۔ انہی کاموں میں سے زنانہ مدرسہ علیگڈہ بھی ہے اور ہمیں امید ہے کہ حامیان تعلیم نسواں جو اُنکی خواہش اور ضرورت بہت کچھ پہلے ہی تسلیم کر چکے ہیں ہمارے ڈیپوٹیشنوں کی امداد فرمائنگے۔

ہمارے معزز دوست سید اصغر علی خانصاحب انسپکٹر پولیس حیدر آباد تعلیم نسواں سے خاص ہمدردی رکھتے ہیں۔ اونھوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ آیندہ عید کو میں اس بات کی کوشش کرونگا کہ قربانی کی کھالوں کا روپیہ جمع کر کے نارمل اسکول کے لیے بھیجوں۔ ہم اونکی اس عنایت کے ممنون ہیں اور ہمکو توقع ہے کہ دیگر حامیان تعلیم نسواں بھی اس طرف توجہ فرمائینگے۔ ہر مقام پر ہزارہا قربانیاں ہوتی ہیں۔ مرد اور بیبیاں دونوں قربانی کرتے ہیں۔ اگر ناظرین خاتون اس بات کا التزام کریں کہ حامیان تعلیم نسواں کے ہاں سے قربانیوں کا روپیہ سالانہ نارمل اسکول کو مل جایا کرے تو بھی ایک معقول رقم مل سکتی ہے۔

ہم کو اپنے دوست مسٹر انعام الحق بی۔ اے کی ہمشیرہ کے انتقال کا حال سنکر

نہایت ہی سخت رنج ہوا - یہ لیڈی نہایت روشن خیال تھیں اور ابھی بالکل جوان عمر تھیں
انکے بے وقت انتقال سے اونکے شوہر مسٹر سلام اسحق پر جو ہمارے کالج کے
ایک قابل گریجویٹ ہیں اور ایک عزیز عہدے پر ممتاز ہیں سخت صدمہ ہوا ہے - ہمکو
مسٹر انعام اسحق اور مسٹر اسلام اسحق سے دلی ہمدردی ہے - مرحومہ نے چھوٹے چھوٹے دو
بچے چھوڑے ہیں - ہمارے رسالہ خاتون کی ابتدا سے خریدار تھیں - خدا مغفرت کرے

ہمکو مسماۃ میمونہ بیگم صاحبہ کے انتقال کا حال سنکر نہایت ہی رنج ہوا - میمونہ بیگم
صاحبہ خاتون کی خریدار اور ہمارے معزز خانصاحب محمد رسالدار تاولی کی ہمشیرہ تھیں
نہایت نیک نفس اور قابل بیوی تھیں - افسوس ہے کہ انکے انتقال سے کچھ دنوں بعد ان کے شوہر
کا بھی انتقال ہوگیا - چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہوگئے جو اب تاولی کے پاس ہیں - ہمکو
میمونہ بیگم مرحومہ کے اعزا و پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے -

ہم نہایت افسوس کے ساتھ ایک اور جوان عمر لیڈی کے انتقال کی خبر
شایع کرتے ہیں - یہ لیڈی مسز محمد صالح خان ہیں جنکا انتقال ابھی مکہ معظمہ میں ہوا ہے
یہ حاجی محمد یعقوب خانصاحب رئیس بہتاولی کی صاحبزادی تھیں - حاجی صاحب کی
صرف یہی ایک لڑکی تھی اور کوئی اولاد نہیں ہے - حاجی صاحب کے جوان لڑکے کا
پہلے انتقال ہوگیا تھا اب مسز صالح خان کے انتقال کے بعد جو صدمہ اونکو ہوا ہوگا
اوسکا اندازہ اولاد والے خود کرسکتے ہیں - ہمیں محمد صالح خانصاحب اور خاص محمد یعقوب
خانصاحب سے اونکے اس صدمہ اور رنج میں دلی ہمدردی ہے -

بعض لوگ ہر ہائینس بیگم صاحبہ والی بھوپال دام اقبالہا کے عطیہ مبلغ پانچہزار کے متعلق جو تیاری کورس کے لیے حضور عالیہ نے ہم کو عطا فرمایا ہے غلط فہمی سے یہ سمجھے ہیں کہ یہ "رقم اس شخص کو انعام میں دیجائیگی جو سب سے بہتر کورس تیار کر کے پیش کرے گا" اس غلط فہمی کی اصلاح ضروری سمجھ کر ہم یہاں اعلان کرتے ہیں کہ کورس انعامات کا اشتہار دے کر تیار نہیں کرایا جاوے گا بلکہ ٹکسٹ بک کمیٹی علیگڈھ میں قایم کی گئی ہے اوسکی زیر نگرانی ایک دفتر قایم ہوگا جس میں دو قابل شخص رکھے جائیں گے۔ جنمیں سے ایک اردو فارسی اور عربی میں قابل اور عمدہ وسلیس عبارت لکھنے کا ماہر اور مستند شخص ہوگا۔ جس کی مدد کے لئے اور انگریزی کتابوں سے مضامین اخذ و ترجمہ کرنے کے لئے ایک گریجویٹ دیا جاوے گا۔ ٹکسٹ بک کمیٹی ہفتہ وار انکے کام کو جانچتی رہے گی اور حسب موقعہ ہدایات سے اونکی رہنمائی کرتی رہیگی۔ ست کافی ذخیرہ اردو و فارسی عربی انگریزی فرانسیسی اور جرمن کی تعلیمی کتابوں کا فراہم کیا جارہا ہے

مذکورہ بالا قابلیتوں کے اشخاص کی تلاش میں ہم سرگرم ہیں۔ اب تک ہماری کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں کمیٹی کے خاطرخواہ آدمی ملجانے کی عنقریب توقع ہے خط وکتابت ہو رہی ہے۔ اسی اثنا میں ہم متوقع ہیں اس کام کے اہل اور لایق لوگ اپنی درخواستیں بھیجتے رہیں گے اور اپنی شرایط سے مطلع کریں گے اور دراسپنے کام اور قابلیت کا نمونہ بھی کمیٹی کے غور وپسند کے لئے ارسال کرینگے ہماری رائے میں جس قسم کا کورس ہمارے ذہن میں ہے اور جس کا سرسری خاکہ ہم نے اپنے رسالہ کے جون نمبر میں شایع کیا تھا کہ جسے دیکھکر ہر ہائینس دام اقبالہا نے عطیہ کا اعلان فرمایا، ایسا کورس کوئی ایک شخص بغیر مدد کافی ذخیرہ

کتب کے اور بغیر ہدایت و رہنمائی مختلف مذاق و قابلیت کے لایق ممبروں کی ایک کمیٹی کے جیسے کہ ہم نے قرار دی ہے نہیں بنا سکتا اور اس بدیہی بات کی آزمایش میں بیکار وقت کھونا ہم نہیں چاہتے۔ اور بہت جلد کمیٹی کے زیر ہدایت کام شروع کردیں گے۔ اُمید ہے کہ حامیان تعلیم نسواں ہم کو مفید کتابوں کے نام لکھنے اور جو اسکی قابلیت رکھتے ہوں وہ عمدہ اور دلچسپ و مفید مضامین خود لکھنے اور اون کا ہر قوم و ہر زبان کی کتابوں میں اتہ پتہ بتانے سے ہمیں مدد دینگے

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب، مولانا حالی، مولانا ذکار الله صاحب نے اس کورس کی نگرانی و امداد حتی الامکان قبول فرمائی ہے۔

لکھنو میں پردہ پارٹی

۱۴۔اگست کو لکھنو میں اہل خانہ مسٹر شاہ حسین بیرسٹرایٹ لا تعلقدار گدیہ نے اپنے مکان پر لکھنو کی بیگمات اور یورپین لیڈیوں کو "ایٹ ہوم" دیا۔ چونکہ ایسے مفید جلسوں کی کیفیت سے مطلع ہونا خاتون کی خاتونوں کا پہلا حق ہے۔ لہذا اخبار انڈین ڈیلی ٹیلیگراف میں جو انگریزی کیفیت اس جلسہ کی شایع ہوئی ہے اوس کا ترجمہ خلاصتاً درج ذیل کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

کل لکھنو کے لئے بڑی خوش قسمتی کا دن تہا کہ اوسمیں سب سے پہلے پردہ پارٹی منعقد ہوئی - یہ واقعہ معمولی نہیں بلکہ اوس سے لکھنو کی زنانہ سوسائٹی میں جو ابتک نئی تعلیم اور شایستگی کے اثر سے الگ تہلگ رہی تہی ایک انقلاب شروع ہوگا یہ پارٹی بیگم شاہ حسین نے دی تہی - پیاری میزبانہ کا ہاتہ اون کی پیاری بہن یعنی بیگم حبیب اللہ ڈپٹی کلکٹر منیجر ریاست محمود آباد بٹا رہی تہیں - بیگم مقبول حسین کی لڑکی

اور بھتیجی بھی خاطر تواضع میں سرگرم تھیں اور اپنے کام سے بہت خوش نظر آتی تھیں۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ ان دونوں بی بیوں کی شادیاں جدید اصول کے موافق بغیر کسی فضول دھوم دھام اور نمائش کے ہوئی تھیں۔ ترک رسوم و اصلاح کا ستارہ جوان نوجوان خاتونوں کی شادی کے وقت عروج پر تھا اب تک اُن کی عادات و اخلاق کا رہنما ہے۔

مہمانوں کی تعداد پچاس تھی لکھنؤ کی ممتاز یوروپین لیڈیز بھی بلائی گئی تھیں ضیافت کی چیزیں سب نہایت عمدہ اور پرتکلف تھیں انگریزی قسم کی چیزیں ایک انگریز کمپنی نے ہم پہنچائی تھیں تاش چوسر وغیرہ بیٹھکر کھیلنے کے کھیل بھی مہیا کیے گئے تھے کوٹھی کا شاندار ڈرائنگ روم بڑی خوشنمائی کے ساتھ آراستہ تھا۔ غرض اس دعوت کو ہر اعتبار سے دلچسپ و کامیاب بنانے کے لیے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مگر سب سے زیادہ دلکش اور خوشنما منظر ہندوستانی بیگمات کے شوخ رنگ ریشمی لباسوں اور یوروپین لیڈیز کی پوشاک کے ہلکی ہوائی رنگوں کی آب و تاب اور مقابلہ سے پیدا ہوا تھا۔ ہندوستانی بیگمات کے طرح طرح کے اور قیمتی زیورات یوروپین لیڈیز کے لیے نہایت خوشنما اور دلفریب اور ایک عجیب اور نئی چیز تھے۔ نہ صرف ہندوستانی بی بیوں کا یوروپین لیڈیز سے ملنا ایک عجیب چیز تھی بلکہ خود ہندوستانی بیگمات کا باہمدگر میل جول بھی ایک نئی بات تھی بعض تو اوّل اوّل بہت ہی شرمائی ہوئی نظر آتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ بے تکلفی کے ساتھ ہنسنا بولنا شروع ہو گیا۔ مجھے تو اسپر بہت ہی تعجب ہوا کیونکہ میں نے ہمیشہ یہی سنا تھا کہ ہندوستانی بی بیوں میں بے حد شرم و جھجک ہوتی ہے! بلکہ مجھے تو اُن کی کیفیت دیکھکر یہ خیال ہوتا تھا کہ وہ آج کی پارٹی سے بہت ہی خوش ہیں اور اسکا لطف لے رہی ہیں۔

میزبانہ اپنا آبی کریب چین کا پھولدار لباس بہت سلیقہ کے ساتھ زیب تن کیے ہوئے تھیں۔ اُنکا اور اُنکی عزیزہ بیگم مقبول حسین (ڈپٹی کلکٹر) کا لباس ٹھیٹھ ہندوستانی طرز کا نمونہ تھا جسمیں وہ نہایت شاندار نظر آتی تھیں۔ بیگم حبیب اللہ کا لباس ہلکے سبز رنگ کا زرکار تھا اور بڑی خوشنمائی کے ساتھ اُسے پہنے ہوئے تھیں۔ دیگر خوشنما لباسوں میں مسز نسیم (ایڈوکیٹ لکھنؤ) کا سفید گاؤن بہت شاندار تھا۔ مسز غلام الثقلین (سکرٹری صیغہ اصلاح تمدن محمڈن کانفرنس) اور مسز علی اوسط بیرسٹر کے لباس بھی بہت بھاری اور مطلّا تھے۔

امید ہے کہ یہ پردہ پارٹی بہت دن تک یاد رہیگی بلکہ لکھنؤ کی زنانہ سوسائٹی میں ایک تاریخی واقعہ شمار ہوگی۔

رقمہ ایک (یوروپین) لیڈی نامہ نگار

ریویو

حساب جَو جَو بخشش سَو سَو

یہ عنوان و مطلع ہے ایک کتاب کا جسکا اصلی نام "حساب خانہ داری" ہے اور جسے سید ممتاز حسن صاحب منیجر خاتون اسٹور دہلی نے سلطانہ بیگم صاحبہ اور مالکہ خاتون اسٹور کی فرمایش سے ترتیب دیا ہے۔ بالشت بھر سے سوا بالشت قد کی، خوشخط، مجلد سو سے زیادہ صفحوں کی یہ کتاب ہمارے پاس آئی ہے اول کے پندرہ بیس صفحوں میں ریل، تار، ڈاک، منی آڈر، پارسل، سامان سفر کے روانہ کرنے وصول کرنے وغیرہ کے قواعد جو روزانہ کام آتے ہیں اور دیگر مفید ہدایات اور عمدہ عمدہ معلومات کے بارہ مصالحوں سے اس کتاب کو چٹ پٹا بنایا ہے سحری اور افطار کے اوقات۔ کئی سال کی دیسی اور انگریزی جنتریاں بھی دی ہیں جنمیں ایک جنتری میں مہینوں کے نام دہی ہیں جو مستورات لیا کرتی ہیں۔ مختلف ممالک، اُنکے دارالخلافوں اور سکوں کے نام اور ہر قسم کے وزن، پیمانے وغیرہ بھی درج ہیں جنکے سبب سے کتاب کا یہ حصہ فی الحقیقت بہت کارآمد ہوگیا ہے۔ کوئی ایسا مجموعہ جسمیں دیکھکر مستورات واقفیت عامہ کی ضروری باتوں کا پتہ لگالیا کریں اب تک اُردو میں موجود نہ تھا۔ ہمیں امید ہے کہ مسٹر ممتاز حسن اس حصۂ کتاب کو جدید اضافوں اور تازہ اصلاحوں سے ہر سال رونق اور ترقی دیا کرینگے اس کتاب کے دوسرے حصے میں مختلف قسم کے حسابات اور یادداشتیں لکھنے کے لیے نقشے ہیں جنمیں خانے الگ الگ بنے ہوئے اور جدولیں کھنچی ہوئی ہیں۔ مثلاً جمع خرچ کا نقشہ، حساب روزانہ کا نقشہ، جنس ماہوار کا نقشہ، ملازمین کی تنخواہ کا لگا لگایا حساب، دھولائی کے کپڑوں کا نقشہ وغیرہ لطف یہ ہے کہ ہر مہینے کے لیے ہر ایک قسم کا نقشہ علیحدہ ہے۔ لڑکیوں کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ گھر کے حسابات لکھنے سیکھیں یہ کتاب سلیقہ اور طریقہ سے گھر کے حسابات رکھنے سکھاتی ہے اور باقاعدہ حساب لکھنے کی اچھی عادت ڈالنے کے لیے لڑکیوں کے واسطے بہت مفید ہے اور عام طور پر حساب کتاب خانہ داری کو صحت و قرینہ کے ساتھ رکھنے کے لیے سب کے واسطے کارآمد ہے بلکہ ہمارا خیال ہے کہ اصول و ترتیب کیساتھ گھر کے آمد و خرچ اور ہر قسم کے حسابات لکھنے سے چونکہ بہت سی فضولخرچیاں اور اسراف آئینہ ہو جاتے ہیں لہٰذا گھر کے انتظام میں بہت کچھ اصلاح و باقاعدگی پیدا ہو سکتی ہے یہ کتاب اسطرح حساب رکھنے میں بہت مدد دیگی۔ قیمت کاغذ قسم اول ۱۴ر قسم دوم ۱۲ر پتہ منیجر خاتون اسٹور دہلی۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۷۱

خاتون

جلد ۴ | ماہ رجب المرجب ۱۳۲۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۰۷ء | نمبر ۹

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

علی محمد خاں کے اہتمام سے
مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علی گڑھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہی اور اسکی سالانہ قیمت دے ۱/) اور ششماہی ۱۲؍ ہے

۲۔ اس رسالے کا صرف ایک مقصد ہی یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑہی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہی اور جبتک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہوتے ہیں اُسکی طرف ہمیشہ مردوں کو متوجہ کرتے رہینگے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑہنے کی انکو ضرورت محسوس ہوتا کہ وہ اپنی اولاد کو اُس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہی معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جاویں۔

۶۔ اس رسالے کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہی اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے طیار کیا جائیگا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڑہ ہونی چاہیے۔

عورتوں کے حقوق مذہب اسلام میں

چند روز ہوئے۔ اتفاق سے میری نظر عیسائیوں کے ایک ماہوار رسالہ پر پڑی جسمیں ایک مسیحی نامہ نگار عورت نے مذہب اسلام پر حملہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس مذہب نے عورتوں کو نہایت پست درجے میں رکھا ہے اور اون کو ذلت اور حقارت کے غار سے اوبھرنے نہیں دیا برخلاف مذہب عیسوی کے جس نے عورتوں کے حقوق کو بہت بلندی پر پہونچایا ہے اور اس باب میں کوئی مذہب ہمارے مذہب کے ساتھہ ہمسری کا دعوے نہیں کر سکتا!!

مجکو مسیحی نامہ نگار عورت کی اس تعصب بھری تحریر کو پڑھنے سے نہایت رنج ہوا۔ مگر میں نے اپنے دل میں کہا۔ کچھہ عجب نہیں کہ وہ مذہب اسلام سے بالکل خبردار نہو اور اوس کو معلوم نہو کہ اس مذہب نے عورتوں کو کس قدر آزادی اور کیا کیا حقوق عطا کئے ہیں

اس لحاظ سے وہ قابل معافی کے ہے۔ اوس نے غالباً وہی مضامین اور وہی کتابین پڑھی ہون گی جو پادریوں نے لکھی ہیں۔ اور جن میں ہر پہلو سے مذہب اسلام پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔

سب سے پہلے ہمکو غور کرنا چاہئے کہ جس زمانہ میں اسلام کا آفتاب جلوہ گر ہوا۔ اُسوقت عورتوں کی کیا حالت تھی۔ اون کی حالت نہایت پست تھی۔ اون کے حقوق پامال ہو رہے تھے۔ نوجوان لڑکیاں زندہ درگور کی جاتی تھیں۔ عورتیں عام طور سے ذلت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ بعض قوموں کا یہ خیال تھا کہ قیامت کے دن عورتوں کو اون کی نیکیوں اور بھلائیوں کا انعام نہیں ملے گا۔ بعض قومیں خیال کرتی تھیں کہ اگر عورتوں سے اون کے مرد کسی ادنیٰ سبب سے ناراض ہو جائیں تو اون کو فوراً طلاق دینا اور اپنے گھر سے نکالدینا نہایت مناسب اور ضروری ہے۔ بعض قوموں کا عمل تھا کہ میاں بیوی میں کیسی ہی ناچاقی ہو اور بیوی میاں کے ہاتھوں سے کیسی ہی تنگ ہو نہ کسی میاں کو یہ اختیار رہتا کہ وہ اپنی بیوی کو جدا کر سکے اور نہ کسی بیوی کو اجازت تھی کہ وہ میاں سے علحدہ ہو کر زندگی بسر کر سکے بعض قوموں میں مرد کئی کئی بیویاں کر سکتے تھے اور اس کی کوئی حد اونھوں نے مقرر نہیں کی تھی۔ بعض قومیں اس بات پر نہایت زور دیتی تھیں کہ کوئی حالت ہو اور کیسی ہی ضرورت پیش آئے ہر مرد کو ایک بیوی سے زیادہ نہیں رکھنی چاہئے۔ مہذب سے مہذب قوموں یعنی یہودیوں اور عیسائیوں نے بھی اوس زمانے میں عورتوں کی حالت کو بلند درجے پر نہیں پہنچایا اور اون کے ماننے والوں نے کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ عورتوں اور مردوں کے حقوق برابر ہیں۔ اور عورتیں بذات خود زندگی بسر کر سکتی ہیں۔

غرضکہ دنیا میں عورتوں کی یہ پست اور ذلیل حالت تھی کہ اسلام کا آفتاب عرب کے اُفق سے اوٹھتا ہوا نظر آیا۔ اس کے آنے سے تمام دنیا میں روشنی پھیل گئی اور جن قوموں نے اس روشنی کی پیروی کی۔ اون کی حالت بہت جلد ترقی کر گئی۔ اسلام نے نہایت دردناک آواز

سے پکارا کہ "اے بے مروت اور سنگ دل انسانو! نوجوان عورتوں کو زندہ دفن کرنے سے باز آؤ! سوچو اور غور کرو کہ جب تم سب خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا کہ یہ نوجوان لڑکیاں جو زمین کے اندر جیتی جاگتی دفن کی گئی تھیں۔ آخر کس گناہ پر قتل کی گئیں!"

اس نے عورتوں کی حالت کو ایک دم سے بلندی پر پہنچا دیا اور اون کے حقوق مردوں کے برابر کر دئے۔ دنیا ہی میں نہیں۔ بلکہ آخرت میں بھی چنانچہ اوس نے دنیا کی قوموں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ اسلام کو ماننے والے مرد ہوں یا عورتیں ہوں، خدا اور اس کے رسول پر یقین رکھنے والے مرد یا عورتیں ہوں، عبادت کرنے والے مرد ہوں یا عورتیں ہوں، سچ بولنے والے اور سچ پر عمل کرنے والے مرد ہوں یا عورتیں ہون، صبر اور تحمل کرنے والے مرد ہوں یا عورتیں ہوں، خدا کے سامنے عاجزی اور خلوص سے کھڑے ہونے والے مرد ہوں یا عورتیں ہوں، صدقہ اور خیرات دینے والے مرد ہوں، یا عورتیں ہوں، روزہ رکھنے والے مرد ہوں یا عورتیں ہوں، پاکدامنی اور عفت پر قائم رہنے والے مرد ہوں یا عورتیں ہوں، خدا کو ہر حالت میں یاد کرنے والے مرد ہوں یا عورتیں ہوں، ان سب کے ساتھ خدا نے وعدہ کیا ہے کہ اون کے گناہوں کو معاف کرے گا اور اون کو بڑے بڑے انعام عطا کرے گا۔ ایسی صاف اور صریح آیتوں کے سننے کے بعد مسلمانوں نے یقین کر لیا کہ دنیا کی طرح عورتیں آخرت میں بھی اون کی ہمنشین اور ہمدم ہیں اور اون کے اور مردوں کے درمیان کوئی فرق اور امتیاز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں خدا نے صاف صاف طور پر فرمایا ہے کہ اے مسلمانوں! تم میں سے کوئی مرد ہو یا عورت ہو۔ میں کسی کے نیک عمل کو ضائع نہیں کروں گا۔"

اسلام نے مردوں کو حکم دیا کہ عورتوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی سے پیش آؤ اور بتایا کہ جو مسلمان اپنی عورتوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کرتے ہیں۔ وہ بہت اچھے مسلمان ہیں۔ پھر کہا کہ

اگر تم کو اپنی بیویوں کی کوئی بات ناگوار گذرے تو اون کو طلاق دینے اور اون کو اپنے سے جدا کرنے میں جلدی نہ کرو۔ کیونکہ شاید بعض برائیاں تم کو ناگوار گذرتی ہوں اور خدا نے تمہارے لئے کچھ بھلائیاں اون برائیوں میں چھپا رکھی ہوں "۔ اوس نے اعلان کیا کہ طلاق نہایت سخت اور نازک مجبوریوں کا علاج ہے۔ اس قانون کو ہنسی کھیل نہیں بنانا چاہیے۔ کیونکہ مباح اور جائز چیزوں میں سے یہی ایک چیز ہے جسکو خدا غصہ اور نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اگر کوئی ایسی حالت ہو جس میں طلاق نہ دینے سے گھر کے امن وامان اور انتظام میں خلل آتا ہو اور کسی تدبیر سے میاں بیوی کی نا اتفاقی دور نہ ہو سکتی ہو اور اس سبب سے خانگی زندگی عذاب الہی کا نمونہ ہو تو مجبوراً دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہو جانا چاہیے۔ ورنہ ہرگز نہیں۔ میں نے اخباروں میں یوروپ کے حالات پڑھے ہیں۔ جہاں ایک مرد ایک عورت رکھ سکتا ہے اور اوسکو بدکاری کے سوا اور کسی حالت میں گو کہ وہ کیسی ہی نازک حالت ہو اور اس سے گھر والوں پر کیسی ہی مصیبت نازل ہوتی ہو۔ طلاق نہیں دے سکتا۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ اون ملکوں میں مرد اور عورت دونوں ایک دوسرے سے آزاد ہونے کے لئے نہایت ناجائز اور شرمناک طریقوں پر عمل کرتے ہیں۔

مسیحی کہتے ہیں کہ طلاق کے جائز ہونے کا خوفناک نتیجہ یہ ہے کہ عورتوں اور مردوں میں دلی محبت قائم نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ عورت کو ہر وقت مرد کی طرف سے طلاق ملنے کا خطرہ ہے "۔ میں کہتی ہوں کہ اگر عورت کو یہ معلوم ہو کہ کیسی ہی مجبوری اور کیسی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئے وہ مرد کے پنجے سے نہیں چھوٹ سکتی ہے تو اوس کے اور مرد کے درمیان محبت کی بنیاد مضبوط نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے اگر یہ بات معلوم ہو کہ اس رشتے کی بنیاد صرف باہمی محبت پر قائم ہے۔ اور اگر محبت نہ رہے تو یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تو اس حالت میں دونوں کی محبت کی بنیاد مضبوط ہوگی اور دو پایدار رہے گی۔

ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا قانون بھی جو اسلام نے مقرر کیا ہے اور جسپر مسیحی اور

اون کے سوا اور مذہب والے سختی کے ساتھ اعتراض کرتے ہیں۔ ایک نہایت عمدہ قانون ہے اور وہ بھی خاص مجبوریوں اور خاص ضرورتوں کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگر مسلمان اوس کو ناجائز طور سے استعمال کریں اور اوس کی حدود اور شرطوں کا خیال نہ رکھیں تو اسکا الزام مسلمانوں کی ذات پر ہے۔ اسلام پر نہیں ہے۔ دیاسلائی کے موجد نے دیاسلائی اس لئے ایجاد کی تھی کہ اوس سے ضرورت کے وقت آگ پیدا کی جائے اور اوس آگ سے زندگی کی ضرورتیں پوری کی جائیں۔ اگر کوئی شخص دیاسلائی سے یہ کام لے کہ لوگوں کے گھروں میں آگ لگاتا پھرے تو اس سے نہ موجد پر الزام آتا ہے۔ نہ دیاسلائی کے مفید ہونے پر۔ اسلام کا حکم یہ ہے کہ اگر ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی ضرورت ہو اور سب بیویوں کے حقوق برابر نہ رکھنے کا ڈر نہ ہو تو مسلمانوں کو اس کی اجازت ہے کسی اور صورت میں نہیں۔ اب اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی کیا ضرورت پیش آتی ہے۔ وہ ضرورتیں میں ذیل میں بیان کرتی ہوں۔

(۱) اگر کوئی عورت کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جائے۔ جو بہت مزمن ہو اور آسانی سے دور نہ ہو سکتی ہو تو مرد کے دل میں دو خیال گذرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر وہ ایسی تقدیری اور ناگزیر حالت میں اوسکو طلاق دے اور اپنے سے جدا کر دے تو یہ بات مروت اور شرافت اور انسانیت کے خلاف ہے کیونکہ ایسی حالت میں اوس عورت کو ایسا شوہر نہیں مل سکتا جس کو اوس کے ساتھ ہمدردی ہو اور جو اس کی ضروریات کا ذمہ دار ہو سکے۔ دوسرے یہ کہ اگر وہ اوس کو گھر میں رہنے دے اور اوس کے سوا کسی اور عورت سے شادی نہ کرے۔ تو اوس کی نسل کے قطع ہو جانے کا اندیشہ ہے اور ممکن ہے کہ وہ ایسی بیماریوں میں مبتلا ہو جائے جن سے چھٹکارا پانا مشکل ہو جائے اور اگر اون بیماریوں سے بچنا چاہے تو ممکن ہے کہ وہ بدکاری کے خوفناک اور تاریک غار میں گر جائے اس صورت میں اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ مرد اپنی اصلی بیوی کے سوا کسی اور عورت سے شادی کرے۔ لیکن فرض کرو کہ عورت کی جگہ مرد بیمار ہو اور اوس کی بیماری چھوت دار ہو اور ایک سے دوسرے پر اثر کرتی ہو۔ تو عورت کے لئے اس سے بہتر کیا تدبیر ہو سکتی ہے کہ

وہ مرد سے طلاق حاصل کرے اور اس طرح اوس کی متعدی بیماری کے اثر سے اپنے تئیں اور اپنی ہونے والی اولاد کو محفوظ رکھے اور کسی تندرست شوہر سے شادی کرکے اپنے اوس فرض کو پورا کرے جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے۔

(۲) اگر کوئی عورت بانجھ ہو اور اوس سے اولاد پیدا ہونے کی توقع نہو تو مرد کے لیے اسکے سوا کیا چارہ ہے کہ وہ کسی اور عورت سے بھی شادی کرے اور اپنی نسل کو دنیا میں قطع نہونے دے۔

(۳) دنیا میں عورتوں کی تعداد مردوں سے عام طور پر زیادہ ہے۔ مگر مردوں کو کئی بیویاں کرنے کی اجازت نہ دی جاے۔ تو اوسکا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی عورتیں بلا شوہر کے زندگی بسر کریں گی۔ جیسا کہ یوروپ میں دیکھا اور سنا جاتا ہے۔ اور ایسی عورتوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ طرح طرح کی خوفناک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں اور بیماری اور افلاس کی حالت میں اور اُس حالت میں جبکہ وہ موت کے کنارے ہوتی ہیں، اون کے لیے کوئی پناہ دینے والا اور کوئی خبر گیری کرنے والا نہیں ملتا اور آخر کار، وہ خودکشی کرتی ہیں۔

یہ کہنا کہ ایک سے زیادہ بیویاں کرنے میں مرد سب کے ساتھ دلی محبت نہیں کر سکتا۔ ایک غلط خیال ہے۔ انسان کا دل ایسا وسیع ہے کہ اوس میں ایک سے زیادہ انسانوں کی محبت بے تکلف سما سکتی ہے۔ کیا ہر ماں یا ہر باپ کے دل میں اوس کے تمام بچوں کی محبت نہیں سما سکتی؟ میرے نزدیک کئی بیویوں کے ہونے سے مرد کی محبت میں کوئی فرق نہیں آسکتا۔ بشرطیکہ کوئی اور سبب اوس محبت کو نہ مٹاے۔

عیسائی مذہب والوں نے مسلمانوں کے مقابلے میں اپنے مذہب کی جو برتری اور خوبی بیان کی ہے وہ یہ کہ آسانی سے طلاق نہو سکے۔ اور ایک سے زیادہ بیویاں نہ کر سکنے کے سوا اور کوئی خوبی اور برتری نہیں ہے۔ مگر میں اچھی طرح ظاہر کر چکی ہوں کہ خاص مجبوریوں اور دشواریوں کی حالت میں اگر اسلام کے ان مسائل پر عمل نہ کیا جاے تو پھر کوئی علاج اس مذہب سے

نہیں بنایا ہے۔

یوروپ دعویٰ کرتا ہے کہ اوس نے عورتوں کی حالت کو بہت بلندی پر پہنچایا ہے اور اون کی عزت و برتری کو تسلیم کیا ہے۔ مگر میں سنتی اور اخباروں میں دیکھتی ہوں کہ وہاں عورتوں کو بلا اجازت شوہروں کے اپنی جائداد اور اپنے مال میں بھی تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہر۔ برخلاف اس کے اسلام کی رو سے عورتیں مردوں کی طرح جائداد کی وارث ہوسکتی ہیں۔ اونکو اختیار ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے مال میں سے جو چاہیں اور جب چاہیں خرچ کریں۔ مردوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی بیویوں کی رضامندی کے بغیر اون کے مال پر ہاتھ ڈالیں اور اوسکو اپنے کام میں لائیں۔ ہمارے مذہب کے علما جو فقیہ کہلاتے ہیں صاف صاف لکھتے ہیں کہ مردوں پر فرض ہے کہ وہ اپنی بیویوں کی تمام ضرورتوں کو اپنی طاقت کے موافق پورا کریں۔ مگر عورتوں پر صرف یہ بات اونھوں نے فرض کی ہے کہ وہ شوہروں سے محبت رکھیں اور اون کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم نہ نکالیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عورتیں گھر کی چار دیواری میں جو کام خانہ داری کا انجام دیتی ہیں یہ اونکا احسان ہے۔ اون کے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ کیا یہ بات سچ نہیں ہے کہ یوروپ ابتک اوس بلند خیالی کے درجے تک بھی نہیں پہنچ سکا جو ہمارے علمار نے فقہ کے مسائل تیار کرنے میں ظاہر کیا ہے؟ کیا سچ نہیں ہے کہ یوروپ کا یہ دعویٰ کہ وہ اپنی عورتوں کی عزت اور برتری حد سے زیادہ کرتا ہے۔ محض غلط ہے۔ اسلام نے عورتوں کی حالت کی جو اصلاح کی ہے۔ وہ اس سے پہلے کبھی کسی مذہب نے نہیں کی۔ اوس نے میاں بیوی کے حقوق جس خوبی اور عمدگی سے بیان کیے ہیں اور جن کی تفصیل میں کسی اور مضمون میں کروں گی، اونکو دنیا کے دوسرے مذہبوں میں تلاش کرنا محض بے فائدہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ اب یوروپ کے باشندے اون شایستہ اور پاکیزہ اصولوں کی طرف آتے جاتے ہیں۔ جو مذہب اسلام نے قایم کیے ہیں۔ مگر ابھی تک وہ ان اصولوں کی تہ کو نہیں پہنچے اور اون کے اسرار پر اچھی طرح مطلع نہیں ہوئے۔ اور ابھی وہ اس لایق نہیں ہوئے کہ ان ترقی

یافتہ اصولوں کی پوری قدر کرسکیں۔ اس کی مثالیں بہت سی ہیں جن کے بیان کرنے کیلئے بہت سا وقت درکار ہے۔ میں بطور نمونے کے ایک مثال بیان کرتی ہوں۔ میں نے ایک ماہوار رسالے میں جو عورتوں کی اصلاح اور حمایت میں نہایت قابلیت سے نکلا جاتا تھا اور جو اب افسوس ہے کہ بند ہوگیا یہ خبر پڑھی تھی کہ لندن کے ایک نامور عالم مسٹر ٹامس نے یہ رائے دی ہے کہ اس ملک میں اخلاق کی درستی کا اس سے بہتر کوئی علاج نہیں ہے کہ مرد ایک سے زیادہ بیویاں کیا کریں۔ اس رائے کو لندن کے اخبار "ولتھ" کے ایک نامہ نگار عورت نے نہایت پسند کیا ہے اور اخبار "ایسٹرن مسلم" میں مس اینی۔ وڈ نے اور اخبار "الکوا" میں لیڈی گک نے اس رائے کی نہایت زور شور سے تائید کی ہے۔

غرضکہ اب نہیں تو چند روز بعد ضرور وہ دن آئے گا جبکہ یوروپ کے باشندے اسلام پر طعن کرنا اور الزام لگانا چھوڑ دیں گے۔ اور ان عمدہ اور پاکیزہ اصولوں کی دل سے قدر کرنے لگیں گے۔ جو اسلام نے قائم کئے ہیں اور ان پر عمل کرنے کے لئے نہایت خوشی سے تیار ہوں گے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ یوروپ عیسائیت سے دور ہوچکا ہے اور رفتہ رفتہ اسلام سے قریب آتا جاتا ہے اور منزل مقصود اب کچھ بہت دور نہیں ہے۔

مس امراؤ بیگم۔
از انسٹیٹیوٹ گزٹ

دل کی صفائی

جو صفتیں کہ خداوند کریم میں ہیں کسی انسان میں کیا قدرت ہے کہ وہ ان صفات کی برابری کرسکے۔ لیکن اس کی مرضی یہ ہے کہ اسکے بندے بھی ویسے ہی پاک و عمدہ خصائل اختیار کریں۔ جیسا کہ وہ طاقتور ہے جیسا کہ وہ رحیم و رازق ہے اسی طرح اسکے صاحب مقدور بندے عاجزوں اور بندوں پر رحم کریں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجا لائیں کہ اس پاک پروردگار نے ہمیں اپنے دوسرے بندوں میں عزت بخشی ہے اور ممتاز کیا ہے۔ خدا کا وہی پیارا ہے اور دین و دنیا

ہیں سرخرو جو خلیق رحمدل نیکدل کہلائے۔ اور جو شیطان کی پیروی کرتا ہے وہ خدا سے
بھاگتا ہے اور خدا کی نظر رحمت سے دور رہتا ہے اوسکو نہ دنیا میں چین نہ عاقبت میں آرام
اخلاق انسان کی زندگی کا حسن اور خاصکر لڑکیوں اور مستورات کا بناؤ سنگار
ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس سے کیسے ہی دشمن کیوں نہ ہوں شیر و شکر ہو جاتے
ہیں۔ ہر ایک کی نظروں میں وقعت رہتی ہے۔ بدخلق انسان خواہ کیسا ہی
مالامال کیوں نہ ہو۔ وہ ہرگز مقبول نہیں ہو سکتا جبتک کہ اخلاق کے زیور سے
آراستہ پیراستہ نہو جاے بدخلق انسان کبھی خوش رہ نہیں سکتا برخلاف اسکے خوش خلق
انسان خندہ پیشانی شگفتہ رو نورانی صورت رہتا ہے۔ تم خود اسکی عادتیں جانچ سکتی ہو۔
انسان کی دلی حالت اچھے برے خیالات کا بہت کچھ اثر چہرے سے بخوبی ظاہر ہوتا
ہے۔ جو بیبیاں خلیق ہوتی ہیں اُنکے شوہر بھی بے دام غلام بنے رہتے ہیں پیاری
لڑکیو والدین اور کنبے کے تمام خرد و کلاں کی نیک دعائیں لیتی رہو۔ خوش خلقی کا زیور ہمیشہ
پہنے رہو۔ دل کیا ہے؟ وہ بیشک خدا کا گھر ہے خدائے پاک کی کیسی بزرگی ہے۔ بندوں
کی کیا طاقت کہ اسکی شان و بزرگی بخوبی سمجھ سکیں پھر جب مکین ایسا قادر مطلق ہے تو اُسکا
مکان کیسا ہونا چاہیئے؟ وہ بہت صاف شفاف کشادہ رہنا چاہیئے۔ پرنور پرضیا ہو۔ حسد
کینہ بغض غصہ کے کوڑے کرکٹ سے ہرگز ہرگز میلا کچیلا پراگندہ نہ رکھنا چاہیئے۔ اور اس پاک
پروردگار کے مکان کو جہالت کے پردے حسد کے کوڑے کینہ و بغض کے خار غصے کی آتش
کبر و ریا کے اندھیرے سے بچانا چاہیئے۔ جب صاحب خانہ کو اپنی خانہ داری کا انتظام کسی دوسرے
کے سپرد کرنا ہو تو غور کرنا چاہیئے کہ اس نئے منتظم پر اب کیا لازم ہو گیا؟ ہر ایک نقص سے بچانا
تاکہ صاحب خانہ کی لعنت ملامت سے اُسکی اٹھانی نہ پڑے۔ پس جب ظاہر و باطن کی اسقدر حفاظت
لازمی امر ہے تو پھر ہمیں چاہیئے کہ اس مصنوعی گھر سے کئی درجے خدا کے پاک گھر کو پاک و صاف
رکھیں موجودہ زمانے میں گھروں کی خوب صفائی کیجاتی ہے نئے فیشن سے آراستہ پیراستہ

کیا جاتا ہے عمدہ فرنیچر سے سجوایا جاتا ہے تاکہ بہت خوبصورت دکھلائی دے صاحب خانہ کی عزت بزرگی اور دوچند بڑھجاے۔ پس جب ظاہر ہے کہ سلیقہ آدمیت بہت کچھ گھر کی صفائی پر منحصر ہے تو بہتر ہیں چاہئے کہ ہم اپنے دلوں کو جو خداے پاک کا گھر ہے۔ حسد کینہ غصہ کبر و ریا کے عوض ان چیزوں سے آراستہ پیراستہ کریں۔ صاف دلی وصفائی کی سفیدی۔ استقلال بردباری کے درودیوار ہمت کی چھت خوف خدا ورسول پابندی شرع تہذیب خوش کلامی کی خوبصورت وخوشنما پرندوں چڑیوں کو اس گلشن میں چھوڑ دو شیریں بیانی کے پردے اوران سب کے بیچوں بیچ صاف ستھرا اورنفیس ہمدردی کا لیمپ روشن کردو۔ اور رحم کی کنجی سے مکان کو مقفل کردو۔ خوف خدا ونیک نیتی کو اوسکا دربان بناؤ۔ تاکہ حسد کینہ وغیرہ ادہر کو نہ آنے پائیں۔

جب حسد نہ ہوگا بیشک دلی ہمدردی پیدا ہوگی۔ جب ہمدردی ہوگی تو ساری قوم ایکدل بنجائے گی۔ جس سے قوم کا ستارا چمک اُٹھیگا۔ خدا ہماری بہنوں بھائیوں کو ایکدل ہونے کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔ فقط

راقمہ خاکسار

عباسی بیگم

زیادہ گوئی

یہ عیب اگرچہ بعض بھائیوں میں بھی ہوتا ہے۔ مگر بہنوں میں زیادہ ہوتا ہے جب آپس میں کسیکا ذکر کرتی ہیں تو اسکی پوشاک کا نام اور رنگ اور اسکے زیور کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔ کہ اس جیز کا پاجامہ ایسے رنگ کا تہا اور دوپٹہ اس قسم کا تہا اور کرتی اس کپڑے کی تہی وغیرہ۔ اسی طرح اگر سفر کا بیان کرینگی تو بہی ذرا ذرا بیان کرتی ہیں کہ سننے والیاں بہی تنگ آجائیں۔ پس اس قسم کی باتیں جن سے کوئی فائدہ نہ ہو داخل عیب ہیں۔ اور لڑکیوں کے

حق میں زیادہ باتیں بہت ضرر کرتی ہیں کہ ان کی زبان درازی کا سبب یہی ہو جاتی ہیں۔ جنکا وبال عمر بھر بھگتنا پڑتا ہے۔

ایسی کوئی بات نہ کہو جس کا انجام خراب ہو بلکہ بولنے یا پوچھنے سے پیشتر سوچ لو کہ اس کلام سے ہمارا یا دوسرے کا کیا فائدہ ہے۔ اگر کسی طرح سمجھو تو زبان پر لاؤ ورنہ سکوت کرو۔ ایک حکیم کا قول ہے کہ بعض اوقات ایک شخص مجھ سے بات کہتا ہے اور میرے پاس اسکا جواب اتنا اچھا ہوتا ہے۔ جیسا پیاسے کو ٹھنڈا پانی۔ مگر میں فضول ہونیکے خوف سے اسکو زبان سے نہیں نکالتا۔ اسی طرح لقمان حکیم کا حال لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں برس روز تک ہمیشہ جایا کرتے تھے۔ اور آپ زرہ بنایا کرتے تھے۔ ہر چند لقمان کا دل چاہتا تھا کہ معلوم ہو جاوے کہ کیا چیز بناتے ہیں۔ مگر سوال کو فضول جانکر کبھی نہ پوچھا۔ یہاں تک کہ حضرت داؤد نے اوسکو تمام کرکے پہنا اور فرمایا کہ لڑائی کے واسطے یہ بہت اچھا لباس ہے تب لقمان نے یہ جملہ کہا کہ فضول باتوں سے چپ رہنا دانائی کی بات ہے۔

پس جہانتک تم سے ہو سکے فضول بات نہ کہو۔ فضول بات کی عادت ہونے سے بعض اوقات کوئی کلمہ منہ سے نکلجاتا ہے۔ پھر اوسپر افسوس کرنا پڑتا ہے کہ کیوں کہا۔ اور اگر زبان قابو میں رہتی ہے تو کبھی بولنے پر ندامت نہیں ہوتی۔ فقط

خاکسار
شاکرہ اختر

روشن آرا بیگم

خواتین اسلام میں روشن آرا بیگم وہ عورت ہے جو علمی قابلیت اور فہم و ذکاوت میں نہایت ممتاز تھی یہ اورنگ زیب کی حقیقی چھوٹی بہن تھی۔ اور فطرتاً اُس سے بہت کچھ مشابہت رکھتی تھی۔ اسکی مادرِ مہربان ارجمند بانو بیگم عرف ممتاز محل تھی جسکا سایۂ عاطفت عہد طفولیت ہی میں اُس کے سر سے

اٹھ گیا تھا شاہجہاں نے اسکو تعلیم کیلئے ستی النساخانم کے سپرد کیا جو ممتاز محل کی بہت عرصہ تک مصاحب رہی تھی۔ ستی النساخانم مشہور شاعر طالب آملی کی ہمشیرہ تھی جسکو جہانگیر نے ۱۰۲۸ھ ہجری میں ملک الشعراء کے خطاب سے سرلبند کیا تھا۔ اور وہ نصیرا کی زوجہ تھی جو معروف شاعر حکیم رکنا کاشی کا بھائی تھا۔

ستی النساخانم بڑی قابل عورت تھی۔ فن طب اور قرأت وغیرہ میں اپنے ہمعصروں میں یکتا تھی۔ اور شاعری تو اسکے گھر کی لونڈی تھی۔ ستی النساخانم نے روشن آرا کو باقاعدہ تعلیم دی جس سے بہت جلد اُسنے علم و ہنر میں کمال پیدا کرلیا۔

روشن آرا کی ایک بڑی بہن جہان آرا تھی جس کی تصنیف سے مونس الارواح ہے۔ اور جو عہد شاہجہاں میں سیاست اور حکومت کی روح رواں تھی۔ اور بادشاہ پر اُسکو اسقدر اقتدار تھا کہ بغیر اُسکی صلاح و مشورے کے وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ روشن آرا سے جہان آرا بیگم کے ساتھ حاسدانہ تعلقات تھے اور دونوں میں اسی وجہ سے ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ جب تک شاہجہاں کا آفتاب اقبال درخشاں رہا جہان آرا کے جاہ و وقعت میں روزافزوں ترقی ہوتی رہی۔ اور اُس زمانہ تک روشن آرا کے حسد میں اضافہ ہوتا رہا۔

آخر ۱۰۶۷ھ میں روشن آرا کے نصیبے نے کروٹ لی۔ اور شاہجہاں کی علالت نے اُسکے بیٹوں میں خانہ جنگی برپا کردی۔ عالمگیر بھی دکن سے بڑے کروفر کے ساتھ دارالخلافت آگرہ کو روانہ ہوا اور اثنا راہ میں **دارا شکوہ** کی فوجوں کو شکست دیتا ہوا داخل آگرہ ہوا۔ اور یہ کوشش کرنیلگا کہ قلعہ پر کسی طرح قبضہ ہوجاے۔ اُسوقت تجربہ کار اور جہاں دیدہ بادشاہ نے اُسکو ایک محبت نامہ کے ذریعہ سے مدعو کیا۔ اور اورنگ زیب بھی والد بزرگوار کی زیارت پر آمادہ ہوگیا۔ شاہجہاں نے اس موقع پر حفاظت قلعہ کا بہت کافی انتظام کیا تھا۔ اور اسی غرض سے قلعہ کے اندر بہت سی قلماقنیاں مسلح پہرے پر متعین کردی تھیں۔ روشن آرا نے قلعہ کا یہ سب انتظام دیکھکر اورنگ زیب کو پوشیدہ طور پر فوراً اطلاع دی کہ وہ قلعہ میں آنے کا ہرگز ارادہ نہ کرے ورنہ جان کی خیر نہیں اور قلعہ کے سب

اندرونی حالات سے بھی اُسکو آگاہ کیا۔ اورنگ زیب نے یہ متوحش خبر سنکر عیادت شاہجہاں کے عزم کو فسخ کیا۔ اور روشن آرا کا وہ انتہا درجہ کا مشکور ہوا کہ اُسنے اُس کی جان ہلاکت سے بچائی۔ روشن آرا کی محبت اورنگ زیب کے دل میں اسوقت سے متمکن ہو گئی اور وہ بھی خانہ جنگی کے زمانہ تک قلعہ کے تمام حالات سے خفیہ طور پر اوس کو آگاہ کرتی رہی۔ آخر اس خانہ جنگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب نے اپنی چالاکیوں سے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور تھوڑے دن میں افق سلطنت تمام بغاوت کے گرد و غبار سے پاک و صاف ہو گیا۔

عالمگیر کے تخت پر جلوہ گر ہوتے ہی روشن آرا کا اختر بخت چمکا۔ شاہی خاندان میں اب اُس کی سب سے زیادہ عزت ہونے لگی۔ اور بڑی مشکل امور میں بھی بادشاہ اُس سے مشورہ طلب کیا کرتا۔ اب وہی رتبہ جو جہاں آرا کو عہد شاہجہاں میں تھا روشن آرا کو حاصل ہو گیا۔ اُس کی جاگیر میں بھی بہت اضافہ کیا گیا۔ ارکان سلطنت اُسکے در دولت پر نذریں پیشکش کرنے کے لئے حاضر ہوتے تھے اور وہ اُن کو گرانبہا خلعت عطا کرتی تھی۔

روشن آرا نے جہاں آرا بیگم کی طرح سے بہت جاہ و شوکت کے سامان کئے۔ اُس کی سواری کا جلوس اس شان سے نکلتا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں چنانچہ ڈاکٹر برنیر اپنے سفرنامہ میں اس چشم دید واقعہ کی ان لفظوں میں تصویر کھینچتا ہے۔

"چنانچہ آپ اپنے خیال کو کیسی ہی وسعت دیجئے مگر روشن آرا کی سواری سے زیادہ اعلیٰ درجہ کا تماشہ قیاس میں نہ آئے گا۔ یہ بیگم پیگو کے نہایت عمدہ اور بڑے قد آور ہاتھی پر ایسے میگھ ڈنبر میں سوار ہوتی ہے۔ جسکے سنہری اور لاجوردی رنگوں کی چمک قابل دید ہے اسکے ہاتھی کے پیچھے پیچھے چھ اور ہاتھی چلتے ہیں جن پر اُسکے محل کی معزز عورتیں ہوتی ہیں۔ اور اُنکے میگھ ڈنبر بھی شان اور خوبصورتی میں روشن آرا کے میگھ ڈنبر جیسے بلکہ تقریباً ویسے ہی ہوتے ہیں۔ شاہزادی کے بڑے بڑے اور خاص خاص خواجہ سرا بھاری بھاری پوشاکیں پہنے ہوئے منقش گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور ہاتھوں میں چھڑیاں لئے ہوئے ہوتے ہیں اور اوسکے ہاتھی کے اردگرد ایک رسالہ کشمیری اور تاتاری عورتوں کا

ہوتا ہے۔ جو نازو انداز اور سنگار کیے ہوئے خوبصورت اور بادپا گھوڑوں پر سوار ہوتی ہیں۔ علاوہ انکے اور بہت سے خواجہ سرا گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں جنکے ساتھ بڑی بھیڑ پیدل ملازموں کی ہوتی ہے۔ جو ہاتھوں میں بڑی بڑی چھڑیاں لئے ہوئے شاہزادی کی سواری کے دائیں بائیں بہت دور آگے آگے سامنے کی لوگوں کو ہٹاتے چلتے ہیں کہ راستہ صاف رہے۔ ان ساتھ ستر ہاتھیوں کا تول تول کر قدم رکھنا اور سکیھ ڈنبر کی چمک دمک اور نہایت خوش لباس اور بے شمار خدم وحشم کا انبوہ واقع ہیں دیکھنے والے کے دل پر شاہی شان وشوکت کا ایک عجیب اثر ڈالتا ہے۔ مگر میں ان سب دلفریب سامانوں کو فلسفیانہ بے اعتنائی کی نظر سے نہ دیکھتا تو بے شک میں بھی انھیں ہندوستانی کیشعروں کی مانند جو استعارے کے طور پر کہتے ہیں کہ "یہ شاہزادیاں نہیں بلکہ دیویاں ہیں جو ہاتھیوں پر سکھ ڈنبروں میں بیٹھی ہوئی خلایق کی نظروں سے پوشیدہ جا رہی ہیں" اپنے خیالات کی بلند پروازی کا مغلوب ہو جاتا۔ یہ حسین بیگمیں اپنے سکھ ڈنبروں میں یوں دکھائی دیتی ہیں گویا ہوا میں پریاں اُڑی جا رہی ہیں۔ ان بیگمات کی سواریوں کا تجمل اسقدر دلچسپ ہے کہ اوسکی یاد سے اب بھی (فرانس میں) طبیعت کو ایک مسرت حاصل ہوتی ہے۔"

حاصل یہ کہ روشن آرا کا عروج ابتدائے سلطنت عالمگیر میں معراج کمال پر پہنچ گیا تھا۔ لیکن مثل مشہور ہے "ہر کمالے را زوالے" بہت جلد اُسکو تنزل بھی ہو گیا۔

مورخین نے اسکی یہ وجہ لکھی ہے کہ عالمگیر تخت ہند پر بیٹھتے ہی کچھ دنوں بعد سخت علیل ہو گیا اس موقع پر روشن آرا نے سب انتظامات سلطنت اپنے ذمہ لے لئے۔ اور تمام احکام اسی کے نام سے جاری ہونے لگے۔ اُسنے شاہی مہر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اور تمام فرامین پر وہی مہر لگاتی تھی اسی کے ساتھ اعیانِ سلطنت کو اُسنے عیادت بادشاہ سے محروم رکھا۔ یہاں تک کہ بیگمات محل بھی عالمگیر کی حالت کو بچشم خود دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں۔ اس زمانہ میں اکیلی روشن آرا عالمگیر کی تیمار دار تھی۔ اور اسی کے حکم کے مطابق عالمگیر کا علاج ہوتا تھا۔ اس بنا پر سخت بے چینی پھیلی اور تمام لوگ روشن آرا کی ان حرکتوں سے برافروختہ ہو گئے۔ روشن آرا نے اسی کے ساتھ یہ اور غضب کیا کہ جب کہ عالمگیر کی ملکہ ہند و بیگم نے جسپر عالمگیر دل و جان سے فریفتہ تھا جتیانا

محل میں داخل ہوکر شاہنشاہ کو خود دیکھنا چاہا تو روشن آرا نے اُس کے نازک رخسارے پر ایسا سخت طمانچہ مارا کہ وہ تلملا گئی۔

کچھ دنوں کے بعد جب عالمگیر کو افاقہ ہوا تو اُسنے روشن آرا کی یہ نازیبا حرکتیں سنیں اور سکو ان باتوں سے ایسا رنج ہوا کہ روشن آرا کی اگلی وفاداری کے تمام کارناموں پر پانی پھر گیا اور وہ اسکی نظر سے اتر گئی۔ روشن آرا کو جو پہلے جاہ و عز حاصل تھا وہ بھی اب باقی نہیں رہا۔ یہاں تک کہ محل کی عورتیں بھی اُسکے سایہ سے بھاگنے لگیں کہ کہیں اس مرکز عتاب کے شمول میں وہ بھی معرض نقصان میں نہ پڑ جائیں ؎

کون ہوتا ہے بھلا وقت مصیبت کے شریک　　　کام جب دل پہ پڑا ساتھ جگر نے نہ دیا

لیکن اس پر بھی اورنگ زیب کا عتاب زیادہ تر دل ہی تک محدود رہا۔ اسنے روشن آرا کی جاگیر میں کسی طرح کی کمی بیشی نہیں کی۔ نہ اُسنے کسی اور طرح پر اپنے عتاب کا عملاً اظہار کیا۔ لیکن اس شاہی عتاب نے روشن آرا کے عیش و مسرت کو منغص کر دیا۔ اور اس زندگی سے اُسنے موت کو بہتر خیال کیا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انسان ایک بار رفعت کے معراج کمال پر پہنچکر اپنے کو قعر ذلت میں دوبارہ ملینا گوارا نہیں کر سکتا۔

روشن آرا نے یہ حالت دیکھکر عالمگیر سے اجازت چاہی کہ وہ شاہی محل سرا کو چھوڑکر کہیں اور بود و باش کا انتظام کرے۔ لیکن عالمگیر نے اس بات کو پسند نہیں کیا۔ اور اُسکو دوسری جگہہ رہنے کی اجازت نہیں دی۔ اس عدم اجازت کی قوی وجہ یہ تھی کہ روشن آرا اُس زمانہ میں اورنگ زیب کی شاہزادیوں کی اتالیق تھی اور اُنکو تعلیم دیتی تھی۔ عالمگیر نے سمجھا تھا کہ اس سے بہتر اتالیق شاہزادیوں کے لئے نہ مل سکے گی۔

اس بیگم نے بمقام دہلی انتقال کیا اور وہیں دفن بھی ہوئی۔

روشن آرا کی وفات کے متعلق جو عالمگیر نامہ میں ہے اُسکو ہم یہاں بجنسہ نقل کرتے ہیں۔

ن بلکہ عصمت بہ خصائل حمیدہ و شمائل پسندیدہ محبت باگرامی برادر انصاف داشت اما بادشاہ جہاں را

از مہاجرت جنیں مخدرہ شفیقہ دل غمگیں و دیدہ نمی شد۔ ناکام برضاے قادر مختار پرداختہ زاد راہ بجا آورد وخیرات ومثوبات بخوشنودی ارواح پاک نزاد مہیا ساختہ متعلقان مرحومہ را از ذکور واناث بہ فراوان عنایت و رعایت از لباس تعزیت بیروں آوروند۔"

روشن آرا عفت وعصمت میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھی۔ اُسکے انتقال کا عام طور پر گیا گیا اور اس سانحہ نے مستقل مزاج اور سنگدل بادشاہ کی معمولی حالت میں تغیر پیدا کر دیا اور سنکر اُس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

محبوب الرحمٰن کلیم۔ بی۔ اے۔

عورتیں قومی ترقی کا اعلیٰ ذریعہ ہیں

آج اس سال کا عرصہ ہوا یہ مضمون الہلال (مصر کا ایک عربی رسالہ) میں شایع ہوا تھا اسکا ترجمہ المعارف میں چھاپا گیا تھا۔ چونکہ یہ مضمون فی نفسہ انسان کے لیے ایک نہایت عمدہ دستور العمل ہے اسلیے ہم اسکو خاتون میں نقل کرتے ہیں۔ فی الحقیقت یہ اس قابل ہے کہ ہماری قوم کے وہ بزرگ جو تعلیم و تربیت کے حامی ہیں اسکو غور سے پڑہیں۔ اور اس بات کو خوب سمجھ لیں کہ قومی ترقی جسکی صدا ہر مجلس اور ہر محفل میں بلند کی جاتی ہے اوسکی بنیاد عورتوں کی تعلیم و تربیت پر ہے۔

کوئی قوم جو عورتونکی تعلیم و تربیت سے غافل ہے کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ وہ تمام اسباب ترقی جو اس مضمون میں بیان کئے گئے ہیں۔ اُن سب کا اصل الاصول یقیناً صرف عورتوں کی شایستگی اور تعلیم ہے جیسا کہ خود مضمون نگار نے اُسکو ثابت کیا ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم ہر طرح پر لڑکونکی تعلیم سے مقدم ہے۔ اور لڑکوں کی تعلیم کامل تعلیم نہیں کہلانے کی جبتک کہ لڑکیاں تعلیم پاکر اونکی مائیں۔ اور اونکی بیویاں نہ بنجائیں۔ ملک کی اصلی روشنی قوم کی اصلی ترقی سوسائٹی کی اصلی عظمت صرف اسی

ایک مسئلہ پر ہے جسکی طرف ابھی تک ہماری قوم کے بزرگوں نے کامل توجہ نہیں فرمائی ہے۔ اور اگر وہ اب بھی کچھ دنوں یوں ہی غافل رہیں گے۔ تو یہ کہنا پڑیگا کہ وہ اصلی ترقی کے خواہاں نہیں ہیں۔

اڈیٹر

اسمیں کچھ شک نہیں کہ سوسائٹی میں بہت سے امور ایسے ہوتے ہیں۔ جو ترقی اور تنزل پر اثر ڈالتے ہیں۔ اگر کوئی قوم پست ہوجاے۔ اوسکی حالت خراب ہوجاے۔ اوس کے تمام کاموں میں ابتری پیدا ہوجاے اور تجارت بے رونق ہوجاے تو ہم پہلی نظر میں یہی خیال کرینگے کہ اسکا سبب یا گورنمنٹ کی خرابی ہے یا رعیت کی جہالت۔ یا زمین کا سرسبز اور شاداب نہ ہونا۔ یا اسکے سوا اور اسباب ہونگے۔ جو ملک کی دولت اور اوسکی ترقی کے رستہ پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ اس حالت کا علاج اگر ہم تلاش کرنا چاہیں۔ تو ہم یہی تجویز کرینگے کہ حکومت کی اصلاح ہو۔ علوم کی اشاعت کی جاے۔ قوم کی تربیت میں کوشش کی جاے۔ زراعت اور تجارت میں جو خلل آگیا ہے وہ دور کیا جاے۔ یا اسی طرح کی اور باتیں تجویز کریں گے جو شایستگی کے لئے ضروری خیال کی جاتی ہیں۔ اور جن کے مفید ہونے میں کوئی شخص اختلاف نہیں کرسکتا۔

لیکن تنہا یہی امور ایسے نہیں ہیں جن پر دنیا کی قوموں کی ترقی یا تنزل کا دارومدار ہو بلکہ ممکن ہے کہ ان اسباب کی تاثیر کمزور ہو۔ یا وہ دوسرے پوشیدہ اسباب سے پیدا ہوئے ہوں جنکی کوئی پروا ہی نہیں کرتا۔ یہ سچ ہے کہ حکومت کا خراب ہونا اور حاکموں کا ظلم و ستم یہ دو سبب قوم کی ذلت اور پستی اور اوسکی حالت کی تباہی کے لئے کافی ہیں اور جہالت بھی بلاشبہ اون اسباب سے ہے۔ جو ملکوں اور قوموں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ اور ہم اس بات کا بھی انکار نہیں کرتے کہ علم کے وسیع اور عام طور پر اشاعت کرنے سے ہر قوم معراج ترقی پر پہونچ سکتی ہے۔ اور یہ حال دوسرے اسباب کا بھی ہے مگر ہم ان تمام اسباب پر اس وقت بحث نہیں کرینگے۔

ہمارے ملک کے انشا پردازوں نے ان سب کے مطالعہ میں کوشش کی ہے۔ اور انکو نکتہ چینی کے ساتھ جانچا اور پرکھا ہے۔ اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو شائستگی اور تہذیب پر ان امور کے اثر ڈالنے سے انکار کرتا ہو ہم ان امور کے اصلی اسباب پر بحث کرنی چاہتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ حکومت کی خرابی ملک کو تباہ کرتی ہے۔ تو یہ سچ ہوگا۔ لیکن پوچھنا یہ ہے کہ وہ خرابی کیونکر پیدا ہوئی۔؟ اگر ہم یہ کہیں کہ رعیت خود اپنے جاہل ہونے سے ذلیل اور پست ہوجاتی ہے۔ تو یہ بھی درست ہے۔ لیکن دریافت کرنا یہ ہے کہ رعیت کے جاہل ہونے کا سبب کیا ہے۔ اسی طرح اگر ہم یہ بات کہیں کہ زراعت اور تجارت کی طرف سے بے پروائی کرنا ملک کی خوش حالی اور سرسبزی کو ملیامیٹ کردیتا ہے تو یہ بھی صحیح ہوگا۔ لیکن ہم سے پوچھا جائے گا کہ اس بے پروائی کا کیا باعث ہے۔ یہ تنزل کے اسباب جو ہم نے بیان کئے انکی اصلی علت ضرور کچھ اور ہے جس کے معلوم ہونے سے ملک کی تباہی دور ہوسکتی ہے۔ یہی حال ترقی کے اسباب کا ہے اور انکی بھی اصلی علت کچھ نہ کچھ ہے۔ ہم ان تمام اصلی اسباب پر تفصیل کے ساتھ نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔ اور وہ اصلی اسباب جن کا ہم نے ذکر کیا حسب ذیل ہیں۔

(۱) عورت عورتیں ان طاقتور اور پوشیدہ اسباب میں سے ہیں جنکی تاثیر سوسائٹی پر ہوتی ہے۔ عورتوں کی شرمگینی۔ پردہ نشینی۔ نزاکت اور لطافت کو حقارت کی نظر سے مت دیکھو تم اپنی نوجوانی اور دوڑ دھوپ اور محنت اور کوشش پر مغرور مت ہو۔ میدان جنگ میں توپوں سے آگ برسانے۔ ملکوں اور براعظموں کی سیر و سیاحت کرنے۔ سمندروں کی تہ میں غوطہ لگانے بجلی۔ بھاپ اور نیچر کی دیگر قوتوں سے کام لینے اور انکو مسخر کرنے پر فخر نہ کرو۔ تم اپنی قوت اور شوکت سطوت اور جبروت سے عورتوں پر اپنے تئیں ترجیح مت دو۔ تم اپنے علم۔ صنعت۔ ایجاد اور انکشاف سے عورتوں کو مت ڈراؤ۔ تم کیسے ہی معزز اور بلند مرتبے کے۔ کیسے ہی عالم اور صناع ہو مگر یہ خوب سمجھ لو کہ تم وہی پودے ہو جنکو عورتوں نے اپنے ہاتھ سے لگایا۔

تم اونھیں کے دل اور اونھیں کی زبان کی مخلوق ہو۔ اگر اُن کا نازک اور کمزور دل نہ ہوتا تو تمہارا بےخوف و دلیر اور طاقتور دل کہاں سے آتا؟ اگر انکی نازک اور نرم انگلیاں نہ ہوتیں۔ تو تمہارے فولادی اور مضبوط ہاتھ کہاں سے ہوتے؟ بس عورتیں جو باورچی خانہ کے کام میں مشغول رہتی ہیں انکا سوسائٹی پر ایسا زبردست اثر پڑتا ہے جو بڑے بڑے لشکروں اور سپہ سالاروں اور عالموں سے ممکن نہیں۔

یہ تو صاف ظاہر ہے کہ عورت ہی ماں ہوتی ہے۔ عورت ہی بیوی ہوتی ہے۔ عورت ہی بہن ہوتی ہے۔ اور ماں اور بیوی اور بہن ہی وہ ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن اور شائستگی کی باگ ہے۔ اس تمدن اور شائستگی کو کامیابی اور ترقی کی بلندی پر پہونچانا یا پستی اور تباہی کے گڑھے میں پھینک دینا انھیں کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنا اثر اس طرح چپ چاپ ڈالتی ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ اسمیں ذرا بھی تعجب نہیں ہے کیونکہ جب کوئی انسان اعلی رتبہ پر پہونچتا ہے یا ترقی کے مدارج طے کرجاتا ہے تو وہ یا تو کسی بیوی کا شوہر ہوتا ہے یا کسی ماں کا بیٹا یا کسی بہن کا بھائی یا وہ شوہر بھی ہوتا ہے بیٹا بھی اور بھائی۔ یعنی وہ عورت ہی کی گود میں پلا ہے۔ عورت ہی کا رفیق ہے۔ عورت ہی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے۔ وہ بچپن اور لڑکپن کے زمانہ میں عورت ہی کا مطیع تھا۔ اور مجبوراً اُسی کے احکام کو مانتا تھا۔ جوانی کے ایام میں وہ عورت ہی کے ساتھ محبت رکھتا تھا۔ اور اوسکی مہربانیوں کا احسانمند تھا۔ جوانی کی عمر میں وہ عورت ہی کی تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ اور اوسی کی مہربانیوں کا احسانمند تھا۔ اوسنے اپنی زندگی کے دس حصوں میں سے نو حصے عورت ہی کے ساتھ بسر کیے اور جو بات اُسکے نازک اور نرم ہونٹوں سے نکلتی تھی اُسکو تسلیم کرتا تھا جس طریقہ پر اوس نے چاہا اوسی طریقہ پر وہ جوان ہوا۔ وہ خوشی سے اسکا مطیع اور فرمانبردار رہا۔ اوسی کے اشاروں پر چلتا رہا۔ اور آنکھ بند کیے اُسکے حکموں کو مانتا رہا۔ جب تم کسی انسان کو دیکھو کہ وہ اعلی درجہ کی ترقی اور علم و فضل کے حاصل کرنے میں محنت اور کوشش کرتا ہے۔ تو سمجھ لو کہ جو بات عورت نے چپ چاپ اسکے دل میں ڈال دی تھی وہ اوسی کو کھلم کھلا طلب کرتا ہے۔ اور جو چیز عورت نے اُسکی طبیعت

ہیں مضر کمندی تھی وہ انسی کی تلاش میں بالارادہ سرگرم رہتا ہے۔ جج عدالت میں اعلیٰ اعلان
احکام جاری کرتا ہے حالانکہ اسکے احکام میں ماں یا بیوی کے خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے
سوداگر بازار میں اپنا مال فروخت کرتا ہے۔ حالانکہ اسکی باتوں میں اس سختی یا نرمی یا شیریں کلامی
یا بدگوئی کا اثر پایا جاتا ہے جو اوس نے اپنے گھر کے آدمیوں سے سیکھی ہے اسی طرح کوئی
مضمون نگار یا صناع یا وکیل یا طبیب ہو اسکے کاروبار میں عورت کے فیضان صحبت کا اثر
ہوتا ہے۔ یہ اسلئے کہ عورت کا اثر انسان پر بہ نسبت تمام امور فطرت کے زیادہ ہوتا ہے۔ فرانس
کے باشندے انسانوں کی ہر ایک بری یا بھلی حالت کو عورت کی طرف منسوب کرتے ہیں
اگر کوئی حادثہ ظہور میں آئے اور اس کا سبب معلوم نہ ہو تو وہ کہتے ہیں کہ عورت کو ٹٹولو غرضکہ وہ
اسباب جو سوسائٹی پر اپنا اثر ڈالتے ہیں انمیں عورت سب سے زیادہ اثر ڈالتی ہے۔ اگر عورتیں
تربیت اور تہذیب سے آراستہ ہوں تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ سوسائٹی کی ترقی کے
لئے وہ اعلیٰ ذریعہ ہوسکتی ہیں۔

(۲) عام اخلاق۔ اس سے ہماری مراد نوجوانوں کی بری یا بھلی عادتوں سے ہے۔ اخلاق
کی بہت قسمیں ہیں جن کی تفصیل سے یہ مضمون بہت طویل ہوجائے گا۔ ہم اس مقام پر انمیں
سے چند ضروری اخلاق کا بیان کرتے ہیں اور وہ حسب ذیل ہیں۔

اول پرہیزگاری جس سے ہماری مراد عام طور پر بری باتوں سے بچنا اور خاصکر بدکاری
سے پرہیز کرنا ہے۔ یہ ناپاک خصلت تہذیب اور شائستگی کو سب سے زیادہ برباد کرنے والی ہے
کیونکہ اسمیں پست ہمتی۔ ذلت اور دنائت پائی جاتی ہے۔ پس وہ قوم جس میں بدکاری عام طور پر
پھیلی ہوئی ہے۔ اسکے افراد ذلیل۔ پست ہمت۔ کم عقل اور ناتواں ہونگے۔ خاصکر اس حالت
میں جبکہ نفس کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی جائے اور سب کے سب بیہودہ باتوں میں محو ہوں، اگرچہ
حرام تک نوبت نہ پہونچی ہو۔ ایسے لوگ جو بیہودہ چال چلن رکھتے ہوں۔ اور بدکاریوں میں غرق
ہوں اونسے کسی فائدہ کی توقع نہیں ہوسکتی بلکہ وہ تہذیب و شائستگی کے جسم میں فاسد اعضا ہیں۔

اس بیان سے خیال میں آسکتا ہے کہ کیونکر سلطنتیں تباہ ہوتی ہیں۔ اور جب یہ مہلک بیماری کسی قوم کے بڑے آدمیوں یا حکومت کے ارکان میں پھیل جاتی ہے تو وہ قوم جلد جلد بگڑنے لگتی ہے کیونکہ عیش پرستی انکو انصاف پرستی اور فرائض حکمرانی سے باز رکھتی ہے اور کل قوم پر عام بلا نازل ہوتی ہے۔

مگر وہ لوگ جو افعال بد سے بچتے رہتے ہیں۔ وہی دنیا میں کچھ کام کرتے ہیں۔ جب وہ کسی بات پر جھک پڑے تو جھک پڑے۔ انکو ہٹانے والی کوئی چیز نہیں۔ اور جب وہ کسی بڑے کام میں لگا دیے گئے تو اُسکے کرنے پر فوراً کمربستہ ہو گئے اور اوسی کے ہو رہے۔ ایسے ہی لوگ اپنے ملک کی خدمت کرتے ہیں۔ اور اسکی عظمت بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔

بداخلاقیوں میں سے ایک آفت قماربازی کی ہے۔ یہ بھی بدکاری کے برابر تہذیب کو نقصان پہونچاتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ مضرت رساں ہے۔ قماربازی اخلاق کو بگاڑ دیتی ہے جوا کھیلنے والوں کی طبیعتوں میں لالچ اور بغض پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سے مال کا نقصان اور ترقی کی امیدوں کا خون ہو جاتا ہے۔ جوا کھیلنے والے میں محبت اور ہمدردی نام کو نہیں رہتی۔ وہ اسی دھن میں رہتا ہے۔ کہ مال کو برباد کرے۔ جب وہ اپنے بھائی کا بھی دوست نہیں ہوتا تو اپنے اہل وطن پر کب مہربان ہو سکتا ہے؟ وہ سوسائٹی کا دشمن ہے کوئی قوم جسمیں قماربازی کی عادت جاری ہو کامیاب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ قوم کا وجود افراد قوم کے اجتماع پر منحصر ہے۔ اور قماربازی انکو تتر بتر کرتی ہے۔

(۳) خانگی زندگی۔ خانگی زندگی کو تہذیب سے بہت بڑا تعلق ہے۔ کیونکہ جب لوگ خانگی زندگی اعتدال سے بسر کرتے ہیں تو انکے دماغ صحیح اور بدن تندرست ہوتے ہیں۔ اور جب خانگی زندگی میں تنزل کرتے ہیں تو انکا حال ابتر ہو جاتا ہے۔ جو آدمی رات دن کھانے پینے میں مشغول رہتے ہیں۔ اور زندگی کے دیگر ضروری کاموں پر توجہ نہیں کرتے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ جو شخص دن کا بڑا حصہ عمدہ کھانے کی فکر میں گنوا دیتا ہے۔ وہ اپنے اور

دوالفرض سے غافل رہتا ہے۔ فرض کرو کہ کھانے پینے کی فکر میں وقت کا زیادہ حصہ صرف نہیں ہوتا تاہم محض بسیارخوری کی عادت انسان کو کام سے روک دیتی ہے۔ اور دل و دماغ میں سستی اور کاہلی پیدا کر دیتی ہے۔ جیسی کہ ایک عربی مثل ہے "البطنة تذهب الفطنة" یعنی پرخوری کی عادت عقل و دانش کو کھا جاتی ہے۔ نشہ کی چیزوں میں منہمک ہو جانا اور رات بھر جاگنا یہ بھی نہایت بری خصلتیں ہیں اور جسمانی اور دماغی تندرستی کے لیئے سم قاتل ہیں۔

تہذیب اور شائستگی کے ضروری اور کارآمد امور میں سے ایک امر صفائی ہے ہمارے ناظرین کو پہلی نظر میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ شاید صفائی ایسی اہم اور ضروری بات نہیں ہے۔ جسپر زیادہ توجہ کی جاوے۔ مگر حقیقت میں صفائی سوسائٹی کے لیئے ایسی ہی ضروری چیز ہے جیسے کہ لباس اور خوراک ہر آدمی کے لیئے۔ جس مکان میں صفائی اور ترتیب کی حکومت نہیں ہے اسکے رہنے والوں میں سستی اور اداسی چھائی رہتی ہے۔ اور جو شخص اپنے جسم کو پاک صاف رکھتا ہے اسکا دماغ بھی صحیح ہوتا ہے۔ اور جو شخص نجس اور گندے بستر پر سوتا ہے اور اوسکی پروا نہیں کرتا ہے وہ بے حس ہے۔ اور اس سے کسی طرح کے نفع کی امید نہیں ہے۔

(۴) دینداری۔ یہ بھی اُن اسباب میں سے ہے جو سوسائٹی پر چپ چاپ اثر کرتے ہیں۔ اس سے ہماری مراد خدا سے ڈرنا ہے۔ جن لوگوں کے ایمان کمزور ہو جاتے ہیں اُن کے دل مرجاتے ہیں۔ اور وہ بے سرے ہو جاتے ہیں۔ اور اون کا روک ٹوک کرنے والا کوئی نہیں رہتا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تعلیم و تربیت مذہب سے بے پروا کرتی ہے مگر انکا یہ خیال ہی خیال ہے۔ کیونکہ انسان بالطبع خودغرضی اور طمع کی طرف مائل ہے۔ جب اوسکی ذات میں کوئی چیز روک ٹوک کرنے والی نہیں رہتی تو وہ بے محابا لوگوں کا مال لوٹ لیتا ہے۔ اور اونکی اذیت کی کچھ

پروا نہیں کرتا - مذہب ہی ایسی چیز ہے جو نفس کی بیجا اُمنگوں کو روک سکتا ہے - ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے کہ بعض لامذہب آدمی اوروں کی نفع رسانی میں ویسی ہی کوشش کرتے ہیں جیسی کہ وہ اپنی ذات کے لئے کرتے ہیں - مگر ایسے آدمی بہت تھوڑے ہیں - اسکے سوا اُنکی یہ عادت اُس مذہبی تعلیم کے باعث سے ہے جو اونہوں نے اس سے پیشتر کہ وہ مذہب کو خیرباد کہیں اور خدا سے انکار کریں، ماں کے دودھ کے ساتھ پائی ہے - اور شاید جب تم اُن سے مباحثہ کرو تو وہ تمہیں گمراہ سمجھیں - اور مذہب نے جو اثر اُن کی طبیعت پر کیا ہے اسکا صریح انکار کریں - اسمیں ذرا بھی شک نہیں ہے کہ انسان ہمیشہ محض علم کی مدد سے بداخلاقیوں سے نہیں بچتا - بلکہ اکثر اسکی بدکاری میں ترقی ہوجاتی ہے - دینداری سوسائٹی کے قایم رہنے کے لئے نہایت ضروری ہے - اور دنیا کی تمام قوموں میں وہی قوم زیادہ خوشحال ہوتی ہے، جس کے افراد زیادہ ایماندار ہوں اور جزا اور سزا کو مانتے ہوں -

اوپر کے تمام بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عورت، عام اخلاق - خانگی زندگی اور دینداری اُن اسباب میں سے ہیں جو چپ چاپ سوسائٹی پر اپنا اثر ڈالتی ہے - لیکن اگر تم غور سے اُن پر نظر ڈالو تو معلوم ہوجائے گا کہ اِن تمام اسباب کا مدار صرف عورت پر ہے تنہا عورت ہی وہ بڑا سبب ہے جو چپ چاپ سوسائٹی پر گہرا اثر ڈالتا ہے - عورت ہماری طرز معیشت کا انتظام کرنے والی ہے - وہی عام اخلاق کا سرچشمہ ہے - وہی ہمکو دینداری اور خداپرستی کا دودھ پلاتی ہے - اگر وہ چاہے تو قوم بن جائے اور چاہے تو بگڑ جائے عورت کی تعلیم و تربیت ہی سب سے بڑا وسیلہ قوم کی ترقی کا ہے - وہی قوم کو اپنے دامن تربیت میں پالتی ہے اور اونکی اصلاح کرتی ہے اور اسکے اخلاق کو تہذیب کے سانچے میں ڈھالتی ہے - اگر اسکے اخلاق بگڑے ہوں تو کل قوم بگڑ جاتی ہے - ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ "عورت ایک ایسا آئینہ ہے کہ اگر تم اسمیں اپنی صورت کو دیکھو تو یہ معلوم ہو گا کہ اس کو تمہاری ذات سے اور تم کو اُسکی ذات سے تعلق ہے - اگر تم عورت

میں بری خصلتیں پیدا کرو تو وہ شیطان ہو جاتی ہے اور اگر اسکو عمدہ اخلاق سے آراستہ کرو تو وہی فرشتہ بنجاتی ہے۔"

(عبد العلیخاں)

دولت کی اصلیت و روپیہ کی حقیقت

اب سے ہزاروں لاکھوں برس پیشتر جبکا علم صرف اسی کو ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ تمام روحیں خوشی خوشی اپنے وطن اصلی میں بس رہی تھیں کہ یکایک شومی قسمت سے افضل ترین روح یعنی بابا آدم سے بھول چوکی ہوئی۔ پس عتاب ہوا کہ تم فوراً اپنا مسکن اسلئے چھوڑ دو اور نیچے اُتر جاؤ۔ ہزار رو او ویلا! ہزار فریاد و بکا۔ ثابت ہوئیں، فرشتے کشاں کشاں لے چلے۔ اور آخر وقت جناب باری کا حکمنامہ گوش گذار کیا گیا کہ دیکھو اے آدم میں تم کو زمین پر جسکو دنیا کے نام سے پکارا اپنا خلیفہ بنا کر بھیجتا ہوں اور یہ خلافت تمہاری اولاد کو نسلاً بعد نسلاً وراثتاً ملے گی۔ اور یہ بھی یاد رکھنا کہ وہ دنیا جہاں تم جاتے ہو اسباب کی جگہ ہے جب اسباب اکٹھا کروگے اس سے نتیجہ ظہور میں آوے گا۔ میں نے ہر ایک چیز کے کچھ قوانین مقرر کر دیے ہیں اب ہر ایک عمل اپنے قوانین سے وابستہ رہیگا۔ اور وہاں صرف تم کو اپنے ہاتھ پاؤں ہلانا ہوں گے کیونکہ محنت اس دنیا میں برگزیدہ زندگی بسر کرنے کے لئے لازمی ٹھیرائی گئی ہے اور نیز محنت ہی سے تمہارے ظاہری اور باطنی قوی ترقی پذیر ہونگے۔ یہ حکمنامہ سنکر حضرت آدم دلمیں اپنے پریشان ہی ہوئے تھے اور یہ کہہ ہی رہے تھے کہ وطن چھوٹا تو چھوٹا مگر ع

پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

کہ عالم الغیب کا دریائے رحمت جوش میں اُمنڈ آیا اور ارشاد ہوا کہ بس تو مت پریشان ہو اے آدم تحقیق کر دیکھ میں نے دیا ہے تجھکو بیج جسمیں میں نے اپنی کامل صناعی سے کام

نشو و نما اور پھل لانے کی قوت کو اکٹھا کیا ہے اور وہی ہے جس نے تجھکو زمین اور پاس اُسکے ہے چشمہ پس تیرا کام صرف اتنا ہے کہ تو زمین کو ذرا سی نرم کرکے اس بیج کو اسمیں دبا دے اور چشمہ سے اسے سیراب کر پس پیدا ہوگا اس سے درخت اور لگیں گے اسمیں پھل اور یہی تیری خوراک ہوگی - یہ سنتے ہی حضرت آدمؑ کی باچھیں کھل گئیں - کہ واہ واہ ! یہی گیہوں کہ جس کے درخت چھونے تک کی بہشت میں ممانعت تھی وہ اس دنیا میں روزمرہ کی خوراک قرار پائیگا کیا خوب دنیا ہوگی - حکمنامہ تو سن ہی چکے تھے مسرت سے بلا انتظار سواری دوچھلانگیں مار کر دنیا میں آن وارد ہوئے -

یہاں جو آئے عجب رنگ دیکھا - ایک عالم ہی دوسرا پایا - نہ وہ فضا ہے نہ وہ شادابی درخت ہیں مگر وہ رنگت نہیں - پھول ہیں مگر وہ خوشبو نہیں - پھل ہیں مگر وہ ذائقہ نہیں - گیہوں کی جستجو میں پریشان سرگردان کبھی اس پھل کو چکھتے کبھی اس پھول کو سونگھتے پھرے - مگر گیہوں کا پتہ اب لگتا ہے نہ تب - مجبوراً بھوک سے زیادہ پریشان ہوتے تو پھر پھلوں پر گذارا کرتے - سوائے جنگل کے جانوروں کے دوسرا کوئی انیس نہ تھا انہیں سے اپنی طبیعت بہلاتے - انہیں کی پرورش کرتے - موقع بموقع ایک آدھ انہیں سے نہ شکار بھی کر جاتے تھے - اسکی کھال سے اپنے جسم کو موسم کی سخت گیریوں سے حفاظت کرتے تھے - مگر اسکے ساتھ ہی حضرت آدم ایک بات اور بھی اکثر دیکھا کرتے تھے - وہ یہ کہ جب وہ پھل کھا کر گٹھلی پھینک دیتے تھے تو انمیں سے اکثر گٹھلیاں جو نرم اور زرخیز زمین پر گرتی تھیں - وہ کچھ عرصہ میں ہیئت بدلکر چھوٹے پودے کی شکل میں ظاہر ہوتیں اور اسپر کچھ زمانہ گذرنے کے بعد وہ پودے ویسے ہی درخت ہوجاتے تھے اور اسمیں اسیطرح کے پھل لگ جاتے تھے - پس ایسی حالت میں حضرت آدمؑ کو ایک زمانہ گذر گیا - ایک مرتبہ تنہائی سے پریشان ہوکر جناب باری کیطرف دست بدعا ہوئے کہ اے خدایا ! مجھکو کوئی انیس دے جو میری ہی جیسی انسان ہو - چنانچہ حضرت حوا بھی گئیں -

بی بی حوا کا دنیا میں آنا تھا کہ حضرت آدم کی سست و بیکار زندگی میں ایک طرح کی روح

دوم - اُصول مذہب جس سے دنیا کے تمدن پر بہت بڑا اثر کیا ہے - لیکن اسکے ساتھ ہی پیٹ کا دھندا ہمیشہ مقدم رہا جسمیں یہ شرط لگی ہوئی تھی کہ جب ماتھے سے پسینہ بہے گا تب منہ میں روٹی جاوے گی -

اب اس عصر میں اولاد آدم ہی بالغ ہوچکی تھی - ہر ایک کی طبیعت علیحدہ اور ہر ایک کا مذاق جدا کچھ تو زراعت میں مشغول ہوئے کچھ شکار میں مشغول ہوئے جو زیادہ سست تھے انھوں نے تیر کمان ہی بنانے پر اکتفا کی - کچھ عرصہ تک تو آپس میں مل جلکر رہے - یعنی جو شکار کھیلتے تھے وہ گیہوں ہی کھاتے تھے - اور جو زراعت کرتے تھے وہ شکار ہی کھاتے تھے لیکن حضرت آدم اور بی بی حوا کی آنکھیں ابھی بند بھی نہونے پائی تھیں کہ آپس میں لڑائی جھگڑا شروع ہوا - قابیل نے ہابیل کو مار ڈالا - اور سب الگ الگ ہو گئے - اسوقت بڑی تکلیف اٹھانی پڑی کیونکہ پیدایش سے اگرچہ جناب باری نے ہر ایک کی طبیعت کے ساتھ ایک خاص کام کرنے کا مذاق پیدا کیا تھا - مثلاً جن کو زراعت میں دلچسپی تھی وہ زراعت کرتے تھے اور جن کو شکار میں دلچسپی تھی وہ شکار کھیلتے تھے اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس شخص کو جس کام میں دلچسپی ہے وہ کمال کے درجے تک پہنچا سکتا ہے - اور اگر دوسرا کام کرے تو اوسکو وہ حسنِ انتظام کے ساتھ انجام نہیں دیسکتا - مگر اسکو کیا کرے کہ جناب باری نے اس خاص مذاق کے ساتھ انسانی ہیولے میں ایک دوسری بات بھی وابستہ کر رکھی ہے - وہ ایک اس بات کی کہ جس چیز کو دوسرے کوشش کرکے پیدا کریں اُسکو اپنے استعمال میں لاوے اور قدرتاً ایسا خواہش کرنے کا اسکو حق حاصل تھا - مگر وہ حق کچھ شرائط پر مبنی ہے جو آگے چلکر بیان ہونگے -

مثلاً جو کھیتی کرکے گیہوں پیدا کرتے تھے اُن کو اس بات کی خواہش تھی کہ وہ کسیطرح سے شکار کا گوشت کھائیں - اور جو شکار کرتے تھے ان کو انسانی طبیعت اس بات پر مجبور کرتی تھی کہ وہ گیہوں کا مزہ چکھیں - اب یہ صرف دو طریقوں پر ہو سکتا تھا اول یہ کہ ایک

دوسرے کی چوری کریں مگر اس میں خوف تھا جانکا۔ لہذا اس بات پر باہمی فیصلہ ہوگیا کہ ہم تم کو اتنا گوشت دیں اور تم ہمکو اتنے گیہوں دو۔ پھر نہ کچھ لڑائی رہی نہ جھگڑا سب خوش اور آرام کے ساتھ رہنے لگے۔

اس تمام دیباچہ سے یہ بات ثابت ہوئی۔ کہ انسان جن جن چیزوں کی خواہش کرتا ہے جب وہ افراط سے مہیا ہو جاتی ہیں تو وہ سکھ سے زندگی بسر کرتا ہے۔ اور ان اشیا کا مہیا ہونا ہی گویا اُسکے لئے دولت کا مہیا ہونا ہے۔ لہذا پہلا خیال جو دولت کے نام کے ساتھ ہمارے ولمیں آتا ہے یہ ہے کہ وہ چیزیں جو دولت شمار کی جاسکتی ہیں ان میں اس بات کی قابلیت کا ہونا ضروری ہے کہ وہ انسانی خواہشات اور ضروریات پورا کرسکیں دوسری بات یہ کہ ان پر حق مالکانہ حاصل ہو۔ تاکہ کسی دوسرے کی چیز کو جس پر حق مالکانہ حاصل نہیں ہے بذریعہ تبادلہ کے حاصل کرسکے۔ تیسری بات یہ کہ ان چیزوں میں قوت یا قابلیت تبادلہ کی ہو یعنی دوسرے اس شے کی خواہش اسی طرح کریں جیسا وہ دوسروں کی اشیاء کی خواہش کرتا ہے۔ المختصر یہ کہ کوئی شے جس میں کہ قوت تبادلہ ہو دولت کے نام سے موسوم کیجا سکتی ہے۔

پس جیسا ہم ابتک سمجھ رہے تھے کہ دولت روپیہ کے ڈھیر کو کہتے ہیں۔ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر یہ ٹھیک ہے تو اسکے یہ معنی ہیں کہ اولاد آدم بالکل مفلس تھی۔ کیونکہ ان کے پاس تو ٹکا ہی نہیں تھا۔ جب مفلس تھے تو گویا وہ بہت پریشان زندگی بسر کرتے ہونگے۔ کیونکہ پیسہ پاس نہیں تو روٹی کہاں سے ملیگی۔ اور سامان آرام کا مہیا ہونا تو درکنار۔ لیکن ایسا نہیں تھا وہ پیٹ بھرکر روٹی کھاتے تھے اور جن چیزوں کی اونکو خواہش ہوتی تھی۔ وہ اس شے کے تبادلہ سے جسمیں وہ اپنی محنت کے ذریعہ سے ایک خاص قابلیت یا قدر پیدا کرتے تھے۔ حاصل کرتے تھے۔ مثلاً جو گیہوں بوتے تھے۔ وہ جب اس سے نہایت ہی آسودہ ہو جاتے تھے تو ایک خاص مقدار علیحدہ ہی ضرور رکھتے ہونگے۔ تاکہ آئے دن اگر

ضرورت پڑے تو اسکو کام میں لاسکیں۔ اور نیز اس مقدار میں سے کچھ دیگر اور چیزیں مثلاً
گوشت زبان کا مزہ بدلنے کے لئے اور کھال اوڑھنے کے لئے حاصل کرسکیں۔ پس اب
اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ وہ کس درجہ دولتمند تھے۔ تو سوائے اس کے کہ ہم گیہوں کی مقدار
اور کھالوں کی تعداد سے ان کی دولت کا اندازہ کریں اور کوئی ذریعہ نہیں۔ لہذا ہر ایک شے
جس میں کہ قوت تبادلہ ہو یا یوں کہو کہ ہر ایک شے جسمیں کہ قابلیت یا قدر اس بات کی ہو
کہ وہ ایک دوسری مفید اور کارآمد شے کو تبادلہ میں لا سکے اسکو دولت کے نام سے پکارتے
ہیں۔ اب یہ بات فوراً ذہن میں آجاوے گی کہ وہ چیزیں جسمیں تبادلہ کی قوت نہیں ہے دولت
نہیں شمار کی جاتی۔ مثلاً سورج کی روشنی اور ہوا جو انسانی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہیں مگر
مبدء فیاض نے اپنی مخلوق کو اس فیاضی سے دے رکھی ہے۔ کہ ہر متنفس جتنی ہوا کی
خواہش کرے نہایت آزادی سے اپنے جسم کے اندر لیجا سکے۔ پس اگر کوئی شخص ہوا کو ایک
برتن میں بند کرکے کسی دوسرے شخص کے پاس لیجاوے تاکہ اسکے بدلے میں کوئی دوسری
چیز جسے اس کی خواہش ہے حاصل کرے۔ تو کیا وہ دوسرا شخص اس معاملہ پر راضی ہوگا
ہرگز نہیں۔ کیونکہ بجائے اسکے کہ وہ اپنی چیز تبادلہ میں دے کر برتن کی بند ہوا حاصل کرے
وہ خود جتنی ہوا چاہے قدرت سے عنایتاً لے سکتا ہے۔ لہذا ہوا دولت نہیں شمار کیجا سکتی
لیکن اگر انسان اس ہوا میں اپنی محنت سے کوئی خاص قدر پیدا کردے ایسی قدر کہ
دوسروں کو اسکی ضرورت ہو۔ تو ایسی حالت میں ہوا بھی دولت شمار کی جاسکتی ہے۔

مثلاً سیلون میں جبکہ غوطہ خور موتی جمع کرنے کے لئے سمندر کی تہ میں جا ٹھہرتے
ہیں تو ان کی زندگی قایم رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کسی مصنوعی طریقہ سے ہوا
ان تک پہنچائی جاوے۔ چنانچہ ربڑ کی نلکیوں سے ہوا ان تک پہنچائی جاتی ہے اور
اسکے معاوضہ میں کچھ ملتا ہے۔ پس ایسی حالت میں ہوا بھی دولت ہے۔ قبل اسکے
کہ دولت کے بارے میں کچھ اور کہا جاوے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ چند الفاظ جو

اور استعمال کئے گئے ہیں اور جنکا استعمال کرنا نہایت ضروری ہے۔ ان کی ہی تشریح کر دوں۔

مثلاً کسی شے میں قدر کا ہونا۔ یا کسی شے کا کارآمد ہونا۔

"قدر" اس خاص صفت کا نام ہے جو کسی ایک شے کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ انسانی ضروریات کو پورا کر سکے۔

مثلاً ایندھن کی یہ قدرت کہ وہ آگ پیدا کرے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک شے کو اس قسم کی قدر ہو کہ وہ کسی ایک یا کئی ایک انسانی ضروریات کو پورا کر سکے۔

مثلاً لکڑی علاوہ ایندھن کے اور کے حاجات کے لئے بھی مستعمل ہوتی ہے۔ اس سے میز۔ کرسی۔ پلنگ وغیرہ بھی بنتے ہیں۔ بعض چیزوں میں علاوہ صفت مذکورہ بالا کے ایک اور بات بھی پائی جاتی ہے۔ جس کا ہم فائدہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اسکے مفید ہونے کا اندازہ ایک دوسری شے سے کیا جاتا ہے جو بحالت تبادلہ حاصل ہوتی ہے۔ اور اس دوسری شے کی مقدار کو جو کہ تبادلہ کر کے حاصل ہوئی ہے۔ پہلی شے کی قیمت کے نام سے پکارتے ہیں جو کہ اوّلاً تبادلہ میں دی گئی۔

دوسرا جملہ "کسی شے کا کارآمد ہونا۔ اس سے یہ مراد ہے کہ کسی ایک خاص شے میں انسانی خواہشات پورا کرنے کی قابلیت ہو۔ اس سے اس شے کا مفید ہونا نہیں ضروری ہے۔

مثلاً سنکھیا ہے کہ مفید ہونا تو درکنار۔ انسانی خواہشات پورا کرنے کی قابلیت ہو۔ اس سے اس شے کا مفید ہونا نہیں ضروری ہے۔ کہ حکیم اور ڈاکٹر اسکو دوائیوں کے ساتھ تجویز کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک اور بات غور طلب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ ایک چیز حد درجہ کارآمد ہو مگر اس کی قدر اسی درجہ تک نہ ہو۔ اور چونکہ قدر کا اندازہ قیمت سے کیا جاتا ہے اسلئے اسکی قیمت اور اشیا سے جو تقریباً اتنی کارآمد نہیں بہت کم ہے۔

مثلاً نمک حد درجہ کی کارآمد چیز ہے اگرچہ اسکی قدر بہت کم ہے۔ اسلئے اسکی قیمت بھی بہت کم ہے۔ پس ہر ایک شخص کا یہ کام ہے کہ قدرت کے دی ہوئی چیزوں میں اپنی محنت سے قدر پیدا کرے اور قدر کا اندازہ قیمت سے کیا جاتا ہے اور قیمت کو ترتیب دینے کے لئے سکہ ایجاد کیا گیا جسکی حد میں روپیہ پیسہ اشرفی وغیرہ آتے ہیں۔ پس مختلف اشیا کی قدر کا اندازہ اسی نقد سے کیا جانے لگا۔

اب میں اپنے اول مضمون دولت کی طرف رجوع کرکے ناظرین کی توجہ اس بات پر مائل کرتا ہوں۔ جبکہ دولت اور روپیہ کی ماہیت سے اچھی طرح آگاہ ہوگئے۔ تو ضرور ان پر صاف صورت سے عیاں ہوگیا ہوگا۔ کہ دولت ایک علیحدہ چیز ہے اور سکہ علیحدہ اور جن ممالک کے لوگوں نے دولت اور روپیہ میں کچھ فرق نہیں جانا انسے بڑی بڑی غلطیاں صادر ہوئی ہیں اور ملک کو بے پایاں نقصان پہنچا۔ جیسا کہ اگلے زمانہ کے مدبر دولت اور روپیہ کو ایک سمجھکر اپنے ملک کی دولت کا اندازہ سونے چاندی یا جواہرات کی مقدار سے کیا کرتے تھے۔ یعنی جتنی زیادہ مقدار سونے یا چاندی یا جواہرات کی ایک ملک میں ہوتی۔ اتنا ہی وہ ملک دولتمند سمجھا جاتا تھا۔ اس بات کو مدنظر رکھکے ایک ملک کے مدبر اس بات کوشش کرتے تھے کہ دوسرے ملک والے اپنا اسباب ان کے ملک میں نہ بھیجنے پاویں اور یہ سمجھتے تھے کہ جتنا نقد دوسرے گروہ دوسرے ملک کا اسباب خریدا جاوے گا۔ اتنا نقد ان کی دولت سے گھٹ جاوے گا۔ اور نقد کے بدلے جو مال ملتا تھا اسکی قدر وقیمت کا آمد ہونے کا اندازہ کچھ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ سترہویں صدی میں ملک انگلستان کے مدبر اس بات کے کوشاں تھے کہ جہانتک ہوسکے اپنے ملک کی تجارت کو ترقی دیں اور دوسرے ملک کا اسباب ان کے ملک میں کم فروخت ہو۔

مثلاً جو اسباب فرانس وغیرہ سے آتا تھا اس پر محصول اسقدر زائد لگاتے تھے کہ فرنچ سوداگروں کو مجبوراً اپنے مال کی قیمت بڑھانا پڑتی تھی اور جب قیمت بڑھ جاتی تھی تو لوگ بہت

کم خریدتے تھے۔

چنانچہ جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے کہ سکہ ایک پیمانہ ہے کہ جس سے اشیا کی قدر کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ یا یوں کہو کہ نقد تبادلہ کو انجام دینے کا ایک سہل حصول ذریعہ ہے پس اگر ایک ملک کے لوگ باہم صلاح و اتفاق کر کے جس کسی ایک مناسب شئے کو خواہ وہ سونا ہو یا چاندی۔ یا تانبا۔ یا چمڑہ یا کوئی اور چیز ہو۔ ایسا ذریعہ اور پیمانہ فرض کرلیں تو اس ملک کا نقد وہی شمار کیا جاوے گا۔ مثلاً پچھلے زمانہ کی تواریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی وقت میں چین کا سکہ ایک مربع شکل کی چادر کا کیا تھا۔ نیز عرب کسی زمانہ میں دوسرے ملکوں کی دولت کا اندازہ چوپایوں کی تعداد سے کیا کرتے تھے چنانچہ جب پہلے پہل انہوں نے ملک فرانس کی بابت سنا تو یہ سوال کیا کہ اس ملک میں کتنے چوپائے ہیں؟ اب ایک اور بات کہنی باقی رہی ہے۔ وہ یہ کہ ایک عام سکہ جسکو ہم روپیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اسکے مقرر کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ اور اسکے کیا فوائد ہیں؟

یہ بات تو صاف ظاہر ہے کہ معاوضہ تمدن انسانی کے ساتھ ساتھ کسی حالت میں بھی نہیں چل سکتا تھا۔ کیونکہ اگر کوئی عام پیمانہ اشیا کی قدر کے اندازہ کرنے کا ایجاد نہ کیا جاتا تو بڑی دقتیں واقع ہوتیں۔

مثلاً ایک بڑھئی ہے اسکے پاس چارپائی۔ میز۔ کرسی وغیرہ ہیں۔ اب اول تو یہ دقت کہ اس جزو دولت کے رکھنے اٹھانے کے لئے بڑے انتظام کی ضرورت ہے علاوہ بریں اسکو یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ اگر وہ ایک میز دیگا تو اتنی روٹی اور ایک پلنگ کے بدلے میں اتنا کپڑا۔ اور کسی اور چیز کے بدلہ میں جوتا وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح سے چمار کو بھی ایک یادداشت رکھنے کی ضرورت ہے۔ اور دنیا میں چیزیں اتنی بکثرت پیدا ہوتی ہیں کہ ہر ایک شے کی قدر کا اندازہ تبادلہ کی شے کی قدر کے ساتھ یاد رکھنا

مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکنات سے تہا۔ اور نیز اگر ایک میز کے بدلے میں اوسکو روٹی ضرورت ضرورت سے زیادہ ملتی تو وہ زیادہ مقدار گویا بکار ضایع ہی ہوجاتی کیونکہ وہ میز توڑ کر تو اپنی خواہش کے مقدار کے موافق روٹی حاصل کر نہیں سکتا۔ اسلئے ہر دفعہ میں کچھ حصہ اسکی دولت کا ضایع ہوتا۔

اسلئے قدرتاً یہ بات محسوس ہوئی کہ کوئی ایسا پیمانہ ایجاد کرنا چاہیے جسمیں اولاً یہ حیثیت ہو کہ آپس میں برابر تقسیم ہو سکے۔ دوسری صفت یہ ہونا چاہیے کہ رکھنے اٹھانے میں کوئی دقت نہو۔ اور ایک مدت تک رکھنے سے بھی اسکی قدر میں کوئی کمی نہ واقع ہو۔ تیسری صفت یہ ہونا چاہیے کہ سب اسکی خواہش کریں۔ چوتھی صفت یہ ہونا چاہیے کہ اسکی مقدار میں کمی نہ واقع ہو۔ زیادہ نہو تاکہ پوشیدہ اسکو کسی جگہہ رکھہ سکیں۔ اور یہ خیال شروع زمانہ تمدن انسانی میں نہایت ضروری تہا جبکہ جان و مال کی حفاظت اوس سے بہت زیادہ مشکل تہی جتنی اب ہے۔

ان مذکورہ بالا خیالات کو مدنظر رکہکر مختلف وقتوں میں مختلف قوموں نے مختلف پیمانے اشیا کے قدر کے اندازہ کرنے کے لئے مقرر کئے تہے۔ مثلاً ملک چین میں چار کی مربع شکل کی ٹکیا۔ عرب میں چوپایے۔ مغربی افریقہ میں کوڑیاں۔ اور ابی سینیا میں سفید پتھر کے ٹکڑے گرچہ آگے چلکر ان تمام قوموں نے جن کو سونا یا چاندی کسی نہ کسی طرح سے دستیاب ہوا خواہ ملک کے فتح کرنے سے یا تجارت سے۔ اُنہوں نے انہیں دہاتونکو اس پیمانہ کے لئے استعمال کیا۔ اور جب یہ دہاتیں پوری طور سے استعمال میں آگئیں تو اُسوقت سونے یا چاندی یا تانبے کے ٹکڑے توڑنے اور کاٹنے چہانٹنے میں ایک نئی دقت محسوس ہوئی لہذا ایک عام پیمانہ فرض کر کے اسی کے وزن و شکل پر تمام سونا اور چاندی تقسیم کر دیا گیا۔ اور بڑے عیش و آرام سے بسر کرنے لگے۔ نہ کوئی دقت تہی نہ تکلیف۔

کسی ایک شخص کے پاس دولت ہونے کا مقصد ہرگز نہیں کہ سامان عیش و عشرت

مہیا ہو یا او نہیں - بلکہ اس سے یہ مراد ہے کہ اسکے دست قدرت میں یہ بات حاصل ہو گئی ہے کہ جس چیز کی خواہش کرے وہ اسکو دستیاب ہو سکتی ہے -

مثلاً کسی شخص کے پاس ایک چیز دوست ہے جیسے کہ غلہ تو اسکے یہ معنی ہونگے کہ اسکے پاس وہی چیز ہے اور بس کیونکہ اگر کسی دوسری چیز کی ضرورت واقع ہو تو اول تو اسکو یہ معلوم کرنا ہوگا کہ کوئی ایسا شخص ملے جسکے پاس وہی چیز ہو جسکی یہ خواہش کرتا ہے - اور اسکے ساتھ ہی دوسرے شخص کو بھی غلہ کی خواہش ہے اور بعدہ یہ کہ دونوں باہم تبادلہ کی شرائط پر رضامند ہو جاویں تب کہیں اسکو وہ شے نصیب ہو سکتی ہے جسکی اسکو خواہش ہے - برخلاف اسکے اگر نقد یعنی سکہ رواں اسکے پاس ہے تو اسکے یہ معنی ہونگے کہ اسکے مالک کو یہ قوت وقدرت حاصل ہے کہ جس وقت جس چیز کی خواہش کرے بلا کسی زحمت کے فوراً اسکو دستیاب ہو سکتی ہے - اور یہ قوت صرف سکہ ہی کو حاصل ہے - اسلئے وہ حاکم وقت کی نظروں سے نظر انداز نہ ہو سکا - اسلئے کہ اولاً تو اسکو اس قسم کی سخت ضرورت رہتی تھی - کیونکہ ہر وقت ایسی ضرورتیں پیش رہتی تھیں - جو کسی قسم کی دولت انجام نہیں دیسکتی تھی سوائے سکہ کے -

مثلاً کسی ملک فتح کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے - یا کسی ملک سے معاہدہ کرنے میں کچھ دینے کی ضرورت ہے -

دوم - یہ کہ عوام الناس نے اسمیں دھوکا دہی شروع کر دی تھی یعنی جو جتنا چاہتا بنا لیتا اور اکثر تو اصل میں میل ملا کر اصل سکہ خود لے لیتے تھے اور جھوٹا دوسرں کو دیدیتے تھے - ان سب باتوں کو روکنے کے لئے حاکم وقت نے سکہ بنانے کا کام اپنے تحت میں لیا تاکہ بے ایمانی اور دغا بازی کوئی نہ کر سکے - یہی وجوہات ہیں کہ روپیہ کو یہ شرف حاصل ہوا - اور عوام بھی اپنی دولت کا اندازہ صرف روپے ہی سے کرنے لگے - راقم محمد عبد العلیم

طالبعلم بی - اے کلاس - ایم - اے - او کالج علیگڈھ -

پراسکوویہ

اکثر لوگ کہا کرتے ہیں کہ جب سے حضرت بارود کا قدم میدان جنگ میں آیا شجاعت اور بہادری کا خاتمہ ہوگیا - اب تو بہادر سے بہادر آدمی ہو مگر موجودہ زمانے کے اسلحہ کے آگے اوسکی کچھہ پیش نہیں چلتی - ایک گولی دشمن نے دور سے ماردی اور وہیں ختم ہوگئے اور دل کی حسرت اپنے ساتھہ لے گئے - مگر فی الحقیقت دنیا سے بہادری اور جوانمردی کا خاتمہ نہیں ہوا اور نہ ہوگا - یہ سلسلہ ابدالاباد تک جاری رہے گا - جنگ پر کیا موقوف ہے انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں بھی اُن جذبات کا ثبوت دے سکتا ہے جو شرافت کا شعار اور انسانیت کا معیار ہے - لڑائیوں کے موقع پر تو معمولی آدمی بھی ایسی ایسی شجاعت کا کام کر بیٹھتے ہیں جن کی ان سے توقع نہیں ہوتی - مگر حالت امن میں دلیری اور استقلال سے کام کرنیوالے اور اس وقت اصلی جوش و جذبات کو کام میں لانے والے معدودے چند ہی ہوتے ہیں - پراسکوویہ جس کی بے مثل و بے نظیر شجاعت کا قصہ ہم لکھیں گے وہ اُن ہی بہادروں میں سے ہے کہ جنہوں نے بندگان خدا میں سے ایک خون بہانے کا بھی ارتکاب نہیں کیا - جو مصیبت جھیلی اپنے سر اٹھائے تو آپ نہ کسی بچے کو یتیم کیا نہ کسی عورت کو بیوہ -

پراسکوویہ ملک روس کی رہنے والی تھی اسکا باپ فوج شاہی میں کپتان کا درجہ رکھتا تھا یہ بیچارہ بڑا نیک دل اور راستباز آدمی تھا - روس اپنی خودمختارانہ حکومت کی وجہ سے ہمیشہ پولیٹیکل سازشوں کا جولانگاہ بنا رہا ہے مگر زار پال کا عہد حکومت تو اوسکے لئے خاص مصیبت کا زمانہ تھا زار کی متلون مزاجی نے اُسکی رعایا کو بددل اور عمال کو ناکارہ کر دیا تھا - جلاوطنی اسکے عہد میں بہت عام تھی اسکے مشیر اور ہمنشین بڑے بداخلاق لوگ تھے جو رات دن بے گناہوں کی غلط شکایتیں کرتے تھے تاکہ زار کا تقرب حاصل کریں - کپتان پولوف پراسکوویہ کا باپ بھی اس ہی قسم کے درباریوں کے ہتکھنڈوں کا شکار ہوا - ایک دن

اچانک اس بیچارے کے گھر پر دوڑ آئی اور گاڑی میں سوار کرکے مع اس کے خاندان
کے سیبریا کی برف پوش قلعوں میں اپنی زندگی کی تاریک دن کاٹنے کیلئے بھیجدیا گیا۔ بیچارہ
اپنے قصور سے آگاہ نہ تھا گورنمنٹ کے کارندوں نے کوئی وجہ حراست نہ بتائی۔ غرض
جار ناچار آب دیدہ ہوکر وہ پیٹرزبرگ سے اپنی بیوی اور تین سال کی خوردسال بچی کے ساتھ
سیبریا میں زندگی گذارنے کے لئے بھیجدیا گیا۔ کپتان آدمی دم خم کا تھا صدمہ کو ٹھنڈے جی
سے برداشت کیا۔ چند مہینوں کے کٹھن سفر کے بعد یہ بیچارے مصیبت کے مارے سیبریا
پہونچے یہاں انکو قیدیوں کا لباس پہنایا گیا اور خاص رقم جو پولٹیکل مجرموں کو بنک روس سے
ملتی ہے ان کی معاش کے لئے مقرر ہوگئی اول تو رقم ہی بہت قلیل تھی۔ کہ جس سے
بسر اوقات مشکل تھی۔ دوسرے افسروں کی بددیانتی کہ بیچارے سخت مجبور رہتے۔ پراسکوویہ
کا بڈھا باپ رات دن محنت کرتا کرتا ہار جاتا مگر اُسپر بھی اتنا میسر نہ آتا کہ اپنی بیوی اور بچے کا پیٹ
پال سکے۔ سخت مجبور اور پریشان تھا۔ قیدیوں نے گورنر سے تنخواہ کے نہ ملنے کی شکایت بھی
کی مگر برسوں گذر گئے کسی کے کان پر جوں تک نہ چلی۔ بیچارہ بیوقوف اپنی زندگی سے تنگ
تھا بچے اور بیوی کی فاقہ کشی نہ دیکھی جاتی تھی۔ مگر کرتا تو کیا کرتا قہر درویش بجان درویش
یوں ہی دن گذرتے تھے۔ پراسکوویہ ۸ و ۹ برس کی ہوئی تو خود اپنے باپ کے ساتھ کام
کرنے جایا کرتی۔ رائی کے کھیت میں قصبے کی روسی لڑکیوں کے ساتھ کام کرتی کچھ غلہ
وغیرہ ملتا گھر لے آتی۔ اگرچہ پراسکوویہ کا باپ اس مصیبت میں تھا اور وہ خواندگی وغیرہ کا بندوبست
نہ کرسکا تاہم خاندانی تعلیم جو شریفوں کے بچوں کو حاصل ہوتی ہے اوس سے پراسکوویہ بالکل
معرا نہ تھی۔ پراسکوویہ میں غور کرنے کی عادت بچپن ہی سے تھی اور جوں جوں وہ بڑی ہوتی
جاتی تھی اسکی فکر کی عادت ترقی کرتی جاتی تھی۔

ایک دن اپنے ماں باپ کی ہمیشہ کی مایوسی اور غمگین صورت سے متاثر ہوکر اسنے وجہ
ان دونوں قیدیوں کی رنجیدگی کی دریافت کی عقلمند ماں باپ آہ سرد بھر کے چپکے ہورہے اور

اور باتوں میں ٹال دیا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی مصیبت میں اس بے گناہ بچی کو بھی گرفتار
کریں اور اپنی گذشتہ اوج کا قصہ سناکر اوسکی محسوسات کو اور تیز کریں۔ مگر ماں باپ کے انکار
سے بچی کو ایک ٌ دہن لگ گئی الانسان حریص علی ما منع[1] اور آخر کار ان کو ایسا مجبور کیا
کہ انہیں اپنی سرگذشت کہنی پڑی اور صدمہ میں بیچ میں نہ باپ کو خیال آیا نہ ماں کو دھیان
رہا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور اچھی طرح بیچاروں نے اپنے حالات کہہ سنائے۔ یہ ننہی سی جان
ان واقعات سے ایسی متاثر ہوئی کہ اوسکو دن کی بھوک اور رات کی نیند حرام ہو گئی
رائی کے کھیت میں جاتی اور کسی درخت سے لگی اپنے خیالات میں محو رہتی بعض وقت
تو انہماک کا یہ عالم ہوتا کہ اسکو اپنی ہمجولیوں کی ہانک پکار بالکل نہ سنائی دیتی جو کھیت میں
کام کرتیں اور ہنسی مذاق کرتیں۔ رات دن کی کاہش جان نے اسے لقات کی شکل
کر دیا تھا۔ دنوں کے فکر و غور کے بعد اوسنے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں سینٹ پیٹرزبرگ جا کر
اپنی پیاری ماں باپ کے لئے پادشاہ سے معافی حاصل کرونگی۔ اُسنے سوچا کہ یہ بات
کب تک ہنڈیا میں پکا کرے گی۔ آخر کار اپنی ماں سے کہہ ہی دیا۔ والدین اوسکی ہٹ سے
واقف تھے سخت پریشان ہوئے کہنے لگے یا الٰہی یہ اور مصیبت آئی۔

اب لڑکی کو کچھ اور خیال ہی نہ تھا پیٹرزبرگ جانے کا جنون سر پر سوار تھا۔ اپنی ماں
کی رات بھر خوشامد درآمد کرتی اور ایک افسر کی منت سماجت کر کے پروانہ راہداری بھی حاصل
کر لیا۔ اتنے میں اسکی ماں کی طبیعت سخت علیل ہو گئی اور ایسی بیمار پڑی کہ جان کے
لالے پڑ گئے سچ ہے مصیبت کہہ کر نہیں آتی۔ ماں کی دوران علالت میں اس نے
ماں کی ایسی خدمت گذاری کی کہ اوسکے دل میں اپنی وقعت پیدا کر لی۔ اور گھر ایسا گیا کہ بالکل
اپنی ہوی کو بھول گیا۔ خدا نے اس بیچاری بچی کی دعا سن لی کہ اُسکی ماں اللہ اللہ کر کے
اچھی ہو گئی۔ پر اسکو یہ کی عزت اب اسکی ماں باپ ایک نا تجربہ کار بچے کیطرح نہ کرتے تھے
بلکہ مشیر اور حصہ دار کی طرح اسکی رائے کا پاس کرتے تھے۔ موقع کو غنیمت جان کر اُس نے

[1] انسان وہی کرنیکی طرف دوڑتا ہے جس سے اوسکو منع کیا جاتا ہے۔

اپنے باپ اور ماں پر اپنی بیقراری کا ایسا اثر ڈالا کہ انہوں نے اُس کی درخواست کو منظور کر لیا ؎

مشکلے نیست کہ آساں نشود — مرد باید کہ ہراساں نشود

سچ ہے کہ دنیا میں کوئی کام ایسا نہیں کہ انسان نہ کرسکتا ہو کوئی ایسی مصیبت نہیں جس پر آدمی قابو نہ پاسکے ہاں مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے اَن تھک محنت اور زبردست قوت ارادہ کی ضرورت ہے۔ الغرض پراسکوویہ نے اپنے ایک کپڑوں کا بیگ لیا اور اُسمیں تذکرہ راہ داری رکھا اور سفر پر چل کھڑی ہوئی۔ اس وقت اسکے باپ کی کل دولت ۲ روبل تھی جنکو اپنے ماں باپ کی از حد اصرار پر اس نے لے لیا اور قیدیوں نے جب اسکے اس ارادہ کا حال سنا تو انہوں نے بھی اسکی روپیہ پیسے سے مدد کرنی چاہی۔ سب کا چندہ ملاکر ۵۰ روبل ہوا مگر اُسنے انکار کر دیا۔ غرض اس حالت میں بیچاری پراسکوویہ اپنے عزیز و والدین سے جدا ہوئی سب قیدی اسکو گانوں کی حد تک چھوڑنے آئے یہاں سے اسکو کچھ لڑکیاں مل گئیں اور انکے ساتھ آگے گانوں میں چلی گئی۔ سیبریا سے پیٹرزبرگ کا راستہ کئی مہینے کا ہے۔ پراسکوویہ قیام کرتی منزل بمنزل چلی جاتی۔ اس لڑکی کے راستے کی مصیبتیں بے حد ہیں۔ انکے سننے سے بے اختیار دل بھر آتا ہے۔ ہم ان کو طوالت کے خیال سے مختصر کرتے ہیں۔ راستے میں بسم اللہ مصیبتوں سے ہوئی چند بدمست شرابی سے روسی لڑکے ملے جنھوں نے ان لڑکیوں کو بہت تنگ کیا۔ اکثر دفعہ مرتے مرتے بچیں۔ گانوں کے لوگ سرد مہری سے پیش آئے کسی نے چور جانا کسی نے اُچکا خیال کیا۔

اکثر بیچاری بھوکی رہی طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کیں ایک دفعہ ایک گانوں والوں نے اس کو نکالدیا۔ مجبوراً رات کی تاریکی میں سفر کرنا پڑا۔ رستے میں گانوں کے کتے پیچھے چمٹ گئے۔ اور ٹانگ کو زخمی کر دیا۔ بھلے کو ایک راہی کسان آگیا کہ جس نے اس کو

موت سے نجات دلائی۔ آگے چلکر بارش وہ موسلادہار ہونے لگی کہ اب برس کے کبھی نہ برسے گی۔ رات کی تاریکی ہوا کی اور جاڑے کی شدت اور جاڑا بھی روس کا۔ آندہی کے جھکڑ سے ایک درخت گر پڑا اُسنے غنیمت جانا اور اسکے پتوں میں چھپی مگر سردی کسی طرح کم نہوئی۔ صبح کے وقت ایک گاڑی پاس کے قصبے میں جاتی ملی۔ گاڑی والے نے رحم کہا کر اسکو بٹہا لیا صبح کے ۸ بجے کے قریب گاڑی گانوں میں پہونچی۔ گاڑی بانوں نے گانوں میں اتار دیا۔ قصبہ اچھا خاصہ تھا بہت سے صاف ستھرے مکانات دکھائی دیئے گھر گھر سب سے مصیبت کا حال کہا مگر کسی کے دل میں رحم نہ آیا آخر کار بیچاری ایک گرجا کر دروازے پر دہوپ میں سکنے کو بیٹھ گئی یہاں بھی مصیبت نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا دیہات کے شریر بچوں نے اینٹ پتھر مارنا شروع کئے اُس وقت اسکا عجب عالم تھا سردی کے مارے اُسکے گلابی نازک ہونٹ نیلے پڑ گئے ہر ساری بدن میں کپکپی پڑی تھی ہاتھ پانوں ایسے اکڑ گئے تھے کہ ہلائے نہ ہلتے تھے۔ خدا کی قدرت کہ ایک بڑہیا آ گئی اسنے اس بیچاری کے حالات پر رحم کہایا ان شیطان کی نانی لڑکوں کو دھتکار کے دور کیا اور اپنے روسی شبہہ کو رفع کرنے کے بعد اپنی پیٹھ پر لاد کر اپنے جھونپڑے میں لیگئی۔ اور مدت تک اسکو مہمان رکھا اور جب اسکا مرض جاتا رہا جو جاڑے سے پیدا ہو گیا تھا تو رخصت کیا۔ پر اسکو وہاں بھی طرح ٹھوکریں کہاتی مصیبت جھیلتی منزل بمنزل چلی جاتی تھی اسکی ہمت کسی طرح پست نہ ہوتی تھی۔ آخر کار جاڑے کا موسم آ گیا۔ اب بڑی مشکل آ پڑی جاڑے میں سفر کرنا بالکل محال ہے کیونکہ راستے بالکل یخ بستہ ہو جاتے ہیں دریا ندی نالے جم جاتے ہیں کاشت بند ہو جاتی ہے اور جنگل میں خونخوار درندوں کی بادشاہت ہو جاتی ہے۔ اُسکے میزبان نے کہا کہ اس موسم میں سفر کرنا اپنے آپ کو موت کے موہنہ میں دینا ہے۔ تم آئندہ موسم گرما کا انتظار کرو۔ مگر پراسکو ویہ نے کسی طرح نہ مانا۔ آخر کار میزبان نے اسکے لئے یورپی روس جانیوالی گاڑی میں ایک بیٹھک کا بندوبست کر دیا۔ سردی کا موسم جنگل کی ہوا دوسرے بیماری

اٹھی اٹھی تھی اور بھی حالت ابتر ہونے لگی گاڑی والوں نے رحم کھا کر اُسکے لئے چندہ سے ایک پوستین خریدنے کا فیصلہ بھی کر لیا مگر کوئی پوستین دستیاب نہ ہوئی۔ بیچاروں نے اپنی پوستینیں دیدیں اور خود سردی جھیلی۔ جب یہ قافلہ اپنی منزل پر پہونچا تو پراسکوویہ گرجا میں گئی یہاں اسنے بڑے خضوع اور خشوع سے عبادت کی اتفاق سے گرجا میں اسکا تعارف ایک نہایت ہی نیک دل عورت سے ہوگیا جس کا نام میلین تھا۔ یہ عورت سخاوت اور فیاضی میں شہرہ آفاق تھی۔ اوسنے پراسکوویہ کی مصیبت کا حال سنکر بڑی ہمدردی ظاہر کی اور اسکو کئی مہینے اپنا مہمان رکھا یہاں موسم کے موافق کپڑے سفرخرچ وغیرہ سب سے اسکو مطمئن کر دیا اور کچھ آداب مجلس وغیرہ بھی سکھلائے۔ جو شہر میں ضروری خیال کئے جاتے ہیں اور جس سے یہ بیچاری بالکل بے بہرہ تھی۔

نیک دل میلین نے ایک کشتی میں اسکو بٹھا دیا اور ایک معتبر آدمی کے سپرد کر دیا۔ دریائے والگا میں اس دفعہ طغیانی بہت آئی اور کشتی پانی میں ڈوب گئی۔ پراسکوویہ کا محافظ بیمار ہوگیا اور اوسکو ایک کنارے کے قصبے میں چھوڑ دینا پڑا۔ مگر پراسکوویہ صحیح سالم دریا سے نکل آئی اور ملاحوں نے اسکو بچانے میں اپنی جان لڑا دی ماسکو میں پراسکوویہ کو ملاحوں نے اوتار دیا میلین نے ایک خط یہاں کی راہبہ کے نام دیا تھا مگر استنے بڑے غدار شہر میں سے بیچاری کے حواس باختہ ہوگئے۔ گرجا میں گئی اول اول تو گرجا کی عورتوں نے بہت بے التفاتی کی مگر آخرکار وہاں کے افسر نے شرف باریابی بخشا اور بہت اچھا سینٹ پیٹرزبرگ پہونچانے کا بندوبست کیا اور ایک معزز افسر کے نام خط دیا جسکی مدد سے وہ آخرکار شہنشاہ کے دربار میں پہونچ گئی۔ سینٹ پیٹرزبرگ میں پراسکوویہ کو جاتے ہی شہنشاہ کی باریابی حاصل نہیں ہوگئی یہاں اسکو مدت تک ٹھوکریں اٹھانی پڑیں آخرکار والدۂ زار کے سکرٹری کے ذریعہ سے وہ زارینہ کی خدمت میں پہونچی زار کی ماں بڑی رحم دل اور سخی عورت تھیں۔ انہوں نے جب پراسکوویہ کی مصیبتوں اور اسکے اس عظیم الشان ارادہ کا حال سنا تو وہ بہت خوش ہوئیں انہوں نے اسکو بہت کچھ

انعام واکرام دیا اور مادرانہ شفقت سے پیش آئیں۔ زار تک پہنچا دیا اور اُس سے اُس کی جلاوطن ماں باپ کی سفارش کی زار پال تو مرچکا تھا۔ زار سکندر جو رحم دل تھا حکمراں تھا اُسنے معافی دیدی اور بہت خوش ہوا بڑا انعام واکرام دیا۔

(باقی آیندہ)

اڈیٹوریل

زنانہ نارمل اسکول علی گڈھ اُن اسلامی درسگاہوں میں سے ہی جسکا اثر کُل قوم کی تعلیم نسواں پڑرہا ہی اور پڑیگا۔ اگر قوم اس بات کو تسلیم کرچکی ہی کہ عورتوں میں تعلیم کا پھیلانا ہماری قومی ترقی اور اغراض کے لیئے ایسا ہی ضروری ہی جیسا کہ مردوں کی تعلیم تو پھر ایک ایسی درسگاہ کا جیسی کہ علی گڈھ کا زنانہ اسکول ہی اس ضرورت کو پورا کرنیکے لیئے لازمی سمجھنا چاہیئے اور قوم کو اُسکو ترقی دینا اپنے اوپر ایک فرض تصور کرنا چاہیے۔ ہم خصوصیت کے ساتھ ناظرین خاتون کی توجہ زنانہ نارمل اسکول کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور خاتون کی پڑھنے والی بیگمات اس بات کو اپنے دل سے کبھی فراموش نہونے دیں کہ ہندوستان کی عورتوں کی ترقی کے لیے اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہی۔ ہزارہا سال کی جہالت اور ذلت جس میں یہ غریب مبتلا تھیں اُس کی آج تلافی کرنے کی کوشش ہورہی ہی ہم کو کمال انسانی ہمدردی نے اس خاص مسئلہ کی طرف کھینچا۔ ہمنے دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی اور خدا کا شکر ہی کہ ایک گروہ کثیر اسوقت ہمارا ہم خیال ہی۔ ہمارے ہمعصر انسٹیٹیوٹ گزٹ نے کسی گزشتہ نمبر میں قوم کی توجہ نارمل اسکول کی طرف دلائی اور قوم سے اپیل کیا ہی کہ وہ اس کی مالی حالت کو اچھے پیمانے پر پہنچانے میں مدد دیں۔ ہمیں امید ہی کہ یہ کل ہماری اپیلیں اور ہمعصروں کی ہمدردی اور ہماری کوشش رائگاں نہ جاوے گی۔

زنانہ ہشیار کی نمایش کے بارے میں ہمارے پاس کثرت سے تقاضے آئے ہیں۔ لوگ خواہشمند ہیں کہ امسال بھی بدستور نمائش کیجاوے۔ چند لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو اس نمائش کو اسوجہ سے فضول خیال کرتے ہیں کہ بیبیاں اس نمایش کو آکر نہیں دیکھتی ہیں۔ ہم اُن حضرات سے متفق ہیں کہ اگر بی بیاں آکر نہ دیکھیں تو صرف مردوں کو دکھانے سے کچھ فائدہ نہیں ہی لیکن یہ بات قابل ذکر ہی کہ لکھنؤ میں اور علی گڑھ میں ہمنے ایک کافی تعداد پردہ نشین بیبیوں کو نمایش گاہ میں جاکر ہر چیز کو بغور دیکھنے کا موقع دیا تھا اور جن بیبیوں نے ان اشیار کو دیکھا انکو انتہا درجے کا فائدہ پہنچا۔ ڈھاکہ کی نمایش میں ہم بی بیوں کو دکھانیکا انتظام نہ کرسکے کیونکہ وہاں کا انتظام ہمارے ہاتھ میں نہ تھا ہم مجبور رہے اور ہم سے اخیر وقت میں جب صرف ایک مہینہ رہگیا تھا تو نمائش کا انتظام کرنے کے لیے خواہش کی گئی تھی لیکن کراچی میں ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں کا انتظام ہمنے خاص بزرگوں کے ہاتھ میں دیا ہی وہ اس نمایش کا ایسا انتظام کرینگے کہ کل پردہ نشین بیبیاں نمایش دیکھ سکیں اور نیز وہ کل اشیار کو جو نمائش میں بھیجی جاویں گی باحتیاط و بہ حفاظت تمام اشیار بھیجنے والوں کے پاس واپس بھیج سکینگے۔ ہماری رائے قطعی طور پر یہ ہی کہ نمایش ہونی چاہیے اور اسکا انتظام بھی شروع کر دیا ہی۔ گزشتہ نمایش میں ہمنے جن لوگوں سے انعام و تمغے دینے کا وعدہ کیا تھا وہ کبھی مایوس نہوں تاخیر ضرور ہوئی ہے لیکن تمغے بھی ضرور ملیں گے۔ تمغوں کا روپیہ ہمارے پاس سے جاچکا ہی اور عنقریب تمغے تیار ہوکر آجاوینگے۔ ہمیں ناظرین خاتون سے اور دیگر حضرات سے توقع ہی کہ وہ ابھی سے آیندہ نمایش کی کامیابی کا خیال رکھینگے۔

ایک کتاب موسومہ زنانہ حُسن ولباس مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور مؤلفہ مصنفہ لالہ بالک رام صاحب لاہور سے ہمارے پاس آئی ہی اُس میں ممالک ایشیار اور مصر اور ٹرکی اور ہسپانیہ کی عورتوں کی تصویریں بھی مصنف نے درج کی ہیں۔ مصنف ایک فلسفیانہ خیال

کے بزرگ معلوم ہوتے ہیں اور فلسفہ کی اُس خاص شاخ سے جسکو فلسفہ حُسن کہتے ہیں آپ کو بہت کچھ لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔ مصنف نے مستورات کے مختلف اعضاء اور خط و خال کے حُسن و خوبی پر بحث کی ہے اور بعض بعض مقامات پر اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے جو مخصوص اُنھیں کا خیال معلوم ہوتا ہے اور جس سے شاید دوسرے لوگ متفق نہ ہونگے۔ خوبصورتی خدا کی بہت بڑی نعمتوں میں سے ہے اور ایک خوبصورت بیوی اگر اچھے اخلاق اور اعلیٰ لیاقت کے زیورات سے بھی مزین ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ایک کامل انسان کہلانے کی مستحق ہے۔ لیکن ہر شخص کی خوبصورتی کا معیار جداگانہ ہے۔ اور دنیا کی قومیں مختلف مذاق رکھتی ہیں چنانچہ ملک چین میں سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ عورت کا پاؤں چھوٹا ہو خواہ مُنہ چڑیل ہی کا سا کیوں نہ ہو۔ وسط افریقہ کے حبشیوں میں جس قدر عورت موٹی ہوگی اُسیقدر زیادہ خوبصورت متصوّر ہوگی۔ اُس ملک میں مائیں اپنی لڑکیوں کو بچپن میں سوائے چانولوں کے پانی یا پیچ کے اور کچھ غذا کھانے کو نہیں دیتیں۔ چنانچہ بارہ چودہ سال کے سن میں ایک لڑکی تھل تھلاتا ہوا گوشت کا ڈھیر سی نظر آتی ہے جسکو چلنا پھرنا بھی دشوار ہوجاتا ہے اور اگر کوئی لڑکی اسقدر موٹی ہوجائے کہ وہ بیٹھکر اُٹھ نہ سکے تو وہ سب سے زیادہ حسین خیال کیجاتی ہے اور وہاں کا بادشاہ اُسکو پسند کرتا ہے اور اپنی ملکہ بناتا ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید۔ ہر شخص کا معیار جداگانہ ہے نگاہ اپنی اپنی۔ پسند اپنی اپنی۔ پس ہم مصنف صاحب کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے کہ جو معیار اُن کا ہے وہی دنیا بھر کو مرغوب اور پسند ہوگا۔ ہاں اس بات کا ہم بڑے زور سے اعتراف کرتے ہیں کہ مصنف نے ایک عمدہ اور دلچسپ علم کی اُردو زبان میں بنیاد ڈالی ہے۔ اور اگر مرد اور عورتیں اس کتاب کو پڑھیں گی تو اُنکو بہت فائدہ ہوگا کیونکہ اس میں جسم اور لباس کی صفائی کے متعلق بہت اچھی اچھی

باتیں درج ہیں اور بعض معمولی بیماریوں کا جن کی وجہ سے خوب صورتی میں فرق آجاتا ہے اُن کا علاج بھی بتایا ہے گو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اگر کوئی بیوی مصنف کا کوئی مجوزہ نسخہ استعمال کرنا چاہے تو اُسے کسی ڈاکٹر یا حکیم سے مشورہ لینا ضروری ہو گا۔

مصنف کتاب ہذا نے لباس کے متعلق جس قدر تحریر فرمایا ہے وہ بہت قابل غور ہے۔ یہ بات سب لوگ تسلیم کرینگے کہ ہمارے لباس میں اصلاح کی ضرورت ہے مصنف کتاب ہذا نے اس اصلاح کے متعلق بہت سی مفید اور ضروری باتیں لکھی ہیں ہم مصنف صاحب کے شکر گزار بھی ہیں کہ اُنھوں نے اس کام میں جس سے ہم کو خاص تعلق ہے ایک خاص خدمت کی ہے۔ یہ کتاب ۱۷۴ صفحوں کی چھوٹی تختی کے سفید کاغذ پر نہایت عمدہ چھپائی جلد بندھی بندھائی ڈبی کاغذ پر للعہ ر کو دیسی کاغذ پر ۱۲ روپیہ کو اس پتہ سے ملتی ہے۔

پتہ

لالہ بالک رام بر مکان لالہ مدن گوپال صاحب وکیل چیف کورٹ لاہور

پردہ

ماہ اگست کے پرچۂ خاتون میں مس لے۔ کے صاحبہ اور خدنگ صاحب کے مضامین میں کچھ آزادی کی بو آتی ہے اسپر شاید بعض لوگوں کو اعتراض ہو کہ خاتون میں ایسے مضامین کیوں شائع کیے جاتے ہیں۔ اول تو مس لے۔ کے صاحبہ خود ایک ہندوستانی خاتون ہیں اسی ہندوستان میں پیدا ہوئیں یہیں کی آب و ہوا میں اُنکی پرورش ہوئی اور اسی ایشیائی سوسائٹی میں اُن کا نشو و نما ہوا اُن کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ پردے کی مخالف ہیں کسی طرح قرین قیاس نہیں ہو سکتا۔ اُنھوں نے خود لندن میں جاکر جنم لینا گوارا کیا اور اپنے آپ کو ایک یوروپین معاشرت کی خاتون قرار دیکر ایک یوروپین

کی آنکھ سے ہماری حالت کو دیکھنے کے بعد اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ہر زن و مرد
جو یورپ میں پیدا ہوا ہوگا اُس کے یہی خیالات ہونگے۔ مس لے کے صاحب کے
مضامین کا سلسلہ ابھی جاری رہیگا دیکھیں آیندہ جاکر وہ ایشیائی معاشرت کی خاتون کی
زبان سے کیا کچھ ثابت کراتی ہیں۔ مسٹر خدنگ نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہے
جسکے بارے میں کسی کو کچھ شکایت ہوسکے۔ اُنھوں نے ایک قصہ لکھا ہے اور قصے کے
پیرایے میں ہندوستانی عورتوں کی موجودہ حالت کے متعلق بھی کچھ لکھ گئے۔

ہمارے ناظرین یہ تو جانتے ہیں کہ جہاں ہم پردہ کے حامی ہیں وہاں اپنی مستورات
کی موجودہ حالت کو بھی نہایت ناپسندیدہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خدنگ صاحب نے
یقیناً پردہ کی نسبت کچھ نہیں لکھا ہے بلکہ عورتوں کی اُس قید تنہائی کی بابت لکھا ہے
جسکو جاہل لوگ بیہانتک جائز رکھتے ہیں کہ عورتوں کو عورتوں سے بھی نہیں ملنے دیتے
لیکن اگر خدنگ صاحب کا مطلب پردہ کی مخالفت ہو تو ہم کو اُنکے خیالات پر افسوس
کرنا پڑیگا اور آیندہ اُنسے خواہش کرنی پڑیگی کہ وہ پردہ کو اپنی حالت پر رہنے دیں۔
کیونکہ اسوقت جن امور میں ہم کو اصلاح کرنی منظور ہے پردہ کسی طرح اُن کی
سد راہ نہیں ہے۔

اوپر ہم نے زنانہ صنعت و حرفت کی نمایش کا اعلان کیا ہے اُس نوٹ کے
لکھنے کے بعد سندھ سے جو ہمارے پاس خطوط آئے ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ
اسکے سال ہم کو اس کام میں بہت کچھ کامیابی کی امید رکھنی چاہیے۔ بزرگان سندھ
میں سے جناب مسٹر محمد الیاس صاحب و مسٹر محمد یوسف صاحب دو صاحبوں نے
خاص طور پر اس کام کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ مسٹر محمد الیاس صاحب نے مہربانی سے
نمائش کا لوکل سکرٹری ہونا منظور فرمالیا ہے اُنھوں نے صوبہ سندھ میں ابھی سے

بڑی سرگرمی سے کام شروع کر دیا ہے۔ جا بجا اپنے ایجنٹ بھیجکر خالص سندھی ساخت کی اشیاء جمع کرنی شروع کی ہیں اب جو صاحب یا جو خاتون کوئی چیز نمایش کے لیے ابھی سے بھیجنا چاہیں وہ مہربانی سے مسٹر محمد الیاس صاحب کے پاس حیدرآباد سندھ میں جن کا قیام گاہ متصل عیدگاہ حیدرآباد سندھ ہی بھیجیں مسٹر محمد یوسف صاحب مشہور لیڈر مرحوم سردار یعقوب خاں صاحب کے بھائی ہیں اور محمد الیاس صاحب اُنکے بھتیجے ہیں۔ یہ دونوں صاحب صوبہ سندھ میں بہت با اثر ہیں اور ہمیں بہت کچھ توقع ہی کہ اُن کی کوشش سے ہماری نمایشس ابکے نہایت کامیابی کے ساتھ ہو سکے گی۔ ہم نے خود ابھی سے کوشش شروع کر دی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ۔ گوالیار اور بھوپال اور بمبئی وغیرہ بڑے بڑے مقامات پر ہم کو غالب خود جانے کا اتفاق ہوگا اور ہم خود اُن مقامات سے اشیاء بہم پہنچانے کی کوشش کرینگے۔ خاتون کے ناظرین کو ہماری پوری مدد کرنی چاہیے اور اشیاء کے بھیجنے میں ایک خاص بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ کوئی صاحب یا خاتون جب کوئی چیز بھیجیں وہ ماسوا کسی لکڑی کے بکس کے کسی دوسری قسم کی پارسل میں نہ بھیجیں۔ کراچی کی تمام معزز ہندو مسلمان اور پارسی لیڈیاں اس نمایش کو دیکھنے کی ابھی سے مشتاق ہیں ہمیں امید ہے کہ ہماری خاتونیں اُن کی دلچسپی کے لیے پورا سامان بہم پہنچانے کی کوشش کرینگی۔ واپسی کا کرایہ ہر حالت میں ہمارے ذمہ ہوگا۔

بعض لوگ نارمل اسکول کا اصلی مقصد سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں ہم کو اس بارے میں پبلک کی اطلاع کے لیے بہت کچھ لکھنا ہے لیکن خلاصے کے طور پر یہاں پر یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ نارمل اسکول کے جاری کرنے سے ہمارا یہ مقصد نہ تھا کہ لڑکیوں کو قرآن شریف اور تھوڑی سی اُردو زبان سکھا کر ہم استانیوں

ڈپلوما دیدیں۔ ہمارے ایک دوست نے ہمکو لکھا تھا کہ وہ استانیوں کے مدرسہ کا
ابتک یہ مطلب سمجھتے رہے ہیں کہ جو عورتیں اسوقت خفیف اُردو اور قرآن شریف
جانتی ہیں اور استانیاں کہلاتی ہیں اُن کو سال ڈیڑھ سال تک تعلیم دیکر اُن کی
قابلیت میں کچھ اضافہ کر دیا جاتا لیکن استانیوں کے مدرسہ جاری کرنے سے
ہمارا یہ مقصد کبھی نہیں ہوا اور نہ ہے۔ ہمارا مطلب شروع سے یہ ہے کہ ایک ایسا
مدرسہ ہو جس میں ایک لڑکی کم از کم مڈل کے درجے تک لیاقت حاصل کرنے کے
بعد دو سال تک فن درس و تدریس کے حاصل کرنے میں صرف کرے اور اُسکے
بعد ہم اُسکو استانی ہونے کی سند دیں۔ اگر اس سے کم لیاقت کی لڑکی ہوگی تو
ہم اُسکو کسی طرح لڑکیوں کی تعلیم کے لیے مقرر کرنے کی سفارش نہ کر سکینگے۔

اب اس قسم کے مدرسے کے لیے ابتدائی باقاعدہ تعلیم کا ہونا از حد لازمی تھا اور
اسی لیے مدرسہ جاری کر دیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ پانچ چھ سال کی متواتر تعلیم
کے بعد ہم اُس لیاقت کی تعلیم یافتہ لڑکیاں اپنے مدرسے میں تیار کر سکیں گے
جو ہمنے اوپر بیان کیا ہے۔

ہمیں زنانہ نصاب تیار کرانے کے لیے ایک قابل آدمی کی ضرورت ہے۔
مصالح ہمارے پاس بہت کچھ جمع ہو گیا ہے اور باقی ہو رہا ہے۔ بڑی بڑی
کتابوں میں سے خلاصہ کرنے کے لیے ہم کو وقت نہیں ملتا۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ
کوئی صاحب ہمارے زیر نگرانی اور کمیٹی نصاب کی ہدایت کے موافق اس کام
کو علی گڑھ میں رہکر انجام دیں تنخواہ ہم حسب لیاقت پچھتر روپیہ ماہوار تک
اور رہنے کا مکان دینگے۔ سال بھر میں یہ کام ختم کر دیا جاوے گا۔ کوئی صاحب
اگر انگریزی۔ عربی۔ فارسی جاننے والے بھی ہوں اور اُس کے ساتھ

تصنیف و تالیف میں بھی مذاق رکھتے ہوں تو اُن کو ہم ترجیح دینگے۔

درخواستیں مع اسناد و نمونہ جات تصنیف و تالیف سکرٹری سیغہ تعلیم نسواں کے پاس بمقام علی گڑھ آنی چاہییں۔

ہم سے ایک شخص نے کچھ عرصہ ہوا کہ دریافت کیا کہ انسان کو افکار سے بچنے کے لیے اور خوشی حاصل کرنیکے لیے کیا تدبیر کرنی چاہیے۔ ہم نے سب سے اول اُنسے یہ دریافت کیا کہ آپ کا کیا شغل ہے اور آپ کیا کام کرتے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ کام ہمارے دشمن کریں خدا کے فضل سے فارغ البالی ہے۔ گوشت روٹی کھانے کو اللہ کا دیا بہت ہے، کام کاج کرنے کی کوئی محتاجی نہیں ہے اسپر ہم نے اُن کو یہ جواب دیا کہ ہمیں آپ کی حالت کی تشخیص کے بعد اب مطلق کچھ شبہ باقی نہیں رہا کہ جب تک آپ کی موجودہ حالت قائم رہے گی آپ نہ افکار سے نجات حاصل کر سکینگے۔ اور نہ خوشی آپ کو حاصل ہوگی۔ اور اگر آپ کی یہ خواہش ہو کہ آپ کو خوشی حاصل کرنے کی تدبیر بتائیں تو وہ یہ ہے

تدبیر

کسی وقت اپنے دماغ کو پریشان خیالات میں منتشر مت ہونے دو۔ اور دماغ کو پریشانی اور خیالات کو انتشار سے بچانے کیلیے دنیا میں صرف ایک علاج ہے اور وہ علاج **شغل** ہے۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۷۱

خاتون

جلد ۲ | ماہ شعبان ۱۳۲۵ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۰۷ء | نمبر ۱۰

اڈیٹر شیخ محمد عبد اللہ بی۔ اے ایل۔ ایل۔ بی۔ سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

علی محمد خاں کے اہتمام سے
مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علیگڈھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اسکی سالانہ قیمت دو روپے اور ششماہی ایک روپیہ ہے

۲۔ اس رسالے کا صرف ایک مقصد ہے یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جب تک مرد اس طرف متوجہ نہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور اُسکے بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہورہے ہیں اُسکی طرف مردوں کو ہمیشہ متوجہ کرتے رہینگے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جاے۔ جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑہنے کی اُنکو ضرورت محسوس ہوتا کہ وہ اپنی اولاد کو اُس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالے کی مدد کرنے کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی مدد آپ کرنا ہے اگر اسکی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر اُستانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائیگا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڑھ ہونی چاہیے۔

مہذب شادی

سکندر جہاں بیگم صاحبہ قدیم نامہ نگار خاتون اور نارمل اسکول کی بڑی حامی و مددگار بیوی ہیں۔ خود مدرسے میں جاکر لڑکیوں کی تعلیم کی نگرانی کرتی ہیں۔ لڑکیوں کو صفائی اور دیگر ضروری امور کے سبق سکھاتی ہیں۔ لڑکیوں کے دلوں میں بھی ان کی بہت محبت ہے۔ اور کیوں نہ ہو جو کسی پر شفقت کریگا وہ اُسکو اپنا گرویدہ ضرور بنائیگا۔ مہذب شادی کے مضمون میں اُنھوں نے آجکل کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ عام طور پر اب پُرانی رسموں کو لوگ محض فضول اور بعض کو ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ ہر پہلو سے اصلاح کی طرف پبلک متوجہ ہے۔ رسوم شادی کی اصلاح کیوں نہ ہوتی۔

مضمون نگار کے مضمون کو بیبیاں بڑے ذوق شوق سے پڑھیں گی۔ لیکن اُس میں ہمارے مطلب کی بھی ایک خاص بات ہے۔ ناظرین اُسکو ذرا توجہ سے پڑھیں وہ یہ ہے کہ ہر شادی پر نارمل اسکول علیگڈھ کا بھی کچھ حصہ نکلنا چاہیئے۔ اڈیٹر

محمودی بیگم - آپا جان آپ احمدی بیگم کی بیٹی کی شادی میں دلی گئی تھیں سنا ہے کہ نئے طریقہ سے
شادی ہوئی۔

مسعودی بیگم - ہاں بہن اُسوقت میں دلی میں تھی جب ہی یہاں آئی تم سے ملنے کا موقع نہیں ملا۔
بوا نیا زمانہ نئی نئی باتیں - شادی کے طریقے بھی بدلتے جاتے ہیں۔ ساچق چوتھی چالے
تو ہوے نہیں۔

محمودی بیگم - سچ - اچھا کیا ساچق تو اس زمانے میں بالکل نامناسب تکلیف وہ رسم ہے آرائش و
نمائش پر جو روپیہ خرچ ہوتا ہے وہ بالکل فضول ہوتا ہے اس رسم میں کوئی بات بھی
تو نہیں نکلتی۔

مسعودی بیگم - بوا شاہی رسمیں بلا غور و توجہ ابتک جاری رکھیں - وہ بادشاہی خدائی تھی عوام
میں بھی دولت بیشمار تھی تعلیم بھی اس قسم کی نتھی اسی طرح روپیہ خرچ کرتے تھے کئی
دن کی شادی ہوا کرتی تھی - تورے بندی - اُبٹنا - مہندی ساچق - برات - چوتھی - چالے
ہوا کرتے تھے اب اس زمانے میں لڑکے کی تعلیم پر کیا کم خرچ ہوتا ہے لڑکیوں کی تعلیم پر بھی
خرچ ہوتا ہے اُستانی و مس صاحبہ کو گھر پر تعلیم کی غرض سے رکھو سو روپیہ سے کم خرچ
نہیں ہوتا ان وجوہات سے شادی کے فضول خرچ روکنے کی فکر سب کر رہے ہیں۔

محمودی بیگم - جوں جوں تعلیم پھیلتی جائیگی بُرائی سوجھتی جائیگی - احمدی بیگم کی بیٹی کے بیاہ کا حال تو
بتایئے کہ کس طریقے سے شادی ہوئی۔

مسعودی بیگم - بوا میں تو جہیز ٹکنے کے وقت سے کئی دفعہ گئی جو کچھ ہو سکا مدد دی -

محمودی بیگم - کیا سب جہیز گھر ہی میں ٹکا -

مسعودی بیگم - نہیں ایک مغلانی اور رکھی تھی دونوں لڑکیاں ٹانکتی تھیں - گھر لو جو غریب عورتیں اپنے
گھر پر سلائی کرتی ہیں اُنسے ٹکوایا کارچوب کا کام کچھ لڑکیوں نے کیا کچھ کپڑے باہر کارچوب ہوئے
سیا ہوا تو پہلے ہی سے تیار تھا گوٹہ اب ٹکا ہے بیٹی کی مشکل ہے۔

محمودی بیگم۔ مشکل یا آسان شادی کیوقت تو سل ٹک جاتا ہے اور جہیز سے جو لڑکیوں کو آرام ملتا ہے وہ بیان سے باہر ہے عمر بھر ہی جہیز کی چیزوں سے آرام ملتا ہے۔

مسعودی بیگم۔ ہاں یہ تو سچ ہے۔ احمدی بیگم نے چینی شیشے کے برتن زیادہ دیے ہیں تانبے کے کم دیے ہیں۔

محمودی بیگم۔ ہاں ضرورت کے لحاظ سے چینی شیشے کے زیادہ دیے ہیں۔

مسعودی بیگم۔ یہ پچیس جوڑے کپڑوں کے جسمیں چار ساڑھیاں ریشمی کلابتونی ہیں چار لہنگے پانچ پاجامے تنگ موری کے باقی ڈھیلے پاجامے اوپر کے کپڑوں میں جاکٹیں ہندوستانی۔ انگریزی کرتے ہر قسم کے کپڑے کی ساڑھیاں کسی پر کامدانی کسی پر کارچوبی فیتہ سب کپڑے موزوں ٹانکے ہیں۔

محمودی بیگم۔ کیا دلی میں ساڑھیاں لہنگے پہنتے ہیں۔

مسعودی بیگم۔ لہنگے تو نہیں مگر ساڑھیوں کا رواج چل نکلا ہے۔ احمدی بیگم کے میاں کی ملازمت کا سلسلہ پنجاب میں دیر تک رہا اور لڑکیوں کو سادگی کی تعلیم ملی خیالات میں تبدیلی ہو گئی ہے لڑکیاں لباس کئی طرح کا پہنتی ہیں جہیز بھی ویسا ہی بنایا۔ جہیز میں الماریاں میز کرسیاں اور گھر سجانے کے سامان میں بہت سی چیزیں دیں ہیں۔ چاندی کا چھپر کھٹ۔ تھالی۔ جوڑ۔ پنکھا۔ خاصدان۔ عطر دان چار کا سٹ بھی چاندی کا دیا ہے۔ خاصدان نئی وضع کا بنوایا ہے۔

محمودی بیگم۔ وہ کیسا ہے۔

مسعودی بیگم۔ خاصدان تین حصہ میں ہے۔ پان الگ کرکے اوپر کے حصے میں رکھ لو بیچ کے حصے میں چھالیا رکھ سکتے ہیں۔ شادی سے ایک ہفتہ پہلے مکان کی صفائی ہوئی دولھا کا جوڑا سادہ طور سے منگوا لیا۔

محمودی بیگم۔ سادہ طور سے کس طرح۔

مسعودی بیگم۔ احمدی بیگم نے سمدھن سے کہلا بھیجا۔ کہ دولھا کے کپڑے نمونے کے لیے بھیج دیجیے اور مٹھائی کی چنداں ضرورت نہیں ہے یہ رسم فضول معلوم ہوتی ہے۔ دولھا کی ماں نے ایک تھجی میں کپڑے تہ کر کے بھیج دیئے۔ مکان کی صفائی کے بعد شادی کا بلاوہ چھپوا کر تقسیم کرایا۔

محمودی بیگم۔ کیا لکھا تھا۔

مسعودی بیگم۔ رقعہ ہی جو موجود ہے پڑھ لو۔

محمودی بیگم نے مندرجہ ذیل رقعہ پڑھ کر سنایا۔

بنا ہمن۔ تسلیم

۱۱۔ تاریخ ماہ رجب بروز یکشنبہ بوقت صبح ۸ بجے دن کے میری بڑی لڑکی اختری بیگم کا عقد قرار پایا ہے پس آپ سے ملتمس ہوں کہ آپ ۱۰ تاریخ روز یکشنبہ بوقت چار بجے شام کے تشریف لا کر تقریب اُبٹنے میں بھی شریک ہو کر مجکو ممنون و مشکور فرمائیں۔

المکلّف

احمدی بیگم

قریب کے رشتہ داروں کو اتوار کے دن صبح سے بلایا تھا صبح سے مکان کی صفائی فرش فروش ہوا تصویروں گلدستوں سے سجایا گیا سب نے کپڑے بدلے دلہن کو ایک کمرے میں بٹھادیا ۹ بجے دن کے بیویاں آنی شروع ہوئیں۔ قریب بیس بائیس بیبیوں کے آئیں۔ ۱۱ بجے نیاز فاطمہ زہرا علیہا السلام کی ہوئی کھانے سے فارغ ہو کر سب بیبیوں کی خواہش سے جہیز دکھایا بہنوں نے دلہن کے کپڑے ہار سنگھار کی ڈنڈیوں میں رنگے بہنوں کے نیگ مانگنے پر ایک گنی دی۔

محمودی بیگم۔ اُدھر سے جوتی چھپوائی وغیرہ کا نیگ ملا۔

مسعودی بیگم۔ سب لڑکیوں نے اتفاق کیا کہ جوتی چھپانا ذلیل رسم ہے۔ اس رسم کے بُرے معنی پیدا

ہوتے ہیں اسکو چھوڑنا چاہیے یہ بات سُنکر اختری کی ساس بہت خوش ہوئیں۔ دلہن نوائی وغیرہ کے نام سے سو روپیہ نیگ کے لڑکیوں کو ملے۔ جہیز دکھا کر دولہا کا جوڑا کشتی میں لگا یا باہر سے پینڈیاں بنوا کر اندر بھیجیں۔

محمودی بیگم۔ اور دولہا کے لیے برتن بھیجے ہیں۔

مسعودی بیگم۔ نہیں احمدی بیگم نے کہا یہ فضول رسم ہے برتنوں کی دولہا کو کیا ضرورت ہے۔ جوڑے کے ساتھ دو شالہ سونے کی گھڑی قمیص کے سونے کے بٹن بھیجے۔

محمودی بیگم۔ احمدی بیگم نے کیا سوچکر فضول لغویات کو چھوڑ کر شادی کی ہے یہ اور بات ہے کہ خدا نے روپیہ دیا ہے جہیز میں داماد کو عمدہ عمدہ قیمتی چیزیں دیں۔ جسکو جسقدر مقدور ہو ویسا کرے اور پھر دولتمندوں کے لیے تو گویا مثال قائم کر دی۔

مسعودی بیگم۔ بیشک وہ گھر معمولی شادیوں جیسا نہ معلوم ہوتا تھا ہر وقت نہایت صاف پانی پان کھانا وغیرہ سب ضروریات کا بہت اچھا انتظام کیا۔ شام کے وقت جب بہت سی بیبیاں جمع ہوگئیں دلہن کے اُبٹنا لگا یا گیا۔ دولہا کو اُبٹنا جوڑہ پینڈیاں بھیجدیں ڈومنیاں سہرے سہاگ گاتی رہیں ڈومنیوں کو بیہودہ لغویات الفاظ نکالنے کی سخت ممانعت کر دی گئی تھی۔

محمودی بیگم۔ اے تو ڈومنیوں کو بلایا ہی کیوں۔

مسعودی بیگم۔ احمدی بیگم کی چھوٹی لڑکی اور رشتہ کی لڑکیوں کے اصرار سے۔ رات کو کھانے سے فارغ ہو کر دلہن کے صرف ہاتوں میں مہدی لگائی گئی۔ ہاتھ کی پشت پر مثل اور دلہنوں کے نہیں لگائی سب لڑکیوں نے ہارمونیم باجا بجایا اور غالب حافظ کی کئی غزلیں گا کر سب مہمانوں کو سُنا کر محظوظ کیا۔ پھر فونوگراف سُنایا۔ فونوگراف ایجاد کرنیوالے نے غضب کیا ہے۔

محمودی بیگم۔ خیر فونوگراف تو غیر ایجاد ہے مگر لڑکیوں کے گانے کی تعریف کرنی چاہیے۔

مسعودی بیگم۔ ہاں کوئی اچھا کوئی بُرا یہ قدرتی مادہ جو انسان میں پیدا ہوا ہی سب اُسکو صرف کرتے ہیں۔ یہ کہو اس زمانے میں باجوں نے اور انگریزی تعلیم نے بڑھا دیا ہے۔
پھر ۱۱ بجے رات کے سب مہمان سو گئے چار بجے مکان میں صفائی ہوئی سب مہمانوں نے لباس بدلے اور دولھا کو سہرا بھیجا بہنیں دُلہن بنانے لگیں ۶ بجے کے قریب برات آگئی اندر سمدھنیں اُترنی شروع ہوئیں ادھر سے دو بیبیاں سمدھنوں کے استقبال کو گئیں۔ اور چاندی کی پیالی میں پہلے سے صندل گھسوا رکھا تھا وہ سمدھنوں کی مانگ میں لگائی تھیں۔ دولھا کی طرف سے دلہن کے لیے کشتی میں کارچوبی جوڑا اور ایک خوبصورت صندوقچے میں زیور دوسرے صندوقچے میں ایک چاندی کا آئینہ ۲ دو خوب صورت کنگھیاں دو چاندی کی عطر کی شیشیوں وغیرہ سے سجا ہوا آیا۔
محمودی بیگم۔ عطر کی شیشیاں کنگھیاں صندوقچے میں سجی اچھی معلوم ہوتی ہونگی مسّی بھی تھی۔
مسعودی بیگم۔ نہیں مسّی نہیں آئی۔
محمودی بیگم۔ بری بھی نہیں لی۔
مسعودی بیگم۔ بری تو لی یہاں سے ہنڈیاں گئیں۔ احمدی بیگم اور اُنکی سمدھن نے تو چاہا تھا کہ یہ رسم بھی ترک کردیں مگر احمدی بیگم کی ساس نے کہا کہ یہ کُنبے رشتہ کا لینا دینا ہی یہ رسم بُری ہی یا اچھی ابھی ترک نہیں ہوسکتی۔ بَری میں صرف نقل میوہ مصری بس ساچق تو ہوئی نہیں جو سہاگ پوڑا وغیرہ آتا دولھا سے سرّج پسوایا نہیں کہ سل بٹے کی تلاش ڈھونڈھ پڑتی۔
محمودی بیگم۔ زیور کیا کیا آیا نتھ بھی آئی۔
مسعودی بیگم۔ زیور بہتیرا آیا جڑاؤ وہاں سے آیا سادہ یہاں سے ملا نتھ نہیں آئی لڑکی کی ناک نہیں چھدی۔ صرف کان چھدے ہیں۔

محمودی بیگم۔ ریت رسمیں ہوئیں۔
مسعودی بیگم۔ ہاں احمدی بیگم نے کہا یہ تو مذاق کی باتیں تل کھانڈ دولھا کو کھلانا کاجل لگانا وغیرہ
کچھ نہیں ہوا۔
محمودی بیگم۔ یہ شکر ہے کہ احمدی بیگم کو سمدھن ہمخیال ملیں۔
مسعودی بیگم۔ اُن کی بچپن کی سہیلی ہیں تعلیم یافتہ ہیں ایک جگہ پڑھا شادی ہونے تک
ہروقت کی صحبت تھی پھر کبھی ملنا نہ چھوٹا۔ آرسی مصحف کے بعد دولھا کو چار
پلائی گئی۔ رخصت کے وقت سے پہلے اندر سمدھنوں کو ناشتہ دیا گیا چار
بسکٹ مٹھائی وغیرہ اور ایسا ہی باہر سمدھیوں کو دیا گیا۔ رخصت کے وقت
سمدھنیں آپس میں خندہ پیشانی سے ملیں۔ ایک نے دوسرے کو مبارکباد
دی۔ احمدی بیگم کی سمدھن نے کہا بہن شکر ہے آج آپ اور میں اپنے اپنے
فرض سے بہت لغویات فضولیات کو ترک کرکے سبکدوش ہوئے۔
شکر کا مقام ہے خدا اور بہنوں کو بھی ہدایت دے۔ لیجیے یہ پانچسو کا نوٹ حاضر ہے
کسی ایسی جگہ بھیجدیجیے جہاں آپ مناسب سمجھیں۔ اسپر احمدی بیگم نے کہا کہ
پانچسو میری طرف سے بھی لیجیے اور میری رائے تو یہ ہے کہ نارمل سکول جو علی گڑھ
میں کھلا ہے وہاں اشد ضرورت ہے۔ غریب مفلس لڑکیاں تعلیم پائینگی جو غریب
پڑھوانا چاہتے ہیں مدرسہ جاری ہونے سے پہلے کہاں پڑھوا سکتے۔
احمدی بیگم سمدھن نے کہا کہ آپ ہی رکھیے اور کل پرسوں بھیجدیجیے اسکے بعد
دولھا اندر آیا چارسو روپیہ احمدی بیگم نے سلامی دی۔ سب سمدھنوں کو
چلتے وقت ایک ایک ہار پھولوں کا اور گوٹہ کا ورق لگی گلوریاں دیں عطر لگایا
بیٹی کو ہنسی خوشی رخصت کردیا۔ دوسرے روز شام کو احمدی بیگم نے لڑکی
اور دولھا کو بلایا دو روز رکھکر ساس کی خواہش پر بھیجدیا۔ پھپھیوں خالاؤں

نے دولھا دلہن کو بُلایا اپنے رشتہ داروں کو بلایا دعوت کی لڑکی کی سہیلیوں
نے کسی نے کھانے کی کسی نے چا ء کی دعوت دی دو ہفتے بعد لڑکی اپنے
میاں کے ساتھ چلی گئی اب عید سے پہلے لڑکی اور اُسکے دولھا کو احمدی بیگم
نے بُلالیا۔ عید کے دن احمدی بیگم نے شام کو چند سمدہنوں اور چند اپنے
رشتہ داروں میل ملاپ والوں کی دعوت کی اُس دعوت میں اور کھانوں کے
علاوہ سوّیاں بھی تھیں۔

محمودی بیگم لڑکی کو دستور کے موافق کچّی سوّیاں نہیں بھیجیں۔

مسعودی بیگم۔ وہاں دستور کی پابندی نہیں تھی۔ مقصد فضول رسموں کا توڑنا میل ملاپ
بڑہانے پر نظر تھی۔ دوسرے روز اُسی طرح احمدی بیگم کی سمدھن نے دعوت
کی مکان سجائے گئے لباس پُر رونق پہنے گئے گانے کا شغل بھی تھا آپسمیں
تعلیم و تہذیب کے ذکر و تدبیریں ہوتی تھیں ہنسی مذاق بھی اعتدال کی حد سے
آگے نہ بڑہتا تھا نہایت مہذب محفل ہوتی تھی۔

رقمہ

سکندر جہاں بیگم

مکالمہ

بیگم رہنے بھی دیجیے یہ سب آپ کی کہنے کی باتیں ہیں اے وہ تو ہم پہلے ہی سے
جانتے ہیں کہ مردوں کی ہمدردی صرف لکچروں اور مضمونوں کی آرائش کے لیے
ہی باقی اللہ اللہ اور خیر صلا۔

میاں۔ آخر آج مردوں پر ایسی کیوں خفگی کیا قصور ہوا مجکو تو ایسی کوئی بات نظر
نہیں آتی جس سے مردوں کی ہمدردی کو جو انھیں بی بیوں سے ہے محض ایک

خیالی ہمدردی خیال کرتی ہو کم از کم میں تو اپنی طرف سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے
جتنی ہمدردی بیبیوں سے ہی مردوں سے نہیں ہی۔ مرد زیادہ آزاد طاقتور اور
ہوشیار ہوتے ہیں وہ اپنی خبرگیری آپ اچھی طرح کر سکتے ہیں کسی دوسر
کی اُنکو محتاجی نہیں بلکہ دوسرے اُنھیں کے محتاج ہوتے ہیں لیکن بیچاری
عورتوں کو نہ وہ آزادی ہی نہ خدا نے اُنکو ویسا مضبوط دل اور ویسی قوت
جسمانی عطا کی ہی بلکہ اُنکے جسم نازک دل نازک خیالات نازک بات بات پر
اُنکے دل پر اثر ہوتا ہی خود وہ بلحاظ رسم و رواج کے اپنے لیے روٹی کما
نہیں سکتیں پھر بتاؤ کہ ہمدردی کے قابل عورتیں ہیں یا مرد۔ میرے خیال
میں جس شخص کو عورتوں سے ہمدردی نہو وہ نہایت وحشی ہوگا اور مردانہ صفات
سے اُسکو بالکل عاری سمجھنا چاہیے۔

بیگم۔ جی صاحب یہ تو آپ سب کچھ ٹھیک فرماتے ہیں اور دیکھیے آپ کے الفاظ
سے مضمون میں کیا رنگت پیدا ہو گئی ہی اور لکھنے اور پڑھنے والے کے دل پر
ضرور اثر ہوگا میں تو پہلے ہی سے اس بات کی قائل ہوں اور ابھی کہہ چکی
ہوں کہ مردونکے پاس زبانی ہمدردی اور لفظی دلجوئی کی کیا کمی ہی ذرا اُس برتاؤ
پر غور کیجیے جو عورتوں سے کیا جاتا ہی اسوقت آپ کی یا میری ذات سے بحث
نہیں ہی۔ عام طور پر مردوں اور عورتوں کی روزمرہ کی زندگی پر نظر ڈالیے
تو آپ کو یقین آجائیگا کہ میری کہن بالکل سچ ہی۔ یہ تو سچ ہی کہ نہ سب مرد ایک
سے ہیں نہ سب عورتیں لیکن جہانتک میں خیال کرتی ہوں بمشکل کوئی بی بی
ایسی ہوگی جو مردوں کی سختی اور جابرانہ حکومت سے کسی نہ کسی مصیبت میں
مبتلا نہو کمبخت وحشی ہیں کہ وہ مظلوم عورتوں کو مثل جانوروں کے رکھتے
ہیں پچھاڑتے ہیں مارتے ہیں ذرا ذراسی بات پر ستاتے ہیں گویا یہ

سمجھتے ہیں کہ ان کی جان ہی نہیں ہے اور متوسط درجے کے مہذب لوگ بھی گو اور
باتوں میں تو وحشت کے حلقہ سے باہر نکل آئے ہیں لیکن عورتوں سے
انکا سلوک بدستور وحشیانہ چلا آتا ہے وہی مارپیٹ ستانا رولانا بے مہری
بے مروتی دو دو چار چار شادیاں کرتے ہیں غرضکہ ہر قسم سے تکلیف دیتے
ہیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ ایسی وحشیانہ حرکات سے نہ تو نادم ہوتے
ہیں اور نہ دوسروں کی نگاہ میں ذلیل سمجھے جاتے ہیں بلکہ بعضوں کے نزدیک
عورتوں کا ستانا تو خاص غیرت اور مردانگی کی نشانی ہے۔ آپ ہی نے تو
اُس جاہل رئیس کا قصہ بیان کیا تھا کہ اُسکے نزدیک جو آدمی اپنی بی بی کو مارے
بغیر کھانا کھائیگا وہ مرد ہی نہیں۔ خیر ان وحشیوں اور نیم وحشیوں کو تو جانے
دیجیے اب روشن خیال بڑے مہذب ترقی یافتہ اپنے گریبان میں مُنہ
ڈالکر دیکھیں کہ وہ عورتوں سے کونسا مہذبانہ برتاؤ کرتے ہیں۔

میاں۔ بیگم آجکل کے تعلیم یافتہ روشن خیال لوگوں کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ بھی
اپنی بی بیوں سے ظالمانہ یا سختی کا برتاؤ کرتے ہیں بڑی بے انصافی ہے
تم دور کیوں جاتی ہو اپنے آپ ہی کو دیکھو کیا تم گھر کی مالک نہیں ہو کیا تمام
ملازمین اور ماماؤں اور خادماؤں پر تمھاری حکومت نہیں ہے ہماری کُل
کمائی اور کل چیزوں پر تم کو وہ اختیار نہیں ہے جو ہمکو ہے کیا گھر کے انتظام
میں ملازموں کی موقوفی اور بحالی میں اشیاء کی خرید و فروخت میں تم بالکل
خودمختار نہیں ہو کیا تمھاری کوئی ضرورت ایسی ہے جسکو میں پورا کر سکوں اور
وہ پوری نہ ہو کیا تم سے بالکل برابری کا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ کیا تمھارے
ہمارے تعلقات اعلیٰ درجے کی محبت اور اتفاق پر مبنی نہیں ہیں کیا تمھارے
ذرا سے رنج بیماری اور تکلیف سے اُسی درجے کی تکلیف مجکو نہیں ہوتی جیسی آپکی

ذاتی تکلیف اور رنج سے ہوتی ہے۔ کیا تم سے کبھی بے مہری اور بے مروتی کا برتاؤ کیا گیا ہے کیا تمھاری موجودگی میں دوسری شادی کرنا ایک بڑا اخلاقی گناہ تصور نہیں کرتا ہوں کیا علاوہ اُن معمولی شکر رنجیوں کے جو اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں میں ہو جاتی ہیں اور جنکا نہونا انسانی طاقت سے باہر ہے اور کوئی جھگڑا یا تنازع جسکا گہرا اثر ہمارے دلوں پر ہو کبھی ہمارے تمھارے درمیان ہوا ہے پس بتاؤ کہ میں بھی مردوں میں ایک مرد ہوں اور جب میں تمھارے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے پر قادر ہوا ہوں تو اور مرد بھی یقیناً ایسے ہو سکتے ہیں اور میں جانتا ہوں اور میرے علم میں بہت سے میرے دوست بھی ایسے ہیں جو اپنی بی بیوں سے نہایت اعلیٰ درجہ کا مہذبانہ برتاؤ کرتے ہیں تم بتاؤ کہ تمھارا یہ کہنا کہ مہذب لوگ اپنے گریبان میں مُنہ ڈالکر دیکھیں کہ وہ اپنی بی بیوں سے کیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ ایک محض بے انصافی کا خیال ہے۔ اور اس قسم کے خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت میں قناعت اور شکر گزاریوں کا مادہ نہیں ہے۔

بیگم۔ یہ باتیں تو تمھاری سب ٹھیک ہیں اور میں بھی جانتی ہوں کہ تمھارے جیسے اور بہت سے تعلیم یافتہ نوجوان ایک طرح سے اپنی بی بیوں سے قریب قریب برابری کا برتاؤ کرتے ہیں لیکن میں آپ ہی سے کہتی ہوں کہ آپ انصاف سے کہیے کہ ہماری خوشی کی حد صرف وہیں تک ہے جو آپ نے اوپر بیان کی ہے یا اُس سے آگے بھی بڑھنے کی ہم کو ضرورت ہے اگر کچھ دنوں کے لیے آپ ایسا کریں کہ گھر کی چار دیواری میں آپ اپنے کو بند کرلیں اور سوائے اَناؤں ماماؤں اور چھوکریوں کے اور کسی دوسرے شخص کا مُنہ دیکھنا نصیب نہو صبح سے شام تک سوائے بچوں کی چیخ پکار ماماؤں کی تُو تُو مَیں مَیں کے اور کوئی آواز آپ کے کان میں نہ پڑے اور آٹے دال کی فکر کے سوا اور آپ کا کوئی شغل نہو تو پھر آپ پر اُس زندگی کی

خوشی کی حقیقت سمجھائے جسکی ہم سیر کرتے ہیں آپ کو چند روز تک ایسی زندگی بسر کرنا دشوار ہو جائے لیکن ہم ہیں کہ ہم کو عمر بھر اسی ایک حالت میں رہنا ہے گھر کی چار دیواری کیا ہے ایک کولھو کے بیل کا چکر ہے کہ ساری عمر پھرا کیے اور پھر آخر کو جہاں تھے وہیں رہے۔

میاں۔ تو کیا بیگم تمھارا یہ دل چاہتا ہے کہ مردوں کی طرح گھر سے باہر نکلکر بلا پردہ عام جنگلی عورتوں کی طرح سڑکوں پر چکر لگاتی پھروں۔ میں تمھارا مطلب اچھی طرح نہیں سمجھا۔

بیگم۔ پردے سے باہر نکل کر پھرنے کو تو میرا دل نہیں چاہتا اور نہ کوئی شریف بی بی اسکو گوارا کرے گی ہم اسیوقت تک بی بیاں ہیں جبتک کہ گھروں کی چار دیواری میں بیٹھی ہیں جب گھر سے باہر نکلیں تو عام عورتوں میں اور ہم میں کیا فرق رہے گا کسی شریف بی بی کو کبھی پردے سے باہر نکلنے کا خیال بھی دل میں نہ لانا چاہیے لیکن کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ گھر کی چار دیواری میں رہکر ہم اُس تنہائی کی سختی کو کم نہیں کر سکتے جو اب ہم کو برداشت کرنی پڑتی ہے۔

میاں۔ تمھاری باتیں تو مجھکو ایک پہیلی معلوم ہوتی ہیں پردے میں رہنا تو قید تنہائی ہے اور پردے سے باہر نکلنا خلاف شرافت ہے تو پھر بتاؤ کہ تمھاری شکایت کا علاج کیا اور اس میں مردوں کا قصور کیا۔

بیگم۔ ایک روز آپ ہی ذکر کر رہے تھے کہ انسان ایک تمدنی حیوان ہے یعنی بہت سے آدمی ملکر رہتے ہیں تو اُنکو خوشی حاصل ہوتی ہے اُنکے کاروبار چلتے ہیں اور مثل شیروں چیتوں وغیرہ جانوروں کے الگ تھلگ رہنا اُن کو شاق گزرتا ہے نہ خوشی حاصل ہو سکتی ہے نہ دوسرے اُنسے اچھی باتیں سیکھ سکتے ہیں نہ وہ دوسروں سے اچھی باتیں سیکھ سکتے ہیں بلکہ جو تنہائی جانوروں کی عادت

میں داخل ہی وہ تنہائی انسان کے لیے تجویز کی گئی ہی یعنی جس آدمی کو سخت سے سخت سزا دینی ہوئی ہی تو تنہائی میں رکھتے ہیں اس سے میں یہ نتیجہ نکالتی ہوں کہ جسقدر جس انسان کو اپنے دوسرے ہم جنسوں سے علیحدہ رکھا جائے گا اُسیقدر اُس کی عمدہ عادتوں خصلتوں اور اُس کی دل کی شگفتگی اور خوشی میں بھی کمی واقع ہوگی۔ بی بیوں کو جیسا کہ اسوقت ان کو رکھا جاتا ہے اسی سے وہ ایک بہت بڑی خوشی سے اور ایک بہت بڑی تعلیم سے محروم رہتی ہیں اور یہ کام مردوں ہی کا ہی پُرانی قسم کی سوسائٹی میں گو عورتوں پر دیگر قسم کے تشدد تھے اُنکے حقوق پائمال کیے جاتے تھے بات بات میں اُن کی دل آزاری کے سامان پیدا کیے جاتے تھے لیکن بعض بعض موقعے ایک دوسرے کے ملنے کے بھی ایسے دیے جاتے تھے جس سے اُن کی اُس تمدنی زندگی کی ضروریات کو فائدہ پہنچتا تھا جسکا ذکر اوپر ہوا ہی مثلاً شادی اور غمی میں بی بیوں کا جمع ہونا ایک بہت بڑا موقع تنہائی کی سختی سے بچنے کا تھا۔ سال بھر میں کئی کئی تقریبات ہوتی تھیں جس میں کنبے رشتہ کی بی بیوں بلکہ غیر نئی نئی بیبیوں سے بھی ملنے کا موقع ملتا تھا۔ خالہ۔ پھوپھی۔ بہنیں۔ بہنیلیاں۔ سہیلیاں۔ نندیں۔ بھاوجیں کئی کئی روز تک ایک ایک جگہہ ملکر رہتی تھیں۔ بچوں کی چہل پہل رہتی تھی ملکر بیٹھتے تھے دل خوش ہوتا تھا اچھی بُری باتوں کا ذکر ہوتا تھا تو اُسکا اثر کئی کئی مہینے دل پر رہتا تھا پھر کسی دوسری تقریب کے لیے تیاریاں کیجاتی تھیں۔ اسی طور پر سال بھر گزر جاتا تھا گو جاہل مردوں سے رنج پہنچتا تھا تو اُسکے ساتھ یہ خوشی کے سامان بھی تھے وہی مثل ہی کہ جہاں کانٹا تھا وہاں پھول بھی تھے۔ لیکن اب کچھہ رنگ ہی دوسرا ہی چار دیواری میں بند رہنے کی سختی تو وہی ہی لیکن اب مردوں کو نئی نئی باتیں سوجھتی ہیں اصلاح تمدن جاری کیا ہی اُسکے معنی یہ رکھے ہیں کہ

تقریبات میں بی بیاں جانے نہ پائیں کیونکہ خرچ زیادہ ہوتا ہی اپنے اخراجات کا تو خیال نہیں ہی کہ پہلے زمانے میں آسودہ لوگ بھی اپنے معمولی طریقوں سے گزارا کرتے تھے۔ اگر کسی آدمی کی آمدنی سو روپیہ ہوتی تھی تو وہ امیر سمجھا جاتا تھا اب ہزار روپے کی بھی کسی کی آمدنی ہو تو ٹکا پس انداز نہیں ہوتا۔ بیڈئم بائل اور وائٹ وے کے ہاں سے سوٹ چلے آتے ہیں معمولی چند دوستوں کی دعوت ہو تو فضول تکلفات میں کثرت سے روپیہ صرف ہوتا ہی مہینے کے آخر میں آمدنی خرچ برابر اب کفایت شعاری کی مد کیا نکلتی ہی کہ دس پانچ سال میں کوئی تقریب کرنے کے چند منہ جھلنے والی بہنوں کو بھی کوئی جمع نہ کر سکیں۔ کل اصلاح و تمدن کا یہی نچوڑ ہی اگر یہی اصلاح تمدن ہی تو فی الواقع یہ کوئی اصلاح نہیں ہی خرچوں کی حالت ویسی رہی بلکہ اس سے بھی بڑھکر فضول خرچیاں اور ہماری خوشی کا جو تھوڑا سا سامان تھا اُس پر بھی ہاتھ صاف کیا اب بتائیے میں نے جو مردوں کی شکایت کی سہے وہ جا ہے یا بیجا۔

میاں۔ بیگم تمہارا کہنا ٹھیک ہی لیکن اصلاح کے معنی تم ٹھیک نہیں سمجھی ہو۔ اس بات کو تو میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس نئی روشنی کے نوجوان بھی انتہا درجہ کے فضول خرچ ہوتے ہیں اُن کی فضول خرچی کے لیے بجز اسکے اور کوئی روک نہیں کہ اُن کی بی بیاں قابل ہوں۔ انصاف سے کہو کہ ایک جاہل بی بی سے عمدہ انتظام کی کیا توقع ہو سکتی ہی جو لوگ خود تو فضول خرچی میں روپیہ اُڑاتے ہیں اور بیبیوں کو فضول رسمیات میں خرچ کرنے سے روکتے ہیں اُن کی بات قابل لحاظ نہیں ہے کیونکہ اُن کا قول اور فعل ایک دوسرے کے مطابق نہیں۔ لیکن بیگم کیا تمہارا یہہ خیال ہی کہ ادہر تو مرد حماقت کر رہے ہیں اُدہر بیبیاں بھی حماقت شروع کر دیں جو لوگ اصلاح چاہتے ہیں وہ مردوں اور عورتوں دونوں کو فضول خرچی سے

روکتے ہیں۔ لیکن فضول اور جاہلانہ رسموں کی اصلاح میں صرف
کفایت شعاری ہی مدنظر نہیں ہو اور بہت سی اصلاحوں کا خیال ہو جو شادی
وغمی کی رسمیں ہماری طرز زندگی کا جزو ہو گئی ہیں اُنسے صرف مالی نقصان نہیں ہے
بلکہ عادات اور اخلاق پر بھی بُرا اثر پڑتا ہو تم ہی انصاف سے کہنا کہ جب کسی کی
شادی غمی سے لوٹ کر بی بیاں آتی ہیں تو جو جو سبق وہاں سے سیکھ کر
آتی ہیں وہ ایسے نہیں کہ جنکو ہم اپنے قومی اخلاقی اور عادات کے بگاڑنیوالے
خیال نہ کریں۔ بیبیاں ایک دوسری سے ملکر تو آتی ہیں لیکن اُس رسمی ملاپ
میں کچھ ایسا زہریلا اثر ہو کہ بجائے اسکے کہ ایک سے دوسری کو محبت پیدا ہو اپنے
گھر میں آکر دوسروں کی بدگوئی کرتی ہیں اکثر حسد اور کینہ کا رنگ اپنے دلوں پر
لگا آتی ہیں اور اپنی بچیوں اور اولاد کے سامنے دوسروں کی بُرائی کے دفتر
کھولتی ہیں جوان لڑکیاں ڈومنیوں کے فحش گیت .... سنکر آتی ہیں
اپنی ہمجولیوں میں بیٹھ کر اُن کو دُہراتی ہیں۔ علاوہ اسکے یہ رسمی ملاپ سب کے لیے
باعث تکلیف ہو۔ ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے تنگ اور تاریک مکانوں میں
مجبوراً سینکڑوں آدمی جمع کرنے پڑتے ہیں نہ بیٹھنے کا آرام نہ اُٹھنے کا اکثر بیبیاں
دو تین روز کے بعد جب اپنے گھر لوٹ کر آتی ہیں تو نیم مردہ ہوتی ہیں کھانا کبھی
وقت پر نہیں ملتا نہ سونا نصیب ہوتا ہو اُدہر گھر والوں پر ایک مصیبت ہوتی ہو۔
"ایک بولی تین کام" جس کا کام نہ کرو وہی ناراض اتنے بڑے انبوہ کی سب ضرورتیں
کیسے پوری کرسکتے ہیں۔ کرنے کو تو بیچارے اپنی شہرت کے لیے کرتے ہیں
لیکن اُلٹی بدنامی ہوتی ہو۔ اور عام طور پر دیکھا گیا ہو کہ کوئی ایسی شادی ہوگی کہ
جس میں سب مہمان خوش آئیں۔ بس تمھیں بتاؤ کہ یہ ملنے کا ڈھنگ کیسا۔ اگر
دو تین روز دن رات بھیڑ بکریوں کی طرح باڑے میں بند رہنا پسند ہو تو یہ

تمہاری سمجھ کا قصور ہے ورنہ ہم کو تو بیاہ شادی کی ملاقات کچھ زیادہ دلچسپ معلوم نہیں ہوتی۔

بیگم۔ میں پہلے ہی کہتی تھی کہ باتوں میں مردوں پر غالب آنا ناممکن ہے۔ اگر پرانی رسمی شادیوں میں جمع ہونا اور رسمی ملاپ آپ کو ناپسند ہے تو پھر آپ کے نزدیک اب بی بیوں کو ایک دوسری سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دینا چاہیئے۔

میاں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اسوقت مجھے ضروری کام ہے باہر جاتا ہوں۔ جب لوٹ کر آؤنگا تو بتاؤنگا کہ بیبیوں کے میل ملاپ اور بیاہ شادیوں میں جمع ہونیکی نسبت میرے کیا خیالات ہیں۔

ایک بیگم

اگلے زمانے کی ایشیائی عورتیں

اہل مغرب مشرق سے بالکل ناواقف تھے اور اُنکی لاعلمی کا پردہ جو مشرق و مغرب کے درمیان حائل تھا۔ اب رفتہ رفتہ اُٹھتا جاتا ہے۔ ورنہ بعض یورپین مشاہدہ کرنیوالوں نے۔ خواہ بوجہ تعصب یا بوجہ قومی تحقیر کے۔ اہل ایشیا کے سر وہ باتیں تھوپ دی ہیں۔ جو نہ کبھی اُن میں تھیں نہ اب ہیں۔ سچ آخر ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا مگر جب اُس کے اردگرد لاعلمی اور جہالت کی دیواریں کھڑی ہوں۔ تو اُسکے ظاہر ہونے میں دیر ضرور لگتی ہے۔ ایشیا اور اہل ایشیا کے متعلق۔ جو متعدد خیالات اہل مغرب رکھتے ہیں۔ اور جنکو وہ بمنزلہ سچ کے سمجھتے ہیں۔ ہم اُن خیالات سے اُن کا وہ خیال۔ جو وہ ایشیائی عورات کے متعلق رکھتے ہیں منتخب کر کے اس دلچسپ مضمون کو شروع کرتے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ مشرق میں عورت بڑی حقارت کی نظر سے دیکھی گئی ہے درانحالیکہ مغرب میں ہمیشہ اس کا ایسا احترام کیا گیا ہے جیسے ایک دیبی کا احترام

کیا جاتا ہی۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہی۔ کہ اُن کا یہ مقولہ کہانتک سچ ہی۔ عورت کی پرستش کرنا اور اُسکو دیبی سمجھنا تو درکنار۔ اہلِ یونان اور اہلِ روما نے کبھی اُسکو عزت کی نگاہ سے بھی نہیں دیکھا۔ عہد پرکلیز[۱] میں اہلِ ایتھنز بھی اپنی بی بیوں کے ساتھ لونڈیوں سے بہتر سلوک نہیں کرتے تھے۔ سنین وسطیٰ میں۔ عیسائیت کے اُن تاثرات کی وجہ سے۔ جن کو بہت کچھ بڑھ چڑھ کر سمجھا جاتا تھا۔ عورت کے درجے میں کسی قسم کی بہتری نہونے پائی۔ تمثیلاً ہم ایک نقل لکھتے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوگا۔ کہ اہلِ یوروپ اُس زمانے میں صنفِ ضعیف کی کیا وقعت سمجھتے تھے! ایک روز رومیوں کے پہلے شہنشاہ شارلمین اور اُس کی بہن کے درمیان کسی مضمون پر بحث چھڑ گئی اور بڑے شدّ و مد کے ساتھ مناظرہ ہونے لگا۔ مگر جب شہنشاہ نے دیکھا۔ کہ اس زبانی جنگ میں کسی طرح اپنی بہن سے پیش نہیں جاتی۔ تو اُس نے اپنے آہن پوش ہاتھ سے بہن کو ایک طمانچہ مار کر اُس بحث کا خاتمہ کردیا۔ چند مغربی ممالک میں جو درجۂ برتری آجکل عورتوں کو حاصل ہی اُسکا اصلی محرک مفروضہ ٹیوٹانک (جرمن) اثر نہیں ہے۔ بلکہ مشرقی اثر ہی اسکا اصلی محرک ہی! جنوبی فرانس میں شاعرُل اور پھکڑّ بازوں نے عورت کو اپنے ناپاک تغزّل میں عیاشی کی دیبی بنایا تھا۔ مگر وہ مسلمان ہی تھے۔ جنھوں نے اُسکو سب سے پہلے اس قعرِ مذلت سے نکال کر اوجِ برتری پر پہنچایا۔ جرمنی کے خاندان ہوین استوفن کے سب سے اعلیٰ اور بلند پایہ بادشاہ فریڈرک دوم (جو باستثنائے مذہب وملّت تمام خصائل مسلمانوں ہی کے رکھتا تھا) ہی کے ذریعے سے اہلِ یورپ نے شیولری (شجاعت) سیکھی۔ اُسوقت عورت کا درجہ تو بہتر ہوگیا۔ مگر اُس کی تعلیم و تربیت میں کچھ ترقی نہونے

[۱] پرکلیز شہر ایتھنز میں ایک مدبّر گزرا ہی ۴۹۵ھ (؟) قبل از مسیح میں پیدا ہوا اور ۴۲۹ھ قبل از مسیح میں مرگیا۔ ۱۲ مترجم۔

پائی انگلستان میں تو اٹھارویں صدی کے آخر تک عورتوں کی تعلیم کی جانب سے غفلت و بے پروائی کی جاتی تھی۔ جسکا ثبوت یہ ہے کہ اسی زمانے میں میری ولسٹن کرافٹ گاڈوین نے ایک کتاب لکھی۔ جس میں اُسنے بڑے دردآمیز اور پُرجوش لہجے میں لڑکیوں کو ابتدائی تعلیم دینے کی ضرورت کو ثابت کیا تھا۔ انیسویں صدی ہی کے ساتھ یورپ میں عورتوں کے بھی دن پھرے اور انھیں انکے اکثر حقوق حاصل ہوئے ایں۔ اس لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ اب بیسوی صدی کے آغاز میں یورپ کی بربار و اہو ان کو تحصیل علوم کے تمام مواقع حاصل ہونے کے بعد۔ اُس شاندار زمانے کو بھول جائیں۔ جو ایشیائی عورتوں کو اُن دنوں حاصل تھا۔ جن دنوں کی یاد کو زمانے کی دست نے اب مٹا دیا ہے۔

چونکہ ایشیا کی کُل اقلیم کی عورتوں کے متعلق خامہ فرسائی کرنا ایک ایسا وسیع مضمون ہے جس کی اس مختصر بیان میں گنجایش نہیں۔ بایں وجہ یہ دکھلانے کے سبب کہ ایشیائی سوسائٹی میں عورتوں کو کیا رتبہ حاصل تھا۔ میں قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ کے تمدنوں سے صرف دو دو کیفیتوں کا ذکر کرتا ہوں۔ مصری تمدن جو شاید دنیا کا قدیم ترین تمدن ہے۔ ابھی بالکل کتم عدم میں مستور ہو کر ساکت نہیں ہو گیا ہے۔ بلکہ اسوقت تک ہمیں اپنے بعض اعلیٰ خیالات اور کارگزاریوں کی یاد دلاتا ہے۔ برعکس اہل یونان و اہل روما کے۔ جو اہلِ مصر سے ہزارہا سال بعد مہذب و شایستہ بنے۔ اہلِ مصر نے اپنے زمانے میں عورت کو تخت برتری پر بٹھا دیا تھا دنیا میں جو پہلی بلند پایہ ملکہ گزری ہے۔ وہ مصر ہی کی ملکہ ہات شش پت تھی گو اُسنے اپنے بعض مرد اسلاف کی طرح فوجوں کی سرداری تو نہیں کی۔ مگر ملک کی بہبودی و ہواخواہی ہمیشہ اسکے مدنظر رہی۔ نہ وہ پُرانی لکیر کی فقیر بنی رہی۔ نہ لوگوں کے تعصبات سے متاثر ہو کر رسم و رواج کی پابندیوں اور پیچیدگیوں میں اُلجھی۔

بلکہ اُس نے وہی طریقۂ عمل اختیار کیا۔ جسکو اپنے ملک اور رعایا کے لیے مفید و کارآمد جانا
اس حقیقت سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانے کے مصر میں سیلک[۱] قانون نافذ نہیں تھا
بلکہ فرمانروا کی بڑی بیٹی سے سلسلۂ وراثت کے قائم ہونے کو مقتضائے فطرت
سمجھا جاتا تھا۔ مصر کی وہ پُرہیبت و پُرشوکت ملکہ۔ جو فسانوں اور ناٹکوں کی ہیروین بنکر
مشہور آفاق ہوئی کلیوپٹرا تھی۔ وہ ایک دیبی تھی۔ جس کی رگوں میں دنیوی ناپاک خون دَوڑ رہا
تھا۔ اور اُسی نے اپنی غیر دنیاوی دلربائیوں کی مغلوب نہونے والی طاقت سے رومیوں کی
سلطنت کو دو دفعہ اپنا فرماں پذیر بنالیا تھا۔

مقدس نیل کے کناروں کو چھوڑکر اب ہم بہشتی دریاے گنگ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں
ظلمت میں چھپے ہوے گزشتہ زمانے کے مشہور ہندو واضع قوانین منو کا قول ہے کہ ”
جہاں عورتوں کی عزت کی جاتی ہے وہاں دیوتاؤں کا گزر ہے“ ہندوستان میں صنفِ
اعلیٰ کو ہمیشہ بڑی بڑی تمدنی دسوشیل، آزادیاں حاصل رہی ہیں۔ اور مرد ہمیشہ اپنی
اس آزادی کا بچاؤ یہی دلیل پیش کرکے کرتے رہے ہیں کہ ”خود ہمارے اُصول اخلاق
عورتوں کی عصمت و آبرو کو محفوظ رکھتے ہیں“ ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ اگلے زمانے
میں مرد اور عورتیں ملکر سمندر کے کنارے سیر کو جایا کرتے تھے اور بغیر کسی جھوٹی شرم
اور رکاوٹ کے باہمی صحبت کا لطف اُٹھاتے تھے۔ سنسکرت ناٹکوں میں ہم نے یہ بھی
پڑھا ہے کہ عورتیں گھر کی چار دیواری سے (جہاں وہ مستور و محصور سمجھی جاتی تھیں)
باہر نکلکر اپنے خاوندوں کے شریف دوستوں سے باتیں کرتی تھیں۔ علم و حکمت اور

---

[۱] دریاے سیلا کے کناروں پر چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں فرنگیوں کی ایک جماعت آکر مقیم ہوئی جو سیلین
کہلائے اور پانچویں صدی میں اُنھوں نے ایک مجموعہ قوانین وضع کیا جو سیلک لا مشہور ہوا۔ اس مجموعہ
کے ایک قانون کی رو سے عورت وراثت سے محروم سمجھی جاتی تھی اور تخت سلطنت پر نہیں
بیٹھ سکتی تھی ۱۲ مترجم۔

فنون لطیفہ کے آسمان پر اکثر عورتیں اختر تاباں بنکر چمکی تھیں۔ مشہور آفاق للاؤتی۔ جو زمانہ قدیم کے ایک بڑے ہیأت داں کی بیٹی تھی۔ نہ صرف اپنے باپ کی اُس کے عظیم الشان کام میں مدد کرتی تھی۔ بلکہ بعض صورتوں میں باپ پر فوقیت لیجاتی تھی۔ بعض ناٹکوں میں۔ جیسے۔ کرمالتی اور مادھو ہیں۔ ہم پڑھتے ہیں کہ عاشق ومعشوق ایک دوسرے کی تصویر کھینچتے تھے۔ یہ ایک ایسا کرتب تھا۔ جس کی نظیر زمانۂ موجودہ میں کہیں نہیں ملتی۔ کہتے ہیں کہ ویدوں کی بعض مذہبی نظمیں عورتوں ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ میتھیلا کے راجہ جنکا نے ایک دفعہ ایک مناظرے کا جلسہ منعقد کیا تھا۔ جس میں کارگی نامی ایک بی بی نے مہنت یاگ نول کیہ کے ساتھ مذہبی مضامین پر مباحثہ کیا تھا اُس زمانے میں بعض بی بیاں ایسی بھی ہوا کرتی تھیں جو مباحثوں میں ثالث مانی جاتی تھیں۔ ملک دکن بھی ممالک شمالی سے کچھ پیچھے نہیں رہا تھا۔ چنانچہ چار تامل بہنیں ایسی گزری ہیں۔ جو شاعری اور اُصول اخلاق میں کامل مہارت اور دیگر مضامین میں بھی اعلیٰ استعداد رکھتی تھیں۔ ہندوستان کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اس میں ایسی بھی کئی رانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ جو تنہا فرماں روائی کرتی تھیں۔ دور کیوں جائیں۔ اہلیہ بائی ہی کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ جسنے وسط ہندوستان کی ایک بڑی ریاست میں ملک داری کی زمام تھام رکھی تھی۔ رانی بھوانی اور اس کی تمام جانشین نے بھی فرماں روائی کی قابلیت کے بڑے ثبوت دیے ہیں۔ رضیہ بیگم کا اس ملک میں پیدا ہوکر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہونا ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بھی کچھ کم باعث افتخار نہیں۔ ۱۸۵۷ء میں جھانسی کی رانی نے عین میدان جنگ میں اپنی تیغ بیدریغ کے جوہر دکھا کر مردانہ بہادری کی داد دی تھی۔

بودھ کے مولد سے اب ہم اس سرزمین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ جہاں اُسکے مذہب نے قبول عام کا درجہ پایا۔ یعنی ہندوستان کا خیال چھوڑ کر جاپان کا ذکر چھیڑتے

ہیں - بیرن سوئی مات سو اپنی کتاب "بزن سن" میں لکھتے ہیں۔ کہ بعض یورپینوں کا
یہ خیال غلط ہے۔ کہ عہد قدیم میں جاپانی عورتیں معاملات خانہ داری اور چولھے چکی کے
سوا اور کچھ نہ جانتی تھیں۔ بلکہ بعض جاپانی مہارانیاں۔ جنکو زمانہ بھر جانتا ہے۔ ایسی بھی
گزری ہیں۔ جن کی سواریوں اور جلوس کی شان وشوکت آسیریا کی ملکہ سیمیرامس کے
جاہ وحشم سے کچھ کم نہ تھی۔ بعض من چلی عورتیں ایسی بھی ہوا کرتی تھیں۔ جو اپنے
شہورئی خاوندوں یا بابوں کے دوش بدوش میدان جنگ میں جوہر شجاعت دکھلاتی
تھیں۔ سرزمین کرسینتھمم (جاپان) میں شاعرہ فسانہ نویس اور صاحب ہنر عورتوں
کی تو کچھ کمی نہ تھی۔ نویں صدی میں چینی تہذیب کا بڑا شہرہ تھا۔ مگر حقیقت میں جاپانی
عورتیں ہی اس تہذیب کی اصل بانی مبانی تھیں۔ جاپانی علم ادب کے بعض چوٹی کے
ناول مثلاً "جنجی مانوگاتری" اور "مکورازوشی" عورتوں کی تصنیف سے تھے۔
عہد تاکوگاوا کے آخری دور میں بھی بہت سی خاتونیں مثل چوکوراں اور ہار اسیہیں کے
ایسی گزری ہیں۔ جو چینی علم ادب اور فلاسفی میں کامل دستگاہ رکھتی تھیں۔ اُسی زمانے
میں جاپان کی دو شاعرہ عورتوں۔ چائس اور بوتونی نے۔ جنکے نام سے بچہ بچہ واقف ہے،
اعلیٰ درجے کی چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھی تھیں۔ متذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہے۔ کہ
جاپانی اپنے گزشتہ جاہ وجلال پر جس قدر فخر کریں بجا ہے۔ اور بعد میں جو بدسلوکی
انھوں نے عورتوں کے ساتھ کی وہ بھی اُنکے اُس جاہ وجلال پر ظلمت وفراموشی کا
پردہ نہیں ڈال سکتی۔

اقصائے مشرق سے اب ہم اقصائے مغرب کی طرف رجوع کرکے مسلمانوں کی
تہذیب وشائستگی کی بے نظیر روشنی کا بیان کرتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عربوں کی
تہذیب اور اُن کا تمدن بغداد اور دنیا کے اور حصوں میں کئی پہلو سے قابل ستائش
تھا۔ مگر اسلام کے دشمنوں نے اپنی تصانیف میں یہ منوانے کی کوشش کی ہے کہ

اسلام میں عورت کا درجہ نہایت پست رکھا گیا ہے۔ وہ یہی ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں
کہ عورتیں ہمیشہ حرمسرا کی چار دیواری میں مقید رکھی جاتی ہیں اور دیوہیکل حبشی
غلام ان کی نگہبانی پر مامور ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں
جو بعض رسمیں ہم مروج پاتے ہیں وہ دراصل بائزنٹائن رسموں کی پیروی ہے۔ یہ
دکھلانے کے لیے کہ اس عہد پر شکوہ میں۔ جو اسلام کے عروج و ترقی کا زمانہ تھا۔
عرب کس درجے عورتوں کی عزت اور قدر کرتے تھے۔ ہمیں اسپین کے مسلمانوں
کی کبھی فراموش نہونے والی حالت پر نظر ڈالنی چاہیے۔ مسلمان عورتیں اس بے نظیر
دور میں چہرے پر نقاب نہیں ڈالتی تھیں۔ حرم سراؤں یا زنانخانوں میں کبھی وہ
عزلت گزیں ہو کر نہیں بیٹھتی تھیں۔ بلکہ مردوں کی طرح آزادانہ باہر نکلتی تھیں۔ اکثر
بادشاہ بیگمیں کھلے درباروں میں اپنے خاوندوں کے ساتھ پہلو بہ پہلو تخت پر
جلوہ گر ہوتی تھیں۔ اور سکہ مروجہ پر بادشاہ بیگم کے چہرے توام مضروب ہوتے تھے۔
دنیا بھر میں عرب ہی تمام جذبات شجاعت (شیولری) کا سرچشمہ تھا۔ وہ عورت کی
ہمیشہ توقیر کرتا تھا اور اُسکا ادب ملحوظ رکھتا تھا۔ اور میدان مقابلے میں (ٹورنمنٹ)
فنون سپہگری کے کرتب دکھا کر عورت سے داد چاہتا تھا اور اپنی بہادری کے صلے
میں اس کی خوشنودی اور محبت حاصل کرتا تھا۔ لیکی[1] کا مقولہ ہے۔ کہ عرب ہی کی
نقل اتارنے میں جدوجہد کرنے کا نتیجہ ہے کہ یوروپ نے یہ تمام اطوار شائستہ سیکھے۔
عربوں کے دلوں میں اس قدر شرافت کا جوش بھرا ہوا تھا کہ وہ کسی عورت کی
بیکسی اور بے بسی نہ دیکھ سکتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ کہ لوگوں نے اپنے
ایک سردار کو اُس کی بی بی کے ساتھ بدسلوکی کرتے دیکھکر اُسکے محل کے گرد ہجوم کیا
اور آنسو بہا بہا کر سردار سے ملتجی ہوئے کہ اپنی بی بی کو زیادہ نہ ستائیے۔

---

[1] لیکی کا پورا نام ولیم ایڈورڈ ہارٹپول ہے۔ یہ ایک برطانی صاحب تصانیف ہے۔ ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوا۔ مترجم۔

ممالک اسلامی کے کسی صوبے میں اگر کبھی عَلمِ بغاوت بھی بلند ہوتا تھا تو عورت اس مخدوش قطعۂ ملک میں بلاخوف آمد و رفت کر سکتی تھی اور کوئی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ مسلمان عورت۔ جسکو سارد[1] و ساحرہ" . . . کے نام سے خطاب کرتا ہی۔ نہ صرف حُسنِ صورت اور تناسبِ اعضا ہی کی وجہ سے دلربائی کرتی تھی۔ بلکہ ذہانت طبع اور نیک نفسی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ اُس زمانے کی مسلمان عورت کے دل و دماغ کی قوتیں اس درجے تک نشو و نما پائی ہوئی ہوتی تھیں۔ جسکا نظیر ہم آجکل عموماً کسی قوم میں نہیں پاتے۔ خواہ وہ قوم مشرقی ہو یا مغربی۔ نہ کبھی اُسکے تصوّرات و تخیّلات دلائل عقلی سے عاری ہوتے تھے اور نہ کبھی اسکا دل فہم و فراست سے خالی۔ بزمِ عام میں مردوں کے ساتھ طاقت ذہنی کا مقابلہ کرکے وہ انعام حاصل کرتی تھی اور آزمائش میں پوری اُترتی تھی۔ ممتاز اسلامی کُلّیوں (یونیورسٹیوں) میں وہ عروض۔ فلسفہ۔ سائنس اور نحو و منطق کی تعلیم پاتی تھی۔ وہ خالص تحقیق اور نکتہ رسی کی بھی بڑی دلدادہ ہوتی تھی اور اپنی تمام عمر اسی پر وقف کر دیتی تھی۔ انتہا یہ کہ قانون کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ممالک اسلامی میں قانوناً بھی عورت کو ایک اچھا درجہ حاصل تھا۔ اسلام ہی سب سے پہلا مذہب ہی۔ جس نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت کی اور اُن کے جائز حقوق انھیں دلوائے۔ مسلمانوں کی تاریخ لکھنے والا ایک امریکن مورخ لکھتا ہے "تاریخ قدیم یا تاریخ جدید میں اسلامی اسپین ہی ایک ایسے ملک کی مثال پیش کرتا ہے جسکے رسم و رواج اور قوانین کی رو سے عورت غلامی کی حالت میں نہیں رہی۔"

یہاں ہم شریعت اسلام کی بحث کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت نہیں دیکھتے۔ پچھلی دو صدیوں میں مسلمانوں کی حالت رو بہ تنزل رہی۔

---

[1] وکٹوریہ سارد و ایک فرانسیسی ناٹک نویس۔ ۱۸۳۱ء میں پیدا ہوا۔ مترجم

مرد اور عورتوں میں اگلے سے خصائل حسنہ باقی نہیں رہے اور روز بروز وہ حضیض ذلت میں دھنستے چلے گئے۔ عرب کی زندگی سے وہ روشن زمانہ جاتا رہا۔ جسنے مہر درخشاں کی طرح تمام جہان کو خیرہ کر دیا تھا۔ نہ اس کی طبیعت میں وہ فتح و نصرت کا جوش باقی ہے۔ نہ وہ تحصیل علوم کا حرص و ولولہ۔ جس دنیا میں اس کی شمشیر آبدار نے فتح و ظفر کے پرچم اُڑائے تھے اور جس دنیا میں اس کی بے مثل تہذیب و تمدن نے ایک بجلی دوڑا دی تھی۔ اُسی دنیا میں اب وہ ایک آوارہ گرد خانہ بدوش کی حیثیت رکھتا ہے۔

ترجمہ از رسالہ "ایسٹ اینڈ ویسٹ"

عبدالحافظ باعکظہ

بسلسلۂ سابق

قدسیہ

قدسیہ کو اس طرح روتے دیکھکر عارف سے نہ رہا گیا اور وہ بھی رونے لگا۔ ادہر تو یہ میاں بیوی رو رہے تھے اور اُدہر بچہ ہچکیاں لینے لگا اور سخت گھبراہٹ کی حالت میں تھا۔ افسوس کہ اسوقت ان ماں باپ کے پاس اپنے پیارے بچّے کی جان بچانے کے لیے کوئی چارہ نہ تھا۔ بیچارہ عارف دوڑ کر اس گڑھے میں سے تھوڑا پانی لایا اور بچے کے مُنہ اور سر پر آہستہ آہستہ چھڑکنے لگا مگر بھلا اس پانی سے کیا ہوتا۔ تھوڑی دیر میں خفیف سی ہچکیاں تو بند ہوگئیں۔ مگر سانس دہیمی ہوگئی۔ دم توڑنے لگا بدن سرد ہوگیا۔ اسوقت اس معصوم کی وہی حالت تھی جو کسی ٹمٹماتے ہوے چراغ کی ہوتی ہے۔ آخر ش اس طفل معصوم کی معصوم روح آہستہ آہستہ پرواز کرنے لگی او ماں باپ بیٹھے دیکھا کیے اور موت نے اس بچّے کو اپنے ماں باپ سے ہمیشہ کے لیے

جدا کیا۔ نہ وہ دعائیں کام آئیں نہ وہ مایوسانہ التجا کو کسی نے سنا۔ موت اپنا کام کر گئی ؎

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے

حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے کملا گئے

کاش اسوقت موت کسی زندہ شکل میں آتی تو یہی باپ جو اسوقت چپکا بیٹھا دیکھ رہا ہے اس ناتوانی اور لاغری پر بھی شیر کی طرح لپکتا اور اپنے حفیظ کے دشمن کو اس بے طرح حملہ کا مزا چکھا دیتا۔ اور وہ ماں جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہ رہے ہیں چیل کی طرح لپکتی اور اپنے لخت جگر کو بچاتی مگر اب وہی ماں اور وہی باپ اپنا کلیجہ مسوس کر رہ گئے۔ افسوس کہ اُس غریب ماں کی ایک چھوٹی آرزو ایک ذرا سا ارماں۔ اپنے رنجیدہ دل کی ایک ہی خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔ بیچاری ماں ڈہاڑیں مار مار کر رو رہی ہے باپ اُدہر تڑپ رہا ہے اور کوئی ایسا نہیں جو انھیں ذرا سا دلاسا دے۔ کوئی ایسا نہیں جو اس لاڈ میں پلے حفیظ کی لاش کو دیکھکر دو آنسو بہائے۔ عارف کبھی اپنے لخت جگر کے مُرجھائے ہوئے چہرہ کو دیکھتا۔ کبھی اپنی ستم رسیدہ بیوی کو۔ اس غریب کو دوگنا رنج ہو رہا ہے۔ ایک تو اپنے عزیز بچے کے انتقال کا دوسرے اپنی پیاری بیوی کی مصیبت کا۔ تھوڑی دیر اسی طرح سے نہ گزری تھی کہ پھر انھیں یہ خیال ہوا کہ اب اس بچے کو کفن کیا پہنائیں اور دفن کیسے کریں۔ آخرش اُنھوں نے یہی طے کیا کہ سومناتھ پُہنچکر کوئی تجویز کریں اس غرض سے اُٹھے اور اپنی سخت منزل کو طے کرنے لگے۔

ہم ان دونوں مصیبت زدہ میاں بیوی کو تو ادہر چھوڑتے ہیں اور اپنے ناظرین کو سومناتھ کی سیر کرانا چاہتے ہیں۔ اوپر ذکر کیے ہوئے واقعہ کو دو روز گزر چکے ہیں۔ سومناتھ میں آج بڑی گڑبڑ ہے۔ سنتے ہیں کہ کال کے مارے بہت سے مزدور اور کسان شہر میں آ گئے ہیں اور دوکانیں لوٹتے پھرتے ہیں۔ اور

اب جو کوئی اس طرح سے پھرتا نظر آتا ہے اُسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ غرض بڑی گرفت ہے۔
ہم بھی سیر کرتے ہوئے ایک محلے میں نکل جاتے ہیں۔ تھوڑی دور چلکر کیا دیکھتے
ہیں کہ ایک بڑے مکان کے قریب ایک بیچاری غریب عورت کھڑی رو رہی ہے۔
اس کی آواز بڑی پُر درد ہے۔ سننے والے کے بھی آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ کوئی
بیچاری دُکھیا کال کی ماری ہوگی مگر قریب جانے سے معلوم ہوا کہ وہی ہماری غریب قدسیہ
کھڑی رو رہی ہے۔ ہیں یہ عارف کہاں گیا۔ کہیں خدانخواستہ عارف پر کوئی اور
آفت تو نازل نہیں ہوئی۔ اتنے میں اس مکان کا کواڑ کُھلا اور ایک شخص نہایت شریفانہ
اور دھیمی آواز سے پوچھنے لگا۔ تو کون ہے۔ جسکا جواب قدسیہ نے کچھ نہ دیا بلکہ اپنا
منہ چھپالیا۔ قدسیہ کا یہ پہلا ہی وقت تھا جو کسی غیر مرد کے سوال کا جواب دیتی۔ مگر
اُسنے پھر دہراکر پوچھا قدسیہ نے آہستہ سے کہا "ایک غریب مسافر"۔ اُسنے کہا کہ
یہاں روتی کیوں ہے۔ قدسیہ نے جواب دیا کہ "اپنی قسمت پر" یہ سُنکر اس شریف آدمی کا
دل بھر آیا اور اسنے کہا" لڑکی تجھے کیا ہوا ہے اور تو کون ہے بتا تو سہی" قدسیہ نے کہا کہ
میں اپنے دُکھ کی کہانی کہاں تک کہوں۔ اُس شخص نے کہا کہ اچھا تو اندر آ۔ قدسیہ خاموش
ہوگئی۔ بھلا وہ کہیں کسی غیر شخص کے بلانے پر کسی کے مکان کے اندر چلی جاتی۔ جب
قدسیہ خاموش کھڑی ہوگئی تو اندر سے ایک بڑھیا عورت نکل آئی اور اُسنے نہایت ہی
شفقت کے ساتھ قدسیہ سے کہا کہ بیٹی اندر بی بیوں نے تجھے دیکھا اور تیرے حال
پر انہیں ترس آرہا ہے۔ میاں کو انھیں نے بھیجا تھا۔ اب میں آئی ہوں۔ تو بے خوف
اندر چل اور اپنی کہانی سنا وہ تیری ہر طرح سے مدد کرینگی۔ یہ کہکر قدسیہ کا ہاتھ
پکڑکر اندر لیگئی۔ اندر جاکر قدسیہ نے اُن نیک دل بی بیوں کو سلام کیا اور اُنکے
کہنے سے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ قدسیہ کا ادھر بیٹھنا ہی تھا کہ گھر کی سب عورتیں
اُسکے اطراف میں بیٹھ گئیں اور اس سے پوچھنے لگیں کہ تو کون ہے اپنا حال پورا

بیان کر۔ قدسیہ نے مجبوراً اپنا قصہ کہہ سُنایا اور یہ بھی کہا کہ رات کو ہم لوگ سومنا تھ پُہنچے۔ رات تو شہر کے باہر گزری۔ صبح ہوتے ہی ہم نے اپنے بچّے کو (لاش) نہلایا اور ساڑی کے ٹکڑے میں لپیٹ کر ایک گڑھے میں دفن کیا یہ کہکر قدسیہ رونے لگی۔ اسے روتا دیکھکر سب سننے والیاں بھی رونے لگیں۔ پھر قدسیہ نے کہا کہ میں تو اپنے بچے کی قبر پر بیہوش ہوگئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میرے شوہر نے مجھے پکڑ کر اُٹھایا کچھ پانی پلایا اور شہر کی طرف لیچلے۔ جوں ہی ہم نے شہر کے اندر قدم رکھا تھا کہ سامنے سے بہت سے لوگ دوڑتے نظر آئے اور کچھ شور سنائی دیا۔ دو تین قدم آگے نہ چلے ہونگے کہ پانچ سات سپاہیوں نے آکر میرے شوہر کو پکڑ لیا اور لے چلے۔ اُنھوں نے بہت ہی عاجزیاں کیں مگر کسی نے نہ سُنی پھر میں نے رو رو کر اُنسے کہا کہ میرے شوہر کو چھوڑ دو مگر اُنھوں نے مجھے دھکے مار مار کر نکال دیا۔ جب میرا کچھ بس نہ چل سکا تو زمین پر بیٹھکر ڈہاڑیں مار مار کر رونے لگی اور وہ جبراً میرے شوہر کو پکڑ کر لے گئے۔ نہ معلوم اب وہ کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں۔ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم ہوا کہ اُن سے ایسا کونسا جرم ہوا جسکے لیے وہ گرفتار کیے گئے۔ قدسیہ یہ کہکر پھر رونے لگی۔ ان بیچاری رحمدل بی بیوں نے اُسے بہت سمجھایا۔ جب وہ خاموش ہوگئی تو اسے کھانے کو دیا۔ کچھ کپڑے دیے۔ خوشی کی بات ہے کہ قدسیہ کی حالت اب اچھی ہے۔ مگر اُسکا وہ رہ رہکر رونا ہرگز نہ گیا۔ اپنے شوہر اور بچے کی یاد میں وہ جان کھویا کرتی تھی۔

دو چار مہینے اس طرح گزرے ہونگے کہ ایک دن کا ذکر ہے کہ باہر والے دالان میں میاں قاسم علی (وہی شخص جو پہلے روز قدسیہ سے پوچھ رہا تھا) اپنے بھائی مشتاق حسین سے کچھ باتیں کر رہے تھے۔ تذکرتاً یہ بھی کہا کہ میاں مشتاق تم نے اُس لڑکے کو بھی دیکھا۔ وہ جو رستم جی سیٹھ کی دوکان پر نوکر ہے۔ بھئی بڑا چالاک لڑکا

ہی اور اسکے سوا پڑھا لکھا بھی ہی۔ اس کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں۔ کوئی اکیس ۲۱ بائیس ۲۲ سال کی ہوگی۔ مگر بھئی بڑا قابل لڑکا ہی۔ کتنی جلدی ترقی کی ہی۔ اب اسے ۲۵ روپیے ملتے ہیں مشتاق نے جواب دیا کہ ہاں ہاں میںنے دیکھا ہی مگر رستم جی کو یہ کہاں مل گیا۔ بہت چالاک لڑکا ہی اور ویسے بھی چست۔ تھوڑے دنوں میں یہ منیجر ہو جائیگا۔ قاسم علی نے کہا کہ شاید کہیں قحط میں اسکے ہاتھ آگیا مگر اسکو میں نے دو تین دفعہ دیکھا کہ اکیلے بیٹھکر وہ بھی روتا ہی اور شاید اُسکا بھی ایسا ہی دردناک قصہ ہی جیسا اس بیچاری قدسیہ کا ہی۔ یہ کہکر وہ اور اپنی ادہر اُدہر کی باتوں میں لگ گئے۔ مگر قدسیہ نے اس بات کو کچھ تھوڑا سا خفیہ سن لیا تھا۔ اُس کی عجیب حالت تھی۔ خواہ مخواہ دل اُچھل رہا تھا اور جی یہی چاہتا تھا کہ میاں قاسم علی سے کہدے کہ اُس لڑکے کا نام و نشاں ذرا پوچھ لو مگر حیا نے اسے روک رکھا اور یہ اپنے بےچین دل کو اپنے عارف کی یاد ہی سے بہلاتی اگلے دن میاں قاسم علی نے رستم جی کے ہاں جاکر اُنسے اس لڑکے کی پوری کیفیت پوچھی رستم جی نے جواب دیا کہ اس غریب عارف کی کہانی قابل رحم ہی۔ قحط کی وجہ سے یہ اپنے گھر سے چلا راستہ میں اسکا چھوٹا بچہ مرگیا۔ سومناتھ پہنچتے ہی اسے پولیس والوں نے گرفتار کیا اور یہ اپنی عزیز بیوی سے یوں چھُٹ گیا۔ نہ معلوم اب وہ بیچاری کہاں ہی اور کس حالت میں ہی تھوڑے دن تک تو یہ روز خود جاکر ڈھونڈھتا رہا مگر جب کچھ پتہ نہ چلا تو مایوس ہوکر بیٹھ رہا مگر اسکے دل سے اُس کی محبت ہرگز کم نہوئی اور اُس کی یاد میں گھنٹوں رویا کرتا ہی۔ میرا ارادہ ہی کہ کہیں اس کی شادی کرادوں میاں قاسم علی تو یہ سنتے ہی ششدر ہوگئے اور سیدہے اپنے گھر آن کر اپنی بیوی سے پورا قصہ کہہ سنایا اور کہا کہ ہو نہ ہو یہ لڑکا قدسیہ کا خاوند ہی۔ تم کسی طرح قدسیہ سے اسکا نام و نشاں پوچھو اور مجھسے کہدو۔ بیوی نے قدسیہ سے سب پوچھا تو واقعی معلوم ہوا وہی مرزا عارف بیگ ہیں۔ ادہر قدسیہ کو عارف کی خیریت کی خوشخبری

سنائی گئی اور اُدہر عارف کو قدسیہ کی خبر دی گئی۔ پہلے تو عارف مذاق سمجھنے لگا مگر جب پورے طور سے بیان کیا گیا تو وہ خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا۔

تھوڑے دنوں میں ادہر عارف کی ترقی بھی ہوگئی اور اسکی عزیز بیوی قدسیہ بھی مل گئی۔ اب ان دونوں میاں بیوی نے ایک مکان چھوٹا سا کرایہ پر لیا اور اپنی زندگی اپنی مختصر سی تنخواہ میں بسر کرنے لگے۔ ایک سال نہوا ہوگا کہ عارف اُس کمپنی کا مینیجر ہوگیا اور اُسکے ہاں اللہ تعالیٰ نے ایک اور خوشی دی۔ یعنی مرحوم حفیظ کی یاد کو جِلانے کے لیے اُنکے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جسکا نام عارف نے حفیظ النسا رکھا۔ اب تو اللہ نے انھیں خوشی کے دن دکھائے۔ اور ستم رسیدہ قدسیہ کو اس پروردگار عالم نے ایک خوبصورت لڑکی سے گود بھر دی۔ یہ دونوں میاں بیوی اپنے بچے کو لیے اب آرام زندگی بسر کرنے لگے۔ سچ ہی غم بھی گزر جاتا ہی اور خوشی بھی گزر جاتی ہی بر سرِ فرزندِ آدم ہرچہ آید بگزرد۔

راقم

احمد

عورتوں کی نسبت جو غلط خیالات مشہور ہیں

ایک حکایت ہی کہ ایک پادری صاحب یوروپ سے شاہ چین کی خدمت میں پہنچے اور بادشاہ سے اور بہت سی باتوں میں یہ بات بھی کہی کہ حضرت آدمؑ کی پسلی سے حضرت حوّا پیدا ہوئی ہیں اسلیے مرد کی پسلیاں تعداد میں عورت کی پسلیوں سے ایک کم ہے شاہ چین نے پادری صاحب کی یہ بات سُنکر اپنے ملک میں ایسے دو آدمی ایک مرد اور ایک عورت تلاش کرائے جنکے بدن میں سوائے پوست استخواں کے گوشت کا نام نہ تھا اور ان کو بلاکر پادری صاحب کے روبرو کھڑا کیا کہ ان کی پسلیاں گنیں۔

پادری صاحب نے حسب الارشاد دونوں کی پسلیاں بار بار شمار کیں تو وہ برابر تھیں تو کچھ شرمندہ ہو کر کہنے لگے کہ یہ ایک بات میں نے شاید غلط عرض کی تو شاہ چین نے فرمایا کہ جب آپ کی یہ ایک بات غلط ثابت ہوئی تو ہم آپ کی دوسری بات کو بھی کہ مرد کی پسلی سے عورت پیدا ہوئی غلط جانتے ہیں۔ یہ بات غلط مشہور ہو کہ عورت کی ایک پسلی مرد سے زیادہ ہوتی ہو۔

عورت مرد کے باب میں ایک بڑا مغالطہ عوام میں مشہور ہو۔ جسپر مباحثوں کے دفتر کے دفتر سیاہ ہوتے ہیں کہ عورت اور مرد کے قواء دماغیہ برابر نہیں عورت کے ضعیف اور مرد کے قوی ہوتے ہیں۔ جو ضعیف بتلاتے ہیں وہ یہ دلائل لاطائل پیش کرتے ہیں کہ عورتوں میں کوئی بادشاہ مثل سکندر و قیصر اور کوئی مدبر قانون آرا اور شاعر غرا نہیں پیدا ہوا۔ دلیل کی دونوں حصہ کی تو غلطی عیاں ہے کہ ابھی قیصر ہند ملکہ معظمہ اس سلطنت پر فرماں روا تھیں اور اس دانش سے کر رہی تھیں کہ قیصر روم کو کبھی میسر نہیں ہوئی وہ اس دار الفنا سے دار البقا کو رخصت ہوئیں۔ اب اُنکے نمونے کی چھوٹی قیصر بھوپال کی بیگم صاحبہ دام اقبالہا زندہ ہیں جو اپنی ریاست میں فرماں روائی ایسی روشنضمیری اور عالی دماغی سے کر رہی ہیں کہ وہ رئیس مردوں کو بھی مات کرتی ہیں۔ ایسا ہی کتابوں سے ثابت ہوتا ہو کہ عورتوں میں فرماں روائی کی ایسی لیاقت ہو جیسی کہ مردوں میں۔ یہ کہنا بھی غلط ہو کہ کوئی ان میں شاعر غرا نہیں ہوئی۔ جارج اسینٹ صاحبہ کو دیکھو جن کی قصہ طرازی میں سحر پردازی کسی شاعر کی شاعری سے کم نہیں۔ اُنہوں نے یہ سمجھکر کہ مردوں نے جو علم ادب تصنیف کیا ہو کہ عورتوں کے دماغ کو خراب کرتا ہو۔ خود عورتوں کے لیے علم ادب کی بنا قائم کی اور اُنکے سبب سے عورتوں نے خود اپنے لیے علم ادب ایسا تصنیف کر لیا کہ وہ اُن کو مردوں کے علم ادب سے زیادہ روشن دماغ

بناتا ہے۔ انتظام گیتی کے لیے عورتوں اور مردوں کے کاموں کے احاطے ایسے جدا جدا ہیں کہ اُن میں دیکھنا چاہیے کہ اُنکے قوا دماغیہ کی مساوات ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔ ایک ملک گیری اور انتظام ملکی میں اپنے قوا دماغیہ سے کام کرتا ہے دوسرا انتظام خانہ داری میں۔ سوا اسکے مردوں کے کام عقل کے سب پر عیاں ہوتے ہیں عورتوں کے عقل کے کام پردے میں رہتے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کی تعلیم و تربیت یکساں ہو تو اُن کے قوا عقلیہ کی موازنت کرنی چاہیے۔ جب عورتوں کی تعلیم و تربیت نہیں ہوتی اور مردوں کی ہوتی ہے تو ایسی حالت میں انکے قوا عقلیہ کی موازنت کرنا ایسا ہے کہ کوئی کسی وحشی کا مہذب آدمی سے مقابلہ کرکے کہے کہ ایک کے قوا دماغی قوی اور دوسرے کے ضعیف ہیں۔

یہ مضمون بڑا مبسوط میں نے مجالس مناظرہ میں بطور مناظرہ کے لکھا ہے۔ اسکو جو پڑھے گا یقین ہے پھر اُسکو یہ مغالطہ نہوگا کہ عورت کے قوا دماغیہ ضعیف اور مرد کے قوی ہیں۔

ایک جاپانی لطیفہ

اکثر مذہبوں میں یہ حکم ہے کہ عورت کو مرد کی اطاعت کرنی چاہیے۔ اس حکم سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ مرد کے قوا عقلیہ زیادہ قوی بہ نسبت عورت کے ہوتے ہیں بادشاہ کے مشیر اور وزیر جو اسکے محکوم ہوتے ہیں قوا عقلیہ بہ نسبت بادشاہ کے زیادہ قوی رکھتے ہیں محکوم ہونے کا اثر قوا عقلیہ کو ضعیف نہیں کرتا۔ ایک جاپانی نے خوب لطیفہ کہا کہ ایشیا اور یوروپ دونوں میں مرد عورت کو اپنا محکوم رکھنا چاہتا ہے۔ ایشیا میں ہمنے عورتوں کو محکوم خوف سے بنایا ہے یوروپ نے خوشامد و چاپلوسی سے۔ فقط

ذکاء اللہ

سلسلۂ خواتین انگریزی نمبر ۱

ملکہ برتھا

ہم ایک مدت سے دیکھتے آئے ہیں کہ خاتون میں اس قسم کے مضامین بہت کم شائع ہوتے ہیں۔ جنکو ہم قابل تحسین لوگوں کی سوانح عمریوں کا مسلسل مجموعہ کہہ سکیں۔

اب ہمارے دلی ولولوں نے ہمارے ایک لائق اور قابل دوست کے ارشاد کی تعمیل کرنے پر ہمکو آمادہ کر دیا ہے۔ اور ہم خوش ہیں کہ ناظرین خاتون کی خدمت میں ایک ناچیز تحفہ پیش کرتے ہیں۔ علمی دنیا میں ہمارے نزدیک اس سے بڑھکر اور کوئی چیز نہیں ہے کہ ہم گزشتہ لوگوں کے حالات زندگی سے واقف ہو کر اُنکے اعلیٰ اور عمدہ اُصول کو اخذ کریں۔ اور اُنکے نیک اور اچھے کاموں سے اپنی آیندہ زندگی کے لیے کچھ سبق سیکھیں۔

درحقیقت اگر دیکھا جائے تو تاریخ کا ایک جزو اعظم سوانحعمری ہے۔ کیونکہ تاریخ زمانہ کی رفتار سیاسی و تمدنی معاملات ایجاد و اختراع جنگ و جدل اور بہت سی چیزوں کا پتہ دیتی ہے بمقابل اسکے سوانحعمری اُن اچھی اور نیک طبیعتوں کا مفصل طور پر حال بیان کرتی ہے جنکے کارناموں کا ذکر تاریخوں میں بار بار آتا ہے۔ مگر جن کی ذات کی نسبت بہت ہی مختصر طور پر خبر دیجاتی ہے۔ بہت سے ایسے شخص بھی گزرے ہیں کہ جنکا ذکر تاریخوں میں کہیں نہیں آیا۔ پھر بھی ہمارے پاس اُن کی سوانحعمریاں موجود ہیں جنکے ذریعے سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں کیا کیا کام کیے۔ اسلیے ہم نے اب ارادہ کر لیا ہے کہ ناظرین خاتون کے سامنے سوانح عمریوں پر ایک سلسلہ وار مضامین کا تحفہ پیش کریں۔

ہماری نظر انتخاب پہلے انگریزی خواتین پر پڑتی ہے کہ جن میں بہت سی ایسی

نیک اور عالی دماغ بی بیاں گزری ہیں جنکے اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کی نسبت ہماری بہنوں کو بھی علم ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنی طرز معاشرت اور دستور العمل کے لیے مفید اور نفع بخش اصول اخذ کریں۔

سب سے پہلے ہم جس نیک بخت خاتون کا ذکر کرنے والے ہیں وہ "ملکہ برتھا" ہے جو بلحاظ زندگی بہت ہی مطمئن رہی اور تمام عمر اُس نے چین اور آسودگی میں بسر کی۔ ملکہ برتھا جو عیسائیوں کی سب سے پہلی ملکہ گزری ہے اسکے عین حیات میں کوئی ایسا زبردست واقعہ نہیں گزرا جو خصوصیت کے ساتھ قلمبند کرنے کے قابل ہو۔ تاریخ کے صفحے اُسکے حالات زندگی سے بالکل خالی پائے جاتے ہیں۔

بایں ہمہ اُسکے نیک اندیش اور پاک باطن طبیعت کی وجہ سے اور راستبازی کے اثر سے اُسکو ہم ایک منور چراغ سے تشبیہ دینگے۔ کہ جو کفر اور بت پرستی کے تاریک حصہ میں مدت العمر تک برابر روشن رہا۔ اور بہت سے سیاہ قلب انسانوں کو اپنی روشنی سے روشن کرتا رہا۔ یہ ملکہ شاہ فارس کی اکلوتی بیٹی تھی اور بہ نسبت اُسکے والدین کے ہمیں اس کی دادی کا زیادہ ذکر کرنا پڑیگا۔ کیونکہ برتھا اپنے زمانۂ طفولیت سے اپنی دادی ہی کے نام سے واقف تھی اور اُسی کا دم بھرتی تھی اسکا نام "ریدی گند" تھا جو فرانس کے کسی بادشاہ کی بیوی تھی۔ اُس بادشاہ نے اسے اور اسکے چھوٹے بھائی کو ایک جنگ میں گرفتار کر لیا تھا۔ مگر چونکہ وہ بہت حسین تھی بادشاہ اُسکے حسن کا مفتوں ہوگیا۔ علاوہ اسکے "ریدی گند" شاہی خاندان سے تھی۔ ان تمام باتوں نے بادشاہ کے دل میں اُس کی محبت ڈالدی۔ جس وجہ سے اُسنے اُس کی پرورش کرنا شروع کی۔ چونکہ ریدی گند بت پرست تھی۔ اُس بادشاہ نے اُسے عیسائی بناکر تعلیم دینا شروع کی۔ جب وہ سن تمیز کو پہنچی اُس سے شادی کرلی۔ مگر غریب ریدی گند بہت ہی تکلیف میں اپنی زندگی بسر کرنے لگی۔ کیونکہ اُسکا خاوند بہت ہی ظالم

سنگدل اور ضدی آدمی تھا۔ حالانکہ اُسے اپنی بیوی سے بہت محبت تھی مگر وہ بیچاری اپنی جان کو آفت سے بچانے کے لیے اپنے خاوند کو چھوڑ کر دور ایک خانقاہ میں جا کر پناہ گزین ہوئی۔ مصیبت زدہ ریدی گند نے اپنے ہاتھوں سے اپنے لمبے پیارے گھونگر والے بالوں کو کاٹا۔ شاہی لباس اور جواہرات کو چھوڑ کر ایک نن کی کفنی پہننا منظور کر لیا۔ آخر کار اُسی سنگدل بادشاہ کو اسکا پتہ لگ گیا اور وہ اپنے ظالمانہ برتاؤ کرنے پر بہت ہی نادم ہوا۔ اسکے معاوضہ میں اُسے ایک بڑی جاگیر عطا کی۔ جس سے ریدی گند نے ایک خانقاہ بنوائی اور باقی زندگی تعلیم دینے اور نیک کاموں کے لیے وقف کر دی۔ وہ خود خانقاہ کی منتظمہ بھی تھی۔ اُسکے انتظام کے قوانین اور آئین اُس نے وضع کیے اور محتاجوں کی حاجت روائی کیا کرتی۔ مظلوموں کی فریاد رسی میں منہمک رہتی۔ سُست اور کاہلوں کو اُبھارتی۔ اور معصوموں اور یتیموں پر عنایت کیا کرتی تھی۔ ریدی گند نے اسی لڑکی یعنی برتھا کے باپ کی پرورش بھی کی۔ اُس کی تعلیم و تربیت کی نگراں خود تھی۔ اور اُسے مذہبی روایات کا شوق دلایا۔ جس سے وہ ایک خردمند اور اچھا بادشاہ ہوا۔ چونکہ اُس کی تعلیم و تربیت خانقاہ میں ہوتی تھی اُسنے اپنی لڑکی برتھا کی پرورش کے لیے ایسی ہی جگہ انتخاب کی۔ اور اُسے خانقاہ میں بھیجدیا۔ ہمیں اس بات کا بخوبی پتہ نہیں چلتا کہ برتھا نے کس خانقاہ میں پرورش پائی مگر ظن غالب ہے کہ ریدی گند ہی سے یہ فیضیاب ہوئی ہوگی۔

تاریخ ہمیں یہ خبر دیتی ہے کہ ایتھل برٹ Ethelbert شاہ کینٹ سے اسکی شادی ہوئی۔ مگر اس کی درمیانی زندگی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ایتھل برٹ ایک کم عمر سیکشن Saxon بادشاہ تھا جو سولہ سال کی عمر سے سلطنت کے اہم معاملات اور سیاست کا ذمہ دار ہوا۔ یعنی اس کم عمری میں اُسکے نازک دماغ پر افکار کا بھاری بوجھ پڑا۔ مگر خدا کی قدرت کا انتظام بھی کیا ہی عجیب ہے۔ ہر کسے را

بہر کارے ساختند۔

"ایتھل برٹ"، کے مصاحب اور ملازم سب اُسکے خیر خواہ تھے اور ہر وقت اُسکے نفع و نقصان میں شریک ہونے کو مستعد رہتے تھے۔ انگلستان کے بادشاہ اور شہزادے اُن اگلے زمانوں میں اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ وہ اپنی سلطنت کو وسیع کریں چنانچہ ایتھل برٹ کو بھی یہی خبط تھا۔ برخلاف ہمارے بادشاہ ایڈورڈ کے کہ وہ ایک دوسرے سے بہت ہی خلاف رہتے تھے اور رشک کرتے تھے" ایتھل برٹ نے یہ سوچا کہ ایسے موقع پر یہ بہتر ہے کہ ہم انگلستان سے باہر کسی اور بادشاہ کی مدد لیں۔ اپنی اس آرزو کو پورا کرنے کی غرض سے یہ پیرس گیا۔ وہاں اسنے برتھا کو پہلے ہی بار دیکھا اور اُس سے محبت ہو گئی۔ شاہ پیرس کو یہ رشتہ داری پسند آئی۔ کیونکہ اس شجاع اور کم عمر شاہ کینٹ سے وہ بہت ہی خوش تھا۔ قضا کار شاہ پیرس کا اسی سال انتقال ہوا۔ اور "برتھا" اپنے چچا کے پاس بھیجی گئی جو وارث تخت و تاج تھا۔ برتھا کے چچا کو یہ امر ناگوار گزرا کہ ایک عیسائی عورت کی شادی ایک بت پرست بادشاہ سے کیوں ہو۔ ایتھل برٹ فرط محبت میں اس بات کا وعدہ کرنے کو تیار ہو گیا کہ اگر برتھا کی شادی اُس سے کر دیجاے تو اُسے وہ اپنے مذہب پر قائم رہنے دیگا اور اُسکے دینی احکام کے انجام دینے کے لیے ایک عیسائی راہب بھی برتھا کی خدمت کے لیے مامور کر دیگا۔

اُس خداوند کارساز کو آخران دونوں کو ملانا ہی منظور تھا کہ برتھا کے چچا کے دل میں یہ بات پیدا کر دی کہ وہ رضامند ہو۔ پھر کیا تھا چند دنوں کے بعد انکی شادی کر دی گئی اور ہماری شہزادی اب ملکہ کے خطاب سے مخاطب ہوئی اور بڑے ہی تزک و احتشام سے وہ وداع کی گئی۔ ملکہ برتھا اپنے شوہر کی عظیم الشان سلطنت کی طرف روانہ ہو گئی جس کی نسبت وہ قصے سُنا کرتی تھی۔

اُسکا نیا شاہی مکان وہ تھا جو شہر کنٹربری میں ایک مشہور محل تھا جہاں تمام بادشاہان کنٹ کا اپنے زمانۂ حکومت میں قیام ہوا کرتا تھا۔ اس محل میں ایک بہت ہی وسیع اور خوبصورت دالان تھا جہاں بادشاہ اور اُس کی ملکہ اپنے دوستوں اور مہمانوں کی خاطر اور مدارات کیا کرتے تھے اور روز و شب ناچ رنگ کے جلسے رہتے تھے ملکہ برتھا نے اپنی مرضی کے مطابق باغیچہ میں ایک درختوں کا جھنڈ اپنی تفریح اور تفنن کی غرض سے مقرر کر رکھا تھا۔ یہاں اکثر وہ چنگ و رباب بجایا کرتی تھی اور پائیں باغ میں اپنی سہیلیوں اور ہمجولیوں کے ساتھ صنائع قدرت کی گلکاری کی سیر کرتی تھی۔ اُس کی شادی کے بعد ایک عجیب زمانہ خوشی اور اطمینان کا گزرا اور اس عرصہ میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئی جن کی آواز سے قلعہ خوش ہو کر گونجتا رہتا تھا۔ ان بچوں کے نام کچھ عجیب طرح کے تھے مگر لڑکی جسے سب "ثاثا" کے نام سے پکارتے تھے جسکے معنی زندہ دل کے ہیں اسکے اسم بامسمیٰ ہونے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسکی صورت سے ہر وقت بشاشت ٹپکتی رہتی تھی۔ ہماری ملکہ نے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر اپنے لیے ایک گرجا بنوایا تھا وہاں وہ روز جایا کرتی تھی۔ اور "ایتھل برٹ" بتخانوں میں جاکر بت پرستی کیا کرتا تھا۔ ہماری ملکہ کی یہ دلی خواہش تھی کہ "ایتھل برٹ" عیسائی ہو جائے۔ حالانکہ ایتھل برٹ" ایک نہایت ہی عالی دماغ اور اچھا بادشاہ تھا جو ہر وقت اپنی رعایا کی فکر میں رہتا تھا۔ مگر بت پرستی نے اُسکے دل میں کچھ ایسا گھر کر لیا کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی لکیر کا فقیر بنا رہا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ غریب سکسنوں کے بچے چرائے جاتے تھے اور بردہ فروش اُنکو لیجا کر شہر روم میں بطور غلام اور کنیز کے بیچتے تھے۔ روم کے بازاروں اور لڑکوں پر اُنکے جھگڑے کے جھگڑے بکنے کے لیے کھڑے رہتے تھے۔ سکسن بلحاظ خال و خط بہت ہی حسین ہوا کرتے تھے۔ اُن کی گوری چمڑی کرنجی آنکھیں۔ گلابی گال اور ہلکے ہلکے بال

انکا خصوصیت کے ساتھ رومن والوں سے فرق ظاہر کرتا تھا۔ ایک روز ایک راہب سڑک پر سے گزر رہا تھا اور جوں ہی انھیں دیکھا اُسے تعجب ہوا۔ اُس نے اُن بردہ فروشوں سے یہ سوال کیا کہ یہ غلام کس جگہ کے رہنے والے ہیں۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ یہ انگلز Angles ہیں۔ راہب نے کہا کہ نہیں یہ اینجلز Angles ہیں (یعنی فرشتے) اسکے بعد اُس راہب نے انگلستان کے متعلق کچھ اُنسے دریافت کیا اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ لوگ بت پرست ہیں تو فوراً ارادہ کرلیا کہ وہاں جاکر دینِ مسیحی کی ہدایت کرنا چاہیے۔ چند دنوں کے بعد یہ راہب روم والوں کا اسقف (یعنی اعلیٰ راہب) بنا۔ اسوقت پھر اُسکو کچھ خیال آیا تو اپنے ماتحت راہبوں میں سے ایک "اگسٹن" نامی راہب کو اس کام کے لیے تیار کیا۔ اُسکے ساتھ چالیس اور راہبوں کو بھی کردیا۔ جو اسکے زیر دست اور خدمتگار رہتے تھے۔ جب اگسٹن فرانس پہنچا تو وہاں کے لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ انگلستان کی ملکہ عیسائی ہے تو اُسکی ہمت اور بڑھی۔ بہرصورت وہ انگلستان سے قریب ایک جزیرہ تھا وہاں پہونچا۔ وہاں سے اپنے آنے کا پیام اور شاہ سے ملنے کا اشتیاق ملکہ برتھا کو کہلوا بھیجا۔ چند دنوں کے بعد یہ ملکہ برتھا کے اصرار سے ایتھل برٹ اور وہ دونوں اس جزیرہ پر اگسٹن سے ملنے آئے۔ اُسوقت تمام راہب کچھ عجیب قسم کا لباس پہنے ہوے تھے۔ لمبے ڈھیلے ڈھیلے سیاہ رنگ کے جبے۔ بڑی بڑی آستنیں۔ سرخ چوگوشیہ کلاہیں اور اسپر طرہ یہ کہ سر منڈے ہوئے۔ جب شاہ کے آنے کی خبر سنی تو سب ایک صف میں کھڑے ہوگئے۔ ایتھل برٹ اور برتھا بے تکلف زمین پر بیٹھ گئے۔ اور اُن کی لمبی قطار کو تعجب سے دیکھنا شروع کیا۔ چند لمحوں کے بعد حکم دیا کہ وہ سب بیٹھ جائیں۔ اور اگسٹن کو اجازت دی کہ وہ اپنا عرضیہ پیش کرے۔

اگسٹن۔ جلالت مآب حضور والا۔ یہ بندۂ ناچیز اسلیے حاضر ہوا ہی کہ اُس خدا کے
دین کی جناب کو ہدایت کرے یعنی ہمارے پیارے مسیح نے جو روشن رستہ تبلا
اُسکی رہنمائی کے لیے میں حاضر خدمت ہوا ہوں۔

ایتھل برٹ۔ آپ نے جو کچھ فرمایا وہ صحیح ہی مگر میرا قلب جو مجھے ہدایت کر رہا
اُس کی پابندی میں مجھسے فرو گذاشت نہیں ہو سکتی اور میرے لیے یہ ایک مشتبہ
کہ آپ کا مذہب برحق ہے۔

اس گفتگو کے بعد ایتھل برٹ نے اُنسے کہا کہ آپ لوگوں کے لیے ایک مکا
تجویز کیا گیا ہی جہاں پر رہکر آپ اپنے مقاصد کی تکمیل کر سکتے ہیں۔ پھر کیا تھا اُس
میں رہکر بجز اسکے کہ شب و روز اُسی کام میں کوشاں رہے اور کچھ نہیں کرتے
لوگ اُن کی عادات و اطوار دیکھکر خود بخود انکے گرویدہ ہو گئے تھے۔ اگسٹن اکثر
برتھا کے بنائے ہوئے گرجا گھر میں جایا کرتا تھا۔ تھوڑی مدت میں اُسنے ایک معتد
تعداد عیسائیوں کی بنا لی۔ آخر وہ دن بھی آگیا جب ملکہ برتھا کی آرزو پوری ہو
تھی۔ خود شاہ ایتھل برٹ نے اُس چھوٹے سے گرجا گھر میں جاکر دین مسیح
کیا۔ اور تبخانے میں جانے کی قسم کھالی۔ اُس سال کے ختم ہونے سے پہلے قریب
قریب ساری رعایا عیسائی ہو گئی۔ اور اسکی ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک بڑا گرجا گھر بنا
شاہ کے حسب ارشاد ایک بہت بڑا گرجا جس میں ہزاروں آدمیوں کی گنجایش ہو
تھی بنا دیا۔

دین مسیحی کی اسقدر بڑی خدمت کرنے میں اگسٹن کو یہ صلہ ملا کہ وہ وہاں کا
(یعنی اعلیٰ راہب) بنایا گیا۔ اور چند دنوں کے بعد شہر کنٹربری کا اعلیٰ اسقف
آرچ بشپ بنا دیا گیا۔ یہ وہی عہدہ ہی کہ جس کی تقلید برابر اب تک چلی آتی ہی اور
یہ نہیں کہ تمام راہبوں کا اعلیٰ افسر بلکہ رعایا کا بھی بادشاہ کے بعد وہی بادشاہ مو

انگلستان کے بادشاہوں کی تاج پوشی کے موقع پر اسی کو یہ عزت نصیب ہوتی ہے
کہ اپنے ہاتھوں سے اُسے تاج پہنائے۔ گسٹن کو بہت سے اور حقوق حاصل تھے
چنانچہ اُسنے ایک بشپ کو کئی راہبوں کے ہمراہ یارک میں تبلیغ دین مسیحی کرنیکی
غرض سے بھیجا۔ اور ایک قدیم زبردست گرجا جو کنٹربری میں تھا اُس کی مرمت
کرائی جو آج کے دن تک کنٹربری کتھیڈرل کے نام سے مشہور ہے۔
۱۶۰۵ء میں جب اگسٹن کا انتقال ہوا تب اُسکی یادگار میں ایک بڑی زبردست
خانقاہ بنادی گئی۔ جسکا افتتاحی جلسہ ملکہ برتھا کی سرپرستی میں ہوا۔ اس موقع پر
شاہ ایتھل اور اُس کی شہزادی نے سب سے بڑا حصہ لیا۔ ہمیں افسوس کے ساتھ
بیان کرنا پڑتا ہے کہ یہ اخیر موقع تھا جب ملکہ برتھا نے عوام کی کچھ خدمت کی اور اُسکے
بعد کی زندگی کا کسی معتبر ذریعہ سے پتہ نہیں چلتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُسکا انتقال
بھی اسی سال میں ہوا۔ جیسے اُس کی تمام زندگی آرام و اطمینان سے کٹی ویسے ہی
اُسنے دنیا سے پتہ توڑنے پر بھی خوشی ظاہر کی۔ یہ کسقدر بڑا احسان تھا کہ جو اُسنے
اپنے ہمعصروں پر کیا کہ اُنکے خیال کے مطابق اُنھیں کج رائی سے بچایا اور وہ راہ
راست پر لایا۔ کیونکہ نہ ملکہ برتھا وہاں ہوتی نہ گسٹن کو وہاں جانے کی جرأت پڑتی
اب ہمیں اس قصہ سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ اچھی اور نیک عورتیں خواہ وہ کسی
مذہب کی ہوں ہمیشہ اوروں کو فائدہ پہنچاتی رہتی ہیں۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ
شاہ ایتھل برٹ اپنی ملکہ کے بارہ سال بعد انتقال کرگیا۔ اور اسکا مدفن اُسکی
رہبر کے برابر سینٹ پیٹر کے گرجا میں اب تک ہے۔ خدا ان دونوں کی طرح ہمیں بھی
اپنے خیال کے مطابق صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔ اور صداقت کو
ہمیشہ کتاب پر غالب رکھے
ہم اپنے ناظرین خاتون کو اس موقع پر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے

کہ یہ ایک میاں بیوی کی اعلیٰ درجہ کی محبت کا قابل قدر نمونہ تھا ؎

قارون ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت نوشیرواں نہ مُرد کہ نام نکو گذاشت

دعا کرکے رخصت ہوتے ہیں کہ خداوند کارساز سب ایسے میاں بیوی جس میں اختلاف مذہب ہو محبت قائم و دائم رکھے۔ آئندہ ماہ کے پرچے میں ملکہ "ماڈ" کی سوانحعمری ناظرین کی خدمت میں پیش کرینگے۔

آزاد۔ از بمبئی

اڈیٹوریل

نواب محسن الملک مرحوم

آج وہ وقت آپہونچا جسکا کھٹکا کچھ عرصہ سے دل کو لگا تھا۔ نواب محسن الملک کے ساتھ مرحوم کا لفظ استعمال کرتے ہوئے ہمارا دل دُکھتا ہی لیکن مشیت ایزدی میں کسی کا کچھ بس نہیں چلتا۔ چون و چرا کا کوئی موقع نہیں۔ سوائے رنج اور افسوس اور حسرت کے کچھ چارہ نہیں۔

نواب محسن الملک کی وفات سے قوم کے سر سے ایک ایسا شخص اُٹھگیا جیسے میدان جنگ میں عین معرکہ کے وقت فوج کے سر سے کوئی بڑا سپہ سالار اُٹھ جاے یا کسی ریگستان کی دشت نوردی میں قافلے کا رہنما یکایک قافلہ سے علحدہ ہو جاوے یا سخت طوفان کے وقت جبکہ جہاز یا کشتی کو اُسی شخص کی ضرورت ہی جس نے اسوقت تک اہل کشتی کی جان بچانے میں پوری کامیابی حاصل کی ہی وہ خود بخود موجوں کا شکار ہو جاے اور کشتی کو اہل کشتی کی قسمت کے حوالے کردے اور اُنکو بے سر و سامان چھوڑ جاے۔ یہ سب مثالیں نواب محسن الملک بہادر مرحوم کے حسب حال ہیں۔ سر سید کی وفات کے

بعد سے آجتک برابر وہ ہماری فوج کے سپہ سالار اور ہمارے قافلے کے رہنما اور ہماری کشتی کے ناخدا رہے۔ اس زمانے کی اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی اُنھوں نے کسی دوسرے کام میں صرف نہیں کیا۔ اور برابر ایک ہی دُھن میں اور ایک ہی کام میں اپنے پُر درد دل کو مصروف رکھا۔ اور اُسی عین مصروفیت کے عالم میں ہماری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئے۔ ہائے افسوس وائے افسوس کہ ہمسے ایسا زبردست لیڈر چھن گیا۔

نواب محسن الملک بہادر مرحوم سرسید کے بہترین شاگردوں میں سے تھے اُنکی سوانحعمری اگر تحقیقات اور سلیقہ سے مرتب کی گئی تو وہ آیندہ نسلوں کے لیے ایک بڑی بیش بہا چیز ہو گی نواب صاحب مرحوم بلحاظ اپنے حسب و نسب کے ہندوستان کے اعلیٰ شرفا میں تھے۔ لیکن بلحاظ اُس ترقی اور قابلیت اور مراتب اور کام کے یقیناً اپنے خاندان میں وہ اپنی مثال آپ ہی تھے۔ وہ منجملہ اُس گروہ کے ہیں جسنے زمانے کی رفتار اور انقلاب کو پہچانا اور اُسکا ساتھ دیا۔ سرسید مرحوم۔ نواب محسن الملک مرحوم اور چند بزرگ جو اسوقت بقید حیات موجود ہیں اور چند دیگر بزرگ جو اس سے پیشتر گزر چکے ہیں وہ سب اُسی ایک کمیٹی کے ممبر کہلانے کے مستحق ہیں۔ یہی بزرگ تھے کہ سب سے پہلے ان کی آنکھوں نے زمانے کا رنگ بدلا ہوا دیکھا اور انقلاب محسوس کیا۔ مسلمانوں کی ہندوستان کی تاریخ کو اگر ہم بلحاظ اُن کی قومی احساس کے دو حصوں پر تقسیم کریں تو ان دو حصص کی حدِ فاصل غدر کا زمانہ قرار پاتا ہے۔ غدر سے پیشتر کی کل تاریخوں اور سوانح اور واقعات اور انقلابات سے باسانی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب سے مسلمان ہندوستان میں آئے ہیں اُسوقت سے یہ خیال کبھی مسلمانوں کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا کہ مسلمان بلحاظ باشندے ہونے ہندوستان کے بھی ایک قوم ہیں یا اُنکو ایک قوم ہونے کی کچھ ضرورت ہے۔ قوم اور مذہب کے خیال ایک دوسرے میں بالکل مخلوط تھے۔ مذہبی اتحاد اور قومی اتحاد میں تمیز اور تفریق نہیں کی جاتی تھی۔ اور وہ مذہبی خیال اتحاد باہمی کے لیے بھی کوئی کافی ضمانت نہ تھی۔ مسلمان ہمیشہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے

دکن کے بادشاہوں نے مغل بادشاہوں کے خلاف سخت سخت لڑائیاں لڑیں شاہان مغلیہ کا جب موقع چلا تو اُنھوں نے دکن کے بادشاہوں کو نیست و نابود کر دیا۔ بھائیوں اور بیٹوں اور عزیزوں میں خانہ جنگیاں اور لڑائیاں ہوئیں۔ فوجیں اور رعایا اپنی قوم کے لیے اور ملک کے لیے نہیں لڑتے تھے بلکہ کسی بادشاہ یا باغی صوبے کے لیے لڑتے تھے۔ اور اس بات کا جہانتک تاریخ پتہ دیتی ہے ایک فرد بشر کے دل میں بھی خیال نہیں تھا کہ ہم بحیثیت ہونے باشندہ ہندوستان کے اپنے حقوق اپنی آسائش اپنے آرام اپنی بیویوں اپنی بہنوں اپنی بیٹیوں کی عزت اور آبرو کے لیے لڑیں اور کسی سپہ سالار یا بادشاہ یا افسر کا خیال اُس میں مطلق محوظ نہ رکھیں۔ پس اس سے زیادہ کوئی اور ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ جسکو آجکل ہم قومیت کہتے ہیں وہ ہندوستان کے مسلمانوں میں نہیں تھی گو اگر سچ پوچھیے تو تمام دنیا کی تاریخ کا مقابلہ کرنے سے اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ اسلام ہی نے سب سے پہلے اس قومیت کی بنیاد ڈالی تھی۔ اب غدر سے بعد کے زمانے پر جب ہم غور کرتے ہیں تو سب سے اول ہم کو سرسید اس قومی خیال کے میدان میں تن تنہا کھڑے نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے غدر کے واقعات نے سرسید کی آنکھیں کھولی ہوں اور اُنھوں نے اس بات کو محسوس کیا ہو کہ مسلمان جب تک ہندوستانی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک گروہ یا جماعت بنکر اپنی ترقی کے لیے مجموعی کوشش بالاتفاق نکرینگے وہ مثل صحرا کے بکھرے ہوے ریت کے دانوں کے روزانہ آنیوالے انقلابات کے ہوا کے مخالف جھونکوں سے پریشان رہینگے اور اُن کو کبھی اطمینان اور قرار قیام نصیب نہوگا۔ ہم کو اس بات میں شبہ ہے کہ مسلمانوں نے اس راز اور باریکی کو سمجھا بھی ہے یا نہیں لیکن سرسید کے شاگردوں نے اس راز کو ضرور سمجھا تھا اور اُسپر اُنکا عمل تھا۔ سرسید کی وفات پر اور آج نواب محسن الملک کی وفات پر ہم کو اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ کم از کم مسلمانوں کے

ایک حصے میں وہ احساس قومی ضرور پیدا ہوگیا ہے جسکے بانی سرسید تھے اور اُنکے بعد سب سے بڑے واعظ نواب محسن الملک بہادر تھے۔

سرسید کی وفات پر تمام ہندوستان کے قصبات اور دیہات اور بڑے چھوٹے شہروں میں اُنکے لیے ماتمی جلسے ہوئے تھے اور اسی قسم کے جلسے آج نواب محسن الملک کے ماتم کے لیے ہو رہے ہیں۔ پس یہی اتحاد قومی کی بڑی دلیل ہے کہ کل ہندوستان کے مسلمان اس بات پر متفق ہوتے جاتے ہیں کہ کل قوم ایک ہے اور اس قوم کا جو لیڈر جسوقت کے لیے ہوتا ہے اُس کی وفات کل قوم کے صدمے اور رنج کا باعث ہے۔

یہ قومی احساس اور اتحاد پیدا کرنے میں سرسید کو اور اُنکے بعد نواب محسن الملک کو جو جو دقتیں پیش آئی ہیں اُنکا کچھ پتہ حیات جاوید سے لگتا ہے اور کچھ اُسکا حصہ ممکن ہے کہ نواب محسن الملک کی سوانح عمری لکھنے والے کوئی بزرگ ظاہر کرسکیں۔ یہی خدمات ان بزرگوں کی ہیں جنکے لحاظ سے ہم اُن کو ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا خیرخواہ تصوّر کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں اس سے پیشتر جلیل القدر بادشاہ بڑے بڑے مصنف مدبر شاعر مشایخ اور علماء گزرے ہیں۔ لیکن ایسی مثالیں ہمارے سامنے نہیں ہیں کہ کسی نے اپنی قومی تباہی اور مصیبت پر آنسو بہائے ہوں جنکے دل میں حاضر و غائب ادنے اور اعلیٰ چھوٹے اور بڑے غریب اور امیر جاہل اور عالم کا یکساں اور برابر درد ہو اور اُن کی آنکھ سے اُن کی سپید نورانی ڈاڑھیوں پر سے آنسو بہکر موتیوں کی طرح زمین پر گریں۔ نواب محسن الملک بہادر گو آج ہمارے درمیان سے اُٹھگئے ہیں لیکن اُنکے کام اُن کی مثال ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور ہم اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں شکرگزاری کے ساتھ اُس سے فائدہ اُٹھائینگی ترقی کی منزل مقصود پر پہونچنے کے لیے جس بڑے زینے کی ضرورت ہے سرسید نے

اُس کی تعمیر شروع کرکے بہت سے قدم تیار کردیے تھے نواب محسن الملک نے انپر او بہت سے قدم اضافہ کیے اگر اب جو اُنسے بعد آنے والے ہیں وہ بھی اسی طریقہ سے جس طریقہ سے کہ سرسید اور نواب محسن الملک نے کام جاری رکھا تھا اُسکو جاری رکھینگے تو یقین ہو کہ ایک روز اُس منزل تک پہونچنے کا زینہ مکمل ہوجائیگا۔

ہمنے اس نوٹ میں نواب محسن الملک کی سوانح عمری کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے صرف انکے اُس کام کا ایک پہلو دکھایا ہو جس کی وجہ سے وہ قوم میں اسقدر محترم اور ہردلعزیز سمجھے گئے۔ ہماری خواہش ہو کہ نواب محسن الملک کی سوانح عمری ہماری قوم کے کوئی قابل بزرگ لکھیں تاکہ جو کام اُنھوں نے اپنی زندگی میں کیا ہو اُسکے حالات آیندہ نسلوں کے لیے بطور مثال کے ہمیشہ محفوظ رہیں۔

آج نواب محسن الملک کی وفات کی وجہ سے مسلمانوں کی قوم ایک اعلےٰ سے اعلےٰ فصیح اور بلیغ مقرر سے محروم ہوگئی اگر سچ پوچھیے تو فصاحت اور بلاغت کا جو حق ہوتا ہے وہ نواب محسن الملک ہی کو حاصل تھا اور یہ خداداد عطیہ انھیں پر ختم ہوگیا۔ آیندہ ہم کو قوم میں ایک شخص بھی نظر نہیں آتا جس کی تقریریں یا جس کی پرائیویٹ گفتگو سُننے والوں پر جادو کا اثر کریں۔ پتھر سے سخت دلوں کو پگھلا کر پانی کردیں۔ ہنستے ہوئے آدمیوں کو رولادیں اور روتے ہوؤں کو ہنسادیں۔ یہ خداداد بات تھی حاصل کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔

آج نواب محسن الملک کی وفات کی وجہ سے مسلمان ایک نہایت بڑے مدبّر کی رہنمائی سے محروم ہوگئے۔ سرسید کی وفات کے بعد پنجاب سے لیکر مدراس اور بنگال اور بمبئی کے سب مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے متفق اور متحد کرنے کی تدبیر نواب محسن الملک ہی کا حصہ تھا۔ سال گزشتہ کا ڈپوٹیشن جس میں کل ہندوستان کے مسلمانوں کے سربرآوردہ لیڈر اور قائم مقام شامل تھے۔ ایک ماہ کے اندر ترتیب دیکر اُسکو شملہ تک پہنچا دینا یہ نواب

محسن الملک ہی کی کوشش اور تدبیر کا نتیجہ تھا

ایم اے او کالج علی گڑھ کو وہ ترقی جو سرسید کے بعد ہوئی اُس میں سب سے بڑا حصہ نواب محسن الملک بہادر کا ہی۔ سرسید کی وفات سے اسوقت کالج ہر بات میں دوچند ترقی کی حالت میں معلوم ہوتا ہی۔ طالب علموں کی تعداد یقیناً دوچند سے زیادہ ہی لیکن مالی حالت بھی دوچند سے کم نہیں ہی۔ اس پیرانہ سالی میں نواب محسن الملک کا کبھی لاہور۔ کبھی رنگون۔ کبھی مدراس کبھی بمبئی اور کبھی بنگال ڈپوٹیشن لے کر جانا۔ اور سرسید میموریل فنڈ اور دیگر فنڈوں کے لیے چندے جمع کرنا یہ وہ کوشش تھی کہ جسکا موقع خود بانی کالج کو نہیں ملا تھا اور جس کام کو نواب محسن الملک مرحوم نے پورا کیا۔ آج ایم اے او کالج کے سر سے ایک نہایت شاندار اور مرصع تاج اُتر گیا ہی اور وہ ماتمی لباس پہنے نہایت مغموم حالت میں قوم کے سامنے کھڑا ہی۔

آج نواب محسن الملک کی وفات سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی کشتی بھی بے ناخدا کے ہوگئی ہی اور اگر قوم نے اسکو کوئی اچھا ناخدا نہ دیا تو وہ بھی ضرور ڈگمگاے گی۔ آج نواب محسن الملک کی وفات کی وجہ سے سرسید میموریل فنڈ بے سر ہوگیا اور آیندہ اُس کی کامیابی اور تکمیل میں بہت کچھ دقتیں معلوم ہو رہی ہیں۔ غرضکہ جس پہلو اور نہج سے ہم دیکھتے ہیں نواب محسن الملک کی وفات ایک نہایت ڈراونی اور بھیانک بیکسی کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہی۔

نواب محسن الملک بہادر کی وفات کے متعلق اخبارات میں اس سے پیشتر بہت کچھ چھپ چکا ہی لیکن مختصر طور پر ہم بھی لکھنا چاہتے ہیں کہ نواب محسن الملک کس حالت میں اور کہاں پر اس دنیا فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی میں پہونچے۔ نواب محسن الملک بہادر کے دل پر گزشتہ فروری کے واقعات کالج نے ایک نہایت گہرا اثر پیدا کیا تھا اور اُس زمانے میں بعض موقعوں پر یہ معلوم ہوتا تھا کہ نواب محسن الملک اب بہت دنوں تک زندہ نہ

نہیں گئے۔ ایک خاص موقع پر جبکہ تحقیقات کمیشن ہورہی تھی وہ جلسے سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں آئے اور وہاں آکر ایک آرام کرسی پر ٹھنڈے سانس بھرتے ہوئے گر گئے اور کہنے لگے کہ بیٹے بی اس کم بخت دل میں زخم پڑے تھے اب اُن زخموں پر . . . اور نمک چھڑک دیا۔ اب ہم زندگی سے تنگ آگئے ہیں اسکے بعد سے پھر وہ ٹرسٹیوں یا کالج کے کسی جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ بمبئی تشریف لے گئے وہاں جاتے ہی بیمار ہوگئے۔ وہاں سے خاکسار اڈیٹر کو وقتاً فوقتاً نوازشنامے مرحمت فرماتے رہے۔ چنانچہ سب سے اخیر خط جو اُنھوں نے بمبئی سے لکھا تھا اُس میں ہم کو اُنھوں نے گورنمنٹ کے اُس خطبہ کی بابت مبارکباد دی تھی جو نارمل اسکول کے لیے ملا ہی۔ یکایک یہ خبر سُنی کہ نواب صاحب بوجہ علالت اپنے بڑے بھائی صاحب کے یہاں اٹاوہ پہنچے وہاں پر اُنکے بھائی صاحب کا انتقال بھی ہوگیا۔ پھر وہاں سے شبرات کے روز علیگڑھ آئے۔ اُن کی حالت دیکھکر اُن کی زندگی سے قطعی مایوسی ہوتی تھی۔ شب کو آفتاب احمد خانصاحب کے مکان پر ہم سب نے ایک جگہ ملکر کھانا کھایا۔ نواب صاحب نے مشکل سے ایک ڈبل روٹی کا ٹکڑا کھایا۔ چہرے پر آثار ضعف اور ناتوانی بالکل نمایاں تھی۔ اور نیچے کے دانت بھی گر گئے تھے۔ ایسی حالت میں اُنھوں نے سفر شملہ کا قصد کیا کہ لکھنؤ سے ہوکر ۲۷۔ ستمبر کو شملہ پہنچنا ہی۔ اُن سے کہا گیا کہ ایسی حالت میں سفر مناسب نہیں ہی۔ لیکن اُنھوں نے فرمایا کہ ممکن ہی شملہ کی آب وہوا سے فائدہ ہو اور نیز ۲۰۔ تاریخ پر پرائیویٹ سکرٹری حضور ویسرائے سے ملاقات کی مقرر ہوگئی ہے جانا ضروری ہی۔ یہاں سے تشریف لے گئے وہاں پہونچتے ہی کچھ دنوں کے بعد بیمار ہوگئے۔ خاکسار کے تار کے جواب میں نوابصاحب کا خود دستخطی خط آیا کہ سرخ باد کی بیماری ہوگئی ہی جو پہلے بھی ہوجایا کرتی تھی اور امید ہی کہ صحت ہوجائیگی۔ یہاں سے ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب اُنکے قدیم معالج بھیجے گئے۔ لیکن موت کا علاج سوائے مرنے کے اور کچھ نہیں ہی۔ اور خدا کے احکام کے سامنے

انسان کے دعوے ہیچ ہیں - ۱۶- اکتوبر کو بروز بدھ وہ شاندار لیڈر جسپر ہر قومی بات میں ہم کو بھروسہ تھا ہم کو چھوڑکر دنیا سے چلدیا - انا للہ وانا الیہ راجعون -

نواب صاحب مرحوم کی وفات کی نسبت خاکسار کو سب سے اول اخبار ٹائمز آف انڈیا کے تار سے بمبئی میں اطلاع ملی اُس میں یہ بھی لکھا تھا کہ نواب صاحب مرحوم اٹاوے میں دفن کیے جاوینگے - میں نے اُسی وقت بیگم صاحبہ کو ایک تار دیا کہ نواب صاحب علی گڑھ میں سرسید کے پاس کیوں نہیں دفن کیے جاتے اٹاوے میں کیوں دفن کیے جاتے ہیں - یہاں پر علی گڑھ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خانصاحب وحاجی موسیٰ خانصاحب ودیگر ٹرسٹی موجود تھے - اُنھوں نے بھی بیگم صاحبہ کو تار دیے اور باوجود اصرار بعض رشتہ داروں کے بیگم صاحبہ کی اجازت لیکر نواب صاحب مرحوم کو سرسید کے داہنے ہاتھ پر سب سے قرب میں دفن کردیا - یہی جگہ اُنکے لیے موزوں تھی - اور جن لوگوں کے نزدیک اُن کو اُنکے خاندانی مدفن میں دفن ہونا چاہیے تھا وہ بھی چند سال کے بعد شکرگزار ہونگے کہ ایسے بڑے شخص کے لیے علی گڑھ اور سرسید کا قرب تجویز کیا گیا - جمعہ کے روز بعد نماز کے نواب صاحب دفن ہوئے -

اُسی رات کو سید امیر حسن صاحب - برادر حقیقی نواب صاحب مرحوم اور سید علی حسن صاحب چچازاد بھائی حیدرآباد سے اور اندور سے تشریف لے آئے - آگرہ روڈ پر خاکسار اِن دونوں صاحبوں سے ملا - ان کو ہمراہ لیکر علی گڑھ آیا - یہاں آکر اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ نواب صاحب دفن ہوگئے - ہم تینوں رات کو ساڑھے گیارہ بجے کالج پہونچے - مرحوم کی قبر پر فاتحہ پڑھی - اوران دونوں صاحبوں نے بالاتفاق فرمایا کہ جو کچھ ہوا نہایت مناسب ہوا - اور یہ کہکر وہ اُسی وقت گاڑی میں بیٹھکر واپس

اٹاوہ چلے گئے۔

مرحوم کے گو کوئی اولاد نہیں ہے۔ لیکن ایسے ہمدردوں اور بہی خواہان قوم کی وارث خود قوم ہوتی ہے۔ نواب محسن الملک کا ماتم کرنے والی بھی اسوقت قوم ہی ہے۔ اُن کی بیگم صاحبہ ہنوز حیدرآباد ہی میں ہیں۔ اور سُنا ہے کہ اُن کی صحت بھی اچھی نہیں ہے۔ ہم کو اُن سے نہایت ہمدردی ہے خدا اُن کو صبر اور صحت عطا فرمائے

ید بیضا

یعنی اُردو کا ایک دلچسپ اور مفید ماہواری رسالہ

ہندوستان انقلاب کی حالت میں ہے اور مختلف گروہ مختلف میلان رکھتے ہیں اسلیے ہمنے اپنے رسالے کی وہ پالیسی رکھی ہے اور وہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ ہمارا رسالہ میانہ روی کے لحاظ سے مقبولیت کی صلاحیت اور تمدنی امور پر اعتدال کیساتھ بحث کرنیکی وجہ سے پسندیدگی کی قابلیت رکھتا ہے۔ جس طرح خالص مغربی طرزوں کی پیروی ملک اور قوم کے حسب حال نہیں ہے۔ اسی طرح خالص مشرقی خیالات کا اتباع بھی ترقی کے میدان میں کوتاہی پیدا کرنیوالا ہے۔ ہمنے ان دونوں کے درمیان مناسب اعتدال کرنیکی کوشش کی ہے جس سے ہم کو امید ہے کہ ہم ملک اور قوم کیلیے زیادہ مفید ثابت ہو سکینگے مگر اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمنے ملک کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو نظر انداز نہیں ہونے دیا ہے اور ہمارے رسالے کے وہ مضامین جو تبدیل شدہ سوشل حالات اور مابہ النزاع تمدنی مسائل کے متعلق ہیں ہمارے لیے مایۂ فخر ہیں۔ تمام تمدنی اور سوشل اور فلسفیانہ اور تاریخی اور اخلاقی اور ادبی و تنقیدی مضامین جو ہمارے رسالے میں شائع ہوتے ہیں انمیں اُس صفائی زبان اور پاکیزہ خیالات کا پورا خیال رکھا جاتا ہے جو اس ترقی زمانے کے شایان ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ یہ مضامین ہمارے اہل ملک کی وسعت معلومات اور ترقی مذاق میں امداد کر سکینگے اور اُردو داں پبلک کے سامنے یورپین تہذیب اور ایشیائی تعلیم کے باہمی میل جول سے جو گراں بہا جواہرات علمی پیدا ہوئے ہیں اُنھیں کوڑیوں کے مول پیشکش کرینگے۔ اُردو داں پبلک کی تعداد ملک میں اسقدر زیادہ ہے کہ اُردو کے بلند پایہ رسائل کا بہت بڑے پیمانے پر ملک اور قوم کے لیے مفید ہونا صرف ملک کی ادنیٰ توجہ پر منحصر ہے۔ خاصکر اُس صورت میں جبکہ رسالے کے مقاصد میں ذاتی منفعت کا خیال شامل نہو بلکہ یہ کوشش ہو کہ جسقدر رسالے کی مالی حالت میں ترقی ہوتی جائے اُسیقدر اسکو ملک کیلیے زیادہ مفید بنانے میں سعی موفور سے کام لیا جائے اور چونکہ ہمارا بالکل یہی اُصول ہے لہٰذا ہم امید کرتے ہیں کہ ہم بہت جلد اس رسالے کے ذریعے سے ملک کی اہم خدمت انجام دے سکینگے۔

شرح قیمت سالانہ۔ قسم اول عمدہ دبیز کاغذ پر ے۴ قسم دوم معمولی کاغذ پر عہ۴ر

المشتہر حکیم سید محمد سعید خنجر اڈیٹر و مینیجر مقام سکندرآباد ضلع بلندشہر

اعلان

اس رسالہ کی قیمت نظر بر حال موجودہ (سے/) سالانہ رکھی گئی ہے۔ اور ششماہی (عہ۱۲) فی پرچہ (۵/)

تمام درخواستیں بنام شیخ محمد عبداللہ صاحب بی اے ایل۔ ایل۔ بی۔ وکیل ہائی کورٹ علیگڑھ آنی چاہییں

قیمت ہر حال میں پیشگی لیجائیگی۔

جملہ مضامین اڈیٹر کے پاس آنے چاہییں۔

دریافت طلب امور کے لیے جوابی پوسٹ کارڈ یا ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۲۷۱

خاتون

جلد ۴ | ماہ رمضان المبارک ۱۳۲۵ھ مطابق نومبر ۱۹۰۷ء | نمبر ۱۱

اڈیٹر شیخ محمد عبد اللہ بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی سکرٹری تعلیم نسواں سکشن

فہرست مضامین

علی محمد خاں کے اہتمام سے
مطبع فیض عام علی گڑہ میں طبع ہوا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۴ صفحے کا علیگڑھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہی اور اسکی سالانہ قیمت (عـ۱) اور ششماہی عـ۱۲ ہے

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہی یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہی اور جبتک مرد اس طرف متوجہ ہونگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہو رہے ہیں اُس کی طرف ہمیشہ مردوں کو متوجہ کرتے رہینگے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ و اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی اُنکو ضرورت محسوس ہو تاکہ وہ اپنی اولاد کو اس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہی معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالے کی مدد کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہی اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اُس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر استانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائیگا۔

۷۔ تمام خط و کتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علیگڑھ ہونی چاہیے۔

سفرِ رانچی

ہماری معزز لیڈی نامہ نگار مس امراؤ بیگم صاحبہ پانی پتی نے اپنے سفرِ رانچی کے نہایت دلچسپ حالات قلمبند کر کے ناظرین خاتون کے سامنے بطور ایک عمدہ تحفے کے پیش کیے ہیں۔

جب کوئی کسی دور دراز ملک کے سفر کے لیے جاتا ہے تو عزیز دوست اور ملاقاتی اُس سے کسی تحفے کی توقع رکھتے ہیں۔ مس امراؤ بیگم صاحبہ پر بھی قدیم رسم کے موافق ناظرین خاتون کے لیے کوئی قیمتی اور عمدہ تحفہ واجب تھا۔ مس موصوفہ نے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔

ہم مس امراؤ بیگم صاحبہ کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُنھوں نے خاتون کی ترقی کا ساتھ دیا اور آج وہ خاتون کی ایک عمدہ نامہ نگاروں میں سے ہیں اور امید ہے کہ اگر اپنی مضمون نگاری کی مشق جاری رکھیں گی اور اُسکے ساتھ اپنے تعلقات بڑھاتی جائینگی تو ایک وہ زمانہ بھی آئیگا کہ وہ ہندوستان کی مشہور لیڈیوں میں شمار ہوں گی۔

مس امراؤ بیگم کے اس مضمون میں کوئی عجیب بات نہیں ہے لیکن اُنکی قوت تحریر اور مشاہدہ

اس درجے کو پہونچگئی ہے کہ اُنھوں نے معمولی ریل کے سفر کو اور ایک جنگلی قوم کے حالات کو دلچسپ بنا کر دکھایا۔ ایک مضمون نگار میں اور کوئی خوبی نہیں ہے بجز اسکے کہ وہ جس امر پر قلم اُٹھائے اُسکے کل حالات اور ہر پہلو پر سلسلہ ترتیب اور خوش اسلوبی کے ساتھ لکھ سکے۔

ہماری لیڈی ناظرین کو چاہیے کہ وہ امراد بیگم سے اس بارے میں سبق حاصل کریں۔

اڈیٹر

اڑاؤں اور منڈا قوم کے حالات

تیاری سفر ادہر آنے کے لیے ہم عرصہ سے تیاریاں کر رہے تھے، مگر اول تو بھابی خورشید بیگم مرحومہ کی علالت اور بعد میں اُنکے بیوقت انتقال نے ہم لوگوں کو ایسا پژمردہ کر دیا کہ وہ خواہش اور شوق جو پہلے دلوں میں موجزن تھا اب نام کو بھی نہ رہا تھا، بلکہ پانی پت چھوڑنے کے خیال سے طبیعت کو کسی قسم کی خوشی کا احساس نہ ہوتا تھا، مگر اب بھائی صاحب عبدالقادر خاں نے باصرار ہم کو اس سفر پر آمادہ کر ہی لیا۔ اُنکے اصرار سے ہم تیار تو ہو گئے مگر نہایت حسرت بھرے ہوئے دل کے ساتھ؛ اپنے اعزا اور اقربا سے جدائی کے خیال کے علاوہ رہ رہکر مرحومہ کا خیال آتا تھا، چار و ناچار نہایت سوگوار دل کے ساتھ۔ ستمبر کو دن کے پانچ بجے کی گاڑی میں سوار ہونے کی غرض سے اسٹیشن پر پہنچے؛ سہیلیاں وغیرہ الوداع کہنے کے لیے اسٹیشن تک ہمراہ آئیں، چشم پرنم کے ساتھ گلے لگا خداحافظ کہہ ٹرین میں سوار کرا دیا، اور جب تک گاڑی نظر سے غائب نہوئی وہ ڈولی میں بیٹھی بیٹھی جھانک جھانک کر ہم کو الوداع، الوداع کہتی ہونگی؛ اور جب اپنے احباب و اقربا نظروں سے بالکل غائب ہو گئے اور جھک کر جھانکنے سے بھی نظر نہ آسکے تو ہم مجبوراً صبر کر کے بیٹھ رہے؛ گو سفر کی خوشی تھی مگر بھابی مرحومہ کی یاد بار بار ستاتی تھی۔

پانی پت سے روانگی چونکہ ہم لوگوں کے لیے یہ سفر نہایت دور دراز کا تھا، گویا وطن سے کاسے کوسوں جا رہے تھے، اسلیے اس سفر میں بہت سی باتیں ایسی دیکھنے میں آئیں

جو ہم کو نہایت عجیب معلوم ہوئیں اور اس خیال سے کہ شمالی ہند کی بہنوں کو بھی نہایت عجیب معلوم ہونگی، ہم مستورات کا پنجاب سے وسط بنگال جانا گویا کہ ہندی دنیا کے اس سرے سے دوسرے سرے تک جانا ہی اسلیے مجھکو جرأت ہوئی کہ اس سفر کے حالات قلمبند کر کے آپکے خدمت میں بھیجوں، اور چنداں پُر فضا گھنے جنگلوں اور سرسبز پہاڑوں کا حال جن کی چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور جنکے نشیب و فراز انسان کے لیے مجسم سبق ہیں اور جن کی بلندی انسان کو انکے خالق کی یاد دلاتی ہی اور جنکے بلورین چشمے دل میں گدگدیاں اُٹھاتے ہیں جنکی سیر کے لیے عموماً ہر ایک زندہ دل شخص کا دل لوٹتا ہی تحریر کروں۔

مغل سرائے تک ہم کو کسی کی زبان سمجھنے میں چنداں دقت نہ ہوئی مگر آگے بڑھکر کثرت بنگالی زبان ہی سُنی گئی جو مطلق ہم لوگوں کی سمجھ میں نہ آئی؛ آرہ سے کسی معزز بنگالی کی بیوی ہم لوگوں کی ہمسفر ہوئیں، ہم دونوں اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ حسب معمول ایک دوسرے سے تعارف پیدا کریں مگر مشکل تو یہ تھی اور ہم کو اسپر کسی قدر تعجب بھی ہوا کہ وہ تو کچھ نہ کچھ ہماری زبان سمجھ بھی لیتی تھیں مگر جب کبھی وہ کچھ کہتیں تو ہم سوائے چند الفاظ کے اور کچھ نہ سمجھ سکتے تھے، تاہم وہ ہم لوگوں سے نہایت اخلاق سے ملیں اور آرہ سے آسن سول تک سفر اچھی طرح کٹا؛ ۳ بجے شب کے آسن سول پہنچے، یہ اسٹیشن کلکتہ سے تقریباً ایک سو میل گوشۂ شمال و مغرب میں واقع ہی، شہر تو کچھ بڑا نہیں ہی مگر اسٹیشن نہایت بارونق ہی۔ چونکہ ہمیں یہاں گاڑی تبدیل کرنی تھی اسلیے بنگال ناگپور ریلوے کے جس میں ہم کو سفر کرنا تھا وٹینگ روم میں گئے۔ اس لائن کی نہ تو گاڑیاں آرام دہ ہیں او نہ وٹینگ روم ہی اچھے ہیں، بڑی دقت یہ ہی کہ یہاں گورنمنٹ نے کسی کمپنی کو ریفرشمنٹ (کھانا وغیرہ) کا ٹھیکہ نہیں دیا ہی، بلکہ خود انتظام کرتی ہی، یہ انتظامات تو ایسٹ انڈین ریلوے لائن پر ہی نہایت عمدہ ہیں، گو کسی قدر زیادہ قیمت خرچ کرنی پڑتی ہی مگر کلنر کے ہاں کھانیکی ہر ایک قسم کی چیز ہر وقت تیار ملتی ہے، یہ سہولیت اس لائن پر نہیں؛

ایک بنگالن ہمسفر ہوئیں

اسن سول کا جنکشن اسٹیشن یہاں پربہت سے انجن بلکہ انجن خانہ دیکھا، سینکڑوں کل کے انجن تھے، چونکہ اس اسٹیشن کا انجن گھر دنیا کے مشہور ترین انجن گھروں میں سے ہے، اسلئے یہاں چھوٹے بڑے چار پہیہ والوں سے لیکر آٹھ پہیوں والے انجنوں کی ایک کثیر تعداد ہر وقت موجود رہتی ہے، ان کی چیخ و پکار نے اسٹیشن سر پر اُٹھا رکھا تھا ہمنے چاہا کہ آرام کریں مگر ویٹنگ روم کے دروازے بند کرنے پر بھی کمرہ برابر گونجتا رہا۔ یہاں سے ہم ۹۔ ستمبر کو ۸ بجے صبح کی گاڑی سے سوار ہوکر اوراپ پہنچے، یہ اسٹیشن چھوٹا جنکشن ہے، مگر نہایت خوبصورت پہاڑ کے دامن میں واقع ہے، ہم کو چونکہ یہاں بھی گاڑی تبدیل کرنی تھی، اُترنا پڑا، کچھ دیر انتظار کیا ویٹنگ روم میں پڑے رہے وہیں ناشتہ کیا، مگر یہاں پہنچکر یہ خبر ملی کہ رستہ خراب ہے اور ایک جگہ سے لائن پانی کے زور سے ٹوٹ کر بہ گئی ہے اسلئے کچھ دور تک پیدل چلنا ہوگا، اور پھر دوسری جانب نئی گاڑی میں سوار ہونا ہوگا، اتنے میں پورسیہ جانے والی گاڑی تیار ہوگئی جھٹ پٹ سوار ہوکر روانہ ہوئے؛ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں، گھاٹیوں کا تنگ رستہ، گاڑی کا چکر کھاکر سانپ کی طرح لہراکر چلنا لطف دکھا گیا؛ چڑھائی تو اسن سول کے آگے سے ہی شروع ہوگئی تھی، یہاں رفتہ رفتہ بعض جگہ کچھ تو چڑھائی کی وجہ سے اور کچھ برسات کی بارشوں سے لائن کے کمزور ہوجانے کی وجہ سے ٹرین نہایت سست پڑجاتی تھی، گویا پٹریوں پر تھی اور آہستہ خرام بلکہ مخرام کے مقولے پر چل رہی تھی، پہاڑ و سبزہ گھومتا ہوا اور دوڑتا نظر نہیں آتا تھا بلکہ نہایت اطمینان سے اس کی طراوت سے آنکھوں کو ٹھنڈا کرسکتے تھے؛ ان پہاڑیوں کی دل خوش کن دھیمی دھیمی ہوا کھارہے تھے، ٹرین خراماں خراماں جارہی تھی، اور ہم یہ لطف اُٹھارہے تھے پچھلی کوفت سفر کو بھلانے بیٹھے تھے اور خوش ہو رہے تھے کہ یہ گھائیں گھائیں جو تیس چالیس گھنٹے سے دماغ کو تکلیف دے رہی تھی اب ختم ہوجائیگی کہ یکایک جنگل بیابان میں گاڑی ٹھہر گئی

پیدل سفر اور گارڈ نے آکر کہا آپ کو یہاں اُترنا ہوگا اور قریب نصف میل چلکر دوسری گاڑی میں سوار ہونا ہوگا کیونکہ پٹری بارش کے پانی سے بہ گئی ہے، مسافروں نے اُترنا شروع

کیا اور اسباب کاندھوں پر لاد سلیپروں کے عارضی پل پر گزرنے لگے؛ ہماری گاڑی میں چند انگریز اور ایک صاحب کلکتہ کے سوار تھے ہم ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے کہ اسباب کا کیا کیا جائے، خیر ہم تو برقعہ پہنکر چلنے لگے مگر اس سُن سان جنگل میں اسباب کے لیے قلی کہاں؛ اور ادھر اگلی ٹرین کے چھوٹنے کا وقت آن پہنچا۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی، مگر نیک دل گارڈ نے فوراً چار قلی جو امداد پر لگے ہوئے تھے پکڑ کر ہم لوگوں کی نذر کیے، پھر تو کل اسباب ہاتھوں ہاتھ پہنچگیا مگر ہم تھوڑی ہی دور چلکر ہانپ گئے پسینے سے بھیگ گئے، ہاتھ سے کیش بک چھوٹنے لگا، پاؤں من من بھر کے ہو گئے رکھتے تو تھے سامنے مگر پڑتے تھے دائیں بائیں، خیر جوں توں کر کے ٹرین تک پہنچنے کی امید تو ہوئی مگر جب ہم ابھی ٹرین سے بیس گز کے فاصلے پر ہی تھے کہ ٹرین نے سیٹی دیدی کیونکہ سوائے ہمارے سب مسافر بیٹھ گئے تھے، اب تو اور بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے، لیکن بھائی صاحب نے وہیں سے ٹوپی اُتار کر اشارہ کیا۔ جسپر گاڑی ٹھہرالی گئی اور ہم خدا خدا کر کے سوار ہوئے، ہم لوگوں کے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی خدا کا شکر ادا کیا اب ٹرین پورنیہ پہنچکر ٹھہرے گی۔ اطمینان سے بیٹھکر پسینہ خشک کرنا شروع ہی کیا تھا کہ ٹرین پھر تھوڑی سی دور جا کر یک لخت ایسے ہی جنگل میں ٹھر گئی ہم سب کے مُنہ فق اور کلیجے دہک ہو گئے کہ اب کیا افتاد پیش آئے گی، مگر ایک ہی منٹ میں معلوم ہو گیا کہ گارڈ صاحب اپنی لفٹنٹی باسکٹ بھول گئے ہیں اسکو لینے کے لیے ٹرین ٹھرالی گئی ہے، پھر تو ہم خوب ہنسے کہ گارڈ صاحب کیا ہیں ایک جہاز مست کے ناخدا ہیں یا بڑھیا کا چرخہ ہے کہ اول تو چلتا ہی رُوں رُوں کر کے ہے اسپر طرہ یہ کہ دو چکر دیے اور ٹھرالیا، واللہ ہنستے ہنستے آنتوں میں بل پڑ گئے۔ اتنے میں بارہ بجے پورنیہ پہنچے اور فوراً ہی ڈاک بنگلہ میں جا کر دم لیا؛

پورنیہ ایک نہایت سرسبز شہر پہاڑی کے دامن میں آباد ہے اور چڑھائی سخت ہے یہ ایک ایسا پڑاؤ ہے جیسا شملے جانے کے لیے کالکا، چونکہ یہاں سے رانچی تک ریل نہیں ہے،

پش پش میں سوار ہوئے

سڑک تو بن چکی ہی مگر ۱۲۔ نومبر کو کھلیگی اسلیے یہاں سے مسافروں کو ایک گاڑی جسے یہاں پش پش کہتے ہیں اور جسکو آدمی کھینچتے ہیں لینی پڑتی ہی یہ گاڑی چھوٹی سی شکرم کی شکل کی ہے جس میں مشکل سے دو یا تین مسافر بیٹھ سکتے ہیں، اسکو کم از کم نصف درجن قلی کھینچکر لیجاتے ہیں، ہمنے جلد پہنچنے کی غرض سے دو دو قلی اور بڑھا لیے تھے مگر بعض مقامات پر اسقدر چڑہائی ہے کہ یہ آٹھ بھی ہم کو نہ کھینچ سکے حالانکہ اسباب کچھ نہ تھا وہ علیحدہ پش پش میں آتا تھا لیکن سڑک خراب ہونے کی وجہ سے بعض جگہ ہمکو اترنا پڑتا تھا، اسپر بھی خوف تھا کہ گاڑی کہیں کھڈ میں نہ جا پڑے، کیونکہ کھڈونکی طرف جنگلے بنے ہوئے نہیں ہیں، مگر ریل کے جلد چلنے کے خیال سے خوشی ہوتی ہی، معلوم نہیں کہ ہمیشہ آنے جانے والے شخص ایسے راستوں سے اس آدمیوں کی کھینچنے والی گاڑی میں کیسے سفر کرتے ہیں، اگر یہ شاداب جنگل اور سرسبز پہاڑ و بلورین چشمے نہ ہوتے تو یہ سفر ہمارے لیے ایک ناقابل برداشت مصیبت ہو جاتا، صرف یہی پہاڑوں کے دلکش مناظر تھے۔ جنھوں نے ہمارے سفر کو دلچسپ بنا رکھا تھا، گو پش پش میں ہڈیوں کا چکنا چور ہو گیا تھا مگر یہ سین ہم کو سب کوفتیں بھلا رہے تھے، دامن کوہ میں بے شمار درخت ایک سے ایک منہ جوڑے ایک ٹانگ کے سنتری بنے نظر آتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صانع حقیقی کی حمد گا رہے ہیں یا ان کی ایک محفل ہو رہی ہی جس میں یہ پھولوں اور سبز پتوں کی پوشاک پہنے ناچ رہے ہیں، چھوٹے چھوٹے درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ رنگ برنگ پھولوں سے لدے ہوئے ایسے معلوم ہوتے تھے کہ لیڈیوں کا ایک مجمع ٹوپیاں پہنے بیٹھا ہی، انکے اندر نہایت چھوٹی چھوٹی خمدار چشمے جاری ہیں، اس سرسبز گھنے جنگل میں اس چلتے ہوئے پانی کی آواز نہایت ہی سُریلا راگ سا معلوم ہوتی تھی؛

چونکہ یہ لطف ریل میں حاصل نہیں ہو سکتا اسلیے ہم ایسے کئی مقاموں کے چشموں پر کئی کئی گھنٹے ٹھیرے اور اسکے کناروں پر ٹہل کر صانع حقیقی کی صنعت پر غور کرتے اور اُس کی ان عنایتوں کا شکریہ ادا کرتے، ان چشموں کا شیریں اور ٹھنڈا پانی پیتے، غرض اس آب پنواں

کے سُریلے راگ کی خوب ہی بہار لوٹتے اور متاثر ہوتے؛ مگر یہ منظر ہر جگہ نہیں، بعض جگہ پہاڑ محض خشک اور چٹانیں گنجوں کے سروں کی طرح سبزی سے بالکل معرا ہیں، ان کی مہیب صورتیں نظر آتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانے نے انکو گھسا گھسا کر ان کی تر و تازگی چھین لی ہے۔

پورنیہ اور رانچی کے درمیان پانچ پانچ میل کے فاصلے پر ڈاک بنگلے بنے ہیں یہ ایک آرام کی چیز موجود ہے مگر کھانے کا انتظام نہیں کیا گیا صرف ایک چوکیدار رہتا ہے، ہم صبح و شام ناشتہ اور دوپہر و رات کو کھانے کے لیے وہیں ٹھیرتے اور ذرا آرام کرکے پھر پش پش میں سوار ہو جاتے، قلی دن رات چلتے رہتے معلوم یہ لوگ پتھر کے یا لوہے کے بنے ہوئے ہیں تکان تو انکے پاس کو نہیں پھٹکی، دن رات آہستہ آہستہ چلتے رہے نہایت ہی سخت ہڈی رکھتے ہیں؛ یہ لوگ اپنے آپ کو "منڈا" اور "اراؤں" نسل کے بتاتے ہیں۔

منڈا اور اُڑاؤں قوم کے حالات

یہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کی نسل میں سے ہیں اس دیس میں چاروں طرف یہی لوگ آباد ہیں؛ جب آریوں کے گروہ کے گروہ شمال ہند سے وسط ہند کی طرف بڑھے تو یہاں کے قدیم باشندوں کو پہاڑوں کی طرف بھگا دیا اور وہ خود وہاں آباد ہو گئے، یہ لوگ وہاں سے بھاگ کر یہاں آ بسے ہیں اب یہ یہاں کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں؛ تواریخ ہند میں یہ قوم کول قوم کے نام سے موسوم ہے۔

نسل کول کی موجودہ طرز معاشرت

ہندوستان کی قدیم رسوم ان میں ابتک مروّج ہیں اور چار ہزار برس قبل کی زندگی اور مذاہب ان میں ابتک موجود ہیں، گو ان لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے عیسائی مذہب قبول کر لیا ہے لیکن اُنکے اطوار انکا لباس اُن کی طرز معاشرت اُن کی رسوم الغرض اُن کی ہر بات ویسی ہی ہے جیسے کہ اُن لوگوں کی جو ابتک اپنے آباؤ اجداد کے مذہب پر قائم ہیں، اُن کی زندگی کھیت، شراب اور ناچ میں گزرتی ہے یہ لوگ قریب قریب سب کے سب زراعت پیشہ ہیں اور دن بھر اپنی کھیتی باڑی میں مصروف رہتے ہیں شام کو کھیت سے آکر گاتے ہیں شراب پیتے ہیں؛ اسقدر کثرت کے ساتھ شراب پینے والی قوم

ہندوستان میں شاید ہی کوئی دوسری ہو، یہانتک کہ شراب کو ان لوگوں کے لیے جزو زندگی خیال کرکے گورنمنٹ نے ان کو ایک خاص قسم کی شراب جسکو یہ لوگ ہنڈیا کہتے ہیں خود تیار کرنیکی اجازت دے رکھی ہے، مگر یہ اجازت صرف منڈا اور اوڑاوں لوگوں تک محدود ہے، شام کو شراب اور کھانے پینے سے فارغ ہوکر انکے مرد اور عورتیں ایک کھلی جگہ میں جمع ہوتے ہیں اور دس دس بارہ بارہ کی جماعتیں سی بناکر جس میں کنوارے لڑکے اور کنواری لڑکیاں علیحدہ اور شادی شدہ مرد اور عورتیں علیحدہ ملکر اور ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالکر ڈھول کے ساتھ ناچتی اور گاتی ہیں؛ انکے ناچنے اور گانے کا طرز بھی بہت کچھ انگریزی ناچ سے ملتا ہے، جسکو بال کہتے ہیں اور میں نے سنا ہے کہ انگریز انکے گانے کو بہت پسند کرتے ہیں اور نہایت شوق سے دیکھتے اور سنتے ہیں، ماہ نومبر میں انکا تہوار ہوتا ہے جو انُ کے ہاں

کول قوم کے عجیب تہوار

سب سے بڑا ہے۔ اسکو یہ لوگ "کول جاترا" کہتے ہیں اس میں بھی تمام گاؤں کے مرد عورتیں بچے وغیرہ سب باہر نکلکر ایک کھلے میدان میں ملکر شراب پیتے ہیں اور ناچ گانے سے اپنے تہوار کو مناتے ہیں، ہر تین سال کے بعد انکا ایک خاص تہوار آتا ہے جو واقعی نہایت عجیب و غریب ہے، اس موقع پر گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں ہاتھوں میں بڑے بڑے لٹھ لیکر اور مردانہ لباس پہن کر باہر نکلتی ہیں اور لاٹھیوں کو زمین پر دے دے مارتی ہیں، اس موقع پر اکثر عورتوں کے جھنڈ کے جھنڈ مردانہ لباس پہنے مختلف جگہوں میں بڑی بڑی لاٹھیوں سے مسلح دیکھی جاتی ہیں اور دیکھنے والا یہ خیال کرتا ہے کہ یہ لوگ کسی دھاوے پر نکلے ہیں یا کوئی سوانگ بھر رہے ہیں؛ اسکے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ کسی زمانے میں مسلمانوں نے ان اضلاع میں سے کسی پر قبضہ کرلیا تھا، یہاں کے راجہ مہاراجے نے انکے نکالنے کی بہت کوششیں کیں مگر مسلمان بدستور قابض رہے، لیکن کچھ عرصہ بعد ایک عورت نے عورتوں کی سپاہ تیار کی اور رات کو مسلمانوں پر جا پڑی اور انکو قلعے سے نکالدیا، معلوم نہیں کہ یہ کوئی تاریخی واقعہ ہے یا افسانہ ہے کیونکہ نہ تو اس قلعے کا نام جسپر ان عورتوں نے

حملہ کیا تھا معلوم ہی اور نہ یہ معلوم ہوسکتا ہی کہ یہ کونسی صدی کا واقعہ ہے، بہرحال یہ تہوار اُنکے ہاں ہر تیسرے سال منایا جاتا ہی؛ یہ تہوار تو خیر عورتوں کے متعلق ہی اور تین سال کے بعد آتا ہے مگر اسکے علاوہ انکے ہاں اور کئی تہوار ہیں، سب سے بڑا اور مشہور تہوار تو نومبر میں کول جاترا ہوتا ہے اسکے حالات مجکو کافی طور پر معلوم نہ ہوسکے مگر اسکے علاوہ ایک اور تہوار بھی ہے جو چند وجوہ سے مجھے زیادہ دلچسپ معلوم ہوا؛ اسکو یہ لوگ "کرما" کہتے ہیں، اور یہ تہوار مسلمانوں کی چھڑیوں اور انگلستان کے "مے پول" سے بہت کچھ ملتا جلتا ہی، مثلاً جاہل مسلمانوں میں چھڑیوں کے موقع پر ایک لمبے سے بانس کو رنگا رنگ کے کپڑوں سے منڈھ کر لوگ اسکے گرد ناچتے ہیں، مگر یہ تہوار جہانتک مجھے معلوم ہی ادنی درجے کے لوگوں میں منایا جاتا ہی، انگلستان میں مے پول اُس وقت میں آتا ہی جبکہ لوگ اس برفانی ملک کی سردیوں سے نکلکر گرمی کے خوشگوار موسم میں داخل ہوتے ہیں، یعنی ماہ مئی میں، جو ان لوگوں کے ہاں ہمارے ہاں کے موسم بہار کے پھل اور پھول کا زمانہ ہوتا ہی، اس زمانے میں انگلستان کے دیہاتوں میں لڑکے اور لڑکیاں لمبے لمبے بانسوں کو طرح طرح کے پھولوں سے مزین کرکے اسکے گرد ناچتے ہیں، کرما بھی بہت کچھ انہیں تہواروں سے ملتا جلتا ہی، اصل یہ کہ کرما ایک درخت کا نام ہی اور اس تہوار کے موقع پر یہ لوگ اپنے مذہبی پیشوا یعنی پاہن کو لیکر اس درخت کے گرد حلقہ باندہکر کھڑے ہوتے ہیں، پاہن درخت پر چڑہتا ہی اور ایک ٹہنی توڑ کر نیچے پھینکتا ہی، ہر شخص اس بات کی کوشش کرتا ہی کہ ٹہنی اُسکے ہاتھ پر پڑے یا کم از کم اُسکا ہاتھ ہی ٹہنی یا اسکے پتوں کو لگ جائے، کیونکہ یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ ٹہنی سال بھر کا رزق ہی، اور جسکا ہاتھ اس ٹہنی کو لگ جاتا ہی اُسکو گویا سال بھر کے لیے پیٹ کی فکر سے نجات ہوگئی، اب یہ لوگ اس ٹہنی کو لیکر نہایت عزت و حرمت کے ساتھ اور ایک جلوس بناکر گاؤں میں داخل ہوتے ہیں جہاں عورتیں اپنے اپنے کھیتوں میں سے اسوقت کی فصل کے کچھ پودے لیکر اس جلوس کا استقبال کرتی ہیں، اس درخت کرما کی شاخ ایک کھلے سے مقام پر زمین میں لگادی جاتی ہی اور عورتیں اپنے پودوں کو

درخت کے گرداگرد لگا کر ایک بڑا سا حلقہ بنا لیتی ہیں، اسکے بعد ناچ اور گانا شروع ہوتا ہے اور رات کے ایک دو بجے تک ناچ رنگ رہتا ہی: اُس دن یہ لوگ روزہ بھی رکھتے ہیں اور جب تک کہ تمام پودے کرما کی شاخ کے گرد جما نہیں دیے جاتے اُسوقت تک کوئی مرد عورت یا بچہ کچھ کھا پی نہیں سکتا۔ اس قسم کے اور بہت سے تہوار ہیں مگر ان تمام تہواروں میں خاص بات ان لوگوں کی ناچ ہے؛ باقی آیندہ

سا اقـــــــما

مس امراؤ بیگم

سنٹرل محمڈن لیڈیز ایسوسی ایشن علی گڑھ

ذیل میں ہم بنت نذر الباقر صاحبہ کا مضمون درج کرتے ہیں۔ بنت نذر الباقر صاحبہ ہمارے ملک کی خواتین میں روشن خیال خاتون ہیں ناظرین کو یاد ہوگا کہ علی گڑھ میں جو ۱۹۱۳ء میں زنانہ کانفرنس ہوئی تھی وہ چند تعلیم یافتہ خاتونوں کی تحریک سے ہوئی تھی اور اُس میں بنت نذر الباقر صاحبہ بھی تھیں۔ لیکن ایک ایسوسی ایشن کی نسبت ہماری قابل بہن سلطانہ بیگم صاحبہ اور سکندر جہاں بیگم صاحبہ اور مسز عبداللہ اور دیگر متعدد خاتون کی ناظرین خاتونوں نے ہمسے کہا اور ہم کو لکھا لیکن ہمنے ہمیشہ یہ خیال کیا کہ جب تک نارمل اسکول کی عمارت تیار نہو جائیں اُسوقت تک علیگڑھ میں باقاعدہ کسی ایسوسی ایشن کا قائم کرنا بہت دقت طلب ہی یہ سبق ہم کو ۱۹۱۳ء کی کانفرنس کے تجربہ سے حاصل ہوا لیکن اب ہماری جوشیلی اور بیدار مغز بہن بنت نذر الباقر صاحبہ نے اس مضمون میں بڑے زور سے سنٹرل ایسوسی ایشن قائم کرنے کی تحریک کی ہی۔ ہم اس تحریک کی بڑے زور سے تائید کرتے ہیں اور جناب بنت نذر الباقر صاحبہ کو امید اطمینان اور یقین دلاتے ہیں کہ ہم انکے ارشاد کی تعمیل کرینگے۔ دراصل ایک ایسوسی ایشن بنام انجمن تعلیم نسواں جس کی سکرٹری سلطانہ بیگم صاحبہ اور

مسز عبداللہ ہیں اور پریسیڈنٹ سکندر جہاں بیگم صاحبہ ہیں وہ سنہ ۱۹۰۲ء سے قائم ہے
چونکہ اُسکے عہدے دار اور ممبر متفرق مقامات پر چلی گئیں اسلیے اُسکے جلسے نہیں ہوئے
لیکن فی الواقع وہ ایک ایسی مفید انجمن ہے کہ ہم چاہتے ہیں حسب تجویز جناب بنت نذرالباقر
صاحبہ اُسکا نام لیڈیز سنٹرل ایسوسی ایشن رکھا جائے چنانچہ اس مضمون کے آنے سے
پہلے جناب سلطانہ بیگم صاحبہ کا خط آچکا ہے کہ اس انجمن کو ترقی دینی چاہیے۔

ایک بات ہم خاص طور پر ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ انجمن تہذیب نسواں لاہور نہایت
مفید اور ضروری انجمن ہے اور ہم اڈیٹر صاحبہ تہذیب نسواں کو مبارکباد دیتے ہیں کہ
اُنھوں نے ایسی مفید انجمن کی بنیاد ڈالی ہم نہیں چاہتے کہ جیسے مردوں کے کاموں میں
اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں ایسے بیبیوں کے کاموں میں بھی اختلافات پیدا ہوں
اور ایک دوسرے کی رقیب زنانہ انجمن قائم ہو بلکہ ہندوستان کے ہر ایک صوبے
میں ایک ایک انجمن کی ضرورت ہے جو ایک دوسرے کی امداد کریں۔ لیکن بلحاظ بہت سے
خیالات کے ہم بنت نذرالباقر صاحبہ کے اس خیال کی تائید کرتے ہیں کہ سنٹرل ایسوسی
ایشن علیگڑھ ہی میں ہو کیونکہ علیگڑھ مسلمانوں کی تعلیم کا ایک ایسا مرکز بن گیا ہے کہ جس کی
طرف کل ہندوستان کے مسلمانوں کی کشش محسوس ہو رہی ہے۔ ہمیں اپنی ملکی
بہنوں میں تعلیم اور روشنی پھیلانے کے لیے اس مرکز اور کشش سے فائدہ
اُٹھانا چاہیے۔

اڈیٹر

فی زمانا جبکہ تعلیم نسواں کے حامی ملک میں پیدا ہو گئے ہیں اور ہر چہار طرف اسکے
انتظام میں مصروف ہیں شاید یہ کہنا بیجا نہوگا کہ اب ہم کو علاوہ اور قسم کی یعنی سکول کی تعلیم
کے بہت کچھ تبادلۂ خیالات کی بھی ضرورت ہے۔ بفضلہ خدا اس وقت میں بہت سی مسلمان لیڈیز
تعلیم یافتہ موجود ہیں جنکے باہمی تبادلۂ خیالات سے اعلےٰ فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔

گو ہماری تعلیم کے حامی مرد بہت کچھ کر رہے ہیں اور کرینگے لیکن جب تک عورات بھی اُنکے ساتھ ساتھ ہو کر مدد نہ دینگی اُن کی تنہا کوشش بے سود ہو گی میں اپنے ان الفاظ کی سچائی میں نظیریں پیش کر سکتی ہوں۔

دیکھو زنانہ نارمل سکول علیگڑہ کو گو اسکے عدم سے وجود میں لانے والے وہی افراد رجال ہیں جو تعلیم نسواں کے حامی ہیں اور انھیں کی ہمت و کوشش سے یہ تجویز عدم سے وجود میں آئی لیکن ذرا بھی غور کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہی کہ اس میں بہت کچھ حصہ اس فرقہ ناتواں کی کوشش کا بھی شامل ہی اور اب بھی اس کی نگرانی و انتظام بہت کچھ اسی کمزور سوسائٹی کی ممبرز کے ہاتھوں میں ہی۔

الغرض سب بات کو اب زمانہ مان چکا ہی کہ جب تک مثل مردوں کے عورات بھی آپس میں ایک دوسرے سے نہ ملیں گی تب تک ترقی نہ کر سکیں گی۔ مردوں کی تعلیم کی اوج کا باعث محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ہی ہے۔

خدا کا شکر ہی کہ اس وقت اس بات پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں رہی کہ "ہمیں ابھی اپنی آیندہ ترقی کی تدابیر سوچنے کے لیے موقع فرصت کا دینا فرض سمجھا جائے" کیونکہ یہ تو دن بدن ظاہر ہو رہا ہی کہ حقیقی ترقی کے بہی خواہ ممبر قوم فیاض دل صاحب عورتوں کو اجازت دے رہے ہیں آپس میں ملنے کی جس کی تازہ نظیریں یہ آئے دن کی پردہ پارٹیز وغیرہ میں اور اس سے کہیں زیادہ دسمبر ۱۹۰۵ء میں معلوم ہو چکا ہی یعنی لیڈیز کانفرنس علیگڈہ میں ایک رکاوٹ تھی وہ اس کانفرنس نے نکالدی۔ بس اب یہی باقی ہی کہ وہ روشن دماغ بیگمات اپنے وقت و توجہ کو ذرا زیادہ صرف کریں اور بجائے بے بنیاد پارٹیز کے ایک ایسی انجمن بنائیں جو ہماری زنانہ سوسائٹی کے ہر ایک پہلو کی اصلاح کنندہ ہو۔ میں قبل اسکے کہ اپنی سنٹرل ایسوسی ایشن کی تجویز پیش کروں اپنی لیڈی ناظرین خاتون کو یہ خوشخبری سُناتی ہوں کہ نومبر سنہ حال میں روشنخیال پنجاب نے (جنکو فرزندان تہذیب ہی کہوں تو مناسب ہے)

وکٹوریہ گرل سکول لاہور میں جمع ہوکر اپنی ایک باضابطہ انجمن قائم کرلی ہے جسکا نام ہے "انجمن تہذیب نسواں پنجاب" بیشک یہ قابل تحسین کام ہے اس انجمن کی سخت ضرورت تھی۔ اب یہ رائے دی گئی ہے کہ لاہور اسکا سنٹر ہو اور دیگر شہروں میں تعلیم یافتہ لیڈیاں برانچز قائم کریں۔

یقین ہے کہ ایسا ہوکر رہیگا اور ضرور ایڈیٹر تہذیب نسواں و مس محمد عمر صاحبہ کی کوشش سے یہ انجمن ترقی پائے گی اور غالباً اس کی شاخیں جابجا قائم ہونگی۔ یہ تو ہوا لیڈیز پنجاب کے لیے ہمارا صوبہ رہا جاتا ہے کچھ اسبابت پر غور کرکے اور کچھ یہ خیال کرکے کہ جب ہمارا سنٹرل زنانہ نارمل اسکول اور رسالہ خاتون ہے۔ غرض ہر ایک چیز کا سنٹر علیگڑھ ہے بلکہ مسلمانان ہندوستان کی قسمت کا دفتر علیگڑھ میں ہے تو نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہماری سوسائٹی کی اصلاح کرنیوالی کوئی انجمن نہو۔ زنانہ کانفرنس چلی جاتی اگر ہم میں اتنی قدرت ہوتی کہ ہر سال جلسے کرسکتے پھر کوئی ضرورت نہ تھی انجمن قائم کرنے کی لیکن چونکہ ابھی اس قدر ہمت نہیں ہے ضرورت ہے ایک زنانہ ایسوسی ایشن کی۔

اسکے لیے زیادہ تعلیم یا کچھ عرصہ انتظار کرنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ علیگڑھ ایسا مقام ہے کہ جسکے گرد و پیش ایک معقول تعداد تعلیم یافتہ بیگمات کی موجود ہے۔ بیگمات لکھنؤ اور بیگمات دہلی و میرٹھ آگرہ وغیرہ وغیرہ ضرور اپنی انجمن کی ہاتھوں ہاتھ مدد کرینگی۔ میرے محدود خیال میں انجمن تہذیب النسواں لاہور سے زیادہ ترقی کریگی ہماری سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن علیگڑھ کیونکہ ایک تو یہ علیگڑھ میں ہوگی جہاں کی کوئی محنت رائگاں نہیں جاتی اسکے خبرگیراں ہمارے سکرٹری صاحب جیسے ہمدرد ہونگے سکول ہمارا یہیں ہے اور دوسرے بہ نسبت پنجاب کے یہاں کے لیے تعلیم یافتہ بیگمات کا ممبری کے لیے آمادہ ہوجانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ یہ بات نہایت قابل افسوس ہے کہ ہماری ایک بھی سنٹرل ایسوسی ایشن نہیں۔ میں یقین کرتی ہوں کہ ضرور بہت سی بہنیں میرے ہمخیال نکلیں گی کیونکہ ایسی ضروری انجمن ابتک حالت عدم میں ہو اور ہمیں چین آئے۔

میں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے اس کی اعلیٰ سے اعلیٰ تجاویز میری روشن دماغ بہنیں کر سکتی ہیں اور مسز عبداللہ صاحبہ و سکندر جہاں بیگم صاحبہ تو یقیناً ضرور ہی حامی ہونگی گو اُنکے ذمہ کام زیادہ ہو جائیگا ابھی سکول ہی ہے پھر ایسوسی ایشن کی بھی اُنکو نگرانی و مدد کرنی ہوگی لیکن وہ ضرور خوشی سے کام اپنے ذمہ لینگی کیا یہ نہایت قابل افسوس امر نہیں کہ معقول تعداد تعلیم یافتہ لیڈیز کی موجودگی میں اُن کی ایک بھی انجمن نہو جہاں وہ باہم ملکر کچھ سوچ سکیں۔ کانفرنس کو تو فی الحال سرے ہوا جانا اور کچھ عرصہ کے لیے اُسے بند کر دینا پڑا لیکن یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے جو کہ تہذیب النسواں کی بہنوں نے ملکر کرلی تو کیا خاتون کی اعلیٰ تعلیم یافتہ ناظرات نہ کر سکیں گی اڈیٹر تہذیب النسواں اس کی بانی ہوئیں جو صنف نازک میں سے ہیں تو کیا ہمارے بیدار مغز سکرٹری صاحب اڈیٹر خاتون ہماری اس سخت ضرورت کو پورا نکرینگے بلا کسی خاص جگہ سب کے جمع ہونے سے کوئی تجویز عمل میں نہیں آسکتی ہے۔ اب بفضل خدا سکول بھی کھلگیا ہے باہر کی بیگمات اسکے دیکھنے کو تکلیف کر کے آتی ہیں ان سب سامان کے ہوتے ہوئے کوئی وقت اس ایسوسی ایشن قائم کر لینے میں نہیں ہے جب ہماری باضابطہ سنٹرل انجمن قائم ہو جائے گی ہم ہر ایک تجویز کو آسانی سے عمل میں لا سکینگے ہر سال بہنیں آپس میں مل سکینگی۔ ہر ایک بات انجمن علیگڑھ میں پیش ہوا کریگی کہ آیا ہونی چاہیے یا نہیں یہ اڈیٹر صاحب خاتون کے اختیار میں ہے کہ کب جلسہ ہونا چاہیے اگر مناسب سمجھیں تو نارمل سکول کے سالانہ امتحان کے موقع پر ایسوسی ایشن کا جلسہ ہو اُسوقت میں بی بیاں سکول کو دیکھ سکیں گی اُس کی حالت رو بہ ترقی یا خدانخواستہ تنزل کا بھی بخوبی امتحان ہوگا اور انجمن کا جلسہ بھی ہو جائیگا۔ یا اور جو وقت مناسب تجویز کر سکیں دیں۔ اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں کہ ہزاروں لیڈیاں شریک ہوں جسقدر بھی ہو سکیں ورنہ علی گڑھ ہی کی بہت ہیں اور غالباً لکھنؤ میرٹھ وغیرہ سے بھی بیگمات تشریف لایا کرینگی۔ اس انجمن کی جو ممبر ہونگی وہ حتی المقدور اپنے اپنے شہروں میں شاخیں قائم کرینگی پھر تھوڑے ہی عرصے

میں سنٹرل محمڈن لیڈیز ایسوسی ایشن کی شاخیں جابجا کھل جائیں گی اور ہر ایک کے لئے طلب امور آسانی سے طے ہوا کرینگے میرے خیال میں تو یہ بہت ضروری ہے۔

ہاں اب یہ خیال ہے کہ کہیں انجمن تہذیب النسواں پنجاب مجھے اپنی مخالف نہ سمجھے ہرگز نہیں میں اُس کی بھی دل سے حامی و مددگار رہونگی لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ انڈین محمڈن لیڈیز کی سنٹرل ایسوسی ایشن نہیں ہوسکتی۔ بجائے خود پنجاب کے سنٹرل انجمن ہے اس کی شاخیں بھی جہانتک خدا قوت دے پھیلیں ہمارے دل سے دعا ہے لیکن انڈین محمڈن لیڈیز کے سنٹرل ایسوسی ایشن علیگڈھ ہی میں مناسب ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کا سنٹر ہے وہیں ہمارا ذاتی سکول ہے۔

اس انجمن لاہور کو چاہیے کہ اس انجمن علیگڈھ کی چھوٹی بہن ہوکر اُس کی مددگار رہے

اخیر میں اپنی روشن خیال بہنوں سے استدعا کرتی ہوں کہ اس طرف توجہ کریں صرف اس مضمون سمجھکر پڑھکر نہ رکھدیں بلکہ جلدی قلم لیکر رائے دیں تھوڑے دنوں بحث کے بعد (بلکہ بحث کی بھی ضرورت نہیں) جلدی ہی انجمن قائم ہوجائے۔

اور عالی ہمت اڈیٹر صاحب خاتون سے التجا ہے کہ اپنی رائے ظاہر کریں اور دیگر لیڈیز سے اس کی نسبت رائے دینے کی تحریک کریں۔ میں اس دعا پر یہ مضمون ختم کرتی ہوں کہ اے خدا جلدی ہی ہماری باضابطہ ایسوسی ایشن قائم کرادے۔ آمین فقط

رقمہ خاکسار

بنت نذر الباقر

از کنٹونمنٹ سیالکوٹ

خیرات

خیر کی جمع خیرات ہے جسکے معنی بھلائی کے ہیں۔ اس مفہوم سے عام طور پر لوگ آشنا ہیں

لیکن بس وجہ سے کہ خیرات خیرات کہی جاتی ہے۔ اور خیرات دینے والوں کی مذہب میں بہت زیادہ تعریف کی گئی ہے اُسکی حقیقت کو لوگ نہیں سمجھتے ہیں۔

خداوند نے دولت کی تقسیم محنت پر رکھی ہے۔ جو لوگ محنت نہیں کرتے وہ دولت کے مستحق نہیں ہیں۔ اُنکا کھانا اُنکا پینا پہننا سب حرام ہے کیونکہ بلا محنت بلا وجہ بلا سوسائٹی کو کسی قسم کا معاوضہ یا آرام دیے ہوئے وہ کھاتے ہیں۔ یقیناً اُن کی روزی حرام کی ہے۔ لیکن بعض لوگ بوجہ مرض یا اور وجوہات سے مجبور ہو جاتے ہیں اور وہ کسی محنت کے قابل نہیں ہوتے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ سلوک کرنا اور اُن کی مدد کرنا حقیقی خیرات ہے اور اس سے بھی بڑھکر وہ خیرات ہے جو کسی اتفاقی گردش کے مارے ہوئے شخص کو جو اگرچہ مجبور نہو دیجائے۔ کیونکہ بعض اوقات محنت اور مزدوری کرنے والے لوگوں کو بھی ایسا اتفاق ہوجاتا ہے کہ اُن کو فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ بڑے بڑے بادشاہوں کو اور امراء کو ایسی حالتیں پیش آجاتی ہیں۔

مگر جو لوگ تندرست غیر مجبور عام طور پر مانگا کرتے ہیں اور گداگری کا پیشہ کر لیتے ہیں اُن کو دینا بُرا ہے اسلیے کہ اُس سے اُن کی گداگری کی ہمت بڑھتی ہے۔ اور سوسائٹی کے اوپر اُنکا بار مفت پڑتا ہے اور سوسائٹی اُن کی خدمت سے محروم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک شخص جسکا نام حکیم بن حزام تھا پیغمبر پاک کے پاس آئے اور کچھ مانگا آپ نے اُنکا سوال پورا کیا اور گو وہ تندرست تھے۔ لیکن آپنے خیال کیا کہ وقت ہے شاید اتفاقیہ اُسکو ضرورت پیش آگئی ہے۔ دو روز کے بعد وہ پھر آئے اور پھر مانگا آپ نے یہ سوچکر کہ ابتک شاید اس کی روزی کا کوئی سامان خداوند نے نہیں کیا پھر کچھ دیدیا۔ اسکے بعد پھر وہ مانگنے کے لیے آئے۔ تو آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ معلوم ہوتا ہے اس شخص نے گداگری کا پیشہ کر لیا۔ چنانچہ آپنے آہستہ سے سمجھایا کہ "حکیم! انسان کے لیے قناعت سب سے اچھی چیز ہے۔ اور یاد رکھو کہ اوپر کا ہاتھ معزز ہے اور نیچے کا ہاتھ ذلیل ہے" یعنی دینے والا معزز رہتا ہے اور لینے والا

ذلیل رہتا ہی حکیم بن حرام نے اُس تاریخ سے کبھی کسی سے کچھ نہ مانگا۔

بہت سے گداگر اپنی ضرورت سے زیادہ مانگ لیتے ہیں کیونکہ دینے والے اُن کی حالت سے واقف نہیں ہوتے اسلیے ہم اُسکے انسداد کے لیے یہ طریقہ مناسب سمجھتے ہیں کہ ہر ایک مقام پر ایک معتبر شخص کے پاس وہانکے تمام لوگ اپنی اپنی خیرات کا مال جمع کر دیا کریں۔ وہ اس سے جسکو مستحق سمجھے اُس کی امداد کیا کرے یا غریب خانہ بنوا دے جسمیں محتاج اور مساکین رہیں۔ اور اُس مقام کے تمام فقرا کہیں کچھ بھیک نہ پاویں وہیں بھیجدیے جایا کریں اگر یہ صورت ہر جگہ اختیار کی گئی تو امید ہی کہ کم سے کم مسلمانوں میں غیر مستحق مانگنے والے کم رہجا دینگے۔

اڈیٹر

خیرات ایک ایسی چیز ہے کہ اسکے مفید ہونے میں کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا ہر مذہب نے خیرات کی تاکید کی ہی ہندو عیسائی مسلمان پارسی یہودی سب خیرات کو اچھا سمجھتے ہیں اور خیرات کرتے ہیں ہر مذہب والوں کا یہ خیال ہی کہ خیرات اور صدقہ سے بلائیں رد ہوتی ہیں آیندہ آنے والی مصیبتوں سے نجات ملتی ہی۔ زکوٰۃ جو ایک طریقہ خیرات کا ہی ہمپر فرض قرار دیا گیا ہی اور جو شخص زکوٰۃ کا منکر ہو وہ گویا مسلمان ہی نہیں۔ اور جو زکوٰۃ نہیں نکالتا وہ ایک بڑے گناہ کا مرتکب ہوتا ہی زکوٰۃ کا ترک کرنا ایسا ہی جیسے نماز اور روزہ کا ترک کرنا۔

مجھے اس بات کا پورا علم نہیں ہی کہ آیا عیسائی اور ہندو مذہب میں بھی اسلام کی طرح خیرات کا کرنا فرض قرار دیا گیا ہی یا نہیں۔ لیکن عملی طور پر یہ قومیں شاید مسلمانوں سے بھی زیادہ خیرات کرتی ہیں۔ میں نے سُنا ہی کہ عیسائی لوگ اپنی آمدنی کا ایک چہارم تک خیرات میں صرف کر دیتے ہیں۔ پادریوں کے بڑے بڑے مدرسے جن کی تعداد ہزاروں ہی ہے اور یتیم خانے یہ سب عیسائی قوم کی خیرات کی بدولت کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں لاکھوں پادری اور میمیں شہر بہ شہر عیسائیت کا وعظ کرتی پھرتی ہیں اور ہر قحط کے زمانے میں

لاکھوں ہندوستانی یتیم غریب بچوں کو نیز عورتوں اور مردوں کو پادری لوگ عیسائی بناتے ہیں
اُن کی پرورش کرتے ہیں اُن کو تعلیم دیتے ہیں اُنکو کوئی ایسا کام سکھاتے ہیں جس کی وجہ سے
روٹی کمائیں۔ اب اتنے بڑے خرچ کے لیے یہ روپیہ کہاں سے آتا ہے۔ یہ روپیہ صرف
عیسائیوں یعنی یورپ اور امریکہ والوں کی خیرات سے آتا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ صرف
ہندوستان میں کئی کروڑ روپیہ سالانہ پادری صرف کرتے ہیں اور سولے ہندوستان کے
مثل چین وغیرہ کے بھی پادری لوگ برابر اسی طرح کام کر رہے ہیں۔ اس سے اندازہ لگانیسے
معلوم ہوگا کہ کسقدر روپیہ عیسائی لوگ اپنے ملک کے سوا دوسرے ملکوں میں صرف کرنیکے لیے
خیرات کرتے ہیں۔ اور جتنا روپیہ یہ دوسرے ملکوں میں صرف کرتے ہیں اُس سے کوئی دس
گنا زیادہ اپنے ملکوں میں بھی ضرور ہی صرف کرتے ہونگے یہاں پر ہندوستان میں اگر صاحب یا
میم صاحب کے پاس فقیر مانگنے جاتا ہے تو اُسے دھکے دیکر باہر نکالدیتے ہیں اس سے لوگ
یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ بڑے بے رحم ہوتے ہیں لیکن اوپر کے بیان سے آپ نے دیکھ لیا کہ انکی
خیرات کی کیا حالت ہے لیکن یہ جس طرح فیاضی سے خیرات کرتے ہیں اسی طرح عقلمندی سے صرف
بھی کرتے ہیں یہ مستحقوں اور محتاجوں کے لیے خیرات کرتے ہیں اور اُسکے ساتھ ہی اس بات
کی پوری کوشش کرتے ہیں کہ سوائے مستحقوں اور محتاجوں کے دوسرے کے پاس فضول
اُنکا روپیہ نجائے۔ یوں روپیے پیسے کا تو ہر شخص حریص ہوتا ہے۔ آتی دولت کسے بُری معلوم
ہوتی ہے کون نہیں چاہتا ہوگا کہ بلا محنت مزدوری کیے اور جان مارے اُسے روٹی کپڑا ملا جائے
لیکن عیسائی لوگ اس بات کو پورے طور پر جانچ کر اپنا پیسہ صرف کرتے ہیں کہ آیا جس شخص
کو ہم دے رہے ہیں وہ واقعی مستحق اور محتاج بھی ہے یا نہیں یا اپنی سستی کی وجہ سے
مفت خوری پر کمر باندھی ہے اگر کسی شخص کو خدائتعالےٰ نے کان آنکھ ہاتھ پاؤں تندرستی
عطا کی ہے تو اس سے زیادہ اسکو اور کیا دولت مل سکتی ہے اگر وہ اس دولت سے فائدہ
نہیں اُٹھاتا اور ذلیل تانبے کے پیسے کے لیے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا پھرتا ہے

تو ایسے شخص کو خیرات دینا گویا اپنے روپیے کو برباد کرنا ہے۔

عیسائی لوگوں نے ایسے مفت خوروں کا خوب علاج نکالا ہی قانون بنادیا ہی کہ اگر کوئی شخص ہٹا کٹا مانگتا نظر آئے تو اُسے فوراً گرفتار کرکے کسی محنت یا مزدوری میں لگا دو اور محنت کراؤ اور محنت کی اُسے اُجرت دو کہ وہ اپنا پیٹ پالے اور اگر کوئی اپاہج بوڑھا ضعیف ہو جو کام کرنے کے قابل نہو اُسکو محتاج خانے میں رکھو اور مفت کھانا دو اب ہٹوں کٹوں کے لیے محنت مزدوری کے سامان بہم پہونچانے کو اور بڈھے اپاہجوں کی مفت خورد و نوش دینے کو ان لوگوں نے یہ انتظام کیا ہی کہ سب لوگ اپنی اپنی حیثیت کے موافق چندہ جمع کرکے اُس سے ان کاموں کو پورا کرتے ہیں کیا ہی اچھا انتظام ہی خدا کرے ہمارے ملک میں بھی ایسا ہی ہوجائے۔ لیکن شاید انگریز لوگ ہندوستانیوں کے رسم و رواج اور مذہبی خیالات کی وجہ سے ہمارے ہاں کے بھک منگوں کا کوئی علاج نہیں کرتے اور یہ کمبخت بھی اس آزادی سے بہت ہی ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں شاید جتنے بھیک مانگنے والے ہیں دس فیصدی بھی ایسے نہیں جو مستحق یا محتاج ہوں ایسے ایسے جوان مرد اور جوان عورتیں بھیک مانگتی ہیں کہ بعضوں کو دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہی کہ یہ کہیں کے نازپروردہ شہزادے یا شہزادیاں ہیں ہٹے کٹے موٹے تازے سرخ سفید صبح چار بجے سے آکر صداؤں کا تار باندہ دیتے ہیں۔ کوئی موت کی گھڑی اور قبر کی تنہائی یاد دلا دلاکر دلوں کو پگھلاتا ہی۔ کوئی نہایت سُریلی آواز میں کسی پیر یا بزرگ کی مدح خوانی کرتا ہی دلّی میں تو بعض لوگوں نے نئی نئی صدائیں گھڑنے کا پیشہ اختیار کیا ہی پیشہ ور فقیر اُنسے جاکر صدائیں سیکھتے ہیں اور اپنی بھیک کے پیسے میں سے اُنکا بھی کچھ کمیشن مقرر کیا ہی۔ شاید ہندوستان کے سب شہروں میں ایسا ہی ہوگا۔ ہمارے ملک میں تو ایک قوم ہے جو اپنے آپ کو فقیر کہتی ہی۔ اس فقیروں کی قوم کے بہت سے گھر ہوتے ہیں اور اُنکے بوڑھے جوان بچے سب بھیک مانگتے ہیں اور سب سے زیادہ اسی قوم کے بھک منگے

سینہ زوری سے مانگتے ہیں کہ دھنہ دیکر بیٹھ جاتے ہیں اپنا سر پھوڑ کر خون نکال لیتے
ہیں دن دن بھر سورج کی طرف نگاہ کرکے بیٹھے رہتے ہیں اور کچھ نہ کچھ لیکر ہی اُٹھتے
ہیں۔ بعض لوگ سفید پوش بڑی متانت سے آکر بے تکلفی سے بھلے آدمیوں کی برابر
بیٹھ جاتے ہیں اور آہستہ سے جُھک کر کہتے ہیں کہ مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمائیے آپ
کیا کہتے ہیں۔ جناب میں پنجاب کا رہنے والا ہوں بھوپال میں میرے بھائی یا بہنوئی
ملازم ہیں اُنسے ملنے گیا تھا وہ میرے جانے سے پہلے وہاں سے چلے گئے اب
میں لوٹ کر گھر کو جارہا تھا کہ راستہ میں آگرہ کی سرائے میں ٹھہرا تھا جو کچھ میرے پاس
خرچ کپڑا اللہ تھا سب چُرایا گیا وہیں کا کرایہ مرحمت فرمائیے اب اُسوقت ملا یا نہ ملا چھ
مہینے بعد پھر وہی داستان آکر بیان کی اُسکا سفر بھوپال کا ختم ہی نہیں ہونے پاتا اس
قسم کے سینکڑوں حیلہ بہانہ کرکے لوگوں سے رقمیں مارتے ہیں اور ہمارے ملک کے
بھولے بھالے سیدھے صاف دل لوگ انکے فریب میں آکر اپنا مال مفت ضائع کرتے
ہیں۔ عورتوں کی حالت مردوں سے بھی بڑھکر ہے شریف گھروں میں جوان جوان عورتیں
برائے نام برقع پہنکر حجن یا سیدانی بنکر آتی ہیں اور بے تکلفی سے آکر مصافحہ کرنے کو ہاتھ
بڑھاتی ہیں اور منہ ہی منہ میں گنگنانا شروع کرتی ہیں گویا فرشتوں سے باتیں کر رہی ہیں
پھر کوئی خانہ کعبے کے سُنے سُنائے حالات بیان کرنا شروع کرتی ہیں پھر خانہ کعبہ کا
نقشہ دکھاتی ہیں۔ اکثر بی بیاں توانکو سچا سمجھکر کچھ نہ کچھ اُن کی نذر کرتی ہیں۔ اور اگر کسی
بی بی نے کہا کہ محنت مزدوری کرکے کھاؤ حج کرنے کے بعد بھیک مانگنا کیا ضرور ہے
تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہیں گویا ابھی ان کی آنکھوں سے معجزہ اور کرامات ظاہر ہونگے
بلا لیے تو کبھی ٹلتی نہیں۔ خیر یہ تو اونچے درجہ کی مانگنے والی ہیں معمولی عورتوں کو بھی دیکھو
تو جب مانگنے کو آدینگی۔ اگر کہو کہ محنت مزدوری کرو تو جواب ملتا ہے کہ ہم تو خدا کی نوکری
کرتے ہیں ہمارے تو بڑوں سے بھیک مانگتے چلے آئے ہیں کیا تم خدا سے لڑائی کرتی ہو

خدا کا حکم نہیں مانتی ہو فقیر کو ایسا جواب دیتی ہو - اور اب ندو تو کوستی ہیں گالیاں دیتی ہیں -
بازاروں میں مہدی لگے ہاتھ رنگین کپڑے پہنکر برقع مثل پروں کے اُڑتا ہی اور مُنہ تو اکثر کُھلا رہتا ہی دن بھر گھروں اور بازاروں میں مانگتی پھرتی ہیں - انکے گھروں کو دیکھو تو محنت کرنے والوں اور جان مارکر مزدوری کرنے والوں سے بدرجہا بہتر ہوتے ہیں آپسمیں دین لین کرتی ہیں بیٹا بیٹیوں کی شادی میں زیور چڑھاتی ہیں چند مانگنے والیوں کی حالت سے مجھے ذاتی واقفیت ہی کہ اپنے پوتوں کی شادی کی بہوؤں کو سونے کی رقم چڑھائی برادری میں دعوت دی گھروں میں اکثر آکر مصیبت بیان کرتی ہیں اُنکے گھروں میں چاندی کا زیور برتن کپڑے ہوتے ہیں -

غرضکہ اکثر ہمارے ملک کے مرد عورت بھیک مانگنے والے کسی لحاظ سے بھی مستحق نہیں ہیں اور ناظرین خاتون میں سے کوئی بھائی ایسے نہونگے جو ان باتوں کو نہ جانتے ہونگے اور اپنے ملک کے بھک منگوں کی حالت سے بے خبر ہوں - اس کل قصہ کے بیان کرنیسے میری یہ غرض ہی کہ آیندہ کوئی ایسا طریقہ سوچنا چاہیے جس سے یہ اسقدر کثیر روپیہ جو کام چور کاہل مفت خوروں میں صرف کیا جاتا ہے یا تو محتاجوں کو پہنچے یا اس سے قومی کاموں کو ترقی دیجائے - باقی آیندہ

راقمہ
سکندر جہاں بیگم

بیوی

آجکل ہمارے ملک میں عموماً بیوی کا جو کچھ پوزیشن اور درجہ ہے اُسکو ہر شخص جانتا ہی لہذا ہم اس کی ذلت و خواری کی مکروہ تصویر پیش کرنا یا اسکا رقت انگیز دکھڑا رونا نہیں چاہتے بلکہ ہم اسوقت اپنے ہموطن بھائیوں کی خدمت میں چند مشاہیر کی رائے پیش کرتے

ہیں تاکہ وہ اپنے خیال کا ان رایوں سے مقابلہ کریں اور دیکھیں کہ اہل دانش اس بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اور ان کی نظر میں بیوی کا کیا درجہ ہے۔

(۱)

"زن وشو ساتھ ہی دعا مانگتے ہیں۔ ساتھ ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور ساتھ ہی روزہ رکھتے ہیں۔ خوشی اور رنج و راحت و تکلیف میں باہم ایک دوسرے کے مونس ہوا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے کوئی امر پوشیدہ نہیں رکھتے اور نہ ایک دوسرے کے لیے بار خاطر ہوتے ہیں۔ ایسی جگہہ جہاں یہ باتیں ہوتی ہوں اُسے دیکھکر خدا بھی خوش ہوتا ہے۔ ایسی ہی جگہ وہ اپنی برکت نازل کرتا ہے۔ زن وشو جہاں باہم محبت سے رہتے ہیں وہاں وہ بھی ہوتا ہے اور جہاں وہ موجود ہے وہاں بُرائی قدم نہیں رکھ سکتی۔"

(سر جان لبک)

(۲)

"میاں بی بی کا عجب رشتہ ہے کہ مرد و عورت نکاح کے ہوجانے سے دنیا کی سب چیزوں میں شریک ہوجاتے ہیں۔ یہ بات کسی اور رشتہ میں نہیں پائی جاتی . مال مشترک۔ گھر مشترک۔ کھانا پینا مشترک۔ اولاد مشترک۔ آبرو مشترک۔ خوشی مشترک۔ رنج و غم مشترک۔"

(شمس العلما مولانا نذیر احمد ایل۔ایل۔ڈی)

(۳)

"بیوی کی صحبت پر زندگی کی ترقی و تنزل کا انحصار ہے۔

(لارڈ برسلے)

(۴)

"اگرچہ میں کیسی ہی مفلسی کی حالت میں ہوں لیکن اگر کوئی مجھکو دنیا کا تمام خزانہ بھی دیدے تو میں اپنی بیوی سے مبادلہ نہ کروں"

(لوتھر)

(۵)

"دنیا میں وہ سب سے زیادہ خوش نصیب شخص ہی جس کی بیوی عصمت مآب ہو اور جسکے ساتھ وہ عیش سے زندگی بسر کر سکے"

(لوتھر)

(۶)

"تعلیم یافتہ عورت سے شوہر کی ترقی اور جاہل سے تنزل ہوگا"

(لارڈ برے)

(۷)

"جیسا آرام مجھے اپنی بیوی سے ملا حقیقت میں کسی سے نہیں مل سکتا"

(فریڈی)

(۸)

"دنیا میں شریف بیوی مرد کے واسطے نعمت غیر مترقبہ ہے"

(ملٹن)

(۹)

"میں نے اکثر دیکھا ہی کہ ناقص العقل مردوں نے اپنی بیویوں کے تعلیم یافتہ ہونیکی وجہ سے ایسے ایسے کام کیے جو پبلک کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئے"

(ڈیٹا کوئیل)

(۱۰)

"چوبیس سال کے بعد مجھے یہ تجربہ ہوا کہ دنیا میں اگر کوئی شخص میرے کاموں میں مدد دے سکتا ہے تو وہ میری بیوی ہے"

(کاونٹ زنزنڈرف)

(۱۱)

"خدا کی دوسری نعمتوں میں سے مجھے اپنی بیوی زیادہ قابل قدر معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ مصیبت کے وقت میری مدد کرتی ہے اور جب میں مشکلات سے گھبراتا ہوں تو وہ میری بہت دلدہی کرتی ہے۔ وہ میری ایسی نگراں رہتی ہے کہ اُس کی صحبت سے مجھے یقین ہے کہ کوئی بُرا کام نہ کرسکونگا"

(ڈاکٹر کرگ بے)

(۱۲)

"اگر کسی مرد کے پاس نیک عورت ہو تو اُسکو اُس سے بہتر کوئی چیز دنیا میں نہیں مل سکتی۔ اور اسی طرح اگر کسی مرد کے پاس بُری اور بدمزاج عورت ہو تو اس سے بڑھکر دنیا میں اسکے واسطے اور کوئی چیز عذاب جاں نہیں ہوسکتی"

(سائمن اڈریس)

(۱۳)

"میں جب کفار سے کوئی بات سنتا تھا اور وہ مجکو ناگوار معلوم ہوتی تھی تو خدیجہؓ سے کہتا تھا وہ اس طرح سمجھاتی تھیں کہ اُس سے میرے دل کو تسکین ہوجاتی تھی۔ اور کوئی رنج مجکو نہیں ہوتا تھا جو

خدیجہ کی باتوں سے ہلکا اور آسان ہوجاوے "

(حضرت پیغمبر اسلام صلعم)

(۱۴)

" ایمان کے بعد نیک بخت عورت سے زیادہ کوئی نعمت نہیں "

(امیر المومنین عمر ابن الخطابؓ)

(۱۵)

" تم میں سے اچھے لوگ وہی ہیں جو اپنی بیویوں سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں "

(حضرت پیغمبر اسلام صلعم)

(۱۶)

" اگر میں کسی فخر کا مستحق ہوں تو اسکا نصف میری بیوی کا حصہ ہے "

(ونس وودیھ)

(۱۷)

" میری بیوی نے اس کارخیر کی سربراہی کے ساتھ مجھے بھی سرکاری کاموں میں مدد دی ہے "

(لارڈ ڈفرن)

(۱۸)

" عورت اپنے شوہر۔ اولاد اور اسرار دنیوی کی ملکہ ہوتی ہے جسکے روبرو دنیا اور زمانہ۔ تاج اور عصائے شاہی سر تسلیم خم کردیتے ہیں "

(رسکن)

(۱۹)

" میں اپنی بیوی کے ساتھ ہمیشہ اپنی نظموں پر بحث کیا کرتا ہوں اور جو کچھ

اعتراضات وہ میری نظموں پر اکثر کرتی ہے اُن پر میں غور بھی کرتا ہوں اور قبل شائع کرنے کے میں اپنی نظموں کی بابت اُس سے مشورہ لیتا ہوں اور سوائے اُسکے اس امر میں میرا کوئی مشیر نہیں ہوا اور نہ میں نے کسی کو بتلایا۔ وہ اپنی شیریں زبانی اور ملیح لہجے سے ہر وقت میرے پہلو سے لگی بیٹھی گفتگو کیا کرتی ہے اور اس بات کی منتظر رہتی ہے کہ کب وہ میرے کسی امر میں مدد کر سکتی ہے۔"

(ڈینی سن)

(۲۰)

"لوگ کہتے ہیں کہ بیوی کو اپنے دل کی خاص بات نہ بتلانی چاہیے لیکن میرا خیال اسکے خلاف ہے۔ اگر عورت لائق ہو (جیسا کہ مرد کے لیے بھی لائق ہونا ضروری ہے) تو سوائے اُسکے اپنے دل کا بھید کسی کو نہ بتلائے۔ کیونکہ خاوند کا دلی دوست بیوی سے بڑھکر کوئی نہیں ہوتا۔"

(ایڈیسن)

(۲۱)

"میں اپنی بیوی کی ذکاوت اور فراست پر مغرور ہوں اور فخر کرتا ہوں اور میں اپنے کو تمام دنیا سے زیادہ خوش نصیب خیال کرتا ہوں۔"

(ڈینی سن)

(۲۲)

"اچھی بی بی ملنے سے بڑھکر کوئی رحمت نہیں ہو سکتی اور بُری جورو سے بدتر کوئی عذاب الٰہی نہیں ہو سکتا۔"

(سمونیڈیز)

(۲۳)

"اچھی بیوی صرف دنیاوی باتوں ہی میں مدد نہیں دیتی بلکہ اُس سے دماغی باتوں میں بھی مدد ملتی ہے"

(سرجان لیک)

(۲۴)

"اشد ضرورت کے سوائے کوئی کام بیوی کی خلاف مرضی نہیں کرنا چاہیے"

(تھیوڈر پاکر)

(۲۵)

"بیوی کی خاطر و تواضع کو فرض سمجھنا چاہیے"

(تھیوڈر پاکر)

(۲۶)

"بیوی کو لعنت ملامت نہیں کرنا چاہیے"

(〃)

(۲۷)

"بیوی کی طرف غصہ سے دیکھنا نہیں چاہیے"

(〃)

(۲۸)

"عورت پر حکومت نہیں کرنا چاہیے اور نامناسب احکام سے اسکو تھکانا نہیں چاہیے"

(〃)

(۲۹)

"بی بی کے ساتھ محبت بڑھانا چاہیے" (〃)

(۳۰)

"بیوی کی کمزوریوں اور خطاؤں کو معاف کرنا چاہیے۔"

(تھیوڈر پارکر)

(۳۱)

"بیوی کو حسب استطاعت خوش رکھنا چاہیے۔"

(")

(۳۲)

"انسان کو بیوی جیسا بنا دیتی ہے ویسا ہی وہ بنجاتا ہے۔"

(ڈاکٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہال)

(۳۳)

"میں اس کتاب کو اپنی پیاری بیوی کی روح کے حضور میں پیش کرتا ہوں جسنے میرے دل میں ان خیالات کا الہام کیا۔ جس کی حق دوستی اور انصاف پرستی ہر وقت میری مدد کے لیے تیار تھی۔ جس کی خوشنودی اور پسندیدگی کا حاصل ہونا میرے کام کا سب سے بڑا انعام تھا۔ میں نے ابتک جو لکھا ہے اس میں اور اس کتاب میں میری پیاری بیوی شریک رہی ہے اور اسکا حصہ میرے حصے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ کتاب اسوقت چھپ کر شائع کی جاتی ہے جبکہ اس کی نظر ثانی سے محروم ہے۔ اگر میرے قلم میں طاقت ہوتی کہ میں ان بلند خیالات میں سے نصف کو بھی ظاہر کرسکوں جو اسکے ساتھ قبر میں دفن ہو چکے ہیں تو دنیا میری تصنیفات سے بہ نسبت اسوقت کے زیادہ فائدہ اُٹھاتی جبکہ میں ہر ایک کتاب محض اپنے خیال

اور اپنی رائے سے لکھتا ہوں اور اس کی بلند پایہ عقل سے مشورہ نہیں لے سکتا"

(پروفیسر سٹوارٹ مل)

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

فقط

راقم

سید خورشید علی

حیدرآباد۔ دکن

عورت و مرد

روے زمین پر ملکوں میں عورت اور مرد کے تعلقات میں ایسی بوقلمونی ہی کہ عقل انسان حیران ہی کہ قطعی کیا فیصلہ کرے۔ ان تعلقات کی تواریخ کے مطالعے سے والادانشوں نے مختلف نتیجے نکالے ہیں جسکے بیان کے لیے ایک دفتر لکھنے کی ضرورت ہی۔ میں صرف چند باتیں مختصر اندکے از بسیار و یکے از ہزار لکھتا ہوں جنکو جانتا ہوں کہ یہاں کی عورتیں سمجھ جائیں گی۔

یہ قانون قدرت بڑا سچا اور عدل و انصاف کا مقتضا ہی کہ عورت کو اُسکے قدر و منزلت کے درجے سے مرد گرا نہیں سکتا جب تک خود ذلت کے گڑھے میں نہ گرے اور وہ اپنے تئیں اعلیٰ درجے پر نہیں پہنچا سکتا کہ عورت کو بلند پائگی پر نہ پہنچائے۔ ہم کو کرۂ زمین پر ملکوں میں عورت و مرد کے حالات کو دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا مبارک ملک ہیں کہ جن میں عورتوں کے لیے مراتب اعلیٰ پہنچانے میں کوشش ہو رہی ہی جسکے سبب سے مردوں کے اقبال کا عروج ہو رہا ہی اور وہ کیا منحوس ملک ہیں کہ جن میں عورتوں کے روشن ضمیر و دانشمند بنانے میں غفلت ہو رہی ہی جسکے سبب سے مرد ذلت و خواری و ادبار کے غار میں

نیچے چلے جاتے ہیں۔ اس غفلت کے سبب سے ان کی قومی زندگی کیسی تلخ ہو رہی ہی
روز ان کو اپنی غلامی کے کڑوے پھل کھانے پڑتے ہیں کہتے ہیں کہ عورتیں ناقص العقل
ہوتی ہیں اور وہ اس اپنی ناقص عقل سے مردوں کی عقل کو زائل کرتی ہیں مردوں کی
دانائی ان کی دانائی کے سامنے سر جھکاتی ہی خواہ ملک کے قوانین آئین و مراسم کچھ ہی ہوں
انکا اخلاق بگاڑنا سنوارنا عورتوں کے اختیار میں ہوتا ہی عورتیں خواہ آزاد ہوں یا مطیع
وہ مردوں پر فرماں روائی کرتی ہیں اسلیے کہ مرد کے جذبات اُنکے قبضے میں ہوتے ہیں
حضرت آدم کو دیکھو کہ حضرت حوا اُن پر کیسی مسلّط تھیں کہ حکم زوجہ باز حکم خدا پر اُنھوں نے
عمل کیا۔ عورتوں کی جتنی قدر و منزلت کم و بیش ہوتی ہی اتنا ہی اُنکا اثر بُرا بھلا ہوتا ہے
عورتوں کو صنم یا دوست ندیم یا بار برداری کا حیوان مرد جیسا بنائیگا ویسا ہی خود بنجائیگا
عورتیں مردوں کو ایسا ہی بناتی ہیں جیسی وہ خود ہوتی ہیں۔ عورتوں کی اطاعت کی
ایسی باتیں ہوتی ہیں جن میں تمیز کرنی بڑی دشوار ہی کہ اُنکے وقوع کا سبب عورتوں کی
فرط محبت ہوتی ہی یا مردوں کا درعلم۔ مثلاً دیہات میں یہ رسم جاری ہی کہ عورت
صبح کو مرد کے آگے سجدہ کرتی ہے اور اُسکے پاؤں کے بائیں انگوٹھے کو پانی سے
دھوتی ہی اور اس دھوون کو پیتی ہی اور اس اپنی شوہر پرستی سے ایسی خوش ہوتی ہی
جیسی اپنی بت پرستی سے۔ عورتیں اپنے شوہر کی اطاعت و غلامی کو خود اپنی بڑی عزت
گنتی ہیں جنمیں مردوں کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ بعض ہندنیاں اپنے شوہروں کے مرنے
کے بعد اُن کی لاشوں کے ساتھ بناؤ سنگار کرکے آگ میں جلجاتی ہیں اور اپنے بدن کو
راکھ بناتی ہیں اور اسکو سمجھتی ہیں کہ اس سے ہمارا دنیا میں نام اور سرگ میں مقام ہوگا۔
معلوم نہیں ہی کہ یہ ستی ہونا انکا فرط محبت اور عشق کے سبب سے ہی یا مردوں کا
قانون بنایا ہوا ہی کہ شوہر کے مرنے پر تو عورتوں کے ستی ہونے کا حکم لگایا ہی اور بیوی
کے مرنے پر اپنے تئیں ستی ہونے سے بچایا ہی۔ عورت شوہر کے سوز فراق کو سہ

نہیں سکتی۔ رباعی

نسبت نہ ستی سے دے پتنگے کے تئیں　　اس میں اور اُس میں ہے علاقہ بھی کہیں
وہ آگ میں جل جاتی ہی مُردے کے لیے　　یہ گرد بجھی شمع کے پھرتا بھی نہیں

یہ عام رسم ہی کہ عورت خاوند کے مرنے کے بعد سب زیب و زینت چھوڑ کر رہتی ہی خدا کی عبادت میں زیادہ اپنی زندگی کاٹتی ہے۔ ستی تو ایک دن دُکھ اُٹھا کے چھوٹ جاتی ہے۔

ستی ہونے میں بس ایک نام ہے گا　　وے بن آگ جلنا کام ہے گا
وہ چھُٹ جاتی ہی دُکھ ایک آن بھر کر　　یہ اپنی زندگی کاٹے ہے مر کر
وہ مر مٹتی ہی یارو ایک باری　　اسے رہتی ہے دائم دم شماری
کہاں آناً فاناً تن جلانا　　کہاں دن رات رہ رہ من جلانا
غرض عورت وہی ہے خوبصورت　　جو پہنے ہے سدا ملبوس عصمت
ہی عصمت نیک بختی کی نشانی　　نہو تو خاک ہے پھر زندگانی

ہندوں کے مذہب میں دوسرا خاوند کرنا عاقبت کا خراب کرنا اور دنیا میں سارے کٹم کا نام ڈبونا ہی۔ اگرچہ مسلمانوں کے دین میں بیوہ کا دوسرا نکاح گناہ نہیں مگر شرفا بعض مسلمانوں نے ہندوں کا یہ شیوہ اختیار کرکے بیوہ پر ظلم ڈھایا ہی۔ مگر اب یہ جہالت روز بروز کم ہوتی جاتی ہی

شہروں میں اور بعض قصبات میں بیوہ کے عقد ثانی کا رواج زیادہ ہوتا جاتا ہی۔ ہندوں میں بھی بدواہ کے بیاہ کے لیے پنڈت بوستھا دینے لگے ہیں ابھی ایک پنڈت نے بدواہ کے بیاہ کے باب میں کتاب لکھی ہی جس میں ویدا اور دھرم شاستر سے تمام احکام جو ممانعت اور اجازت کے ہیں جمع کرکے نتیجہ نکالا کہ بدواہ کے بیاہ کرنے کو دھرم شاستر منع نہیں کرتا۔ غرض عورتوں نے اپنے تئیں اب مردوں کی اطاعت کو بڑا ثواب جانا ہی

مرد اُن پر جفا کرتے ہیں وہ اُنسے وفا کرتی ہیں وہ چار چار بیویاں کرکے بیویوں کی زندگی تلخ کرتے ہیں وہ اس طرح چوتھائی شوہر سے خوش نہیں ہوتیں مگر دل کو یہ سوچ کر صبر دے لیتی ہیں کہ دنیا میں شاید ہی کوئی عورت ہوگی جسکو پورا شوہر ملا ہوگا۔ تماشا یہ ہی کہ جب مسلمانوں کا بیاہ ہوتا ہی تو مراسم ایسی برتی جاتی ہیں کہ جس سے معلوم ہوتا ہی کہ مرد کو عورت کی اطاعت کرنی چاہیے۔ جب آرسی مصحف دکھایا جاتا ہی تو دولھا کو کہنا پڑتا ہی کہ بیوی آنکھیں کھولو غلام حاضر ہی۔ مہمان عورتیں یہ کہہ کہہ کر کہ ہم نے نہیں سنا کہ تم نے کیا کہا ہی اُس سے بار بار یہی کہواتی ہیں۔ پھر دلہن کی پاؤں کی جوتی دولھا کے سر کو چھواتی ہیں۔ یہ عرب کی ضرب المثل نہایت عمدہ ہی کہ عروس نوعمر ملکہ ہوتی ہی اور عروس نوجوان برابر کی دوست ہوتی ہی اور عروس کہن سال ماں ہوتی ہی اسکے دو معنی ہیں ایک یہ کہ خاوند بیوی کے کہنے میں ایسا ہو جاتا ہی جیسا کہ بچہ ماں کے کہنے میں یا جیسے ماں بچے کی پرورش کی خبر لیتی ہے ایسے ہی بیوی بوڑھے خاوند کی کھانے پینے پہننے اور رہنے کی خبر رکھتی ہی۔ یہاں بھی کہتے ہیں کہ خدا بچے کی ماں اور بوڑھے کی بیوی نہ مارے اس زمانے میں عورتوں میں جو بڑا سخت عیب ہے وہ یہ ہے کہ وہ تعلیم و تربیت یافتہ نہیں ہوتیں اس عیب کے دور ہونے کے لیے بڑی مدت چاہیے اور اسکے لیے موانع اور مزاحمتیں بہت سی آگے آتی ہیں اب انکی تربیت و تعلیم کا آغاز جس طرح سے کہ ہونا چاہیے تھا وہ ہمارے شیخ عبداللہ صاحب بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی سکرٹری تعلیم نسواں نے علیگڑھ میں شروع کیا ہی خدا اسکو اپنے فضل و کرم سے ایسا پورا کرے کہ مسلمان عورتوں میں جو یہ عیب ناتربیت یافتہ ہونے کا لگتا ہی جس کی برابر کوئی عیب نہیں دور ہو جائے۔ وہ روپیے پر موقوف ہے اگر مسلمان اپنی عورتوں کی جہالت کا داغ مٹانا چاہیں تو روپیہ بے دریغ اس کام میں دریا دلی سے خرچ کریں۔ فقط

ذکاء اللہ

بقیہ

مکالمہ

بیگم - اب تو آپ کو فرصت ہی باہر سے لوٹ آئے ہیں اب بتائیے کہ بیبیوں کے میل ملاپ اور بیاہ شادیوں کی نسبت ایسے کیا آپ کے خیالات ہیں جو ہمکو معلوم نہیں اور جنکو سنا کر آپ ہم کو پرچانا چاہتے ہیں -

میاں - ہاں میں اپنے قاعدے کے موافق بیاہ شادی اور بیبیوں میں میل ملاپ کی نسبت اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہوں یہ تو تم جانتی ہو کہ جتنے کام آدمی کرتا ہی یا تو اپنی مرضی اور رضامندی سے کرتا ہی یا دوسروں کے دباؤ سے جتنے کام اپنی مرضی اور خوشی سے کیے جاتے ہیں اُنسے آدمی کو دلی مسرت حاصل ہوتی ہی اور جتنے لوگ مہذب اور آزاد طبیعت ہیں وہ اس بات کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ جو کام ہم کریں اپنی طبیعت سے اور اپنے دل کی خوشی سے کریں - برخلاف اسکے جاہل اور غیر مہذب اور تنگ خیال آدمی اکثر کام مجبوری سے بھی کرتے ہیں یہ مجبوریاں ان جاہل غیر مہذب لوگوں کی کئی قسم کی ہوتی ہیں لیکن سب سے بڑی مجبوری جسکے وہ بندے ہیں وہ برادری کی رسم و رواج کی مجبوری ہے بعض بعض تعصبات کے اعلیٰ قوم کے لوگ بھی برادری کے اُلجھیڑوں میں پھنسے ہیں اور برادری کی رسم و رواج کی مجبوریوں سے شادی و غمی کے مصارف اپنی بساط سے بڑھکر کرتے ہیں . اپنی جائدادوں کو فروخت یا گروی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں دو روز خوب دھوم دھڑکا اور گھماگھمی رہتی ہی اور روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہی اسکے بعد لوگ کھا پیکر اپنے اپنے گھر پہنچتے ہیں اور کھلانے والے پر یہی مثل صادق آتی ہی کہ گھر پھونک تماشا دیکھا - دو روز تماشا دیکھ لیا پھر جو دیکھا تو گھر خاک سیاہ نہ بیٹھنے کو جگھ نہ رہنے کو - آپ پریشان بیوی بچے پریشان وہ برادری کے لوگ جن کی بدولت

جھونپڑے تک بیجد یے جاتے ہیں پاس بٹھانے کے بھی روادار نہیں ہوتے آتے دیکھکر دور سے ہی دھتکار دیتے ہیں بھئی اسوقت ملنے کی فرصت نہیں۔ اب اس درجے کے لوگوں سے بھی ذرا اوپر کو آؤ تو تھیں اور لوگ زیادہ بہتر حالت میں نظر آوینگے لیکن ہندوستان میں ابھی تک اُس قسم کی روشنی اور تہذیب نہیں پھیلی ہے کہ ان پُرانی تکلیف دینے والی رسموں سے جو جھاڑ کے کانٹوں کی طرح ہمارے روزمرہ کی زندگی کے دامن سے لپٹ رہی ہیں ہمکو پوری طرح سے نجات ملے۔ خاصے تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی ان رسموں کی پابندی ابھی تک باقی ہے اور اُس کی زیادہ تر وجہ بیبیوں کی جہالت ہے اور وہ خیال جو تم نے اوپر ظاہر کیا ہے اُس کی وجہ سے بیبیاں ابتک ان رسموں کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتیں۔ اُنکے نزدیک بیاہ شادیوں میں کُنبہ رشتہ برادری کا جمع نہ کرنا گویا اُن کو ایک بڑے حق سے محروم کرنا ہے لیکن اگر غور سے دیکھو تو ان رسمی تقریباًمیں جیسا مینے اوپر بھی ظاہر کیا ہے سوائے تکلیف اور نقصان کے کچھ بھی خوشی یا نفع نہیں۔ بیاہ شادیوں کی نسبت میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنی مالی حیثیت کا خیال کر کے کسی بوجھ کو اُٹھانا چاہیے اگر خدا نے آسودگی دی ہو تو اپنی خوشی سے شادی کرے۔ وہ اپنے قریبی عزیزوں اور میل جول رکھنے والے پڑوسیوں اور اپنے دوستوں کی دعوت کرنی چاہیے۔ یہ دعوت صرف دن ہی دن کی ہونی چاہیے۔ اس میں مردوں اور عورتوں دونوں کو دن بھر کے لیے جمع کیا جائے اور دن بھر باہمی ملاقات میں جس میں جوانوں اور بچوں کو کھیل تماشے میں وقت گذارنے کا پورا موقع ملے اور مہمان بے فکری سے خوب باتیں کر کے اپنا دل بہلائیں۔ لطف سے وقت گزار کر شام کیوقت رخصت کر دیا جائے اور رات کو کسی کو مہمان نہ رکھا جائے اگر کوئی ایک دو عزیز یا مہمان باہر کے ہوں تو وہ جتنے روز تک رہیں کچھ ہرج نہیں لیکن شادی کے نام سے صرف ایک روز اور وہ بھی دن بھر کی مہمانداری کافی

سمجھنی چاہیے جو مہمان جمع کیے جائیں اُس میں اس بات کا پورا لحاظ ہو کہ کسی شخص
کو رسماً نہ بلایا جائے بلکہ محبت اور دوستی کی وجہ سے بلایا جاوے تاکہ مہمانوں سے
ملنے سے بجائے کسی قسم کی تکلیف اور کشیدگی کے پوری خوشی حاصل ہو۔ ہر
خاندان سے صرف چند ہی لوگوں سے بے تکلفی اور محبت کا ملنا جلنا ہوتا ہے
باقی یوں بھرتی کے لیے تو سینکڑوں یک جدی اور خاندانی نکل آتے ہیں لیکن یہ دیکھو
کہ وہ کون لوگ ہیں جو تمہارے دُکھ درد میں تمہارے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں پس
وہی لوگ ہیں جنسے ملکر ہمیں خوشی حاصل ہوسکتی ہے اور شادیوں کے موقعوں پر صرف
اُنھیں لوگوں کو بلانا چاہیے۔ اس طور پر تم دیکھوگی کہ جو لوگ آئینگے وہ تم سے محبت
کرنے والے ہونگے تمہاری خوشی میں پورے طور پر شریک ہونگے اور تمہارے
گھر کو مثل اپنے گھر کے سمجھیں گے نہ اُن کو کوئی تکلیف محسوس ہوگی نہ کسی سے گلہ
کرینگے ہنسی خوشی تمہارے پاس وقت کاٹکر دل میں تمہاری محبت اور پھر ملنے کی آرزو
لیکر اپنے گھر واپس جائینگے۔ ایسی بے تکلف بیبیاں اور سہیلیاں اور پڑوسنیں
جب تمہارے گھر آئیں گی تو تم کو مسرت کا باغ کِھلا ہوا دکھائی دیگا۔ ہر ایک کے چہرہ سے
تمہاری محبت اور تمہاری خوشی میں خوشی کے آثار نمایاں ہونگے۔ تمہارے کاموں
میں تم کو مدد دینگی تمہارے بچوں کو مثل اپنے بچوں کے تصور کرکے اُنسے پیار کرینگی
فرصت پاکر خوشی کے گیت گائیں گی تم کو بھی گھسیٹ کر اپنے پاس بٹھائیں گی محبت
اور خوشی بھرے دل سے تم کو مبارکباد دینگی گویا وہ اُس تقریب کو تمہارے لیے
جنت کا نمونہ بنا دینگی۔ اب بتاؤ یہ شادی اچھی یا وہ جسکا ذکر اوپر ہوا ہے کیا یہ
ملنا اچھا یا وہ۔ اسمیں یہ ہوتا ہے کہ سات پشتوں میں جاکر کسی بی بی سے رشتہ نکلا
اور عمر بھر تو اُس سے کسی قسم کا محبت پیار نہ رکھا اور آج شادی میں لاکر اُسکو سرِ شام
سے ایک تنگ کوٹھری کے کونے میں مٹی کی مورت کی طرح بٹھادیا نہ اُسکو کوئی جانے

نہ وہ کسی کو جانے اور وہ اس فکر میں ہے کہ کہیں کھانا ملجائے تو کھاکر پڑ رہوں۔ جو یہاں سے اُٹھی تو دوسری بی بی میراکو نہ گھیرے گی۔ تم ایک آدھ مرتبہ اُدہر سے نکلیں آداب تسلیم ہوگیا اور بس نہ تمھارے دل میں اُسکی محبت نہ اُسکو تمھاری چاہت دو دن بُرے بھلے کاٹ کر تکلیف اُٹھاکر آنے جانے والوں کی ٹھوکریں کھاکر تمھاری بدانتظامی اور لاپروائی یا تمھاری تنگ چشمی اور بدسلیقگی کی داستانیں لوگوں کو وہیں سے سنانی شروع کیں اور ناک بھویں چڑھاکر خداحافظ کہکر اپنے گھر چلی گئیں۔

بیگم۔ توگویا نکاح کی تقریبوں میں بھی صرف بیبیوں کو دن ہی دن کے لیے مہماں بلانا چاہیے۔ بھلا یہ بھی کوئی مہماں داری ہے: دُلہن کو بنانے میں کسی سے مدد ملے نہ مہدی نہ اُبٹنا کسی بات میں کوئی شریک ہو برات لیکر دولھا آیا اور دن ہی دن میں نکاح ہوا اور سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ حالانکہ اگر سچ پوچھو تو شادی کا رنگ تو رات ہی کو جمتا ہے گھر والی بیبیوں کو دن کو تو کسی بات کی فرصت ہوتی نہیں رات ہی کو کسی سے بات کرنیکا موقع ملتا ہے اب آپ کی اصلاح نے تو اسکا بھی خاتمہ کردیا۔ ''خداحافظ''!

میاں۔ بیگم میں ہر انسان کے لیے اور ہر تقریب میں یکساں قاعدہ مقرر کرنے کا حامی نہیں ہوں۔ حسب ضرورت عام قاعدوں میں ترمیم ہوسکتی ہے یہ تو تم بھی اب تسلیم کرتی ہوکہ سوائے نکاح کی تقریب کے اور تقریبوں میں دن ہی دن کی شادی ہو تو زیادہ آسایش اور خوشی کا باعث ہوگی۔ پھر اس بات کو بھی تم تسلیم کرتی ہو کہ شادیوں میں ملنا جلنا اُنھیں بیبیوں سے بہتر ہوگا کہ جنسے علاوہ شادیوں کے میل ملاپ کے اور روزمرہ کے برتاؤ میں بھی محبت اور پیار کا ملنا جلنا ہو۔ اب نکاح کی تقریب کی نسبت سب سے اول تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ رات کی

مہمانداری جس کی تم عادی ہو اور جسکو تم اسقدر دل سے چاہتی ہو یہ صرف ایک
عادت کی بات ہے اگر بجاے رات کے مہدی اور اٹھنا دن کا ہوا کرے تو کچھ دنوں
میں تم کو رات کا خیال بھی نہیں آئیگا اب دیکھو انگریزوں میں صرف دن کی ہی شادی
ہوتی ہے سب لوگ رات کو مزے سے سوتے ہیں اور صبح کے وقت اُٹھکر اچھے
لباس پہنکر دلہن اور دولھا کے ساتھ گرجاؤں میں جاتے ہیں وہاں پر نکاح ہوجاتا ہے
وہاں سے آنے کے بعد دعوت ہوتی ہے دُلہن اور دولھا کو لوگ تحفہ تحائف دیتے
ہیں مہذب طریقے سے مذاق اور ہنسی کھیل ہوتے رہتے ہیں کوئی لڑکی پیانو بجاتی
ہے کوئی گیت گاتی ہے کوئی دلہن کے پاس بیٹھتی ہے خوشی سے سب کے چہرے پھول
کی طرح شگفتہ ہوتے ہیں پھر سب کی دعوت ہوتی ہے۔ ہنسی مذاق کے لیے کیک
کاٹے جاتے ہیں خوب قہقہے اُڑتے ہیں اُسکے بعد خوشی خوشی دولھا اور دلہن کو
رخصت کرتے ہیں جو کچھ عرصہ کے لیے اپنے گھر سے کہیں سیر و تفریح کے مقام پر
چلے جاتے ہیں۔ اب ان لوگوں سے اگر کہا جائے کہ یہ بجاے دن کے رات رات
بھر جاگیں اور رات کی مہمانداری کے لطف اُٹھائیں تو ان کو نہایت ناگوار گزریگا
کیونکہ رات کا بڑا حصہ خدا نے آرام کے لیے بنایا ہے نہ کہ جاگ جاگ کر گزار دینے کے
لیے اسی طریقے سے جب ہمارے ملک میں دن کی شادیوں کی عادت ہوجائے گی
تو کسی کو رات کا خیال بھی نہیں ہونے کا اور اگر دلہن کی چند بہنیں یا عزیز سہیلیاں اُسکے
پاس رات کو بھی رہجائیں تو کچھ ہرج نہیں ہے لیکن رات کی بھیڑ بھاڑ بچوں کی چیخ پکار
کام کی مصیبت ماماؤں چھوکریوں کا اودہم یہ سب قابل نفرت ہے۔ علاوہ اسکے
بیبیوں کے میل ملاپ کے موجودہ زمانہ میں اور بھی طریقے جاری ہورہے ہیں۔
جلسے ملنے والیوں کو صرف مسرت اور تفریح ہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ بہت فائدہ بھی
ہوتا ہے وہ طریقہ زنانہ انجمنوں اور کلبوں کا ہے شادیوں میں عام طور پر تکلفات کا

ملنا جلنا ہوتا ہے لیکن کلب یا انجمن میں جو بیبیاں جمع ہوتی ہیں وہ نہایت بے تکلفانہ ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں مفید باتوں پر بحث اور گفتگو کرتی ہیں اپنی اور اپنی بچیوں کی تعلیم اور ترقی پر غور کرتی ہیں اور زیادہ ملنے جلنے سے ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور ایسی یگانگت ہوجاتی ہے کہ رشتہ داروں میں بھی نہیں ہوتی اب تم ہی انصاف سے بتاؤ کہ مرد کس بات سے بیبیوں کو منع کرتے ہیں جو باتیں کرنے کی ہیں یا تو اُنسے ناواقف ہیں یا کرتی نہیں اور مردوں کی شکایت کے دفتر کھولدیتی ہیں۔

بیگم۔ یہ تو سب باتیں آپ کی سُنیں لیکن ہر شخص کو نہ اُس قسم کی شادی میسر آسکتی ہے۔ جسکا ذکر آپ نے کیا ہے نہ انجمنوں اور کلبوں کی ممبری نصیب ہوسکتی ہے پھر یہ ہزاروں غریب بیبیاں کیسے آپسمیں ملیں جلیں۔

میاں مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ ایک طبقے کی بیبیوں کے لیے تو میری راے پسند کی گئی اب تم مجھ سے غریبوں کے لیے کیا پوچھتی ہو افلاس خود ایک مصیبت ہے اور اُس مصیبت پر رسموں کا ادا کرنا ایک اور مصیبت۔ غریب لوگوں کا کسی رسم کا بھی ادا کرنا اُن کی سراسر غلطی اور ناعاقبت اندیشی ہے اگر رسم و رواج کی پابندی سے وہ مجبور نہوں تو وہ کبھی اپنے اوپر یہ جبر گوارا نہ کریں کہ گھر کا اثاثہ برباد کرکے برادری کی دعوتیں کریں اور بیوی بچوں کو عمر بھر کے لیے مصیبت میں ڈالیں ایک غریب آدمی کی سب سے پہلی غرض یہ ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کی خورد و نوش کی فکر کرے یہی اُسکی شادی ہے اور اسی میں اُسکو خوش رہنا چاہیے۔ بیگم اگر سچ پوچھو تو یہ میل ملاپ بیاہ شادی اور انجمنیں اور کلبیں یہ سب پیٹ بھرے لوگوں کے چوچلے ہیں ورنہ غریبوں کو تو سواے اپنے پیٹ بھرنے کے اور تن ڈھکنے کے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ بقول شخصے کہ انسان کا بھی وہی حال ہے کہ "بھوک لگی تنور کی سوجھی پیٹ بھرا دور کی سوجھی"

لیکن اس بات کو یاد رکھو کہ خدا جسنے انسان کو پیدا کیا ہی اُس نے مختلف درجے کے لوگوں کے لیے مختلف قسم کی خوشی کے سامان پیدا کیے ہیں جو باتیں تمھاری خوشی کی ہیں تم یہ سمجھتی ہو کہ سب لوگ اُس بات سے خوش ہو سکتے ہیں لیکن اپنے سے اونچے درجے والوں کو یعنی شہزادیوں رانیوں مہارانیوں کو دیکھو کہ وہ ان باتوں سے ہرگز خوش نہیں ہو سکتیں جنسے تم خوشی حاصل کر سکتی ہو۔ اسیطور پر وہ کل مخلوق جو تمول میں عزت میں درجے میں تم سے نیچا درجہ رکھتی ہی اُن کی خوشی کے خدا نے کچھ اور ہی سامان پیدا کیے ہیں جنکا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتی ہو تم ناحق دوسروں کی فکر کرتی ہو خدا سب کا مالک اور حاکم ہی وہ ایک غریب سے غریب کے لیے بھی ایسے خوشی کے سامان پیدا کر سکتا ہی کہ تم کو بیاہ شادیوں کلبوں اور انجمنوں سے بھی کبھی حاصل نہوں پس غریبوں سے یہ کوئی ہمدردی کا طریقہ نہیں ہی کہ جو بات تم کو خوش کر سکتی ہی تم یہ چاہو کہ وہ بھی اسی بات کو کریں اُنسے محبت اور ہمدردی ظاہر کرنے کے اور طریقے ہیں جنکے بیان کا اس مضمون میں کوئی موقع نہیں۔ مجھے اس مضمون میں تمھارے طبقے کی بیبیوں کے لیے تم کو چند باتیں سوجھانی مطلوب تھیں اب میں اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔

رقمہ
ایک بیگم

اڈیٹوریل

اعلان چندہ نمبر ا۔ ناظرین خاتون کو معلوم ہی کہ امسال ڈوڈپوٹیشن مختلف مقامات پر فراہمی چندے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ایک ڈپوٹیشن کے سکرٹری آصف زماں صاحب

تھے۔ اور اُنکے ساتھ سید آغا علی صاحب سپرنٹنڈنٹ ڈائننگ ہال علی گڑھ کالج و
نثار احمد صاحب و عبدالرحمٰن صاحب طلبائے کالج گئے تھے۔ اس ڈپوٹیشن کے
ممبروں نے صرف جیپور اور ٹونک میں کام کیا۔ ابتک ہمارے پاس مبلغ ۹۵۸ روپیے
اس ڈپوٹیشن کی معرفت پہونچے ہیں۔ چندہ دہندگان کی مفصل رپورٹ مع اعلان
بقیہ چندہ آیندہ شائع کیجائے گی۔ اس ڈپوٹیشن کے ممبروں نے حضور انور جناب
نواب صاحب والی ٹونک کی جانب سے ایک بیش بہا عطیہ کی امید دلائی ہے کہ
حضور انور نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اس قومی مدرسۂ نسواں کو اپنی فیاضانہ حمایت
میں لیکر ایک مستقل ماہواری عطیہ سے اُس کی امداد فرمائینگے۔ ہم حضور نواب صاحب کے
اس شاہانہ اور فیاضانہ خیال کے تہ دل سے ممنون ہیں اور کل قوم کو حضور والا
کا ممنون ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کی لڑکیاں قرآن شریف اور دینیات کی کتابیں پڑہینگی
اور ملک میں اُن کی وجہ سے اسلام اور علوم مفیدہ کی روشنی پھیلے گی جسکا دائمی
ثواب حضور والا کی ذات کو پہنچا کریگا۔ اور دوسرے ڈپوٹیشن میں قاضی عبدالعزیز
صاحب و ملا احمد صاحب و سید بنیاد حسین صاحب تھے اس ڈپوٹیشن نے
احمد آباد۔ سورت اور بمبئی میں دورہ کیا۔ اور بڑودہ میں بھی ہمارے مخدوم جناب
مسٹر جسٹس عباس طیب جی کی ہمدردانہ کششش کی وجہ سے دو چار روز کے لیے گئے
ہماری طرف سے بڑودہ جانے کی ہدایت نہ تھی اور نہ بڑودہ پروگرام میں تھا لیکن

ہر کجا چشمہ بود شیریں مردم و مرغ و مور گرد آیند

جناب جسٹس عباس طیب جی کا قرب ایسا نہ تھا کہ ہمارے جوشیلے نوجوان
اُنسے ملاقات کیے بغیر واپس چلے آتے۔ بڑودہ میں جو کچھ کامیابی ہوئی اس کا
حال ڈپوٹیشن کی رپورٹ کے ساتھ شائع کیا جائیگا۔ اسوقت تک اس ڈپوٹیشن
کی معرفت ۲۶۶ روپیے وصول ہوچکے ہیں۔ آیندہ مہینے سے چندہ دہندگان کے

نام نامی مع شکریہ کے درج کیے جاوینگے۔

اعلان چندہ نمبر ۲۔ جناب عبدالحافظ صاحب باعکنظ سکرٹری ہز ہائنس مہاراجہ صاحب بھاونگر نے مبلغ سو روپیہ زنانہ نارمل اسکول کے لیے مرحمت فرمائے ہیں ہم عبدالحافظ باعکنظ صاحب کی سچی ہمدردی کے لیے جو اُن کو ہمارے صیغہ اور نیز عام قومی کاموں سے ہے دل سے ممنون ہیں۔ ہمارے دوست عبدالحافظ صاحب منجملہ اُن نوجوانوں کے ہیں جن کی قومی ہمدردی صرف الفاظ یا تقریر یا تحریر ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ جس کام کو اچھا اور ضروری سمجھتے ہیں اسکو قلمے قدمے۔ سخنے درمے سب طرح کی امداد دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

اعلان چندہ نمبر ۳۔ مسز نیاز احمد صاحبہ نے منجملہ اُس زر مجتمعہ کے جو اُنھوں نے وظائف فنڈ میں جمع کیے تھے اور جس میں سے مبلغ چھ سو روپیہ وہ پہلے بھیج چکی ہیں اب بقیہ تیئیس روپیہ ہمارے پاس بھیجے ہیں۔ مسز نیاز احمد صاحبہ کی حالت سے ناظرین خوب واقف ہیں۔ ان پر جو مصیبت کا پہاڑ گرا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے انسے بہت کچھ توقع تھی کہ وہ ہم کو زنانہ اسکول کی ترقی میں امداد دینگی لیکن اب جبکہ وہ خود ہی مصیبت میں مبتلا ہیں تو بجز اسکے کہ ہم انسے ہمدردی کریں اور کیا کر سکتے ہیں۔

اعلان چندہ نمبر ۴۔ ہمارے مخدوم دوست سید اصغر علی صاحب نے حیدرآباد سے مبلغ چار روپیہ تین آنے زنانہ نارمل اسکول کے لیے بھیجے ہیں ہم نہایت خوش ہیں کہ حیدرآباد کے لوگوں کو تعلیم نسواں سے خاصکر بہت ہمدردی ہے

سید اصغر علی صاحب وسید خورشید علی صاحب کی ذات سے ہمیں امید ہے کہ وہ حیدرآباد سے اس مدرسہ کی امداد کی معقول صورت پیدا کرنے میں کامیاب ہونگے۔

اعلان چندہ نمبر ۵۔ ہمارے صیغے کی خاص ہمدرد والدہ احتشام علی صاحب نے عرصہ ہوا مبلغ دو روپیہ زنانہ نارمل اسکول کے لیے بھیجے تھے۔ ہم اپنے صیغے کے ہمدردوں کے نہایت ممنون ہیں کہ وہ کم وبیش اُس کی امداد سے کبھی اور کسی وقت میں غافل نہیں رہتے

نمائش۔ ہم ناظرین خاتون کو خوشخبری سنانا چاہتے ہیں کہ کراچی میں نمائش کا معقول انتظام ہو رہا ہے۔ اس میں ہم کو مرحوم سردار یعقوب خاں کے خاندان کے ممبروں کا اور بالخصوص مسٹر محمد یوسف اور اپنے نوجوان دوست محمد الیاس صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے خاص توجہ اور کوشش سے اس کام کو انجام دینے کی فکر کی۔ نیز جناب مسز وائنز صاحبہ کا بھی ہم کو ممنون ہونا چاہیے کہ اُنھوں نے کراچی میں ایک زنانہ کمیٹی قائم کی ہے اُس میں ہفتہ وار جلسے ہوتے ہیں اور سب کراچی کی پردہ نشین خاتونیں اُس میں شریک ہوتی ہیں گویا وہ اس کام کو ایسا سمجھتی ہیں جیسے کہ اپنا ذاتی کام ہے۔ اس نمائش سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ مستورات میں آپس میں اتفاق اور میل جول سے کام کرنے کا سلیقہ اور حوصلہ پیدا ہو۔ اور نیز اُن کو اپنے دیگر صوبہ جات کی بہنوں کے ہاتھ کے کام دیکھکر خود بھی کام کرنے کی تحریص وترغیب پیدا ہو یہ مقصد ہمارا امسال امید ہے کہ بہت اچھی طرح پورا ہوگا۔ اور کراچی کی کل بیگمات اس نمائش سے حسب منشار فائدہ اُٹھائینگی۔ اگلے سال اشیاء کے وصول اور واپس کرنے کا جہانتک ہمارے امکان میں تھا ہم نے معقول انتظام کر دیا ہے۔ پارسال ڈھاکہ کی کانفرنس میں بعض کاموں میں نہایت ابتری رہی اور اُس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ہم کو تاریخ کانفرنس سے صرف تین ہفتہ پہلے

نمائش کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اُسوقت ہم سے بجز اسکے اور کیا ہو سکتا تھا کہ ہم وہاں کی لوکل کمیٹی پر پورا بھروسہ کریں۔ اور اس بھروسہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض چیزیں تلف ہو گئیں اور ہمکو اُنکا معاوضہ دینا پڑا۔ ناظرین کو معلوم ہی کہ علی گڑھ کی کانفرنس میں جو انتظام ہوا تھا اُس میں کسی کی ایک چیز بھی ضائع نہیں ہوئی تھی۔ اب ناظرین کو ہمارے انتظام پر پورا بھروسہ کرنا چاہیے اور اس نمائش کی کامیابی میں ہم کو مدد دینی چاہیے۔ مہربانی سے جو صاحب یا خاتونیں اپنی اشیاء بغرض نمائش بھیجنا چاہیں وہ حتی الوسع لکڑی کے بکس میں بھیجیں اور اگر تھوڑی چیزیں ہوں تو کپڑے کے سلے ہوئے پارسل میں بھیجیں۔ کاغذ کے بکس میں ہوے سے بھی کوئی اپنی چیز نہ بھیجے۔ اسمیں چیزوں کے ضایع ہوجانیکا بہت احتمال ہی۔ پارسل اس پتے سے بھیجے جائیں۔

پتہ مسز وائنز صاحبہ یا مسٹر محمد الیاس صاحب Mrs. Vines

مدرسہ اسلام یا کانفرنس کیمپ کراچی

اور پارسلوں کے اوپر موٹے حرفوں میں یہ لکھا جائے کہ **بغرض نمائش**"

اب زمانہ بہت قلیل رہگیا ہی اسلیے چیزوں کو جلد بھیجنا چاہیے۔ پارسل ہمیشہ پسنجر یا سواری گاڑی سے بھیجنا چاہیے مال گاڑی سے کوئی نہ بھیجے اور پندرہ دسمبر تک پارسل روانہ ہوجانے چاہییں۔ اور جو مقامات کراچی سے قریب ہوں وہانسے ایسے وقت میں روانہ ہونے چاہییں کہ زیادہ سے زیادہ ۲۴ دسمبر تک کراچی میں پہنچ جائیں۔

کالج کا آیندہ سکرٹری۔ گزشتہ نمبر میں جو ماتمی نوٹ ہم نے نواب محسن الملک کی وفات پر دیا تھا اُسکے دیکھنے سے ناظرین کے دل پر یہ اثر ضرور ہوا ہوگا کہ ہم کو خدا نے ایک بڑے لیڈر کی لیڈری سے محروم کر دیا۔ لیکن خدا کا

خدائی میں جتنے کام ہوتے ہیں وہ ایک خاص انتظام کے تحت میں ہیں اور اس انتظام کی چلانے والی قوتیں اور کلیں اس درجہ محدود نہیں ہیں کہ کسی ایک پرزے کے کم ہوجانے سے خواہ وہ کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو مشین رک جائے۔ ہم کو تشویش تھی کہ نواب صاحب مرحوم کے بعد اب ہماری کشتی قوم کس طرح کنارے لگے گی۔ خداوند عالم نے ہماری اس تشویش سے ہم کو نجات دی اور ایک اور بزرگ کو ہماری کشتی کا ناخدا بنادیا۔ ہم کو اپنے مخدوم نواب وقارالملک سے پوری توقع ہے کہ وہ بھی اپنے پیشرو نواب صاحب مرحوم کی طرح ہمارے سب کاموں کو اپنی حمایت اور رہنمائی میں لیکر اسوقت تک جو سب کے لیے ضروری اور یقینی ہو انجام دینگے ہم کو نواب صاحب پر پورا اعتماد ہے۔ ہم ہر کام میں ان کی پیروی کے لیے آمادہ ہیں۔ اور خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ نواب صاحب کو صحت اور ہمت عطا فرمائے کہ وہ ہماری امیدیں پورا کرنے میں کامیاب ہوں۔

ریویو

اسلام - یہ ایک مختصر سا رسالہ ہی۔ مسز اینی بسنٹ صاحبہ مشہور واعظہ نے اسلام پر ایک لکچر انگریزی زبان میں دیا تھا۔ میاں حسن الدین خاں صاحب خاموش نے سلیس اردو میں اسکا ترجمہ کرکے شائع کیا ہی۔ عزیزی پریس آگرہ سے ۲ر قیمت پر ملسکتا ہی۔ مترجم نے ترجمہ عام فہم ضرور کیا ہی مگر اس میں ہم کو دو نقص معلوم ہوتے ہیں۔ پہلا اور بڑا نقص تو یہ ہی کہ سہل انگاری سے اصل لکچر کے ایک ایک فقرے کی ترکیب اُسکے پرزور الفاظ اور اسکے انداز بیان کی خصوصیات کا مطلق نہیں لحاظ کیا گیا ہی۔ اور صرف مطلب سمجھکر اسکو اردو میں ادا کر دیا ہی جس سے

تمام خوبیاں لکچر کی ضائع ہوگئیں۔ دوسرا نقص یہ ہی کہ واعظہ نے بہت سی اصلی قرآن کی آیتیں اپنے لکچر میں نقل کی تھیں۔ مترجم نے اُن کی جستجو نہ کی۔ یہانتک کہ حافظ کا مشہور شعر

بمے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید　　　که سالک بیخبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

ہی جو مسز اینی بسنٹ نے پڑھا تھا اسکا بھی ترجمہ ہی کردیا ہی اور اصل شعر کو تلاش کر کے لکھنے کی زحمت گوارا نہ فرمائی۔ بحالیکہ ملک میں اسی وعظ کے اور بھی ترجمے ہوئے ہیں اُنھوں نے ان دونوں باتوں کا خیال کیا ہی۔

مسز اینی بسنٹ نے اپنے صلح کل مذہب کے مطابق اسلام کے ساتھ صرف اپنی سچائی ہی اور خلوص کا اظہار نہیں کیا ہی بلکہ اُنکے تمام وعظ کو غور سے دیکھنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہی کہ اُنھوں نے محنت کر کے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی ہی۔ اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہمقوموں کے خلاف نبوت ہی کے لباس میں دیکھا ہی۔

اُنھوں نے اس لکچر میں پیغمبر اسلام صلعم کی زندگی پر بچپن سے بڑھاپے تک ایک سرسری نظر ڈالی ہی۔ اور اُنکی پاک اور مقدس زندگی کا نہایت صاف الفاظ میں نمونہ دکھلایا ہے اُنکے اوپر خونریزی یا اور بعض فضول الزامات جو دوسری قومیں لگاتی ہیں اسکا نہایت مدلل اور صحیح جواب دیا ہی۔ پھر اُس کی صداقت کی دلیلیں بیان کی ہیں منجملہ اُن کے ایک دلیل یہ ہی۔

"حضرات میں اب پیغمبر عرب کی صداقت کا ایک اور ثبوت آپکے سامنے پیش کرتی ہوں وہ یہ ہی کہ پیغمبر پر سب سے پہلے اُن کی بیوی (حضرت خدیجہؓ) ایمان لائی تھیں جو اُن کی خانگی زندگی کی سب سے زیادہ رازدار تھیں۔ اور اُسکے بعد اُن کے نہایت قریبی رشتہ دار جو بچپن سے اُنکے عادات و اطوار سے بخوبی واقف تھے۔ ایمان لائے۔ ان امور پر اگر آپ غور کرینگے تو پیغمبر کی راستی کا بہت بڑا پتہ پائینگے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ یہ تو آسان بات ہی کہ کوئی فصیح و بلیغ شخص کسی ایسے مجمع میں

اپنی تقریر کے زور سے کچھ اپنے ہمخیال پیدا کرسکتا ہی جہاں لوگ صرف اُسے اسٹیج پر تقریر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اُس کی نج کی زندگی سے واقف نہیں ہوتے ۔ مگر یہ سخت مشکل بلکہ ناممکن ہی کہ خود بیوی ۔ لڑکے ۔ داماد ۔ قریبی رشتہ دار اُسکی صداقت کی گواہی دیں ۔ کیونکہ یہ جب ہی ہو سکتا ہی کہ جب وہ درحقیقت سچا ہو ۔ اور میرے خیال میں اسی کا نام پیغمبری ہی ؂

ان سب کے بعد انھوں نے قرآن کی بعض بعض اہم تعلیمات کا ذکر کیا ہی ۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی مختلف اقوال نقل کیے ہیں ایک جگہ کہتی ہیں " اب آپ ملاحظہ فرمایئے کہ پیغمبر عرب نے آج سے تیرہ سو سال پہلے علم کی فضیلت میں کیا فرمایا ہی علم حاصل کرو ۔ جو علم حاصل کرتا ہے وہ پارسا ہی ۔ جو علم کا ذکر کرتا ہی وہ اللہ کی حمد کرتا ہی جو اُسکو تلاش کرتا ہی وہ حقیقت میں عبادت کرتا ہی ۔ علم ہی انسان کو ممنوعات اور غیر ممنوعات میں امتیاز کرنا سکھاتا ہی ۔ علم ہی راہ بتلاتا ہی علم ہی تنہائی میں صادق دوست کا کام دیتا ہی ۔ جنگل میں غمگساری کرتا ہی ۔ علم ہمیں خوشحالی کی طرف لیجاتا ہی ۔ دُکھ میں وہ ہمارا ہمدرد ہی ۔ دوستوں کے مجمع میں وہ ہمارا زیور ہی ۔ دشمنوں کے مقابلے میں ہتیار ہی ۔ علم ہی سے اللہ کا عاجز بندہ نیکی کا اعلیٰ مرتبہ حاصل کرتا ہی ؂

پھر وہ کہتی ہیں کہ " پیغمبر صاحب کے اس قول کے الفاظ میرے دل پر وجد کی حالت طاری کردیتے ہیں جب میں اُن کی تہ پر نظر ڈالتی ہوں وہ فرماتے ہیں کہ " عالم کی سیاہی شہیدوں کے خون سے زیادہ قیمتی ہی ؂

اسکے بعد انھوں نے گزشتہ مسلمانوں کی حالت ۔ اُنکی نیکی ۔ اُنکی صداقت ۔ اُنکی علمی ترقیات مذہبی اور ملکی کوششوں کا نہایت فیاضی سے اعتراف کیا ہی اور یہ بھی تسلیم کیا ہی کہ تمام یورپ مسلمانوں ہی کے خرمن علم کا خوشہ چیں رہا ہی ۔

آخر میں انھوں نے حاضرین کو ہمدردی کا سبق دیا ہی ۔ اور تصوف کے پردے میں اسلام اور کفر کا مصافحہ کرا کے انکو باہم دوستانہ سلوک کی ترغیب دی ہی چنانچہ وہ کہتی ہیں " میرے بھائیو ! تم میں اکثر ہندو ہیں ۔ تمہارا مذہب اسلام نہیں ہی ۔ اسکا مضائقہ نہیں

معاملہ سب ایک ہے۔ دیکھو تمہارے ہاں کہتے ہیں (سوہم) (تو ہیمی) مسلمان صوفی کہتے ہیں (انا الحق) (حق تو) یعنی میں خدا ہوں۔ تو خدا ہی۔ تم ان رازونکے حقیقی لطف سمجھنے کی کوشش کرو۔ اور پھر تم اپنے سات کرور بھائیوں (مسلمانوں) سے بغلگیر ہوجاؤ جسکے بغیر ہم پوری قوم نہیں بن سکتے۔ تم کو بجائے نفرت کے انسے محبت کرنا چاہیے"۔

مسیز اینی بسنٹ جیسی صوفیہ اور مصلح کل عورت کے لیے یہی موزوں تھا جو اُنھوں نے کہا۔ لیکن ہم حقیقت میں اسکو پرلے سرے کا خبط سمجھتے ہیں کہ دو مختلف المذاہب قوموں میں اس طرح اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کیجائے کہ اُنکے مذہب کے ڈانڈے ملائے جائیں۔ آج تمام دنیا کے بیس بائیس کرور مسلمانوں میں سے سوائے ایک خیال پرست فرقہ کے کوئی بھی (انا الحق) (حق تو) کا قائل نہیں ہی۔ اور نہ کوئی اسکو پیغمبر اسلام یا قرآن کی تعلیم کہہ سکتا ہی۔ یہ ژولیدہ اور پیچیدہ غلط اعتقاد بھی ان لوگوں نے ہندوؤں ہی سے لیا تھا۔ یہ ایسا طریقہ اتحاد ہی جو ناممکن سے بھی کچھ زیادہ کہا جا سکتا ہی۔

مسلمانوں میں نہ چھوت چھات ہی نہ دوسری قوموں کے اتحاد اور اتفاق سے اُن کو کچھ کد ہی۔ اگر باہمی دوستانہ برتاؤ کے لیے کچھ موانع ہیں تو وہ ہندؤں کی ہی طرف سے ہیں۔ قومیت۔ اور ملکی اتحاد۔ دوستانہ برتاؤ کے لیے اتحاد مذہب کوئی ضروری چیز نہیں ہے۔ عیسےٰ بدین خویش۔ موسےٰ بدین خویش مقصد اور غرض ایک ہونی چاہیے۔

لڑکیوں کی پہلی کتاب۔ سلسلہ تعلیم نسواں کی اردو میں لڑکیونکے لیے پہلی کتاب مسز خاموش صاحبہ ایڈیٹر رسالہ پردہ نشیں کی تصنیف ہمارے پاس بغرض ریویو آئی ہی۔ ہم خوش ہیں کہ تعلیم نسواں کی طرف بیشتر اہل ملک کی طبیعتیں مائل ہو رہی ہیں۔ یہ کتاب ہمارے خیال میں بہت اچھی ہی۔ زبان بھی اس کی بہت سہل ہی جسکو چھوٹی لڑکیاں آسانی سے یاد کرسکتی ہیں۔ چھپائی۔ لکھائی کاغذ بھی عمدہ ہے آخر میں کئی ایک چھوٹے چھوٹے خط لکھے

گئے ہیں جنکے بجاے ہم مفید سبقوں کو زیادہ پسند کرتے۔

بہرحال ہم اس کتاب کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے عمدہ اور مفید خیال کرتے ہیں۔ اور امید ہی کہ لڑکیاں اسکو دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکینگی۔ اسکے ساتھ ہم یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ مسز خاموش صاحبہ اس سلسلہ کو اچھی طرح پورا کر سکیں

ملنے کا پتہ۔ عزیزی پریس آگرہ قیمت ایک آنہ۔

د۔ دنہائی المعروف بہ بارہ ماسہ ربانی۔ اُردو زبان میں کئی بارہ ماسے منظوم لکھے گئے ہیں لیکن یہ بارہ ماسہ اپنی طرز میں نرالا ہی۔ اس میں تصوف کے اسرار اور لطائف ہیں۔ اور نہایت عمدگی کے ساتھ چھپا ہے۔ اسکے مصنف مولانا عبداللہ صاحب انصاری ناظم دینیات علی گڑھ کالج ہیں۔ اس کی قیمت ۵/ ہے۔

مطبع مجتبائی دہلی سے ملسکتا ہے۔

خوشخبری

ناظرین خاتون ہماری معزز اور روشن خیال بہن مس عطیہ فیضی کے نام اور اوصاف سے بخوبی واقف ہیں۔ مس عطیہ فیضی وہی خاتون ہیں جو سرکار کی طرف سے ولایت میں تعلیم کی غرض سے بھیجی گئی تھیں۔ اُنھوں نے ایک سال تک ولایت کے ایک بڑے زنانے مدرسے میں تعلیم پائی اور وہاں کے لوگوں کے حالات اور میموں کی طرز زندگی کو اپنی آنکھ سے دیکھا اور اُس سے اپنی ملکی بہنوں کے لیے نہایت مفید سبق حاصل کیے۔ مس صاحبہ موصوفہ کے خیالات جو ولایت سے واپس لائی ہیں معلوم کرکے ہمیں کمال درجے کی خوشی حاصل ہوئی

ہمارے اکثر نوجوان مرد ولایت سے لوٹ کر آنے کے بعد اپنے وطن اور اہل وطن سے متنفر ہی دیکھے گئے ہیں بہت ہی قلیل تعداد اُن نوجوانوں کی ایسی ہے جو فی الواقع قوم کا درد اپنے دل میں لیکر واپس بمبئی کی بندرگاہ میں داخل ہوئی ہوں۔ لیکن مس عطیہ فیضی اس بارے میں کل مردوں سے مختلف الخیال ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ اپنی ملکی بہنوں کے لیے کچھ کریں اور یہ اُسی کا نتیجہ ہے کہ وہ ملک کی روشن خیال اور تعلیم یافتہ بہنوں سے جنوری آیندہ یعنی جنوری ۱۹۰۸ء میں کسی مقام پر ملنا چاہتی ہیں۔ وہ دہلی یا آگرہ کو اس ملاقات کا مرکز قرار دیتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ آیا کوئی بہنیں ایسی ہیں جو مذکورہ بالا ہر دو مقامات میں سے کسی مقام پر آنا چاہیں جہاں پر ملاقات و تعارف باہمی کا ایک جلسہ منعقد کیا جاے اور ایک یا دو روز تک سب بہنیں ملکر ایک مقام پر آئیں اور تبادلۂ خیالات کریں۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۲۷

خاتون

جلد ۴ | ماہ شوال ۱۳۲۵ھ مطابق دسمبر ۱۹۰۷ء | نمبر ۱۲

اڈیٹر شیخ محمد عبداللہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سکرٹری تعلیم نسواں اسکش

فہرست مضامین

علی محمد خان کے اہتمام سے

مطبع فیض عام علی گڑھ میں طبع ہوا

خاتون

۱۔ یہ رسالہ ۴۸ صفحے کا علیگڑھ سے ہر ماہ میں شائع ہوتا ہے اور اسکی سالانہ قیمت (دے/) اور ششماہی عہ/ ہے

۲۔ اس رسالہ کا صرف ایک مقصد ہے یعنی مستورات میں تعلیم پھیلانا اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا۔

۳۔ مستورات میں تعلیم پھیلانا کوئی آسان بات نہیں ہے اور جبتک مرد اس طرف متوجہ نہو نگے مطلق کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ اس خیال اور ضرورت کے لحاظ سے اس رسالے کے ذریعے سے مستورات کی تعلیم کی اشد ضرورت اور بے بہا فوائد اور مستورات کی جہالت سے جو نقصانات ہورہے ہیں اُس کی طرف ہمیشہ مردوں کو متوجہ کرتے رہینگے۔

۴۔ ہمارا رسالہ اس بات کی بہت کوشش کریگا کہ مستورات کے لیے عمدہ اور اعلیٰ لٹریچر پیدا کیا جائے جس سے ہماری مستورات کے خیالات اور مذاق درست ہوں اور عمدہ تصنیفات کے پڑھنے کی اُنکو ضرورت محسوس ہو تا کہ وہ اپنی اولاد کو اس بڑے لطف سے محروم رکھنا جو علم سے انسان کو حاصل ہوتا ہے معیوب تصور کرنے لگیں۔

۵۔ ہم بہت کوشش کرینگے کہ علمی مضامین جہانتک ممکن ہو سلیس اور بامحاورہ اُردو زبان میں لکھے جائیں۔

۶۔ اس رسالے کی مدد کے لیے اسکو خریدنا گویا اپنی آپ مدد کرنا ہے اگر اس کی آمدنی سے کچھ بچیگا تو اس سے غریب اور یتیم لڑکیوں کو وظائف دیکر استانیوں کی خدمت کے لیے تیار کیا جائیگا۔

۷۔ تمام خط وکتابت و ترسیل زر بنام اڈیٹر خاتون علی گڑھ ہونی چاہیے۔

بقیہ سفر رانچی

کول قوم کا مذہب

ان لوگونکے مذہب کا حال بھی اچھی طرح معلوم نہیں ہو سکتا ہی، یہ لوگ ہندوؤں، عیسائیوں، مسلمانوں الغرض ہندوستان کے سب لوگونکو اجنبی اور ایک طرح سے کافر خیال کرتے ہیں، جب تک ان کی شادی نہیں ہوتی اُسوقت تک یہ لوگ مرد اور عورت بالکل آزاد رہتے ہیں اور کسی قسم کی کوئی قید انپر نہیں ہوتی، کنواری لڑکیوں کو گاوں میں پھرنے چلنے گانے بجانے اور کھانے پینے میں بیاہی عورتوں سے کہیں زیادہ آزادی ہے، اور کسی قسم کی روک ٹوک نہیں، مگر شادی کے بعد یہ لوگ مذہب اور رسوم کی قید میں جکڑ جاتے ہیں، مثلاً کوئی بیاہا مرد یا عورت ہم لوگوں کی دی ہوئی چیز نہیں کھا سکتا، یہانتک کہ اگر کھانا کھاتے وقت کوئی غیر مذہب کا آدمی ان کو ہاتھ لگا دے تو انکا مذہب ٹوٹ جاتا ہی، اور جب تک تمام برادری جمع نہ کی جائے اور پاہن کو پانچ چھ روپیہ نہ دیے جاویں اُسوقت تک وہ شخص برادری میں شامل نہیں ہو سکتا۔

شادی بیاہ کے معاملے میں انکے ہاں بہت آزادی ہی، لڑکا اپنی دُلہن خود تلاش کرتا ہی، والدین یا عزیز و اقارب کو اس میں کچھ دخل نہیں ہوتا، جب کبھی کسی لڑکے کی شادی کرنا منظور رہوتی ہی اسکو شام کے ناچ کے جلسوں میں کنواری لڑکیوں میں بھیجدیا جاتا ہی، اور کچھ دن تک وہ باقاعدہ ان جلسوں میں شریک ہوتا ہی اور اسی جماعت میں سے وہ اپنے لیے اپنی حسب منشا لڑکی تلاش کرلیتا ہی:-

یہ لوگ نہایت ایماندار، رہستباز، اور نہایت ہی عمدہ اخلاق کے آدمی ہیں، عورت کا غیر مذہب والے مرد سے بات چیت کرنا اُسکو برادری سے خارج کردینے کے لیے کافی ہی، جہانتک مجھکو معلوم ہوا ہی یہ لوگ ابتک دہوکہ دہی، فریب، دغابازی، اور دیگر عیوب سے جو آجکل ہندوستان میں قریب قریب ہر قوم میں کم و بیش پائے جاتے ہیں بالکل پاک ہیں، بالخصوص وسط چھوٹا ناگپور کے لوگ تو ابتک فی الواقعی وہی زندگی بسر کررہے ہیں جسکا ذکر اکثر قصوں اور کہانیوں میں سُنا جاتا ہی:-

انکے ہاں قسم کھانے کا عجیب دستور ہی، جب تک کوئی شخص ہاتھ میں گوبر لیکر قسم نہ کھائے اُس کی قسم سچی نہیں سمجھی جا سکتی:-

پاہن یعنی مذہبی پیشوا

ان کا مذہبی پیشوا ہی ان کی برادری کا بھی پنچ ہوتا ہی اُسکو پاہن اور کبھی بھوین ہر بھی کہتے ہیں، یہ لوگ بھوت کی پوجا کرتے ہیں اور ہر گاؤں میں چند کھیت بھوت کی پوجا کے لیے مخصوص ہوتے ہیں؛ ان کھیتوں کی آمدنی پاہن یا بھوین ہر رکھتا ہے اور وہ تمام گاؤں کے لیے بھوت کی پوجا کرتا ہی اور اُسکو خوش رکھتا ہی؛ چونکہ میں نے سُنا ہے کہ اکثر انگریزوں کو اس بات کا شوق ہی کہ ان اقوام کے گیت جمع کرکے اُنکا ترجمہ اخباروں میں چھپوایا جائے اور بعض انگریزوں نے ایسا کیا بھی ہے اسلیے مجکو بھی جرات ہوئی کہ ان لوگوں کے حالات کو چند گانوں پر ختم کردوں۔ یہ گیت اُڑاؤں زبان کے ہیں، شاید کسی بہن کو ان میں سے کوئی بات دلچسپ ملے۔ یہ گیت اکثر گاؤں کے جلسوں کے موقعوں پر گائے

جاتے ہیں۔

منڈاری اور اڑانوی گیت

گیت	ترجمہ
(۱) جوُں آن بھیّارے جین ہری چھاگڈا آ سے	اے جوان بھائی تم اپنا جی کھو رہے ہو
نمارُ وبیلُوکنّے جین ہری چھالڈا سے	(بار بار میکے جانیوالی) لڑکی کی خاطر
بیڑی ارگو بیڑی جوان بھیّارے	اپنا جی کھو رہے ہو،
	طلوع آفتاب کے وقت جوان بھائی تم
(۲) ننگن ایدوں ایدوں	میں تمہاری راہ دیکھتی ہوں دیکھتی ہوں
ُملم لے تھرُدےُ اکُسن را، دے	تم دکھائی نہیں دیتے تم کہاں ہو
دھیرا بیجاگے ایدوں ایدوں	(ناچیں) باز و بازو ملانیکے لیے تمہاری راہ دیکھتی ہوں تم دکھائی

اس گیت سے ان کی آزادی اور بال سسٹم یعنی ناچ پارٹی کا پتہ چلتا ہے۔

گیت	ترجمہ
(۳) چوکوئے چُنجاگے کلا اسے	اُٹھ۔ دہان کوٹنے کو جا اے چھوکری
ہا ای کومنخا اولم ر ئی	ہاں چھوکرے، بھینس بھی گھر میں ہی ہے
بیری بیر چنجاگے کلا اُسے	صبح کے وقت دھان ... ...
(۴) ُنلکھن ننالے کوئے کنڈی پیلو	اپنا کام کر، اری سُست چھوکری
راجی کیڑا ہُڈر ہڈر رابرآ لگن	قحط دھب دھب (جلد) کرتا ہوا آرہا ہے،
بیری بیری کو لے کنڈی پیلو	صبح کو کام کر اری سُست چھوکری

اس گیت میں قوم کو محنت اور مزدوری کی طرف رغبت دلائی جاتی ہے اور اُن کو چُست بنایا جاتا ہے۔

(۵) وائے منجی کوٹ چورے یا پیلو — تمھارے لیے اچھا ہوا اے چوریا کی چھوکری
گو باری گڈمی نوں ہٹرا الگدی — کہ تم گوبر کے گڈھے میں گر رہی ہو
پیڑی بیڑی سری ار گو بیری — صبح کو آفتاب طلوع کے وقت
گو باری گڈمی نوں ہٹرا الگدی — تم گوبر کے گڑھے میں گر رہی ہو

اسکا مطلب یہ ہے کہ اچھا ہوا تم کو علی الصباح گوبر میں ہاتھ بھرنے پڑے۔ یعنی خدا نے تم کو اتنے مویشی دیے کہ تم کو انکا انتظام خود کرنا پڑا۔ اسلیے گوبر میں ہاتھ بھرنے والی لڑکی خوش قسمت و بہال ہے۔

(۶) دھیرم توکا گیو چھیلا — دھیرے سے ناچو اور گیو چھیلا
مینا پیلو ننگن ایرا نگی — مینا چھو بیری تم کو دیکھتی ہے
بیری بیری توکا گیو چھیلا — صبح کو ناچو اور گیو چھیلا
مینا پیلو ننگن ایرا نگی — مینا چھو بیری تم کو دیکھتی ہے۔

ان گیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم آزادی اور ناچ رنگ کی کسقدر دلدادہ ہے اور انھیں گیتوں میں قوم کے نوجوان بچوں کو مخاطب کرکے ہمت اور چستی کی تعلیم دیجاتی ہے اور انکے پاک جذبات کو تربیت دی جاتی ہے۔ ان گیتوں کا اثر نوجوان لڑکیوں کے منہ سے افراد قوم پر ایسا ہی پڑتا ہوگا جیسا کہ انگلستان کے ملاحوں کے ناچ گھر میں وہاں کے نوجوانوں پر۔

سمندر کی خدمت میں جانا میری جان . . . الخ

کا اثر ہوتا ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ ان لوگوں کی آبائی ہمتوں کا زمانہ ختم ہوچکا اور اب انکے یہ گیت صرف تفریح ہی کے لیے ہوتے ہیں۔ اور برعکس اسکے انگلستان کی قوم زندہ ہے اور وہ اُن سے عملی سبق حاصل کرتی ہے، اور گیتوں کو میں طوالت کے خوف سے نہیں لکھتی اسی پر اکتفا کرتی ہوں۔

بنگالی قوم کی مستورات کے حالات

یہاں آکر چند بنگالی مستورات سے بھی ملاقات ہوئی، چونکہ بنگالی آجکل ہندوستان کی نہایت زبردست قوموں میں شمار کیے جاتے ہیں اسلیے شاید خاتون کے ناظرین کو ان لوگوں کے حالات معلوم کرنے میں کچھ دلچسپی ہو، میں ان لوگوں کے متعلق نہایت مختصر طور پر صرف وہی باتیں لکھنا چاہتی ہوں جو مجھے دلچسپ نظر آئیں۔

میں ابتک یہی سمجھی ہوئی تھی اور یہی اکثر سُنا کرتی تھی کہ بنگالی سیاہ فام اور فربہ اندام ہوتے ہیں، اسلیے سب سے پہلی بات جو مجکو عجیب معلوم ہوئی وہ بنگالی مستورات کا

اُنکا حسن

رنگ تھا، مجھکو شاید کوئی نصف درجن عورتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہی مگر میںنے ایک کو ایک سے بڑھکر پایا، بار بار مجھکو اپنے سابق خیال پر ندامت ہوتی تھی، سیاہ فام ہونا تو کجا یہ لوگ مجکو تو دیکھنے میں نہایت ہی حسین معلوم ہوئے، بڑی بڑی آنکھیں، لانبے لانبے بال، جنکو کئی کئی طرح پر بناتی ہیں، اور زبان نہایت شیریں، لباس بھی مجکو تو اپنی طرف کے تنگ وچُست پاجاموں اور چین لگے ہوے دوپٹوں سے ان لوگونکی ساڑی اور جاکٹ جسکو یہ نہایت ہی ہنرمندی سے سیتی ہیں اور سایہ ہلکے پھیکے بیل اور چین دستی پھول اور کٹا وسے مزین کہیں زیادہ خوشنما اور موزوں معلوم ہوتا ہے۔

مگر سب سے زیادہ عجیب بات جو دیکھی وہ باوجود جوتا، گرگابی وغیرہ گھر میں رہنے کے انکا ننگے پاؤں پھرنا تھا، جب کسی کے ہاں مہمان جاتی ہیں تب بھی اکثر برہنہ پاؤں؛ ہمارے ہاں بھی جب کبھی آئیں برہنہ پاؤں ہی آئیں۔

اخلاق

مجھپر ان بنگالی مستورات کے اخلاق، ان کی بے تعصبی، اُن کی اعلیٰ تہذیب، ان کی خوش سلیقگی، اور سب سے بڑھکر اُن کی مہمان نوازی اور اُنکے میل جول کا نہایت اثر ہوا، گو ہم لوگ ان کی زبان نہیں سمجھ سکتے تھے تاہم اُنھوں نے ہماری خاطر و تواضع اور ہم کو اس مقام سے مانوس کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، گو ہم کو ابھی یہاں آئے

ہوئے کچھ بھی عرصہ نہیں ہوا مگر اتنے دنوں ہی میں ان لوگوں کے اخلاق نے ہمارے دلوں کو اسقدر تسخیر کر لیا کہ گویا برسوں کی ملاقات ہے۔ شاید ان بنگالیوں کے اخلاق کا ہی نام لوگوں نے سحر بنگالہ رکھ لیا ہے:

طرز معاشرت مسٹر کے جی گپتا جو حال میں ہی انڈیا کونسل کے ممبر مقرر ہوئے ہیں انکے چھوٹے بھائی مسٹر جی، جی گپتا یہاں ایک اعلیٰ عہدے پر مامور ہیں، ہم لوگوں کو انکے ہاں آنے جانے کا زیادہ تر اتفاق ہوا اور اسوجہ سے گویا بنگالیوں کی اعلیٰ گروہ کی مستورات کی طرز معاشرت کے دیکھنے کا اچھا موقع مل گیا اور انکے ذریعے سے ہی یہاں اور اعلیٰ درجے کے بنگالیوں کے ہاں آنے جانے کا موقع ملا۔ واقعی ان لوگوں نے ہر بات میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور کچھ عجب نہیں کہ بنگالیوں کی ترقی اور اعلیٰ تہذیب ان کی مستورات کی وجہ سے ہوئی ہو، لباس میں ان لوگوں نے مشرق و مغرب کو ایسی خوبی سے ملایا ہے کہ بالکل نئی بات پیدا کی ہے، کھانے میں ان لوگوں نے زیادہ تر مغربی روش کو اختیار کر رکھا ہے، اکثر گھروں میں انگریزی کھانا پکتا اور انگریزی طریقے سے کھایا جاتا ہے، مگر مٹھائیاں اپنے ہاں کی خود تیار کرتی ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اس ہنر کو ان لوگوں نے فن کے درجے پر پہنچا کر اس میں پورا کمال پیدا کیا ہے، ایک مرتبہ جب ہم لوگوں نے ان کی دعوت کی تو علاوہ انگریزی کھانوں کے شامی کباب اور بریانی بھی پکوا کر پیش کی ان دو کھانوں کو انھوں نے خاص طور پر پسند کیا اس خیال سے دو ایک روز کے بعد میں نے کچھ بریانی اور شامی کباب خاص اہتمام سے خود تیار کر کے مسٹر گپتا کے گھر پر بھجوا دیئے، بس پھر کیا تھا، انکے ہاں سے آئے دن قسم قسم کی مٹھائیاں بنکر آنے لگیں مجکو ندامت ہوتی تھی کہ میں سوائے اپنے ہاں کے مزعفر، پھرنی، فیرنی، وغیرہ کے اور کچھ نہ پکوا سکتی تھی، ہاں ہمارے ہاں کی چپاتیاں بھی یہ نہایت شوق سے کھاتے تھے اور انکے پکانے پر نہایت ہی تعجب کرتے تھے کہ تم ہاتھ سے

کیسے اتنی بڑی اور باریک پکالیتی ہو، کیونکہ ادہر نہ کوئی کھاتا ہے نہ پکاتا، اسلیے مسز جی گپتا نے مجھ سے کہا کہ آپ خود پکا کر دکھائیے میں بھی پکانا سیکھ لوں گی، جب وہ باورچی خانے میں گئیں تو پہلے تو پتلے آٹے کو ہی دیکھکر حیران رہگئیں کہ ہیں! اس کی روٹی کیسے پک سکتی اور بڑھ سکتی ہے مگر جب جواب ملا کہ ایسے ہی آٹے کی عمدہ روٹی پکتی ہے تو یہ پکنے سے پہلے تو اُنکے سمجھ ہی میں نہ آیا، ایک روٹی تیار ہونے پر بہت خوش ہوئیں، اور خود بھی کوشش کرنے لگیں مگر وہ تو پتلے آٹے سے ہی ڈر کر ہاتھ نہ چلا سکیں۔

بنگالیوں کی بے تعصبی

تعصب تو انکے ہاں نام کو بھی نہیں، یہ نہیں کہ اپنے مذہب میں کچی ہوں یا متزلزل الاعتقاد ہوں، برخلاف اسکے یہ لوگ اپنی پوجا پاٹ کے نہایت پابند ہیں۔ مگر باایں‌ہمہ ہم لوگوں کے ساتھ کھانے پینے سے اُن کو مطلق احتراز نہیں! میںنے اپنے ہاں کے لوگوں میں مذہب کے معاملے میں یہ وسعت نظری کہیں نہیں دیکھی جو ان لوگوں میں پائی، فی الواقع ہندوستان کی کوئی قوم اگر عیسیٰ بدین خود و موسےٰ بدین خود، کے اصُول پر کاربند ہے تو وہ بنگالی ہیں، یہ لوگ اپنے مذہب میں پکا رہنا بھی جانتے ہیں اور دوسروں کے مذہبی خیالات اور عقیدوں کی حرمت کرنا بھی اپنا فرض خیال کرتے ہیں - ایک موقع پر ماہ رمضان شریف میں ان لوگوں کا بہت بڑا تہوار یعنی درگا پوجا جسکو ہمارے ہاں دسہرا کہتے ہیں آپڑا، ان لوگوں نے ہماری اور رانجی کی چند اور معزز خواتین کی دعوت کی ہم لوگ شام کے چار بجے انکے ہاں گئے، چاء وغیرہ کا سامان تیار تھا اور وقت بھی آگیا تھا، مگر محض اس خیال سے کہ ہم چاء میں بوجہ روزے کے شریک نہیں ہوسکتے تھے ان میں سے کسی نے چاء نہیں پی اور افطار کے وقت تک انتظار کیا۔"

کھانا کھانے کے بعد رسم "راکھی بندھن" ادا کی گئی یعنی اُنکے ہاں کی مستورات نے باہم اپنی اپنی راکھی ایک دوسرے سے تبدیل کی، چونکہ ہمارے ہاتھوں پر راکھی نہیں تھی

اسلیے مسز گپتا نے ہمارے ہاتھوں پر خود راکھی باندھی اور پھر ہم نے بھی اوروں سے اپنی اپنی راکھی تبدیل کی۔ راکھی باندھتے وقت چند جملے بھی کہتی تھیں جسکے معنی مجھے بعد میں معلوم ہوئے۔

راکھی کی رسم کے بعد گانا بجانا شروع ہوگیا۔ رات کے بارہ بجے تک پیانو، ہارمونیم بجتا رہا۔ بسبر بنگالی ترانے اور نہایت شیریں گانے سنتے رہے۔ موسیقی کے یہ لوگ خاص طور پر شائق ہیں۔ اور اعلیٰ درجے کے بنگالیوں کو چھوڑ متوسط الحال بنگالیوں میں بھی شاید ہی کوئی ایسا گھر ہوگا جہاں کم از کم ہارمونیم نہ ہو اور مستورات گانا عمدہ نہ جانتی ہوں۔ ہندوستانی گانوں کو پیانو پر ایسی ہی خوبی و کمال کے ساتھ بجایا جاتا ہے جیسے کہ ستار یا ہارمونیم پر۔ لڑکیوں کو علاوہ دیگر تعلیم کے کچھ موسیقی بھی سکھائی جاتی ہے مسز گنگا گوبند گپتا کی لڑکی تو پیانو میں ید طولیٰ رکھتی ہیں اور علاوہ بنگالی اور چند ہندوستانی گانوں کے

موسیقی کا شوق

انگریزی گانے بھی نہایت خوبی کے ساتھ پیانو پر بجاتی ہیں۔ طبلہ اور وائلن کا بھی عام رواج ہے۔

الغرض میں بیان نہیں کرسکتی کہ ہم پر ان لوگوں کی طرز معاشرت انکے اخلاق ان کی شائستگی اور ان کی بے تعصبی کا کسقدر اثر ہوا۔ تہذیب اور تعلیم مگر ساتھ اسکے اپنی مذہب کی پابندی آزادی اور تعلیم فنون سیکھنے کا شوق لیکن اپنے ہاں کی رسوم سے وابستگی۔ گویا ہر بات میں مشرق و مغرب کا ایسا عمدہ میل پیدا کیا ہے کہ واقعی اُن کی زندگی قابل رشک ہے:

معلوم نہیں کہ یہ مضمون بہنوں کو پسند ہو یا ناپسند مگر مجکو تو چونکہ اس قسم کی زندگی کے دیکھنے کا پہلا ہی موقع ملا اور میں خیال کرتی ہوں کہ شمال ہند کی مجھ جیسی بہنوں میں سے بہت کم کو یہ اتفاق ہوا ہوگا اسلیے مجھے یہ خیال کرنے میں جرأت ہوتی ہے کہ شاید یہ طبقہ بھی ان حالات کو اسی تعجب کے ساتھ پڑھے جسکے ساتھ میں نے اُن کو دیکھا اور اُنکو ان

چند سطور میں کسی قسم کی دلچسپی ہو"

ممکن ہی کہ بہت سی باتیں میں نے فضول اور بلاضرورت لکھدی ہوں مگر جیسا کہ میں پہلے لکھ چکی ہوں یہ مضمون محض اُن تاثیرات کا ایک خاکہ سا ہی جو یہاں کے لوگوں کی طرز معاشرت نے مجھ پر پیدا کیا"

راقمہ
امراؤ بیگم
از رانچی (مغربی بنگال)

تربیت جسمانی

(۱) جسم

(۲) اُس کی حفاظت اور پرورش

ہوا پانی خوراک۔ ورزش پوشاک

(۱) جسم

جسم ایک پیچ در پیچ کل ہے جو زندگی کے تمام مقصدوں کو پورا کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔

ہم اُسکی نسبت یہ تصور کرسکتے ہیں کہ اُس میں کئی مختلف محکمے ہیں اور ہر صیغہ پر ایک قابو رکھنے والی طاقت حکمراں ہی

اس کل کا ڈہانچا ہڈیوں کا ایک گھروندا ہی اور یہ ہڈیاں جسم کے اُس حصے کے مطابق جن میں کہ اُن کو رکھا گیا ہی اور جس کام کے لیے اُن کو مخصوص کیا گیا ہی مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً ٹانگوں اور بازوؤں کی ہڈیاں لمبی ہوتی ہیں سر کی چپٹی ہوتی ہیں کہ جنسے کھوپڑی بنتی ہی۔ ہڈیوں کو پٹھوں نے ڈہانک رکھا ہی جو کہ ارادے کے تابعدار

خدمت گزار ہیں اور جو کہ دماغ کے ادنیٰ حکم پر جسم کے کسی حصہ کو ادہر اور اُدہر حرکت دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

دماغ کے حکم پٹھوں تک اُن وفادار قاصدوں یعنی سفید رنگ کی رگوں کے ذریعے سے پہنچتے ہیں جو دماغ سے نکلتے ہیں اور جنکو کہ انگریزی میں نرو کہتے ہیں۔ پٹھے جسم کے ہر نرم اور گدار حصے میں موجود ہوتے ہیں۔ انسانی ڈہانچے کے اس کام کرنے والے حصے کی پرورش کرنے کے لیے خون کی نالیاں ، بڑی رگیں ، ہوتی ہیں جو کہ غذائے پرورش یعنی خون کو دل میں سے لیجاتی ہیں۔ اور یہاں یہ بھی بتانا ضروری ہی کہ دل کہاں ہوتا ہی۔ دل سینے کے بائیں جانب والے حصے میں پسلیوں کے نیچے ہوتا ہی۔

خون دل سے روانہ ہو کر ان نالیوں کے ذریعے سے جنکو انگریزی میں آرٹری کہتے ہیں تمام جسم کا چکر لگاتا ہی اور جہاں جہاں سے کہ وہ گزرتا ہی پرورش کا مادہ چھوڑتا جاتا ہی۔ جسم کے انتہائی حصوں تک پہنچ کر اور پرورش کا راتب تقسیم کر کے وہ چھوٹی رگوں کے راستے سے واپس جاتا ہی (جنکو انگریزی میں وین کہتے ہیں) ان رگوں میں سے واپس ہو کر خون پھیپھڑے میں پہنچتا ہے جہاں اُسکو تازہ ہوا صاف کرتی ہی اور طاقت دیتی ہی اور وہانسے پھر دل میں پہنچتا ہے۔ اور دل میں سے پھر اُسی طرح پھیلتا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اور اُسی طرح پھر واپس آتا ہی۔ غرض ہر وقت ایسے ہی ہیر دن پھیروں میں مصروف رہتا ہے۔

پھیپھڑے ہوا کے بڑے بڑے گودام یا خزانے ہیں۔ اور وہ پسلیوں کے نیچے سینے کے دونوں جانب رکھے ہوتے ہیں۔ پھیپھڑوں میں بہت سی چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں یا سوراخ ہوتے ہیں۔ ان کھڑکیوں میں جب ہوا داخل ہوتی ہی تو وہ پھیلجاتی ہیں اور جب ہوا اُن میں سے نکلجاتی ہی تو وہ سکڑجاتی ہیں۔ پھیپھڑوں کو ہوا باہر کی طرف سے مُنہ ناک اور حلق میں سے ہو کر پہنچتی ہے۔ اس ہوا میں سے وہ حصہ جو جسم کے لیے اچھا ہوتا ہے

اُسکو تو پھیپھڑے لے لیتے ہیں اور لیکر خون کو دیدیتے ہیں کہ خون اُسکو تمام بدن میں تقسیم کرآئے۔ مگر جو حصہ ہوا کا کارآمد نہیں ہوتا یا بُرا ہوتا ہی اُسکو پھیپھڑے سانس کے ذریعے سے باہر نکال دیتے ہیں۔

وہ بڑی سڑک جسپر سے جسم کے ہر رگ و ریشے کے لیے غذا کا سامان روانہ ہوتا ہے، مُنہ حلق اور سر چہرہ ہی جسکو انگریزی میں (ایلی منٹری ہز) کہتے ہیں۔

اس کی ابتدا مُنہ سے ہوتی ہی کہ جہاں خوراک داخل ہوتی ہے۔ یہاں سے ہوکر وہ معدے میں گزرتی ہے۔ معدہ ایک ڈھیلی ڈھالی تھیلی ہوتی ہے۔ یہ تھیلی کئی کئی فٹ لمبی آنتوں کے بیچ میں ہوتی ہے۔ جو کہ پیٹ میں اینڈوی کی طرح یعنی (گولائی) میں بچھی ہوتی ہیں۔ جو غذا کہ جسم کے لیے اچھی اور مفید ہوتی ہی آنتوں کے ذریعے سے قبول کرتی جاتی ہی اور جو کہ ردّی اور ناکارہ ہوتی ہے وہ سب نچلی آنت کے ذریعے سے جسکو انگریزی میں (رکٹم) کہتے ہیں خارج ہوجاتی ہی۔ غذا کے قبول اور نامنظور کرنے کے کام میں جگر اور اور اعضا مدد دیتے ہیں۔

دماغ اور نظام عصبی (نظام عصبی سے مراد پٹھوں اور سفید رگوں کا وہ جال ہی جو دماغ سے نکلکر سارے جسم پر پھیلا ہوا ہے)

ملکِ جسم کے حکمراں ہیں جو چپکے چپکے اپنا حکومت کا کام کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے اعضا کی وہ حرکتیں جنکو کہ ہم دیکھتے ہیں وہ بھی انھیں کی ہدایت سے ہوتی ہیں کہ خیال دماغ میں آتے ہی ان پٹھوں کو حرکت دیتا ہے اور پٹھوں کے ذریعے سے جسم کا وہ حصہ جسکا حرکت کرنا ضروری ہوتا ہے ہل جاتا ہے یا کام کرنے لگتا ہی۔ ہمارے اعضا کی وہ حرکتیں جنکو کہ ہم نہیں دیکھ سکتے۔ وہ بھی باریک اور نازک پٹھوں کے ایک جال کے ذریعے سے اور اُس کی ہدایت سے پوری ہوتی ہیں۔

مثلاً پھیپھڑوں کا پھیلنا اور سکڑنا۔ دل کا حرکت کرنا۔ ایلی منٹری ہز کے

ذریعے سے غذا کا نیچے اُترنا اور ہضم ہونا۔ آنکھوں کا دیکھنا اور کانوں کا سُننا۔

بھیجا یا دماغ کھوپڑی کے اندر ہوتا ہی اور وہ ایسی حکمت سے بنا ہوا ہوتا ہی کہ جسم کے تمام مقصدوں اور خدمتوں کو پورا کرتا ہی۔

دماغ میں سے وہ نازک اور باریک خبر رساں تار نکلتے ہیں جو جسم کے ہر حصے میں پہنچتے ہیں اور انہیں تاروں کے ذریعے سے ہر عضو اور ریشے ریشے کو دماغ کے وہ حکم مل جاتے ہیں جنکا اوپر ذکر ہوا۔

کبھی ہم کو ان حکموں کی خبر ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی۔ ان خبر رساں تاروں کا انگریزی نام نرو ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہی۔

گُردے اور مثانے جسم میں سے خراب پانی کو نکالنے کے لیے گویا ایک گندے نالے کا کام دے رہے ہیں۔

اس مختصر بیان کے خاتمے پر جو جسم کے متعلق ہے یہ بھی بتانا ضروری ہے کہ علاوہ اُن اعضا کے جن کا ذکر اوپر ہوا چند اعضا اور بھی ہیں جنکے سپرد خاص خاص کام ہیں۔

مثلاً آنکھ	جو صرف دیکھنے کے لیے ہے۔
ناک	سونگھنے کے لیے۔
کان	سُننے کے لیے

راقم

ڈاکٹر مس سہراب جی

ایک مبارک سنجوگ

بہن ساجدہ بیگم آداب عرض ہی۔ ساجدہ بیگم جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئیں بہن کو گلے لگایا

دعا دی پھر دونوں مل جلکر بیٹھیں۔

عابدہ بیگم بہن مزاج شریف۔

بہن۔ اچھی تو ہوں مگر۔

عابدہ۔ کہو کہو یہ مگر کیسا۔

ساجدہ۔ نہیں کچھ نہیں۔

عابدہ۔ نہیں میں کبھی نہ مانونگی

ساجدہ۔ مگر تم سے شکایت ہی کہ مہینوں اپنی خیریت سے محروم رکھتی ہو صورت کو ترساتی ہو اور مجھی کو اُلٹا اُلہنہ دیتی ہو۔

عابدہ۔ بہن معاف کیجیے گا میری طبیعت کچھ علیل ہو رہی تھی جب ذری سنبھلی تو مجھے ایک معزز گھرانے کی شادی میں جانا ضرور تھا چونکہ دُلہن کے والد کا اصغر کے آبا سے برادرانہ تعلق ہی اسلیے اُن کی تاکید اکید تھی کہ ضرور شادی میں شامل ہوں۔ کل شام کو بفضل خدا شادی اتمام کو پہونچی۔ میں نے آج صبح تمہارے ہاں کا قصد کیا کہ بہن کو دیکھ لوں اور اس مبارک سنجوگ کا کچھ ذکر کروں امید ہے کہ تم بھی بہت خوش ہو گی جو سُنیگا وہ خوش ہوگا۔

ساجدہ۔ ہاں ضرور سناؤ ہم شوق سے سنیگے خوش ہونگے۔

عابدہ۔ اے واہ میں یوں ہی کچھ تھوڑا ہی سُناؤنگی۔ جی نہیں معاف رکھیے۔ اگر ایک اقرار کرو تو شوق سے سُناؤں۔

ساجدہ۔ آخر وہ کیا اقرار ہے

عابدہ۔ آئے زبان سے اقرار تو کرو۔

ساجدہ۔ ہاں بہن ہاں جو تم کہو گی ضرور کر دوں گی۔ تم تو میری بہن ہو جیسی تمہاری خوشی ویسی ہی میری۔

عابدہ۔ میں بہت خوش ہوئی لو اقرار ہو گیا۔ دیکھو بہن اگر ایسی ہی بیاہ شادیاں ہم سب یکدل بنکر رچانے لگیں اور جو بہنیں کہیں کہیں اپنی اولاد کی بیاہ شادی کر رہی ہیں ان کی تائید کریں انکا دل بڑہائیں تو ہم بہت جلد سنور جائینگے۔ نہایت مہذب طریقہ سے رسوم ادا کیے گئے۔ ماشاء اللہ لڑکے اور لڑکی کے والدین نہایت روشن خیال مہذب تعلیم یافتہ بزرگ ہیں۔ جبھی تو جتنے براتی تھے۔ تحسین و آفرین کے دوہرے دوہرے خلعت والدین کو دولھا دولہن کے اس مبارک سنجوگ میں دیے۔ بہن میری تو دلی آرزو اور سچی دعا ہے کہ ہماری ہمجنس بہنیں ہمقوم بھائی سب ان معزز شادیوں کی تقلید کریں جو شاذ و نادر گھرانوں میں ظہور میں آتی ہیں۔

ساجدہ۔ ہاں سُنا ہے کہ بڑے امیر و کبیر مانے جاتے ہیں مگر یہ بھی سُنا ہے انکے شان کے مطابق کوئی سامان نہ تھا نہ کچھ دہوم دہام رہی حالانکہ براتی سب کے سب امیر امرار معزز عہدہ دار عالی تبار تھے۔

عابدہ بیگم۔ یہ آپ سے کسنے کہا ہے کہ کوئی سامان اُن کی شان کے مطابق نہ تھا۔ خدانخواستہ ایسا تو کوئی امر ظہور میں نہ آیا۔ ہر طرح کا انتظام بڑی خوش اسلوبی سے کیا گیا تھا کیا مجال جو ذری بھی بدانتظامی ہوئی ہو ہاں یہ بات ضرور تھی نوبت نقارے طوائف ڈومنی وغیرہ کا طوفان بے تمیزی برپا نہ تھا۔ نہ بیہودہ مراسم ادا کیے گئے۔ لڑکی ماشاء اللہ چشم بد دور تعلیم یافتہ مہذب ہر ایک ہنر میں ماہر ہے۔ خدا رکھے بیگمیں بیبیاں لڑکیاں بچے عزیز رشتہ دار سبھی جمع تھے۔ مگر کیا مجال جو بے فائدہ شور و غل مچا ہو۔ ہر چیز قرینے سے وقت پر۔ یہ دیکھکر مجھے اور بھی تعجب ہوا کہ گھر کی بیگمیں برابر کام خود بھی کر رہی تھیں اپنے ساتھ ماماؤں لڑکیوں کو بھی ہاتھ بٹانے کے لیے تاکید تھی۔ نہ غرور نہ تکبر ہر ایک کی خاطر تواضع۔ خیر یہ تو میںنے مانا کہ اپنا گھر ہی کام دہندا کر لیا مگر اس بات کا تعجب ہے کہ جو مہمان بیبیاں تھیں وہ (جیسا کہ گھر والی

کے جان پر عذاب ہوتی ہیں گھر کا کام دھندا چھوڑ چھاڑ ان کی ہی خاطر تواضع میں بسر کرنا ہوتا ہے ، یہ وہاں نہ تھا بلکہ جو بیبیاں پہلے سے آچکی تھیں وہ ہر نئی اُترنے والی بی بی کی خاطر تواضع میں اپنی جگہہ میزبان بنجاتی تھیں۔ ان سبھوں میں سے کسی کو وہ مرض بھی نہ تھا جو آئے دن ہم چار بیویوں کو ایک جگہ بیٹھنے پر بیہودہ بکتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ واللہ بہن علم بھی عجیب چیز ہے وہ آپس میں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے عزیز رشتہ دار حالانکہ ان میں بہت سی ایسی تھیں جنسے پہلے پہل ملاقات ہوئی ہے۔

ساجدہ بیگم۔ بہن اُن کا لباس کس وضع کا تھا اور زیورات کیا کیا پہنے ہوئے تھیں۔

عابدہ بیگم - ہاں بہن خوب یاد دلایا ہے۔ ان سبھوں کا لباس بھی بہت پسندیدہ خوشنما تھا اوروں کی میں نہیں کہونگی مگر مجھے تو نہایت بھلا معلوم ہوا۔ کلی دار لہنگے جاکٹ کھڑے دوپٹے اوڑھے ہوئے تھیں بعضی بیگمیں ساڑی جاکٹ میں بھی نظر آتی تھیں بہن اس میں ستر پوشی ہونے کے علاوہ حفظ صحت زینت خوبصورتی سبھی کچھ مدنظر رکھا گیا تھا۔ فرل جھالر پیک کارچوبی بیلوں وغیرہ سے بہت خوبصورتی کے ساتھ خوشنما تیار کیے ہوئے تھے۔

بہن ٹھپے کناری مشجر کمخواب سے کہیں زیادہ اچھے معلوم ہوتے تھے حالانکہ اُس میں نہ اس قدر مصالحہ تھا نہ ایسے گہرے رنگ تھے۔ ہزار میں کہوں ایسے خوشنما لباس سے اُنکے چہرے بہت شاندار معلوم ہوتے تھے۔ اس لباس سے کاموں میں بھی کچھ ہرج واقع نہوا۔ بہت بے تکلفی سے ہر کام میں دخل دیتی تھیں دُلہن کی جتنی عزیز و اقارب تھیں سب اسی لباس میں دکھائی دیتی تھیں۔ زیور بھی بہت خوشنما تھا اور مختصر۔ کانوں میں صرف بالیاں پھول یا ادراج بندے۔ ہاتھوں میں سنہری چوڑیاں۔ سچے نگینوں کی پہنچی یا کنگن کڑے۔ گلے میں ست لڑا ایک دو ہار۔ انگشتریاں عمدہ عمدہ بروچ سیفٹی پن (یہ بھی زیورات میں سے تھے)

کنواری لڑکیاں بالکل سادگی سے تھیں۔ لباس بھی عمدہ مگر بہت فوق البھڑک نہ تھا
ہاتھوں میں کڑے یا چوڑیاں اُنگلیوں میں دو انگشتری گلے میں ایک ایک چھاپڑا ہوا
تھا جو جاکٹ کی جھالر سے لپٹا ہوا بند ہاتھا جیسے چاند کے اطراف ہالہ ہوتا ہے۔
اس میں چمکدار جگنی لگی ہوئی تھی۔ میں جہانتک دیکھتی رہی کیا بیبیاں کیا لڑکیاں
سب کے پاس خوبصورت خوبصورت چوڑیوں میں مزین رسٹ واچ بندھی ہوئی
تھی۔ اس سے عجب خوبصورتی تھی۔ اور لڑکیاں ہر ایک کام نہایت پُھرتی اور
چالاکی سے پابندی اوقات کے ساتھ کر رہی تھیں۔ میں دیکھتی رہی کہ کوئی منٹ
اُنکا خالی نہ جاتا تھا۔ اور ہر ایک جاکٹ میں ایک پنسل اور ایک کاپی ہوتی تھی۔ جسپر
جو بات قابل یادداشت تھی اُسکو لکھ لیا جاتا تھا۔ مثلاً نئی نئی بیبیوں سے ملاقات یا
دعوت کے انتظام میں کچھ کمی بیشی سبھی کچھ لکھ لیا جاتا تھا تاکہ وقت مقررہ پر انجام
دیں کچھ بھول چوک نہ ہو جائے۔ نہایت عمدہ طریق اور سگھڑاپا اُن لوگوں کا ہے۔
دولہن کو جو جوڑے دیے گئے تھے وہ نہایت پُر تکلف اور اُن پر دیدہ ریزی سے
کام کیا گیا ہے۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ سب جوڑے لڑکیوں بیبیوں نے خود گھر
میں تیار کیے ہیں۔ جبھی تو ایسا عمدگی سے تیار کیا گیا ہے۔ کیا کہا جائے۔ جہیز ایسے
نئے طریق سے دیا گیا کہ سب تعلیم یافتہ بیبیاں اور مرد تحسین و آفریں کر رہے تھے
جس کی تفصیل یہ ہے۔ چھپر کھٹ مع توشک عمدہ لحاف وغیرہ۔ چوکیوں کا فرش
مع قالین سوزنی مسند وغیرہ۔ نماز کی چوکی چار کرسیاں آرام کرسی دو میز
نیم رنگی کشتی عمدہ لیمپ عمدہ برتن۔ ٹی سٹ چار صندوق دو الماریاں قلمدان
آئینہ سنگار دان ایک سلائی کی مشین ہارمونیم۔ گنگا جمنی دوات قلم اور ایک
چھوٹی سی نہایت خوبصورت آئینوں کی الماری مقیش جسپر ریشمی کار چوبی کام کیا
ہوا سیاہ مخمل کا پردہ پڑا ہوا تھا میں نے اس سے پیشتر کسی کے استعمال میں

نہیں دیکھا تھا۔ سب کا خیال تھا کہ اس میں شاید بیش بہا زیورات پارچہ جات رکھے ہونگے سب کی نگاہیں بڑی بے صبری سے منتظر تھیں۔ آخر کار جب سب جہیز ایک جگہہ کیا گیا۔ سب بیبیاں دیکھنے کو جمع ہوگئیں۔ زیورات پارچہ جات سب یکے بعد دیگرے دیکھنے لگیں۔ جب الماری دیکھنے کی باری آئی۔ سب بڑھیں۔ سبحان اللہ ماشاءاللہ کیا کہوں واہ واہ کسقدر بیش قیمت بیش بہا زیورات رکھے ہوئے تھے جس سے دین و دنیا دونوں حاصل ہو سکتے ہیں۔ بلکہ یہ ایک مبارک فال نیک شگون اس مبارک سنجوگ کا ہی کہ ایسے بابرکات صاحبوں کی نیک تصانیف کے جہیز سے لڑکی سسرال پہونچی۔ تین درجے جدا جدا ہیں سب سے پہلے درجے میں قرآن شریف احادیث مسئلے مسائل کی ضروری جلدیں خوبصورتی سے چنی تھیں۔ جسپر غلاف چڑھے ہوئے چند عربی آیتیں وغیرہ کڑھی تھیں۔ جس میں سے چند مجھے یاد رہگئیں کسی پر لکھا تھا خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِكُمْ۔ پھر دوسری جگہہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ اور سب سے اوپر کو لکھا ہے کہ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ۔ ترجمہ۔ خدا سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ پھر لکھا ہے۔ ولاتکونن من الجاھلین۔ تم کہیں جاہلوں میں نہ شامل ہوجاؤ۔ بعد اسکے فہرست کتب دیکھی۔ جس میں سٹیم پریس لاہور کی وہ وہ کتب موجود ہیں جو لڑکیوں اور مستورات کو دینی دنیوی کارآمد مفید سچی رہبر ہو سکتی ہیں اور چند تواریخ و تصانیف حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ انتظام خانہ داری بچوں کی تعلیم و تربیت شوہر کی خدمتگزاری سینا پرونا تہذیب کی دس گیارہ خاتون کی کاپیاں حقوق نسواں وکیل نسواں غرض جو مفید ضروری ہیں سب خوشخط سنہری مجلد سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ یہ ایسا قابل قدر جہیز تھا کہ جس سے والدین کی اعلیٰ لیاقت مہذب طریق لڑکی کا تعلیم یافتہ ہونا اور علم دوست ہونے کا پورا پورا پتا ملتا تھا اور جسکو میاں بیوی کی آپس کی سچی قدردانی محبت کے بڑھانے کا مبارک پیش خیمہ سمجھنا چاہیے۔

ساجدہ بیگم۔ بہن میں بہت خوش ہوئی واقعی نہایت عمدہ طریق ہے۔ بہن جو مراسم ادا کیے گئے وہ بھی سنادو۔

عابدہ بیگم۔ بہن بس ایسے تھے کہ سب تعلیم یافتہ بیبیاں اور مرد خوش ہو رہے تھے۔ رات بھر مولود خوانی ہوتی رہی۔ صبح سویرے بعد نماز فجر کے نکاح خوانی (سنت رسول) سے فارغ ہو گئے۔ اور باہر مبارک سلامت ہونے لگی۔ اسوقت خدائی گیت گائے جاتے تھے۔ جس سے نور کے تڑکے سہانے وقت میں دل پر عجیب اثر ہوتا رہا۔ بے اختیار بیخودی کے آنسو جاری ہو رہے تھے۔

کھانا کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دُلہن کے بھائی صاحب نے سب براتیوں کو مخاطب کرکے ایک تقریر کی جسکو سب بڑے شوق و ذوق سے سُن رہے تھے۔ سننے کے بعد سب نے تائید کی۔ ایک صاحب دُلہن کے بھائی کے بعد تقریر کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے نہایت جوش سے ایک نظم پڑھی مستورات بخوبی سُن رہی تھیں۔ بہت اچھا انتظام ہو رہا تھا۔

ساجدہ بیگم۔ بہن میں بڑی مشتاق ہوں ذرا مجھے بھی سنادو کہ وہ کیا تقریریں تھیں۔

عابدہ بیگم۔ ہاں ضرور۔ اسکے بعد اُنھوں نے ایک کاپی نکالی (جو اُسی وقت اُن لڑکیوں سے بطور یادداشت لی تھی) اور یوں پڑھنا شروع کیا۔

دُلہن کے بھائی کی تقریر۔ میں آپ لوگوں کی تشریف آوری کا (جو میری ہمشیرہ عزیزہ کے مبارک سنجوگ میں) اپنی نیز والد بزرگوار کی جانب سے نہایت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ بزرگوں نے اس غریب خانے پر رونق افروز ہو کر ہمیں نہایت مرہون منت کیا ہے۔ لہٰذا میں آپ صاحبوں کی اس بندہ نوازی پر ایک ضروری استدعا کرنا چاہتا ہوں جو ایک مدت سے میرے دل میں ہے۔ جسکے لیے میں کسی عمدہ موقع کا منتظر تھا۔ امید کہ

میری عرض پذیرا فرما کر عزت افزائی فرمائینگے۔ جب سب اپنا اشتیاق ظاہر کر چکے تو اسوقت اُنھوں نے کہا۔ کہ صاحبو نہ میں عالم نہ فاضل اور نہ لکچرار کہلانے کی لیاقت رکھتا ہوں۔ میں صرف اسوقت جو عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ تعلیم مستورات پر زور لگائیں۔ اگرچہ آپ ایسے روشنضمیر صاحب کے سامنے علم کی تعریف کرنی نادانی ہے۔ تاہم اس قدر عرض کرتا ہوں جو مجھپر فرض ہے۔ اس بات کو تو ہر انسان خواہ بڈہا یا جوان خواہ ہندو یا مسلمان سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ علم ایک دولت ہے اسکا حاصل کرنا فرض ہے ہمارے ہمقوم بھائی پڑھ لکھکر کیسے کچھ ہو رہے ہیں اُنکے لیے مدرسے کالج یونیورسٹی تیار ہو رہے ہیں۔ بخلاف اسکے اسکا دسواں حصہ بھی بیچاری مستورات کی تعلیم کے لیے نہیں کیا جاتا حالانکہ علم کا سیکھنا مرد عورت دونوں پر فرض ہے۔ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ۔ پھر کیا بات ہے کہ عورتیں علم سے محروم رکھی جاتی ہیں۔ حالانکہ قومی ترقی اعلیٰ تربیت اولاد کی سبھی کچھ ان ہی سے وابستہ ہے۔ اور ماؤں کی گود ہی اولاد کا پہلا سکول ہے۔ میں اس بحث کو نہیں چھیڑونگا۔ اسکے لیے وقت چاہیے علاوہ بریں کئی رسالے کتابیں اسکے لیے مرتب ہو چکے ہیں خصوصاً وکیل نسواں حقوق نسواں سے بڑھکر کسی کتاب کی ضرورت ہی نہیں (اگر کوئی عقل سلیم رکھتا ہو) میں اتنا پوچھتا ہوں کہ بھلا جس لڑکے نے چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اپنے ہر طرف علمی چرچے دیکھے ہوں۔ جسنے ایسے عمدہ مشاغل میں وقت صرف کیا ہو جسکے پیش نظر تعلیم یافتہ میاں بی بی کی ایکدلی اطاعت کی تصویریں پھرتی ہوں، اُس کی روشن خیالی اور عالی دماغی کا کیا کہنا۔ ایسا شخص کس قسم کی بی بی چاہیگا، اُسکے خیالات بی بی کے متعلق کیسے ہونگے

کیا ایسا شخص اُس بی بی کو چاہیگا جسنے حیوانیت کے احاطے سے باہر ایک قدم نہ رکھا ہو کیا وہ ایک مضغۂ گوشت کو اپنی بی بی بنانا پسند کریگا؟ جسکو خدانے ناک کان آنکھ سبھی کچھ عطا کیے لیکن نہ دیکھنا آتا ہو نہ سُننا۔ یہ خیال بالکل غلط ہی کہ شوہر کے خوش رکھنے کو زوجہ کا حسین رہنا کافی ہی۔ نہیں بلکہ شوہر کو خوش رکھنے کے لیے زوجہ کے قواے عقلیہ کو تعلق ہے۔ ممکن ہی کہ زوجہ کی خوبصورتی چند دن عیوب کو پوشیدہ رکھے۔ لیکن ایسی دیوار جسپر خوشنما پھول بوٹے ہوں اس سے انسان کب تک خوش رہ سکتا ہے جس میں بجز اینٹ پتھر کے کچھ نہیں۔ یہی حال حسین زوجہ جاہل کا ہے۔ تعلیم یافتہ مرد اپنی رفیق بی بی میں جسمانی خوبصورتی کے ساتھ زندہ دلی علمی حس و حرکت ضرور تلاش کریگا۔ جسپر سچی محبت کا انحصار ہو سکتا ہی۔

حُسنِ صورت محض بے رونق ہی سیرت کے بدوں
جن گلوں میں بو نہیں وہ خوشنما کہنے کو ہیں

اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ لوگ ہانڈی چولھے کے لیے بیویاں کرتے تھے وہ شخص خصوصاً میاں بیوی کبھی خوش نہیں رہ سکتے جو ایک تعلیم یافتہ روشنخیال دوسری جاہل مطلق ہو۔ ایسے دونوں کو ملانا طوطی را با زاغ درقفس کردند والی مثل ہے۔ اس زمانے کے مرد ایسی بی بی چاہتے ہیں جو مرتے دم تک ہر ایک مرحلے میں رفیق بنی رہے اُسکے خیالات صرف گودام یا باورچیخانے تک محدود نہ ہوں۔ گھر کو روحانی جسمانی برکتوں سے نمونۂ جنت بنادے کیا یہ سب باتیں ایک جاہل بی بی سے ہوسکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اے میرے ہم قوم بھائیو اب بھی مخالفت ترک کرو۔ اپنی اولاد پر رحم کرو اُن کو شادی سے پیشتر زیور علم و تربیت سے آراستہ و پیراستہ کردو"

تاکہ شوہر کے حقوق اولاد کے حقوق اور تربیت سے واقف ہوجائیں سسرال جانے سے قبل اُن فرائض سے آگاہ کرو جو اُن کی زندگی کے اصلی جسز و ہیں۔

بھائیو تم بجائے کاٹ کباڑ سونے چاندی کے طوق اور زنجیروں کے جہیز کے اپنی نور بصر لخت جگر لڑکیوں کو راستبازی رہت گفتاری تحمل بردباری وغیرہ کے بے بہا جواہر رخصتی میں دو۔ تاکہ اُنکے شوہر اُن کی پوری قدر کریں بھائیو عنقریب وہ زمانہ آئیگا (اگر ہماری یہی غفلت رہی) تمہاری جاہل اور ناشائستہ لڑکیوں کو کوئی نہ پوچھے گا۔ تمام شریف گھرانوں میں تعلیم یافتہ عورتیں تمہاری لڑکیوں کی جگہہ چھین لینگی۔ جنکو ہم رذیل بیہودہ کہتے ہیں۔ ملک میں تعلیم عام پھیل رہی ہے۔ جان بوجھکر بھی انجان بننا گویا اپنی اولاد کے حق میں کانٹے بونا ہے۔ جس پہلو سے نظر ڈالو تعلیم نسواں کی اشد ضرورت ہے۔ اگر تعلیم نسواں نہیں تو یقین جانو قوم قوم کبھی نہیں ہوسکتی۔

میں اب ختم کرنا چاہتا ہوں اگرچہ بہت کچھ دل میں بھرا ہے۔ تاہم مختصر کرکے ملتجی ہوں آپ سب صاحبان اس معاملے میں دلی کوشش کریں۔ جیسے اسوقت مولوی شیخ عبداللہ صاحب اڈیٹر خاتون یا مولوی سید ممتاز علی صاحب منیجر تہذیب نسواں کر رہے ہیں۔ خدائے بزرگ ان بزرگوں کی نیک کوشش میں برکت عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

جب وہ اپنی تقریر ختم کرچکے تو دوسرے ایک صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ نظم پڑھنے لگے۔

نظم

تیغ دو دم اُٹھاؤ اُٹھا کر علم کرو — بیچاریوں کے شوق سے تم سر قلم کرو

ورنہ خدا کے واسطے اُن پر رحم کرو — جاہل نہ اُن کو رکھو نہ اتنا ستم کرو

ثابت ہی صاف اس میں نہیں قال وقیل ہے
بے علم گو شکیل ہو پھر بھی رذیل ہے

بیعلمی ہی تو مخزن وکانِ گناہ ہے		یہی ہے جس سے طبقۂ نسواں تباہ ہے
اچھا سلوک تم نے کیا واہ واہ ہے		کرتوت سے تمہارے خدا کی پناہ ہے

کچھ سوچو سمجھو اور خدا سے ذرا ڈرو
کیا کر رہے ہو عقل کی باتیں ذرا کرو

اے مرد تم بیاج ہو عورت ہی مُول ہی		عورت ہی لوگو آپ کا پہلا سکول ہی
عورت نہو تو صاحب خانہ فضول ہی		اور گھر میں خاک دھول بکائن چھول ہی

اولاد بے تمیز ہے اور بے شعور ہے
ماؤں کا ڈھنگ بچوں میں ہوتا ضرور ہے

ہی مرد گر مکان تو عورت مکین ہے		ہی مرد آسمان تو عورت زمین ہے
خاتم اگر ہی مرد تو عورت نگیں ہے		مونس ہی غمگسار ہی اور ہمنشین ہے

قدرت نے ایک سانچے میں دونوں کو ڈھالا ہی
گر یہ نہو تو دال میں کچھ کالا کالا ہے

تم بادشاہ اگر ہو تو عورت وزیر ہی		تم ہو اگر گلال تو عورت عبیر ہے
تم آفتاب ہو تو وہ ماہ منیر ہے		عالی دماغ تم تو وہ روشنضمیر ہی

ہم سنگ ہر طرح وہ ستودہ صفات ہے
تم ڈال گر ہو تو وہ پات پات ہے

عورت ہی تاج مرد اگر تاجدار ہے		ہی مرد گر گلاب تو عورت ہزار ہے
گلشن اگر ہی مرد تو عورت بہار ہے		قمری ہی وہ یہ سرو لب جوئبار ہے

عورت چنبیلی مرد گلِ آفتاب ہے

سچ مچ انھیں سے زینتِ باغِ شباب ہے

مہر النسا جہان میں نور جہاں ہوئی — اور چاند بی بی رونقِ شیر زماں ہوئی

لو دیشا سی دوسری پیدا کہاں ہوئی — رضیہ تھی لاکھوں مردوں پہ جو حکمراں ہوئی

ہنری کی بہن غیرتِ اہلِ فرنگ تھی

وکٹوریہ سے مردوں کی بھی عقل دنگ تھی

بے علم بیوی گھر میں جو شوہر کے آتی ہے — پچھن وہ اپنے آتے ہی سب کو دکھاتی ہے

جب ساس چیخ چیخ کے سر کو کھپاتی ہے — بجلی بسنت ایک کی سُنو سُنو سناتی ہے

دیور سے ہے لڑائی تو نندوں سے بیر ہے

اے مردو دیکھو کیسی جہالت کی سیر ہے

بے علم عورتوں کے کرشمے عجیب ہیں — غمزے نرالے ناز نہایت غریب ہیں

ڈرتا ہوں یاد کرکے نہایت مہیب ہیں — جو دیکھتے ہیں سچ ہے بڑے بدنصیب ہیں

بیوی سمجھتی ہے کہ وہ غمزے دکھاتی ہے

شوہر سمجھتا ہے کہ بلا سر پہ آتی ہے

لازم ہے تم کو عزت و حرمت بڑھاؤ تم — شایاں یہی ہے تم کو کہ گھر کو بناؤ تم

شائستگی جو سوتی ہے اُسکو جگاؤ تم — عورت کو بس پڑھاؤ ۔ پڑھاؤ پڑھاؤ تم

ناصح کا کہنا مانو تمہارے رفیق ہیں

ہمدم ہیں رازدار ہیں مشفق شفیق ہیں

جب وہ ختم کر چکے چاروں طرف سے لوگوں کا ہجوم ہوا سب کے سب نے بڑے سچّے جوش و خروش سے تائیدی عہد و پیمان کیے ۔ اسکے بعد عطر پان پھولوں کے گجرے سے سب کو ہنسی خوشی رخصت کیا ۔ شب میں رونمائی کی رسم ادا کی گئی دلہن کے رخصت کے وقت دل بے انتہا بھرا ہوا تھا ۔ جب رسم ادا ہوئی بیبیوں

نے سلامی وغیرہ دی۔ دلہن کی خالہ جان نے اُسی وقت سب بیبیوں کے سامنے دلہن سے خطاب کیا شوہر کی خدمتگزاری سسرال والوں کا حد ادب وغیرہ ضروری نصیحتیں ایسے پُردرد و پُراثر لہجے میں کیں کہ بعضوں کو ہچکی بندھ گئی۔ دلہن کا تو کیا کہنا۔ بعدہ خالہ نے سب سے پہلے پان دیا اٹھکر پھولوں کا ہار پہنایا خدا حافظ کہکر گلے لگایا ماتھا چوما پھر باری باری سے گلے ملکر دلہن کو رخصت کیا۔ سُنا ہے کہ لڑکی کے والدین نے بے فائدہ جہیز اور رسموں میں جو روپیہ ضائع ہوتا ہے اُسکو زنانے مدرسوں میں دیا ہے اور سونے چاندی کے زیورات کا نقد روپیہ دُلہن کے نام بنک میں رکھوا دیا ہے۔

چوتھی کے دن دلہن کی ہم عمر لڑکیوں نے انگشتریاں اڈیٹر صاحبہ تہذیب نسواں کی تصانیف وغیرہ تحفتاً دُلہن کو دیں۔ کیا کہوں بہن مجھے اس شادی سے کسقدر حظ آیا۔ خدا سے میری دعا ہے اور مصمم ارادہ ہے کہ انشاءاللہ تعالےٰ جہانتک ہوسکیگا میں اپنی زندگی میں ضرور اس طرح کی بیاہ شادیوں کے لیے کوشش کروں گی۔

ساجدہ بیگم۔ ماشاءاللہ سبحان اللہ آفریں اُن والدین پر جنھوں نے اس عمدہ طریق سے سُنّت رسول پر عمل کیا۔ خدا اُنھیں ہمیشہ ان کی اولاد سے سکھ دکھائے۔ اور اُن کی روشنضمیری کے طفیل عام طور پر ایسی شادیاں ہونے لگیں۔ آمین ثم آمین۔

عابدہ بیگم۔ ہاں بہن دعا کرو۔ مگر صرف دعا سے کچھ نہ ہوگا۔ آپ کاج مہا کاج۔ اپنی اور اپنی لڑکیوں کی تعلیم میں درمے قدمے قلمے کوشش کرنی لازم ہے۔ جب ہمارا شوق مرد دیکھینگے وہ بھی ہمارا ہاتھ بٹائینگے۔ ہمکو بہت جلد خواب غفلت سے چونکنا اور کوشش کرنا لازم ہے۔ شعر

تدبیر نہ شامل ہو تو ہمت ہے جہالت
ہمت کی نہ شرکت ہو تو تدبیر حماقت

عابدہ بیگم۔ بہن اب رخصت چاہتی ہوں انشاء اللہ پھر آؤں گی کیونکہ فرصت کم ہے طبیعت بھی میری کچھ سست سی ہو رہی ہے۔ خدا حافظ۔ فقط

رقیمہ

عباسی بیگم بنت مولوی محمد علی صاحب۔ تحصیلدار

رانی بھوانی

رانی بھوانی ضلع راج شاہی (علاقہ بنگال) میں پیدا ہوئی تھی اُسکے باپ کا نام آتما رام تھا۔ اور موضع چھاتن کا چودہری تھا۔ جب رانی بھوانی نے ذرا ہوش سنبھالا اور سن تمیز کو پہنچی تو اس کی شادی ناٹور کے زمیندار راجہ رام جیون رائے کے بیٹے رام کانت کے ساتھ کر دی گئی۔

عادات و خصائل — مشہور ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اوائل عمر میں ہی ماں باپ اُس کی سلیقہ شعاری اور عقلمندی کے کاموں کو دیکھکر حیران رہ جاتے تھے۔ چھوٹی سی تو تھی عمر مگر بات وہ کہتی تھی کہ گویا بڑی بھاری بھر کم تجربہ کار عورت ہے۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو ماں باپ نے اس کی تعلیم کا معقول بندوبست کر دیا۔ اور مذہبی تمدنی اور سیاسی علم میں اُسنے کمال حاصل کیا۔ بچپن سے ہی رانی بھوانی کا میلان طبع دہرم اور رفاہ عام کے کاموں کی طرف تھا جیسی وہ خوبصورتی میں مشہور تھی ایسی ہی وہ علم و ادب اور سلیقہ و ہنرمندی میں بھی شہرۂ آفاق تھی۔

راجہ رام کانت کی بیجا خفگی — رانی بھوانی کا شوہر رام کانت ایسا ہی چڑچڑا بدمزاج اور زود رنج تھا جیسے اکثر امیروں کے لڑکے ہوا کرتے ہیں۔ ماں باپ کے لاڈ محبت اور نازبرداری نے اُس کی عادات و خصائل کی بنیاد کو ایسا ناقص کر دیا تھا کہ وہ جہاں کوئی بات اُسکے مزاج کے خلاف ہوئی اور بگڑ گیا۔ وہ باپ کے حین حیات ہمیشہ زمینداری کے

کام سے جی چراتا رہا۔ یہ کہا جائے کہ وہ زمینداری کے کام کی قابلیت نہیں رکھتا تھا۔ نہیں! یہ بات نہ تھی۔ بلکہ آرام پرست اور تغافل کا مرید ہونے کی وجہ سے کسی کام کے کرنے کو اُسکا جی نہ چاہتا تھا۔ باپ کے جیتے جی تو رام کانت کے مزاج میں جو آیا وہ کیا لیکن اُس کی وفات کے بعد اب راج کے کاروبار اور زمینداری کے تمام انتظام اور ذمہ داری کے کام کا بار رام کانت پر آپڑا۔ اسکے باپ کے وقتوں کا نوکر دیا رام نہایت خیر خواہ اور باوفا شخص تھا۔ اُسنے جب دیکھا کہ راجہ رام کانت زمینداری کے کام کاج کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہے تو چاہا کہ کسی طرح اُسکو سیدھے دھرے پر لگا دے۔ چنانچہ وہ ایک دن موقع پاکر راجہ رام کانت سے بولا کہ "بزرگوں کے وقت کی ہاتھ آئی ہوئی جاگیر آپ جان بوجھکر ہاتھ سے نہ کھوئیں اور اسکے انتظام اور حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوں آپ کی یہ غفلت آپکے حق میں ایک دن سم قاتل کا کام دیگی"۔

راجہ رام کانت بجائے اسکے کہ اپنے ایسے خیر خواہ نوکر کی نصیحت کو قدر افزائی نگاہ سے دیکھتا اور اُس کی فہمائش پر کاربند ہوتا۔ وہ بگڑ گیا۔ اور حکم دیا کہ دیا رام کو فوراً مکان سے باہر نکال دیا جائے۔ دیا رام نہایت ہی ہوشیار اور عقلمند تھا وہ راجہ رام کانت کے ہاں سے نکلنے کے بعد فوراً ہی بنگال کے صوبہ دار علی ویردی خاں کے دربار میں جانے لگا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں اُسنے علی ویردی خاں کے مزاج میں بہت کچھ دخل پا لیا۔

ایک دن اُس نے موقع پاکر خدمت میں عرض کیا کہ "حضور! مینے پتہ لگایا ہے کہ راجہ رام کانت نے لاکھوں روپیہ اپنے خزانے میں جمع کر رکھا ہے لیکن سرکاری مالگزاری کے ادا کرنے میں لیت ولعل کر رہا ہے۔ حضور کی جو رقم واجب ہے وہ ادا نہیں کرتا"۔ نواب علی ویردی خاں نے پوچھا کہ "کیا تو یہ بتا سکتا ہے کہ وہ اپنا خزانہ کہاں رکھتا ہے اور کیا تجھے یہ معلوم ہے کہ راجہ رام جیون رائے کا کوئی اور رشتہ دار اس قابل ہے کہ راج اور زمینداری کے اہم کام کو بحسن الوجوہ انجام دے"۔ دیا رام نے جواب دیا کہ "مجھے

راجہ کے سارے خزانے کا سارا پتہ معلوم ہے۔ اور راجہ رام جیون رائے کا بھتیجا دیوی پرشاد نہایت ہی نیک نیت اور معتبر شخص ہے وہ زمینداری کا ہر کام نہایت سہولت سے کر سکتا ہے۔" یہ سُنکر نواب نے حکم دیا کہ فوراً سپاہی رام کانت کے محل میں جائیں اور تمام مال و متاع لوٹ لیں۔ اور دیوی پرشاد کو رام کانت کی جگہ راج گدی پر بٹھا دیا جائے

رانی بھوانی کی مصیبت

اسوقت رام کانت محلسرا میں تھا جب اُس نے سنا کہ نواب علی ویردی خاں کے سپاہی محل کو لوٹ رہے ہیں اور انواع و اقسام کے مظالم کر رہے ہیں تو وہ اپنی آبروریزی کے ڈر سے رانی بھوانی کو ہمراہ لیکر چور دروازے سے باہر نکل گیا اور اپنے ساتھ خزانے میں سے ایک پائی بھی نہ لی۔ اور زادِ راہ کی کچھ بھی فکر نہ کی۔ سیدھا جنگل کا رستہ لیا۔ رانی بھوانی ان دنوں حاملہ تھی اور وہ پیدل چلنے کی مصیبت اور جنگل کی صعوبتیں برداشت کرنے کے قابل نہ تھی۔ خیر بہزار خرابی رام کانت و رانی بھوانی گنگا کے کنارے تک آئے۔ پھر اُنھوں نے ایک کشتی کرایہ پر کی اور دریا کے پار اُتر کر مرشدآباد میں آئے۔ یہاں پہنچکر اُنھوں نے جگت سیٹھ کے ہاں پناہ لی اور مدت تک علی ویردی خاں کے خوف سے اُسکے ہاں رہتے سہتے رہے۔ پھر جبکہ اُنھوں نے مطلع صاف دیکھا اور خوف و ہراس کی کوئی بات نہ رہی تو ایک مختصر سا مکان لیکر اُس میں رہائش اختیار کی۔

دیارام کی وفاداری

اب رام کانت اور رانی بھوانی کا نت نئی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلتے ہوئے ناک میں دم آگیا تھا۔ لیکن اِن کو ان مصائب سے نجات پانے کا کوئی ڈھب نظر نہ آتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن رام کانت مکان کے ایک دریچے سے بازار کے رخ دیکھ رہا تھا اور اپنے خیالات میں مستغرق بیٹھا تھا۔ اتنے ہی میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک پُر تکلف فنس میں سوار ہو کر دیارام جا رہا ہے۔ رام کانت نے یہ موقع دیارام سے ہمکلام ہونے کا اچھا سمجھا اور بآوازِ بلند بولا کہ "کیوں بھئی دیارام اب ہمیں کب تک اس

مصیبت میں رکھوگے اور مجھے ابھی کتنی مدت تک یہی پاپڑ بیلنے جائیں" دیارام نے رام کانت
کی طرف دیکھا اور تعظیماً فی اللہ وہ قفس سے نیچے اتر آیا اور رام کانت کے پاس آیا۔ وہ اپنے
آقا کی ایسی ذلت دیکھکر سخت متاسف ہوا اور بولا کہ اگر آپ کے پاس اس وقت پچاس ہزار
روپیے ہوں تو بہت جلد پھر راج دلوا سکتا ہوں" رام کانت نے جواب دیا کہ میرے پاس
اس وقت پچاس ہزار کیا پچاس روپیے تک نہیں ہیں۔ لیکن رام کانت کی وفادار اور
جوان بیوی رانی بھوانی نے کہا کہ میرا یہ زیور اور یہ زرین پارچہ کس کام آیگا۔ اگر مصیبت
کے وقت آپکے اوپر سے زیور اور کپڑا بھی قربان نہیں کر سکتی تو یوں سمجھنا چاہیے کہ مجھ سے
زیادہ احسان فراموش دنیا میں کوئی بھی عورت نہوگی۔ غرض یہ کہ رانی بھوانی نے
اپنا سارا زیور اتار کر دیارام کو دیا اور اصرار کیا کہ اس زیور کو بیچکر پچاس ہزار روپیے لیلو۔
چنانچہ دیارام نے وہ زیور فروخت کیا۔ اور جب ملک میں دیوی پرشاد کے ہاتھوں سے
نواب علی وردی خان کی خلعت اتک سر دوکاندار اور ملازموں کو روپیے تقسیم کیے اور
انسے کہا کہ جسوقت دیوی پرشاد دربار میں باریابی کی غرض سے جائے تو باواز بلند
اتنا کہدینا کہ دیکھو یہ وہی بدنصیب شخص جاتا ہے۔

چنانچہ دوکانداروں اور ملازموں نے ایسا ہی کیا کہ جب دیبی پرشاد نواب کے
دربار میں باریابی کی غرض سے جا رہا تھا تو انھوں نے اس کی طرف اشارہ کرکے اسکو سناکر
کہا کہ" دیکھو یہ وہی بدنصیب جاتا ہے" دیبی پرشاد دوکانداروں اور ادنے ملازموں کے
مُنہ سے ایسا سخت کلمہ سنکر از حد رنجیدہ ہوا اور نواب کے سامنے اپنا سارا رونا رویا۔
نواب نے یہ سارا ماجرا سنکر کہا کہ" اگر تمام خلقت تجکو بدنصیب کہتی ہے تو تو ضرور بدنصیب ہی
ہوگا میں ایسے بدنصیب شخص کو ہرگز راجا نہیں بنا سکتا" اسکے بعد علی وردی دیارام کی
جانب مخاطب ہوا اور بولا کہ" راجہ رام جیوان رائے کے خاندان میں اور کون شخص راج گدی
کے قابل ہے" اُسنے جواب دیا کہ حضور! راجہ رام جیون رائے کا بیٹا رام کانت نہایت

عقلمند اور ہوشیار ہی اور راج اور زمینداری کے کام سے خوب آگاہ ہی" الغرض نواب نے فوراً ہی رام کانت کو راجائی اختیارات عطا فرمائے۔ اور دیوی پرشاد کو دربار سے نکلوادیا اسکے بعد بہت مدت تک راجہ رام کانت راج کرتا رہا۔ اور دیارام کو ہمیشہ ہر کام میں اپنا مشیر اور صلاح کار بنائے رکھا۔

رانی بھوانی کی سخاوت اور مذہبی [illegible]

جب راجہ رام کانت فوت ہوا تو اُسکے بعد تمام راج رانی بھوانی کے حصے میں آیا۔ رانی بھوانی بڑی دھرماتما تھی اور سخاوت میں اُسوقت کوئی راجہ بھی اُس پہ فوقیت نہ رکھتا تھا۔ اُسکے زمانہ کے سالانہ حساب کے دیکھنے سے واضح ہوتا ہی کہ ہر سال ایک لاکھ تیس ہزار روپیہ سادھو سنت بیراگیوں اور فقیروں کو تقسیم کیا جاتا تھا۔ اور پانچ لاکھ بیگہ زمین کا لگان معاف تھا۔ بنارس میں بڑی عظیم الشان دھرم شالیں تعمیر کرائی تھیں اور تین سو مکان اسی لیے خریدے تھے کہ جو لوگ کاشی میں تیرتھ جاترا کو آئیں انھیں کرایہ کا مکان نہ لینا پڑے بلکہ وہ ان تین سو مکانوں میں سے جس میں چاہیں ٹھہریں۔ کاشی میں آٹھ من کھیلیں سو سیر چنے اور چالیس من چاول روزمرہ بھوکوں فلاکت زدہ لوگوں میں تقسیم کیے جاتے تھے۔ اور ایک سو آٹھ مرد عورتوں کو وہ کھانا دیا جاتا تھا جو انھیں پسند ہوتا تھا۔ رانی نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ میرے راج میں پانچ روپیہ تک خزانچی اور دس روپیہ تک متصدی اور سو روپیہ تک دیوان بغیر میری اجازت کے بھوکوں اور حاجتمندوں کو دے سکتے ہیں۔ اُسکے راج میں جتنے برہمن تھے اُن کی بیٹیوں کی شادی کا خرچ خود رانی اپنے ذمے لیتی تھی اور ہر برہمن کو حسب حیثیت لڑکی کی شادی کے لیے سرکاری خزانے سے روپیہ ملتا تھا۔ نوراتروں میں دو ہزار جوڑے کپڑوں کے سہاگنوں اور دوشیزہ لڑکیوں کو دیے جاتے تھے ایک ایک تھہ سونے کی تقسیم ہوتی تھی اور اسی موقع پر پچاس ہزار روپیہ پنڈتوں اور برہمنوں کو دیا جاتا تھا۔ بیماروں کا علاج معالجہ کرنے کے لیے آٹھ طبیب [illegible] بیماروں کی خدمت کے لیے بہت سے

دو اور عورتیں ملازم تھیں۔ رانی بھوانی کی دریادلی اور سخاوت کے کارنامے پڑھکر بے اختیار
منہ سے نکل جاتا ہے کہ وہ سخاوت کی دیوی تھی

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اُسکے علاقوں سے آمدنی کے آنے میں کچھ دیر لگی اور وہ دن آپہنچا
جس کا وعدہ تھا کہ بھوکے ننگوں کو روپیہ خیرات کے طور پر دیا جائیگا۔ جب اُسنے
خیال کیا کہ اگر میں آج غریب فلاکت زدہ لوگوں کو روپیہ نہ دوں گی تو اول تو میں اپنے اقرار
میں جھوٹی ٹھہروں گی دوسرے وہ غریب مسکین لوگ میری جانب سے مایوس ہوکر
واپس چلے جائینگے۔ چنانچہ اُسنے حکم دیا کہ کھیتوں میں جسقدر اناج جمع ہے اُسکو فوراً
فروخت کیا جاوے۔ اناج تین لاکھ روپیہ کو بکا۔ اور یہ روپیہ بھی کافی نہ دیکھکر رانی بھوانی
نے اپنا زیور فروخت کیا اور غربا اور مساکین کو روپیہ دیا۔ اُسنے انواع واقسام کی سختیاں
اور دقتیں جھیلیں لیکن اپنے قول وقرار کو کبھی نہ توڑا۔ اگر آجکل بھی ہم تونگر اپنی حیثیت
کے موافق خیرات اپنا فرض سمجھیں اور ہر بات میں اپنے قول وقرار کا پاس رکھیں تو یہ
امر ضروری ہے کہ ان کی اولاد بھی رحمدل اور خداترس اُٹھے اور اخلاق اور تہذیب کے
زیور سے آراستہ ہو۔ اخلاقی عمارت کا پہلا زینہ یہ ہے کہ انسان رحمدل اور خداترس ہو۔
دوسرے کی مصیبت کو دیکھکر جہانتک ممکن ہو اُس کی مدد کرے۔ جو کچھ اقرار کرے اُسکو پورا
کرکے بھی دکھائے۔

رانی بھوانی کے روزمرہ کے کام

رانی بھوانی صبح نور کے تڑکے اُٹھتی اور اپنے مذہبی فرائض ادا
کرتی تھی۔ دوپہر تک دھرم شاستر اور دیگر مذہبی کتابیں سُنا کرتی۔
پھر اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتی اور پہلے دس برہمنوں کو کھانا کھلاکر بعد ازاں خود کھاتی۔
پھر دیوانخانے میں آتی اور اپنے گماشتوں اور محرروں کو جو حکم دینا ہوتا تھا وہ حکم لکھواتی
سہ پہر کو پھر دھرم شاستر سنتی اور شام کو کاغذات پر دستخط کرتی۔ رات کو دو گھنٹے تک
ایشور کی پرارتھنا کرتی۔ اسکے بعد کھانا کھاتی اور پھر کچھ عرصہ تک راج کے کاموں میں مصروف

رہتی - وہ بتیس برس کی عمر میں بیوہ ہوئی تھی اور اُناسی برس کی عمر میں اُس نے اس دنیائے فانی کو خیر باد کہا - فقط (ماخوذ از کتاب ہندی گنگا و دیگر کتب)

راقم

ڈپٹی لال نگم - بی - اے - دہلوی

قاموس النساء

عرصہ ہوا کہ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے یہ اشتہار ہوا تھا کہ اس نام کی ایک کتاب تصنیف کیجائے - اسکے بعد کا ہم کو علم نہیں کہ کسی شخص نے اس کام کے کرنے کا ارادہ بھی کیا یا نہیں بہرحال جو کچھ بھی حالت ہو - اسوقت میں اپنے خیالات اس تصنیف کے متعلق ظاہر کرنا چاہتا ہوں - اور اپنے مکرم دوست شیخ عبداللہ سے یہ کہونگا کہ یہ کام وہ اپنے ذمے لیں اور صیغے کی طرف سے اُسکے مصارف ادا کریں کیونکہ یہ فرض تو درصل صیغہ تعلیم نسواں کا ہی کہ اس قسم کی ایک انسائیکلو پیڈیا تیار کیجائے جس میں اسلامی عورتوں کے حالات درج ہوں اور ہر حال سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اسلام نے معاشرت و سوسائٹی میں عورتوں کے واسطے جو قاعدے قانون بنائے ہیں اُن کا جلوہ ان معزز خاتونوں کے حالات میں کہانتک نمایاں ہوتا ہی - میرے نزدیک اس کتاب میں چند باتیں قابل لحاظ ہیں جنکو میں اس موقع پر لکھتا ہوں -

(۱) سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ عورتوں کا اقتضار طبیعت کیا ہی اور اُنکا نیچر کیا ہے ؟ مختلف ممالک کی آب و ہوا کے اثر ان میں کونسی تغیرات او خصوصیات پیدا کر دیتے ہیں ؟ عام طور سے فطرت نسواں پر بحث کی جائے اور یہ دکھایا جائے کہ انکے جسمانی و ذہنی قوے کی قابلیت و استعداد کس حدتک ہی اور انکا نمو و بروز

کہانتک ممکن ہے۔ پھر ہر ملک کی یا ہر براعظم کی عورتوں کی فطرت کے خصوصیات
دکھائے جائیں اور یہ بتایا جائے کہ ہر ملک کے خصوصیات کے لحاظ سے عورتوں
کی آزادی کس حد تک مناسب ہے؟ اور اسکے لیے جو قواعد و قوانین بنائے جائیں
انکا معیار کیا ہونا چاہیے؟ اسکے بعد ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام کے قوانین ایسے
سادہ و سہل العمل و عام ہیں کہ چند جزئی حالتوں کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد تمام فطرت
اور اقلیموں کے مناسب حال ہیں۔

اس بحث پر قلم اٹھانے کے لیے فزیالوجی اور بیالوجی اور ممالک کی
طبعی جغرافیہ۔ علم الاقوام کے کامل نقشے اس ملک کی عام حالتوں پر جو تصانیف
ہوئی ہیں۔ ان سب پر نظر ہونا چاہیے اور اسکے علاوہ یورپ کی جو تصانیف
عورتوں کے متعلق ہوئی ہیں خاص کر مل کی SUBJECTION OF WOMEN
جو یورپ کے موجودہ اعتراضات کا سرچشمہ ہے، بھی دیکھنا چاہیے۔ اسکے ساتھ ہی تھوڑے
اجتہاد ذہنی کی بھی ضرورت ہے۔

(۴) قدیم زمانے سے لیکر اسوقت تک عورتوں کے تمدن کی رفتار پر نظر ڈالنا چاہیے
اور یہ دکھانا چاہیے کہ عورتوں کی عزت و حرمت مختلف اقوام میں کیا تھی
انکے حقوق کیا تھے۔ یہ حقوق کہانتک بارآور تھے۔ اور فطرت نسواں نے کہانتک
پورے طور سے ان پابندیوں یا اصولوں کا ساتھ دیا اس موقع پر یہ خیال کیا جاتا ہے
کہ مل کا بیان یہ ہے کہ "عورت کا جو کچھ جوہر و طبیعت کہی جاتی ہے وہ بظاہر
ایک مصنوعی شے ہے" مگر یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ فطرت کبھی بدل نہیں
سکتی اور ظاہری پابندیاں یا دباؤ گو وہ کیسے ہی زبردست قوی ہوں اصل فطرت
کو نہیں دبا سکتے۔

اس بحث کے لیے جن نتائج اور مقدمات کی ہمکو ضرورت ہے اسکے خام مواد

کے واسطے انسائیکلوپیڈیا کے مندرجہ ذیل مضامین دیکھنا چاہیے۔

WOMAN, SETTLEMENT, ADULTRY, DIVORCE, MARRIAGE

BIGAMY, HUSBAND AND WIFE

اسکے علاوہ قلائد المفاخر جو ایک فرنچ کتاب کا ترجمہ عربی زبان میں ہے اور جسمیں عورتوں کے متعلق بھی ایک باب ہے اور اُس میں اُنکے تمدن سے بحث کی گئی ہے پیش نظر ہونا چاہیے۔ مگر صرف یہی ایک کتاب ہمارے مقصد کے لیے کافی نہیں ہے

(۳) اسلام نے عورتوں کا کیا درجہ قائم کیا؟ اور اُنکو کیا حقوق دیے۔ اسلام ہی نے درحقیقت عورتوں کو آزادی دی اسلام سے قبل عورتوں کے متعلق نہایت سخت احکام تھے منو کا یہ جملہ یاد رکھنا چاہیے "رات دن عورتوں کو اپنی نگاہبانوں کی حفاظت میں بالکل بے اختیاری کے عالم میں رہنا چاہیے"

اس بحث پر قلم اُٹھانے کے لیے اُردو زبان میں حضرت الاستاذ شمس العلماً مولانا شبلی نعمانی کی کتاب الکلام کے باب حقوق نسواں اور مولوی چراغ علی مرحوم کا مضمون حقوق نسواں اور فرید وجدی کی کتاب المرٔۃ المسلمۃ عربی زبان میں - انگریزی میں اسپرٹ آف اسلام اور لائف اینڈ ٹیچنگس آف محمد دیکھنا چاہیے۔ لیکن اسی پر اکتفا نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ خود کلام مجید واحادیث نبوی صلعم کی تفتیش کرنا چاہیے۔

(۴) آخری مرتبہ زمانہ اسلام میں عورتوں کی حالت کا ہے اسکے پانچ دور ہونا چاہیں۔

(الف) دور جاہلیۃ۔ عرب جاہلی کے زمانے میں عورتوں کی وقعت وعزت اُنکے مراسم وعادات۔ نکاح وطلاق کے طریقے۔ بود وباش اور دیگر معاشرتی امور کیا تھے۔ اسلام کے زمانے میں ان میں سے کیا باقی رہے اور کون کون ناجائز قرار دیے گئے ان عادات ومراسم کے ترک کرنے میں جاہل نومسلمہ عورتوں نے کیا رویہ رکھا۔ اس دور کی عورتوں کے حالات۔

(ب) خلفاء راشدین کا دور۔ اس دور کی خصوصیت یہ تھی کہ احکام اسلام کی صحیح پابندی اس زمانے میں ہوتی تھی اور جو اس زمانے کی عورتوں کے حالات ہونگے وہ زندہ تصویر احکام اسلام کی ہوگی۔ اس زمانے میں غیر ممالک سے چونکہ لڑائی ہوتی رہی۔ لوٹ میں ان ممالک کی عورتیں بھی آئیں۔ یہ یقینی ہے کہ یہ اپنے عادات و مراسم بھی ساتھ لائی ہونگی جنکے عربی مراسم کے اختلاط ہونے پر سوسائٹی کا ایک نیا رنگ ہوگیا ہوگا۔

(ج) خلافۃ بنی امیہ کا دور جب سے شروع ہوتا ہے اسوقت اسلامی تمدن اپنی اُفق اعلی پر تھا۔ غیر اقوام سے روابط بڑھ گئے تھے۔ شاہی محلات اور امرا کی حویلیاں غیر عورتوں سے پُر تھیں مگر اسکے ساتھ ہی بداوت کا رنگ غالب تھا۔ یہ زمانہ عیش و عشرت کا زمانہ تھا وجہ یہ تھی کہ دولت کثرت سے تھی۔ عرب کا وہ خلیفہ جو سوکھی کھجور کھاکر اور پیدل سفر کرکے اپنی خدمت مذہبی و قومی کو انجام دیتا تھا بالکل بدل گیا تھا اگر صورت دیکھو تو پہچا نو نہیں اور یہ دھوکھا ہو کہ سلطنت ایران کے کسی شاہی خاندان کا ممبر ہے۔ علوم و فنون کا چرچا ہو چلا تھا۔ فنون لطیفہ کی گرم بازاری تھی جنسے عورت کی نزاکت اور لطافت کو خاص طرح کا تناسب ہے۔ اسلئے اس دور کی خواتین کے حالات بڑے دلچسپ ہیں۔

(د) چوتھا دور خلافت عباسیہ کا شروع ہوتا ہے۔ ایرانی رنگ ایران کی تراش خراش ایران کی لطافت و نازک مزاجی بالکل عرب کی بداوت و سادگی پر غالب ہے۔ خاص دربار خلافت میں تو ایران کا رنگ پھیلا ہوا ہے مگر اور اطراف میں جہاں عربوں نے فتوحات حاصل کیں ہیں وہاں کے وہ لوگ جو دائرہ اسلام میں داخل ہوتے ہیں بالکل عرب معلوم ہوتے ہیں وضع قطع رفتار و گفتار ہر چیز میں عربی جلوہ نظر آتا ہے۔ لیکن اسکے ساتھ ہی اسپین صرف ہسپانیہ ہوسکا اور پارس فارس

یعنی مطلب یہ ہے کہ ان ممالک کی صورت بدل جانے پر بھی اصلی عادات ومراسم کا منظر پوشیدہ نہیں ہوا۔ اس دور میں علوم وفنون عام طور پر پھیلے ہوئے تھے علماء وفضلا کی قدر دانی تھی۔ قاعدہ ہے کہ جس چیز کی قدر زیادہ ہوتی ہے اُس کی طرف تمام لوگ متوجہ ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ عورتیں بھی اسی اصول کی مصداق بنیں۔ اور اسلام کے ہر دور سے زیادہ اس دور میں قابل وفاضل عورتیں گزری ہیں۔

(۵) چوتھا دور ختم ہوکر پانچواں دور شروع ہوتا ہے۔ مختلف ممالک میں علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم ہوئیں اس دور کی حالت مثل اُس کانذی سیر بین کے ہے جو ادنیٰ سی حرکت دینے پر رنگ برنگ کے پھول سامنے کردیتی ہے۔ ان میں سے بعض خوشنما اور دلکش ہیں تو بعض معمولی یہ صرف حسن ترتیب وانتخاب حرکتی کا نتیجہ ہے کہ کوئی پھول خوبصورت سامنے آجاتا ہے۔

اس دور پر خاتمہ ہے اور اس دور کی عورتوں کے حالات کئی حیثیتوں سے قابل لحاظ ہیں ایک تو یہ کہ انکا خاتمہ ہے دوسرے یہ ہے کہ انکا جو اثر ہمارے دلوں پر رہیگا وہی اثر آخری ہوگا اور ہماری بیگمات کے دل کو بڑھاوا دینے کا یہی دور کام کریگا۔ اسکے بعد یہ دور ختم ہوجاتا ہے۔ اور چھٹے دور کا انتظار ہے دیکھیے خدا اسکا کب وقت لاتا ہے۔

نمبر چار کے لیے مندرجۂ ذیل کتابوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

اغانی۔ عقد الفرید۔ بلوغ العرب۔ احادیث نبوی۔ اسد الغابۃ طبقات بن سعد۔ طبری۔ ابن اثیر۔ مسعودی۔ نفح الطیب ابن خلکان۔ فوات الوفیات۔ معارف ابن قتیبہ۔ ابن خلدون۔ سفر نامہ ابن بطوطہ۔ وابن جبیر۔ مقریزی۔ الف با۔ بیان وتبیین۔

اشعار النصرانیۃ ۔ دواوین شعرا العرب ۔

ضیاء الحسن علوی

قسطنطنیہ

اس آٹھ حرف کے لفظ میں کچھ ایسا چلتا جادو ہے کہ زبان سے نکلتے ہی فوراً ہمارے دلوں کو مسخر کر لیتا ہے ہماری قوم کا بچہ بچہ اس نام سے واقف ہے اور کسی نہ کسی طرح یہ نام کانوں کی راہ سے اسکے ذہن و حافظے کے خزانے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک ایسی کشش مقناطیسی ہے کہ جو خصوصاً مسلمانوں کے دلوں کو اپنے قبضے میں کیے ہوئے ہے اور صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا اسے نہایت وقعت کی نظر سے دیکھتی ہے اس کی وقعت و عظمت کے کئی وجوہ ہیں اولاً تو یہ کہ قسطنطنیہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت کا ایک عظیم الشان دار الخلافہ ہے۔ دوسرے موقع اور منظر کے لحاظ سے یہ دنیا بھر کے شہروں میں بے نظیر ہے۔ جو شخص اسکے حسن خداداد کا نظارہ کرتا ہے وہ بیساختہ اس کی دلفریبیوں کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں ایشیائی اور یورپین تمدن کی تصویر ایک ہی مرقع میں نظر آتی ہے مولوی شیخ عبدالقادر صاحب بی۔ اے۔ بیرسٹر ایٹ لا۔ اڈیٹر مخزن۔ قسطنطنیہ کی اس بے نظیر خصوصیت کو ایک لطیف پیرائے میں بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

دیکھنے کی جو چیز اس شہر میں ہے وہ یہ ہے کہ اسکے بانیوں نے اسکے لیے ایسا موقع ڈھونڈا ہے جسنے اسے سارے جہان کا انتخاب بنا دیا۔ ایک طرف ایشیا اپنی قدامت کو سنبھالے کھڑا ہے اور دوسری طرف یورپ اپنی جدت طرازی پر اترا رہا ہے اور درمیان میں استنبول ہے۔ گویا ایشیا کا

یورپ سے ڈانڈا ملا ہوا ہی۔ ایک طرف سے استنبول یورپ کی اقوام مختلفہ کا مرجع ہے اور دوسری طرف سے ایشیا کی قومیں اُس کی طرف کھنچی چلی جاتی ہیں۔ خصوصاً ایشیا کی مسلمان اقوام کو اس مقام کی قدرتی خوبیوں اور اسکے تجارتی فوائد کے سوا یہاں مذہبی کشش بھی ہے۔ مزید برآں خود ملک کے اندر بھی مختلف مذاہب اور اقوام کی کمی نہیں"۔ نتیجہ یہ ہے کہ۔

جمگھٹا ہی اس میں ترک و فرس و روم و زنگ کا
یعنی گلدستہ ہی اک گلہاے رنگارنگ کا

خداے تعالےٰ کو خود کچھ اس شہر کی مراعات اس قدر منظور ہے کہ اسی کی حکومت میں دنیا کی بڑی بڑی اقوام کے معابد و زیارت گاہ واقع ہیں۔ مکہ معظمہ۔ مدینہ منورہ بیت المقدس۔ نجف اشرف۔ کربلاے معلےٰ۔ بغداد شریف وغیرہ اسی کے علاقے میں ہیں۔ اسکے علاوہ "جوع الارض" کے مریض سلاطینِ یورپ جنھوں نے شگون کے طور پر اس کا "سک مین" نام رکھا ہی وہ الگ اسپر دنداں آز تیز کیا کرتے ہیں۔ غرض اس لفظ کا دنیا کی مختلف اقوام پر مختلف اثر ہوتا ہی اور دنیا کی بڑی بڑی اقوام قسطنطنیہ سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رکھتی ہیں۔

یہ شہر اپنی عظمت و بزرگی کے لحاظ سے جس قدر مشہور ہے اسی قدر اپنی قدامت کے لحاظ سے بھی ایک وسیع حیثیت رکھتا ہی۔ چنانچہ حضرت مسیح کے سات سو برس پہلے بھی اس شہر کا صفحہ دنیا پر رہنا تاریخ سے ثابت ہی۔ اسکا نام اسوقت بزنطاین تھا۔ آجکل جو ملک "ٹرکی ان یورپ" کہلاتا ہے اسی جگہ قدیم زمانے میں میاسی ڈونیا۔ تھیرس۔ میٹیمیا۔ ڈیٹیسیا۔ تھسلی وغیرہ نامی صوبجات واقع تھے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں اہل روما نے انھیں فتح کیا۔ ۳۲۸ء قسطنطین اعظم نے بعیوض روم کے بزنطاین

کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا اور اس میں بہت کچھ ترقی دینے کے بعد اپنے نام پر اسکا نام قسطنطنیہ رکھا اس زمانے سے ۳۳۰ء سے ۱۴۵۳ء تک یہ شہر قیصران روم کا دارالسلطنت رہا جب مسلمان فاتحوں کا بڑھتا ہوا سیلاب اطراف عالم میں پھیلنے لگا تو اکثر سلاطین نے اس عظیم الشان پایہ تخت پر بھی متعدد حملے کیے۔ جن میں سے سب سے پہلا حملہ[1] اور خلیفہ ولید بن عبدالملک کا سپہ سالار عبداللہ بن عبدالمطلب تھا۔ لیکن اس کی فتح کا سہرا قسام ازل نے محمد فاتح کے سر باندھا تھا۔ چنانچہ ۸۵۷ھ مطابق ۱۴۵۳ء میں اس نہایت کمسن فاتح نے ایک حیرت انگیز معرکے کے بعد جس میں خشکی پر کشتیاں چلائی گئی تھیں قسطنطنیہ کو فتح کیا اور اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ اکثر ناظرین جو اس واقعے سے بےخبر ہیں حیران ہونگے کہ خشکی پر کشتی چلانا کیا معنی؟ لیکن عزم صمیم اور ہمت مردانہ کے سامنے اس سے زیادہ اہم باتیں بھی غیر ممکن نہیں ہوتیں مولانا حالی نے نہایت سچ کہا ہے کہ۔

گو رائی بھی پربت ہے اگر دل میں نہیں عزم درست
پربت کو بھی کہتا ہے جی میں ٹھان لی جب پھر پربت بھی ہو تو رائی ہے

---

[1] مضمون نگار صاحب نے اسکے متعلق زیادہ تر قیاس سے کام لیا سب سے پہلے ۴۹ھ میں قسطنطنیہ کی عظمت و شوکت کا غلغلہ چار دانگ عالم میں پھیلا ہوا تھا امیر معاویہ نے فوج بھیجی تھی۔ جسکے افسر یزید بن معاویہ شعبان بن عوف۔ حضرت ابن عباس عبداللہ بن زبیر اور ابوایوب انصاری وغیرہ تھے۔ کچھ حصہ فوج بری لیکن زیادہ تر بحری رستے سے گئی تھی۔ جو دردانیال سے نکلکر بلا فرخسیہ بحر مرمر میں پہنچا۔ اور قسطنطنیہ کے مغربی جانب سات میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالا۔ برابر سات سال تک متواتر لڑتا رہا۔ تقریباً اس مدت میں تیس ہزار مسلمان قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے مارے جاچکے آخر اہل قسطنطنیہ نے مجبور ہوکر امیر معاویہ سے اس شرط پر صلح کرلی کہ پچاس گھوڑے پچاس غلام اور تین ہزار مثقال سونا ہم سالانہ خراج دیا کریگے (ماخوذ از تاریخ ابن جریر طبری)

ایڈیٹر

یہی عزم درست تھا جسنے اس نامور فاتح کو خشکی پر کشتی چلانے میں کامیاب کیا۔ تاریخ شاہد ہی کہ جب محمد فاتح نے قسطنطنیہ پر فوج کشی کی تو اہل شہر نے دریا کی طرف سے بندرگاہ کا راستہ روک دیا تھا۔ اسلیے ترکوں نے یہ ترکیب کی کہ آبنائے باسفورس اور بندرگاہ گولڈن ہارن یعنی شاخ زریں کے درمیان جو سنگلاخ زمین ہی اسپر کئی میل تک تختے بچھا دیے اور جہازوں کو جن میں پہیئے لگا دے گئے تھے ان تختوں پر چلا کر تمام فوجیں بندرگاہ میں اُتار دیں اور اس عظیم الشان شہر کو فتح کر لیا۔ اس بے نظیر و عدیم المثال فتح کا مادۂ تاریخ "بلدۃ طیبۃ" ہے۔

قسطنطنیہ ترکوں کے قبضۂ تصرف میں آنے سے پہلے جبکہ اسپر عیسائی حکومت تھی اس قدر خوبصورت پاکیزہ اور بے انتہا دلچسپیوں کا مرکز نہیں تھا۔ چنانچہ ابن بطوطہ جسنے ۷۳۲ھ میں جبکہ یہاں سلطنت عیسائی تھی اسکو دیکھا تھا اپنے سفرنامے میں لکھتا ہی کہ۔

> تمام بازار نہایت نجس اور کثیف ہے اور گرجے تک اس سے مستثنیٰ نہیں۔

لیکن ترکوں نے اسکے میلے پن اور غلاظت کے دفعیہ کے بہت سے تدابیر کیے اور بہ نسبت سابق کے بہت کچھ اصلاح کر کے بالکل شہر کی کایا پلٹ دی۔

قسطنطنیہ آبنائے باسفورس کے کنارے جو برّ اعظم ایشیا کو برّ اعظم یورپ سے علحدہ کرتی اور بحیرۂ مارمورا کو بحیرۂ اسود سے ملاتی ہے واقع ہی۔ اس آبنائے کی شاخ جو دور تک چلی گئی ہی قسطنطنیہ کو دو قدرتی حصوں میں منقسم کرتی ہی۔ ایک حصہ تو استنبول کہلاتا ہی اور دوسرے میں پیرہ اور غلطہ واقع ہیں۔ استنبول میں مسلمان بکثرت آباد ہیں۔ غلطہ میں بڑے بڑے تاجروں کی کوٹھیاں اور سوداگروں کی منڈیاں ہیں اور پیرہ میں سفرائے دول رہتے ہیں۔ قسطنطنیہ کا ایک حصہ جو ایشیا میں واقع ہے

سقوطری کہلاتا ہے۔ منظر کے لحاظ سے قسطنطنیہ اس قدر دلکش و دلفریب اور خوشنما موقع پر آباد ہے کہ دنیا کے کسی شہر کو یہ نیچرل خوبصورتی حاصل نہیں۔ اسی لیے قسطنطنیہ کی بندرگاہ "گولڈن ہارن" یعنی شاخ زرّیں کے نام سے موسوم ہے۔ اس شہر کی قابل دید عمارتیں۔ شاہی ایوانات جسکو یہاں سرائے کہتے ہیں۔ اور جامع مسجدیں ہیں۔ یہ عمارتیں اپنے مختلف بانیوں کی عظمت و جبروت کی یادگار ہیں۔ یہاں کی کثیر التعداد۔ مشہور اور خوبصورت مساجد میں سب سے عمدہ اور نہایت شاندار مسجد جامع ایا صوفیہ ہے۔

یہ مسجد پہلے ایک عظیم الشان گرجا تھی۔ جسے قسطنطین اعظم نے ۳۲۵ھ میں بنایا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی تعمیر میں سات سال تک دس ھزار مزدور اور ایک سو معمار روزانہ کام کرتے رہے۔ فتح قسطنطنیہ کے بعد فاتح نے اسے مسجد بنالیا۔ اور اب یہ مسجد بوجہ خوبصورتی و آرائش کی وجہ سے اور خوبی عمارت اور عظمت و شان کے لحاظ سے دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ شمس العلما مولانا شبلی نعمانی اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ۔

واقعی یہ عمارت عجیب و غریب اور حیرت افزا ہے۔ بیچ کے گنبد کا قطر ۱۱۵ فٹ اور چھت کا ارتفاع ۱۸۰ فٹ ہے۔ ۱۰۷ استون ہیں اور کل سنگ سماق اور خام کے ہیں۔ ان ستونوں کا قطر تین تین چار چار ہاتھ سے کم نہیں۔ دروازہ قسطنطین کے زمانے کا ہی تانبے کا ہے اسپر قدیم زمانے کی تصویریں بنی ہیں اور اب تک قائم ہیں۔ چھت پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کی جو تصویریں تھیں اُنکے آثار اب بھی موجود ہیں۔

جامع ایا صوفیہ کے علاوہ جامع حمیدیہ جس میں سلطان ہر جمعہ نماز کے لیے تشریف فرما ہوتے ہیں۔ جامع سلیمان۔ جامع سلطان احمد۔ جامع بایزید وغیرہ نہایت ممتاز اور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سلاطین عثمانیہ میں سے ہر سلطان نے

باستثناے چند اپنے عہد میں ایک جامع مسجد ضرور تعمیر کرائی ہے اور اسکے عالیشان اور پر شوکت بنانے کا بڑا خیال رکھا ہے۔ ان کی وسعت و رفعت۔ آراستگی اور شان و شکوہ سے آجتک سیاح متحیر و مرعوب ہوجاتے ہیں۔ قسطنطنیہ کی مردم شماری ۱۱۲۵۰۰۰ ہی۔ آب و ہوا نہایت خوشگوار اور صحت بخش ہی شہر کی وسعت اور تمدن کے بارے میں مولانا شبلی فرماتے ہیں کہ۔

> شہر کی وسعت اور تمدن کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ خاص استنبول میں (یعنی قسطنطنیہ کے صرف ایک حصے میں) ۵۰۰ جامع مسجدیں ۱۷۱ حمام۔ ۳۲۴ سرائیں۔ ۱۶۴ مدارس قدیم۔ ۵۰۰ مدارس جدید۔ ۱۲ کالج۔ ۵۴ کتب خانے۔ ۳۰۵ خانقاہیں ۵۴ چھاپے خانے ہیں۔ کاروبار اور کثرت آمد و رفت کی یہ کیفیت ہے کہ متعدد ٹراموے گاڑیاں۔ بارہ دخانی جہاز۔ زمین کے اندر کی ریل۔ معمولی ریلیں (جو ہر آدھ گھنٹہ کے بعد چھوٹتی ہیں) ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ اور باوجود اسکے تمام سڑکوں پر پیادہ پا چلنے والوں کا اسقدر ہجوم رہتا ہی کہ ہر وقت میلہ سا معلوم ہوتا ہی۔ غلطہ اور استنبول کے درمیان جو پل ہی اُسپر سے گزرنے کا محصول فی شخص ایک پیسہ ہی اس کی روزانہ آمدنی پانچ چھ ہزار روپیے سے کم نہیں ہی۔

سید خورشید علی
حیدرآباد۔ دکن۔

اڈیٹوریل

ختم سال۔ ابھی کے دن ہوئے کہ سنہ ء شروع ہوا تھا۔ طرح طرح سے لوگوں نے اسکا

خیر مقدم کیا تھا عجیب عجیب مضامین اور قصیدے اُسکی آمد میں لکھے تھے - یا آج وہ دن ہی کہ ہم اس سال کی فاتحہ خوانی نہیں تو کم سے کم اُسپر یسین پڑھنے کے لیے بیٹھے ہیں - کیونکہ اب وہ کوئی دم کا مہمان ہے وہ عنقریب گزر جائیگا وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو جائیگا - اور بجالیکہ ۱۹۲۶ء کے آہی مہینے میں وہ ایک امید افزا مستقبل خیال کیا جاتا تھا - اسی میں بہت سے کاموں کے منصوبے باندھے جاتے تھے بہت سے اہم معاملات اسی پر محول کر دیے جاتے تھے اب ایک گزرا ہوا سال تمام ہوگا - اور اس سے کسی قسم کی توقع نہ رکھی جائے گی -

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں -

اس زمانے کی کیفیت بعینہ بائسکوپ کے تماشائیوں جیسی ہی - جنکے سامنے سے جلدی جلدی تصویر کا پردہ کھنچتا رہتا ہی اور وہ بے حس و حرکت اور بیجان تصویروں کو چلتی پھرتی دیکھتے ہیں - اسی طرح زمانے کا ہر ایک سال ان تمام واقعات کا ایک مرقع ہی جنکا واقع ہونا اس سال میں اس ذات نے مقرر کر دیا جسنے ازل سے ابد تک زمانے کی ترتیب دی ہی - دنیا کی نگاہوں کے سامنے سے وہ زمانہ برابر جلد گزرتا چلا جاتا ہی - اور وہ واقعات وہ باتیں وہ کام جنکا وہ مرقع ہے ہماری آنکھوں کے سامنے آتے ہیں اور مٹتے جاتے ہیں -

بازیچہ اطفال ہی دنیا مرے آگے ہوتا ہی شب و روز تماشا مرے آگے

عوام الناس ان سب واقعات کو زید - عمر - بکر کا کام سمجھتے ہیں - دہریہ کہتا ہی کہ یہ واقعات زمانہ کی رو میں اسیکے ساتھ آئے اسی کے ساتھ چلے گئے مگر عقلمند سمجھتے ہیں کہ نہ تصویروں کا کھیل ہی نہ پردوں کا یہ سب ہنر اور تماشا پردہ ساز کا ہے -

دنیا کی مثال یوں سمجھلو کہ تمام دنیا کے لوگ ایک تاریک کمرے میں بند ہیں جسمیں نہ کوئی دروازہ ہے نہ کوئی کھڑکی ہی - صرف سامنے دیوار میں ایک بہت چھوٹا سا سوراخ ہی جسمیں سے روشنی آتی ہے باہر کی جانب اسی سوراخ پر سے ایک بے انتہا لمبی رسی کھنچتی ہوئی چلی جا رہی ہی - کمرے کے لوگ رسی کے صرف اُسی حصے کو دیکھ سکتے ہیں جو اس سوراخ کے مقابل میں رہتا ہی اور جو حصہ نکل گیا اُسکا

ایک ہندلا سا خیال رہتا ہے۔ جو آنے والا ہے اُس کی مطلق خبر نہیں۔ جو شخص کمرے کے باہر کھڑا ہے وہ اِدہر اُدہر دونوں جانب شروع سے اخیر تک سڑک کو دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح وہ ذات جو زمان و مکان سے بری ہے ہر وقت گزشتہ موجودہ اور آیندہ تینوں زمانے اُس کی نگاہوں کے سامنے ہیں اور ہمیشہ اُسکو یکساں تینوں زمانوں کا علم رہتا ہے۔ ابھی زید پیدا بھی نہیں ہوا ہے کہ اُس کی جوانی بڑھاپے موت اور موت کے بعد کے تمام حالات اُسکے پیش نظر ہیں اور ہمیشہ رہینگے۔

الغرض زمانے کا ایک نہایت چھوٹے سے چھوٹا حصہ ہمارے نصیبوں میں لکھا گیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ دن ہمارا رات ہماری۔ مہینہ ہمارا۔ سال ہمارا۔ سب کچھ ہمارا۔ لیکن ذرا غور کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ صرف ایک آن جو سکنڈ کا بھی ہزارواں حصہ ہوگی جسکے وجود میں بھی بعض لوگ شبہ کرتے ہیں ہماری ہے۔ لیکن وہ گزشتہ اور ماقبل سے ایک مسلسل تعلق رکھتی ہے جس سے ایک متصل زمانہ بنتا ہے جسکو ہم مہینہ سال وغیرہ مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اور اُسی کا ایک حصہ یہ سال بھی ہے جو اب چند دنوں میں گزر جائیگا۔

دنیا میں کوئی کام بے نتیجہ نہیں ہوتا اور جس طرح سمندر میں جو کنکری ڈالی جاتی ہے اُسکی حرکت کا ایک اثر دور دور تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ تمام کام جو اس سال میں ہوئے ہیں یقیناً اُنکے نتائج کا سلسلہ بھی بہت کچھ زمانہ آیندہ سے تعلق رکھیگا۔ اسلیے انسان کیواسطے یہ ایک ضروری امر ہے کہ وہ واقعات کی رفتار اور اُنکے نتائج پر غور کرے۔

یہ سال تمام ہندوستان اور خاصکر ہمارے کالج کے لیے ایک تاریخی سال ہے جسکی یاد کبھی نہیں بھول سکتی کیونکہ اس سال ہز مجسٹی شاہ کابل ۱۶ جنوری کو کالج میں تشریف لائے تھے۔ جو کالج کی تاریخ میں ایک ایسا شاندار اور قابل فخر واقعہ ہے جس سے کالج کی عظمت اور مقبولیت دوبالا ہوگئی۔ اور اب آیندہ کسی خود مختار بادشاہ اسلام کی آمد کی امید لگانا ایک نہایت دشوار امر معلوم ہوتا ہے۔

یہ بھی ایک مثل مشہور ہے کہ سرور کے بعد خمار آتا ہے۔ اور زیادہ ہنسی رونے کا سبب ہوتی ہے۔ چنانچہ ہز مجسٹی کی تشریف بری کے بعد ہی کالج میں طلبا کی ناگوار اسٹرائک کا واقعہ پیش آیا جسکو ہم

اسی سرور کا خما سمجھتے ہیں۔
وہ قضیہ بھی رفع ہوگیا اور اطمینان ہوا تھا کہ کچھ دنوں کے بعد ہی نواب محسن الملک مرحوم کے انتقال کا روح فرسا واقعہ پیش آیا۔ نواب صاحب مرحوم اُن لوگوں میں سے تھے جو اپنے ذاتی کمال اور پاکیزگی طبیعت کی وجہ سے قوم اور ملک کے دلوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔ صدیوں آسمان چکر لگاتا ہے تب کہیں اس دل و دماغ کا آدمی کسی قوم میں پیدا ہوتا ہے۔ الغرض یہ سال ایک بہت بڑی خوشی یعنی شاہ کابل کی تشریف آوری سے شروع ہوتا ہے اور ایک بڑے رنج یعنی نواب صاحب مرحوم کی وفات پر ختم ہوتا ہے۔

دوران بقا چو باد صحرا بگذشت　　　تلخی و خوشی و زشت و زیبا بگذشت

یہ سال ہمارے صیغہ تعلیم نسواں کے لیے بھی خاص طور پر قابل یادگار اور مبارک تھا قبل اسکے کہ یہ صیغہ ہمارے سپرد کیا جائے ہم لڑکیوں کے لیے ایک عمدہ کورس بنانے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ اسی زمانے میں ہمنے اس کی ایک اسکیم بھی شائع کر دی تھی۔ مگر ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ اسی اسکیم کو جس کی فکر میں ہم نہایت غلطاں و پیچاں تھے اس سال پھر ہم نے خاتون میں شائع کیا جسکو ہندوستان کی سب سے بڑی اور معزز مسلمان بیگم یعنی ہر ہائنس نواب بیگم آف بھوپال نے دیکھا اور اپنی دریا دلی سے پانچہزار روپیہ ہم کو کورس کے لیے عطا فرمائے جس سے نہ صرف ہمارے صیغے کی بلکہ تمام مسلمانان ہندوستان کی ایک بہت بڑی ضرورت پوری ہوگئی۔ اور ہم نے خدا کی درگاہ میں شکریہ ادا کیا کہ ہماری ایک بہت بڑی مشکل آسان ہوئی ہر ہائنس کے اس عطیہ کا احسان قوم کسی حالت اور کسی وقت میں بھی نہ بھلا سکیگی۔ کیونکہ کسی صیغہ کی کامیابی کی حالت میں اُس کی امداد ہر شخص کر سکتا ہے۔ مگر ابتدا ابتدا میں جو لوگ اُسکا سنگ بنیاد رکھتے ہیں وہی درحقیقت اس کام کے حقیقی خیر خواہ اور محسن ہیں۔ اور وہی السابقون الاولون ہیں۔

اجرش دہد خدا کہ کرد یاری　　　با آنکساں کہ ناصر و یاور نداشتند

کورس کا دفتر باقاعدہ مرتب ہو گیا ہی۔ اور ایک مہینے سے اسکا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے اور خداوند سے امید ہی کہ ایک سال کے عرصہ میں ہم ایک عمدہ کورس ترتیب دے سکینگے اور ہر ہائنس بیگم آف بھوپال کو ہمیشہ ہمیشہ اس علمی صدقہ جاریہ کا اجر ملتا رہیگا۔

اسی سال خوش قسمتی سے گورنمنٹ نے بھی ہمارے صیغہ پر نظر مرحمت فرمائی پندرہ ہزار روپیے زنانہ نارمل اسکول کے بورڈنگ وغیرہ کے لیے منظور فرمائے۔ اور ڈہائی سو روپیے ماہوار تک کی امداد دینے کا وعدہ کیا۔ گورنمنٹ کا شکریہ ہم سے کسی طرح ادا نہیں ہو سکتا۔ وہ ہماری ضرورتوں کو ہم سے زیادہ محسوس کرتی ہی۔ اور جس کام کی ہم ابتدا کرتے ہیں سرگرمی سے اُس کی امداد کے لیے مستعد ہو جاتی ہی۔ تمام قوم کو گورنمنٹ کی اس مہربانی اور احسان کا اعتراف کرنا چاہیے۔ امید ہی کہ ہم عنقریب اسکول کی عمارت کی ابتدا کرینگے۔

ہمارے دیگر معاونین نے بھی خاموشی اور سکوت سے کام نہیں لیا بلکہ اس صیغہ کی امداد کے لیے ہر طرح پر مستعد رہے۔ اس کی مفصل کیفیت خاتون کے صفحات میں ماہوار شائع ہوتی رہی ہی۔ ہم اپنے صیغے کے تمام حامیوں کے دل سے شکرگزار ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خداوند اُن کی ہمتوں میں برکت دے۔ کیونکہ اُن کی سچی ہمدردی قوم اور ملت کے لیے باعث رحمت ہی۔

رسالہ خاتون جو تعلیم نسواں کی اشاعت کی غرض سے ماہوار ہم شائع کرتے ہیں اُس کی حالت پر بھی جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو نہایت خوشی ہوتی ہی کیونکہ اس رسالہ نے جس کی عمر ابھی چار سال کی بھی نہیں ہوئی ہی ملک اور قوم میں بڑی عزت اور مقبولیت حاصل کرلی ہی۔ اور شکر ہی کہ اپنے مقصد اور اغراض یعنی تعلیم نسواں کے صور کو اسنے اس بلند آہنگی سے پھونکا ہی کہ بیشتر حصہ قوم کا بیدار ہو گیا ہی اور تعلیم نسواں کی ضرورت کو محسوس کرنے لگا ہی اور اب بہت کم لوگ ایسے رہگئے ہیں جو مقصد کے مخالف ہوں۔ اور جو مخالف نہیں اُنکی مخالفت بھی

سکوت ہی کے پردہ میں ہی الغرض یہ رسالہ قوم کے لیے ایک نسخۂ بے بدل ثابت ہوا۔ خود اُسنے ایک شاندار زنانہ لٹریچر کی بنیاد ڈالی ہی جو ملک میں مقبولیت کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے تمام بڑے خاندانوں میں اسنے تعلیم نسواں کا چرچا پھیلا دیا ہے۔

حیدرآبادی خیرخواہ۔ پیسہ اخبار۔ وزانہ میں ہم کو حیدرآباد سے ہمارے ایک کرمفرما نے یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ جوشیلے نوجوان جنھوں نے ہمارے خیال میں نہایت سچی خیرخواہی اور دلی ہمدردی سے ہمارے صیغے کی ترقی کے لیے کوشش کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے کام کرنے کے قابل نہیں ہیں اور نام و نمود کے خواہش مند ہیں۔ ہمارے دوست نے دو ایک اور بزرگوں کے نام لکھے ہیں اور اُنسے امید کی توقع دلائی ہے۔ ہم اپنے خیرخواہ دوست کو مطمئن کرتے ہیں کہ وہ حضرات بھی جنکا نام اُنھوں نے پیش کیا ہے ہمارے صیغہ کے پہلے ہی سے حامی اور مددگار ہیں اسکے ساتھ ہی ہم خود اپنے مضمون نگار دوست سے بھی توقع رکھتے ہیں کہ اگر وہ دوسروں کی ہمدردی کو نمائشی بتلاتے ہیں تو خود اس قومی کام میں امداد دیکر اپنی سچی ہمدردی کا ثبوت دینگے۔

اس قومی کام میں نہ زید کی تخصیص ہی نہ عمر کی جو اسکو کرے ہم اُسی کے ممنون و مشکور ہیں اور ہم کسی طرح ان جوشیلے نوجوانوں کی ہمت اور ہمدردی کا احسان فراموش نہیں کرسکتے جو بلا کسی امید کے ہمارے صیغہ کی امداد کے لیے محض اپنے دلی درد سے اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں خدا اُن کی ہمتوں میں برکت دے۔ ہمارا تو یہ مقولہ ہی۔

شاہد آن نیست کہ روے و میانے دارد
بندۂ طلعتِ آں باشں کہ آنے دارد

زنانہ پارٹی۔ ۱۹۔ نومبر ۱۹۲۸ء کو نواب بیگم صاحبہ جزیرہ نے اپنے نئے محل قصر آحمد میں جو اپنی آرائش۔ خوبصورتی اور خوش وضعی کے لحاظ سے ہندوستان کے ممتاز محلوں میں شمار ہونے کے قابل ہے ایک زنانہ پارٹی دی۔ ہمیشہ اس قسم کی پارٹیاں شام کو دیجایا کرتی تھیں لیکن اس دفعہ اُسکے لیے چاندنی رات خاص طور پر مخصوص کی گئی جو اس بے نظیر قصر پر اپنا عجیب خوشنما اور پُرلطف رنگ دکھاتی ہے۔ ٹھیک سات بجے جشن شاہی میں مہمانوں نے شرکت حاصل کی۔ کل محل آویزوں اور جھاڑوں سے روز روشن کی طرح منور ہورہا تھا۔ مامائیں صیلیں۔ کنیزیں۔ پیش خدمتیں قرینہ سے کھڑی ہوئی تھیں۔ نواب بیگم صاحبہ مہتابی پر تشریف فرما تھیں۔ اُنکے اردگرد اُن کی رشتہ دار بیگمات بھی موجود تھیں۔ مہتابی اسوقت چمنستان بنی ہوئی تھی۔ اور دو حصوں میں ہندو اور مسلمان خاتونوں کی الگ الگ میزیں چنی ہوئی تھیں۔ تقریباً ۸۰ خواتین کا مجمع تھا۔

ہندو لڑکیوں نے مختلف کھیل کھیلے گایا اور بڑی دلچسپی کے ساتھ وقت گزارا۔ گیارہ بجے کے بعد یہ جلسہ ختم ہوا۔ دیوان صاحب کی لڑکی نے نہایت عمدہ الفاظ میں مناسب اور عمدہ طریقہ سے بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کیا اور مہمان رخصت ہوئے۔

قاموس النسار۔ ضیاء الحسن صاحب علوی کی تجویز قاموس النسار کے متعلق جو صفحات خاتون میں درج کی گئی ہے نہایت عمدہ اور مفید تجویز ہے۔ ہم خود اس قسم کی ضرورت کو عرصہ سے محسوس کرتے ہیں۔ ضیاء الحسن صاحب نے اسکے بار کو خاص طور پر ہمارے سر پر رکھنا چاہا ہے۔ لیکن ہم ابھی ان ضروری ہی کاموں کو انجام نہیں دے چکے جنپر تعلیم نسواں کی بنیاد ہے اسلیے ہمارا کسی دوسرے کام کی طرف متوجہ ہونا باعث نقصان ہی۔ اسکے ساتھ ہی اگر کوئی صاحب اس قسم کے قاموس لکھنے کی زحمت گوارا کرینگے تو ہم ضروری امداد دینے کے لیے تیار ہیں۔ اور نہیں تو یہ ضروری کاموں سے فراغت کے

بعد ہم خود ہی اس کی طرف متوجہ ہونگے۔ کیونکہ یہ کام کرنے کا ہی۔

کالج کا نیا سکرٹری۔ یہ بات تو پہلے ہی سے معلوم تھی کہ نواب وقارالملک صاحب کالج کے سکرٹری ہونگے کیونکہ نواب صاحب کی ذات ایسی ہی جسپر باتفاق تمام اہل ملک نے اعتماد کرکے انہیں کو اس عہدہ کے لیے موزوں سمجھا۔ اور درصل نواب وقارالملک کی موجودگی میں ملک میں کون ایسا شخص تھا جسپر تمام ملک کی اس طرح نگاہ انتخاب پڑتی چنانچہ ۱۵ - دسمبر ۷ء کو جو ٹرسٹیوں کی میٹنگ ہوئی اُس میں نواب صاحب کالج کے سکرٹری باضابطہ طور پر ہوگئے۔

امید ہی کہ نواب صاحب کا عہد بہ نسبت نواب محسن الملک مرحوم کے بھی زیادہ مبارک اور شاندار ہوگا۔ ہم یہی دعا کرتے ہیں۔ اور خدا سے یہی امید رکھتے ہیں۔

جہاں آرا بیگم

شاہجہاں بادشاہ جس نے دہلی شہر بسایا اُس کی لائق اور فاضل بیٹی جہاں آرا بیگم کی سوانح عمری نہایت خوبی کے ساتھ جناب مولوی محبوب الرحمن صاحب کلیم بی۔ اے۔ نے تصنیف کی ہی جسکو تمام عورتوں کو پڑہنا چاہیے۔ کیونکہ اس کتاب میں جہاں اس بیگم کے صحیح اور معتبر تاریخی حالات ہیں وہاں اُس کی زبان نہایت عمدہ اور پاکیزہ ہے۔ چھپائی لکھائی کاغذ سب اعلیٰ درجے کا۔ اور قیمت صرف ۸/

اہل بیت

اس کتاب کی بھی چھپائی لکھائی اور کاغذ نہایت اعلیٰ درجہ کا ہی۔ اسمیں رسول عربی کی ازواج مطہرات اور اُن کی مقدس بیٹیوں کے نہایت مستند اور صحیح تاریخی حالات لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب اصل میں سرسید علیہ الرحمہ کی کتاب امہات المومنین کا تکملہ ہے۔ اس کی خوبیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ قیمت ۱۰/

دونوں کتابوں کے ملنے کا پتہ

دفتر خاتون علی گڑھ